جاوید احمد غامدی

البیان

الانعام ـ الحجر

۶ــ۱۵

۲

البیان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

باب دوم

باب سوم

باب دوم

الانعام ۔ التوبۃ

قریش پر اتمام حجت
مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر
اور قریش اور اہل کتاب، دونوں کے لیے
خدا کی آخری دینونت کے ظہور کا بیان

باب دوم

الانعام ـ التوبة

۶ —— ۹

یہ قرآن مجید کا دوسرا باب ہے۔ اِس میں 'الانعام' سے 'التوبة' تک چار سورتیں ہیں۔ اِن سورتوں کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں سے پہلی دو ـــــ 'الانعام' اور 'الاعراف' ـــــ ام القریٰ مکہ میں اور آخری دو ـــــ 'الانفال' اور 'التوبة' ـــــ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔

قرآن کے دوسرے تمام ابواب کی طرح یہ چیز اِس باب میں بھی ملحوظ ہے کہ یہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا اور مدنیات پر ختم ہو جاتا ہے۔

اِس کے مخاطب مکی سورتوں میں قریش اور مدنیات میں مسلمان ہیں، اہل کتاب کا ذکر اگر کہیں ہوا ہے تو ضمناً ہوا ہے۔ چنانچہ اِس کی مکیات میں استدلال بھی بیش تر عقل و فطرت اور انفس و آفاق کے شواہد سے ہے یا پھر تاریخ کے حقائق اور قریش کے مسلمات سے۔ اِس لیے کہ وہ صحیح بھی تھے اور قریش اُنھیں تسلیم بھی کرتے تھے۔

اِس کا موضوع قریش پر اتمام حجت، مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر، اور قریش اور اہل کتاب، دونوں کے لیے خدا کی آخری دینونت کے ظہور کا بیان ہے۔

یہ باب ایک ذروۂ سنام ہے جس میں آگے اور پیچھے کے تمام ابواب اپنے منتہا کو پہنچتے اور رسولوں کے باب میں خدا کی اُس سنت کا ظہور ہوتا ہے جس کے تحت اُنھیں

غلبہ حاصل ہوتا اور اُن کے مخالفین لازماً مغلوب ہو جاتے ہیں۔

یہ مضمون اِس باب میں جس ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے، وہ یہ ہے:

الانعام: دعوت و انذار۔

الاعراف: انذار اور اتمام حجت۔

الانفال: اتمام حجت کے بعد خدا کی آخری دینونت کے لیے مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر اور اُنھیں جہاد کی تیاری کی ہدایت۔

التوبۃ: آخری دینونت کا ظہور۔

الانعام- الاعراف

٦ ـــــ ٧

الانعام - الاعراف

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں جو حقائق عقل و فطرت اور انفس و آفاق کے دلائل سے ثابت کیے گئے ہیں، دوسری میں اُنھی کا اثبات تاریخی دلائل کے ساتھ اور اتمام حجت کے اسلوب میں ہوا ہے۔ پہلی سورہ میں دعوت اور دوسری میں انذار کا پہلو غالب ہے۔ دونوں کے مخاطب قریش ہیں اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ دونوں سورتیں بالترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام اور مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ـــــ الانعام ـــــ کا موضوع قریش کے لیے توحید، رسالت اور معاد کے بنیادی مسائل کی وضاحت، اِن مسائل کے بارے میں اُن کی غلط فہمیوں پر تنبیہ اور اُنھیں توحید خالص پر ایمان کی دعوت ہے۔

دوسری سورہ ـــــ الاعراف ـــــ کا موضوع قریش کو انذار اور اُن کے لیے اِس حقیقت کی وضاحت ہے کہ کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت کے مقتضیات و تضمنات کیا ہیں اور اگر کوئی قوم اپنے رسول کی تکذیب پر اصرار کرے تو اُس کے کیا نتائج اُسے لازماً بھگتنا پڑتے ہیں۔

سورۃ الانعام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوۡرَ ۬ؕ ثُمَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱﴾

—— ۱ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

شکر اللہ ہی کے لیے ہے[۱] جس نے زمین و آسمان بنائے، روشنی اور تاریکیاں پیدا کیں۔ پھر تعجب ہے کہ یہ منکرین اپنے پروردگار کے ہم سر ٹھیراتے ہیں[۲]! وہی ہے جس

۱۔ اصل میں لفظ 'اَلْحَمْدُ' استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں یہ کسی کی خوبیوں اور کمالات کے اعتراف کے لیے بولا جاتا ہے۔ پھر ان خوبیوں اور کمالات کا فیض اگر حمد کرنے والے کو بھی پہنچ رہا ہو تو اِس میں شکر کا مفہوم آپ سے آپ شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف (۷) آیت ۴۳، سورۂ یونس (۱۰) آیت ۱۰ اور سورۂ ابراہیم (۱۴) آیت ۳۹ میں اِس کے نظائر سے واضح ہوتا ہے کہ 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ' کی ترکیب میں یہ بالعموم اُسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جسے ہم لفظ شکر سے ادا کرتے ہیں۔

۲۔ یہ مشرکین عرب کے مسلمہ سے استدلال فرمایا ہے کہ جب وہ زمین و آسمان اور نور و ظلمت سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں تو پھر کیسی عجیب بات ہے کہ اُسی کے شریک ٹھیرانے کی جسارت کرتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...شرک پر اظہار تعجب کا ایک پہلو تو یہی ہے کہ جب ساری چیزوں کا خالق خدا ہی ہے تو پھر شرک کی گنجایش کہاں سے نکلی؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اِس کائنات کی چیزوں میں بظاہر جو تضاد نظر

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰٓی اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝۲ وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّکُمْ وَجَهْرَکُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَکْسِبُوْنَ ۝۳ وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ

نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر (تمھارے لیے) ایک مدت ٹھیرا دی اور ایک دوسری مدت بھی ہے جو اُس کے ہاں مقرر ہے۔[3] تعجب ہے کہ اِس کے بعد بھی کج بحثیاں کرتے ہو! وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی۔ وہ تمھارے کھلے اور چھپے سے واقف ہے اور جو کمائی تم کر رہے ہو، اُسے بھی جانتا ہے۔[4] لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُن

آتا ہے، مثلاً زمین اور آسمان، روشنی اور تاریکی، سردی اور گرمی، تو اِس تضاد کے اندر اِس کائنات کے مجموعی مقصد کے لیے ایسی حیرت انگیز سازگاری بھی ہے کہ کوئی عاقل تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اِن میں سے ہر ایک کے خالق و مالک الگ الگ ہیں۔ بلکہ ہر صاحب نظر یہ ماننے پر مجبور ہے کہ پوری کائنات ایک ہی کارفرما کے ارادے اور مشیت کے تحت حرکت کر رہی ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۷)

۳؎ مطلب یہ ہے کہ وہی خدا ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تم انکار نہیں کر سکتے۔ پھر یہ بھی جانتے ہو کہ ہر ایک کے لیے جینے کی ایک مدت مقرر کر دی گئی ہے۔ اِن حقائق کو سمجھتے ہو تو اِس بات میں شک کی گنجایش کہاں سے پیدا ہو جاتی ہے کہ جس خدا کو پہلی مرتبہ تمھیں مٹی سے پیدا کر دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، وہ مرنے کے بعد اِسی مٹی سے تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا؟ تم میں سے ہر ایک کے لیے موت ہے تو اِس بعث و نشر کے لیے بھی ایک دوسری مدت ہے جو اُسی نے مقرر کر رکھی ہے۔

۴؎ یعنی تمھارا یہ رویہ اگر اِس بھروسے پر ہے کہ زمین کا نظم و نسق کچھ دوسرے خداؤں کے سپرد ہے، تم اُن کے پرستار ہو، اِس لیے وہ تمھیں بخشوا لیں گے تو یہ غلط فہمی دور کر لو۔ زمین و آسمان،

مِّنۡ اٰيٰتِ رَبِّهِمۡ اِلَّا كَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِيۡنَ ۝۴ فَقَدۡ كَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ ؕ فَسَوۡفَ يَاۡتِيۡهِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝۵ اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مَا لَمۡ نُمَكِّنۡ لَّكُمۡ وَاَرۡسَلۡنَا السَّمَآءَ عَلَيۡهِمۡ مِّدۡرَارًا ۖ وَّجَعَلۡنَا الۡاَنۡهٰرَ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهِمۡ فَاَهۡلَكۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ وَاَنۡشَاۡنَا

الانعام ۶

کے پاس اُن کے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی آتی ہے، وہ اُس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ سو اُنھوں نے (اِس وقت بھی) حق کو جھٹلا دیا ہے[۵]، جب کہ وہ اُن کے پاس آ گیا ہے۔ اِس لیے عنقریب اُس چیز کی خبریں اُن کے پاس آ جائیں گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے ہیں[۶]۔ کیا اُنھوں نے دیکھا نہیں کہ اُن سے پہلے کتنی قومیں ہم نے ہلاک کر دیں جنھیں زمین پر ہم نے وہ اقتدار بخشا تھا جو، (قریش کے لوگو)، تمھیں نہیں بخشا ہے[۷]؟ اُن پر ہم نے خوب مینہ برسائے اور اُن کے نیچے نہریں بہا دیں، مگر (وہ جھٹلانے پر مصر رہے تو) اُن کے گناہوں کی پاداش میں بالآخر ہم نے اُنھیں ہلاک کر دیا

دونوں کا خدا ایک ہی ہے اور دونوں میں اُسی کا حکم چل رہا ہے۔ تمھارے کھلے اور چھپے، سب احوال بھی اُس کے علم میں ہیں اور تمھارے اعمال سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔ کسی میں یارا نہیں کہ اُس کے علم میں کوئی اضافہ کر سکے۔ متنبہ ہو جاؤ، اُس کی بارگاہ میں کسی شفاعت باطل کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

۵۔ یہاں 'حق' سے قرآن مجید مراد ہے۔

۶۔ یعنی خدا کا عذاب جس کی وعید تمام رسولوں نے اپنی قوموں کو سنائی ہے۔

۷۔ اوپر جو دعویٰ کیا گیا ہے، یہ اُس پر تاریخ کی شہادت پیش کر دی ہے۔ سورۂ اعراف میں اِس

مِنۢ بَعۡدِهِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِیۡنَ ﴿۶﴾
وَلَوۡ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ کِتٰبًا فِیۡ قِرۡطَاسٍ فَلَمَسُوۡہُ بِاَیۡدِیۡہِمۡ لَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۷﴾ وَقَالُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ مَلَکٌ ؕ وَلَوۡ اَنۡزَلۡنَا مَلَکًا لَّقُضِیَ الۡاَمۡرُ ثُمَّ لَا یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۸﴾ وَلَوۡ جَعَلۡنٰہُ مَلَکًا لَّجَعَلۡنٰہُ رَجُلًا وَّلَلَبَسۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّا یَلۡبِسُوۡنَ ﴿۹﴾

اور اُن کے بعد اُن کی جگہ دوسری قوموں کو اٹھا کھڑا کیا۔ ۱-۶

تم پر[۸]، (اے پیغمبر)، اگر ہم کوئی ایسی کتاب اتار دیتے جو کاغذ پر لکھی ہوئی ہوتی اور یہ اُس کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھ بھی لیتے، تب بھی یہ منکرین یہی کہتے کہ یہ کھلے ہوئے جادو کے سوا کچھ نہیں ہے[۹]۔ کہتے ہیں کہ اِس نبی پر (علانیہ) کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ (یہ احمق نہیں سمجھتے کہ) اگر ہم نے کوئی فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک فیصلہ ہو جاتا، پھر اِن کو کوئی مہلت نہ ملتی[۱۰]۔ اور (نہیں سمجھتے کہ) اگر ہم اُس کو کوئی فرشتہ

کی تفصیلات آئیں گی جو اِس سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۸۔ یہاں سے آگے اُن اعتراضات اور مطالبات کا جواب دیا ہے جو منکرین اپنے اعراض کے لیے بہانے کے طور پر پیش کر رہے تھے۔

۹۔ یعنی اعراض کا سبب چونکہ وہ نہیں جو بیان کر رہے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کے خلاف کوئی بات ماننا نہیں چاہتے، اِس لیے اِن کا یہ مطالبہ پورا بھی کر دیا جائے تو اِسی طرح کی باتیں کریں گے۔ یاد رہے کہ یہ اُسی طرح کے مطالبے کا جواب ہے جو اہل کتاب کی زبان سے سورۂ نساء (۴) کی آیت ۱۵۳ میں نقل ہو چکا ہے۔

۱۰۔ یہ اِس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا علم و عقل اور ارادہ و اختیار کے امتحان کے لیے

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٠﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١١﴾

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ

بنا کر بھیجتے تو اُسے بھی انسان کی صورت ہی میں بھیجتے[۱۱]۔ اور اِس طرح اِن کو اُسی شبہے میں ڈال دیتے جس میں یہ اب پڑے ہوئے ہیں[۱۲]۔ حقیقت یہ ہے کہ تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو اُن کا مذاق اڑانے والوں کو اُسی چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ اِن سے کہو، ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا ہے[۱۳]۔ ۷-۱۱

اِن سے پوچھو، زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، وہ کس کا ہے؟ کہہ دو، اللہ ہی کا ہے[۱۴]۔ اُس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے[۱۵]۔ وہ تم سب کو جمع کر کے ضرور روز

بنائی گئی ہے۔ جب پردے اٹھا دیے جائیں گے اور لوگ حقائق کو بچشم سر دیکھ لیں گے تو کسی کا ایمان اُس کے لیے نافع نہ ہوگا۔ ایمان وہی معتبر ہے جو غیب میں رہتے ہوئے اور عقل و فطرت کے اُن دلائل کی بنیاد پر لایا جائے جس کی دعوت انبیا علیہم السلام نے دی ہے۔

۱۱؎ اِس لیے کہ انسان اُسے انسانوں کی شکل ہی میں دیکھ سکتے اور اُس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

۱۲؎ شبے میں ڈالنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے۔ یہ اُس ضابطے اور قانون کی نسبت ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔

۱۳؎ یہ صرف اجمالی اشارہ ہے۔ اِس کی تفصیل آگے سورۂ اعراف (۷) میں آئے گی۔

الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَهٗ مَا سَكَنَ

قیامت کی طرف لے جائے گا جس میں کوئی شبہ نہیں[۱۶]۔ اِس کو وہی لوگ نہیں مانتے جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کر لیا ہے[۱۷]۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ رات میں

۱۴؎ سوال کے بعد مخاطب کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی جواب دینے کا یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب مخاطب کے لیے انکار کی گنجایش نہیں ہوتی اور سوال سے مقصود بھی اصلاً اُس کے کسی مسلمہ کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے۔

۱۵؎ یعنی صفت رحمت سے کمال درجہ متصف ہے، لہٰذا اپنی اِس صفت کے تقاضے بھی لازماً پورے کرے گا۔

۱۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'۔ اِن میں 'اِلٰى' کا صلہ دلیل ہے کہ یہاں کوئی لفظ ہانکنے اور لے جانے کے معنی میں محذوف ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی تفسیر میں لکھا ہے:

> ''...قیامت کا آنا خدا کی صفت رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر قیامت نہ آئے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ اِس کائنات کا خالق رحمان ورحیم نہیں ہے۔ اُس کے نزدیک، نعوذ باللہ، عدل وظلم، نیکی اور بدی، خیر اور شر، دونوں یکساں ہیں۔ یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک اندھیر نگری ہے۔ یہ باتیں چونکہ بالبداہت باطل ہیں، رحمان ورحیم خدا کی شان کے بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے غایت و بے مقصد کام کرے، اِس وجہ سے لازمی ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اُس کی رحمت کامل کا ظہور ہو، اپنے نیک بندوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور جو بدکار و نابکار ہیں، وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۷)

۱۷؎ اِس مضمون کی وضاحت آگے آیت ۳۱ میں فرمادی ہے کہ قیامت کے دن یہ خسارے میں مبتلا لوگ کس طرح حسرت سے اپنے سر پیٹیں گے اور گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے کس بے بسی کے ساتھ جہنم کی طرف دھکیل دیے جائیں گے۔

فِی الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ ؕ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۳﴾
قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ ہُوَ
یُطۡعِمُ وَ لَا یُطۡعَمُ ؕ قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَسۡلَمَ وَ لَا

ٹھیر جاتا اور دن میں رواں ہوتا ہے[18]، وہ اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہ سمیع و علیم ہے[19]۔ ۱۲-۱۳

کہہ دو، اللہ کے سوا کیا میں کسی اور کو اپنا کارساز بنالوں جو زمین اور آسمانوں کا خالق ہے اور کھاتا نہیں، کھلاتا ہے[20]؟ کہہ دو، مجھے تو حکم ملا ہے کہ سب سے پہلے میں اُس کے

۱۸؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَهٗ مَا سَكَنَ فِی الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ'۔ 'سَكَنَ' کے بالمقابل 'ماتحرك' یا اِس کے ہم معنی کوئی لفظ یہاں عربیت کے اسلوب پر حذف کر دیا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۱۹؎ مطلب یہ ہے کہ خدا کی قدرت سب کو محیط اور اُس کا علم سب کو حاوی ہے۔ شب و روز میں کوئی چیز اُس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ وہ جب چاہے گا، ہر جگہ سے سب کو بلائے گا اور اپنے حضور میں اکٹھا کر لے گا۔

۲۰؎ یہ اوپر کی بات کا لازمی نتیجہ بھی ہے اور مشرکین پر ایک نہایت لطیف تعریض بھی۔ مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کے خالق اور پوری کائنات کے رازق کو چھوڑ دوں اور تمھارے اُن بتوں کو معبود بنا لوں جو اپنے وجود کے لیے بھی تمھارے محتاج ہیں اور اُن کے سامنے تم حلوے مانڈے پیش کرتے ہو تو راضی اور آسودہ ہوتے ہیں؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ مشرکین اپنے بتوں کے آگے جو کچھ پیش کرتے ہیں، اِس تصور کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یہ اُن کی پسندیدہ اور مرغوب غذائیں ہیں جن کو وہ نوش کرتے اور جن کی خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ برعکس اِس کے ایک خدا پرست خدا کے نام پر جو کچھ پیش

تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۱۴﴾ قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۵﴾ مَنۡ يُّصۡرَفۡ عَنۡهُ يَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۱۶﴾

وَاِنۡ يَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنۡ يَّمۡسَسۡكَ بِخَيۡرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۷﴾ وَهُوَ الۡقَاهِرُ فَوۡقَ عِبَادِهٖ ؕ

سامنے سر اطاعت جھکا دوں اور تاکید کی گئی ہے کہ تم ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو۔[۲۱] کہہ دو کہ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک ہول ناک دن کے عذاب سے دوچار ہو جاؤں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اُس دن عذاب سے دور رکھا گیا، وہی ہے جس پر خدا نے رحم فرمایا اور یہی کھلی کامیابی ہے۔[۲۲] ۱۴-۱۶

(یقین رکھو کہ) اگر اللہ تمھیں کسی رنج میں مبتلا کر دے تو اُس کے سوا کوئی نہیں جو اُسے دور کر سکے اور اگر بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۲۳]

کرتا ہے، اُس کا کوئی حصہ، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، خدا کو نہیں پہنچتا، بلکہ سب کا سب خدا کے حق دار بندوں کو پہنچتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲۹/۳)

۲۱؎ یعنی تم شرک کرتے ہو تو کرو، اِس کی ذمہ داری تم پر ہے۔ مجھے تو اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ خدا کے سامنے سرنگوں رہوں اور کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھیراؤں۔ اِس مضمون کے لیے اصل میں 'لَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں تاکید کے ساتھ ایک نوعیت کا زجر بھی ہے، لیکن اِس کا رخ اُنھی لوگوں کی طرف ہے جن کا رویہ زیر بحث ہے۔

۲۲؎ اِس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ جو لوگ اِس کامیابی کو بھولے ہوئے ہیں، اُس دن اُنھیں اندازہ ہو جائے گا کہ کس بدبختی اور محرومی کا سامان کر کے دنیا سے آئے ہیں۔

وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۚ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾

الانعام ۶

اپنے بندوں پر وہ ہر لحاظ سے حاوی ہے اور حکیم و خبیر ہے[۲۴]۔ اِن سے پوچھو، کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کہہ دو، اللہ کی، وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے۔ اور میری طرف یہ قرآن اِس لیے وحی کیا گیا ہے کہ اِس کے ذریعے سے میں تمھیں خبردار کر دوں اور اُنھیں بھی جنھیں یہ پہنچے[۲۵]۔ کیا تم اِس بات کے گواہ بنتے ہو کہ خدا کے ساتھ کچھ دوسرے معبود بھی ہیں؟ کہہ دو، میں اِس کی گواہی نہیں دے سکتا۔ کہہ دو، وہی ایک معبود ہے اور میں اُن سے یقیناً بری ہوں جنھیں تم شریک ٹھیراتے ہو۔ ۱۷-۱۹

۲۳؎ یہ اوپر والی بات کی توضیح مزید ہے کہ جب نفع و ضرر سب خدا کے اختیار میں ہے تو کسی دوسرے کو مولیٰ و مرجع کیوں بنایا جائے؟ اور اُس کے حضور میں دعا و مناجات کے لیے ہاتھ کیوں اٹھائے جائیں؟

۲۴؎ لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا کو کسی انجام اور غایت تک پہنچائے بغیر چھوڑ دے۔ اُس کے علم و حکمت کا تقاضا ہے کہ ایک روز جزا برپا ہو جس میں حق و باطل کے فیصلے کیے جائیں۔

۲۵؎ یہ وہی بات ہے جو سورۂ فرقان (۲۵) آیت ۱ میں 'لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ قرآن روز قیامت تک ذریعۂ انذار ہے۔ علما جب اِس کی دعوت لے کر اُٹھیں تو اُنھیں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے اِسی کو ذریعۂ انذار بنانا چاہیے۔ خدا کی معرفت اور عقبیٰ شناسی کے لیے اِس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے جو لوگوں کو بیدار کر سکے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ

جنھیں ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے، وہ اِس (قرآن) کو پہچانتے ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جن لوگوں نے، البتہ اپنے آپ کو خسارے میں ڈال رکھا ہے، وہ اِسے نہیں مانتے[۲۶] (اور شرک پر اصرار کرتے ہیں)، دراں حالیکہ اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اُس کی آیتوں کو جھٹلا دے؟ یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ (اِس لیے) اُس دن کو یاد رکھو جس دن ہم اِن سب کو اکٹھا کریں گے[۲۷]، اِس کے بعد اِن مشرکوں سے پوچھیں گے کہ تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریک

۲۶۔ اوپر قرآن کا ذکر جس مقصد سے ہوا ہے، اُس کی توثیق مزید کے لیے یہ صالحین اہل کتاب کی گواہی پیش کی ہے۔ فرمایا ہے کہ قرآن کے انذار پر ایمان لانے سے وہی محروم ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال رکھا ہے، ورنہ صالحین اہل کتاب تو اُس کو اور اُس کے پیش کردہ حقائق کو اپنے صحیفوں کی روشنی میں اُسی طرح جانتے، پہچانتے اور اُن کا خیر مقدم کرتے ہیں، جس طرح ایک مہجور باپ اپنے یوسف گم گشتہ کو پہچانتا ہے اور اُس کے پیرہن کی خوشبو دور ہی سے محسوس کر لیتا ہے۔

۲۷۔ اصل الفاظ ہیں: 'يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا'۔ اوپر جن گروہوں کا ذکر ہوا ہے، لفظ 'جَمِيْعًا' کی تاکید نے اُن سب کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے، خواہ وہ خدا کے شریک ٹھیرانے والے ہوں، قیامت کا انکار کرنے والے ہوں یا آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والے۔ یہ سب اگرچہ مشرکین تھے، مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وجوہ تکذیب میں کسی حد تک الگ الگ بھی تھے۔

كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمۡ تَكُنۡ فِتۡنَتُهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشۡرِكِيۡنَ ﴿۲۳﴾ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ كَذَبُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ ۚ وَجَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً

الانعام
۶

کہاں ہیں جنھیں تم خدا کا ساجھی گمان کرتے تھے؟ پھر اِن کا فریب ختم ہو جائے گا، مگر کہیں گے[۲۸]: اللہ، ہمارے پروردگار کی قسم، ہم مشرک نہیں تھے[۲۹]۔ دیکھو، اِنھوں نے، (اِن ظالم لوگوں نے) کس طرح خود اپنے اوپر جھوٹ بولا ہے اور جو افترا یہ کرتے رہے، وہ سارا اِن سے ہوا ہو گیا ہے[۳۰]۔ ۲۰-۲۴

اِن میں ایسے بھی ہیں جو کان لگا کر تمھیں سنتے ہیں، مگر اِن کے دلوں پر ہم

۲۸؎ اصل میں لفظ 'فِتْنَة' آیا ہے۔ اِس کی اضافت فاعل کی طرف ہے، جملے میں استثنا منقطع ہے اور انداز کلام طنزیہ ہے۔ یعنی جس طرح کے فریب دنیا میں دیتے رہے، اُس کی گنجایش ختم ہو جائے گی۔ ہاں، کچھ کر سکیں گے تو یہی کہ اپنے جرم کا انکار کر کے اُس کی پاداش سے بچنے کی کوشش کریں۔

۲۹؎ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مشرکین اُس روز اپنے شرک کا اقرار کر لیں گے۔ یہاں انکار کا ذکر ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ پریشان ہو کر کسی مرحلے میں انکار کریں گے اور کسی میں بالآخر ماننے پر مجبور ہو جائیں گے، بلکہ اپنے شرکا کو پکاریں گے بھی کہ جو صورت حال درپیش ہو گئی ہے، شاید اُس سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا ہو سکے۔

۳۰؎ اِس میں یہ لطیف تعریض بھی ہے کہ دنیا میں خدا کے بارے میں جھوٹی گواہی دیتے رہے اور یہاں اپنے اوپر جھوٹ گھڑ رہے ہیں۔

اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ
حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْكَ یُجَادِلُوْنَكَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ

نے (اپنے قانون کے مطابق[۳۱]) پردے ڈال دیے ہیں کہ (جو کچھ سنتے ہیں)، اُسے نہ سمجھیں اور اِن کے کانوں کو بہرا کر دیا ہے کہ سن کر بھی نہ سنیں۔ یہ اگر ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں، پھر بھی اُن پر ایمان نہ لائیں گے[۳۲]۔ یہاں تک کہ تمھارے پاس حجت کرتے

[۳۱] یعنی اپنے اُس قانون کے مطابق جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ جب کوئی شخص حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتا اور جانتے بوجھتے اُسے ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے مہلت ملتی ہے۔ پھر اِس مہلت سے وہ اگر فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اُس کے دل و دماغ کو دعوت حق کے لیے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ خدا کا عذاب ہے جس سے وہ اپنی شامت اعمال کے نتیجے میں مرنے سے پہلے ہی دوچار ہو جاتا ہے*۔

[۳۲] یہ محض مبالغے کا ایک اسلوب نہیں، بلکہ بیان حقیقت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ اِن کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ اِن کے سامنے عجائب اور کرشمے ظاہر نہیں ہوئے۔ آخر یہ ساری کائنات، آسمان و زمین، سورج، چاند، دریا، پہاڑ، ابر، ہوا، رات، دن کیا ہیں؟ کیا یہ کرشمے اور عجائب نہیں ہیں؟ ساری کائنات کرشموں اور عجائب سے بھری پڑی ہے، لیکن جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہی نہ ہوں، اُن کا کیا علاج؟ جس طرح اِن سارے عجائب اور کرشموں سے اِن کی آنکھیں بند ہیں، اگر اور کرشمے بھی اِن کو دکھا دیے جائیں، جب بھی یہ کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے اور اپنی ہٹ پر جمے ہی رہیں گے۔“

(تدبر قرآن ۳/ ۴۴)

* اِس قانون کی وضاحت کے لیے دیکھیے: سورۂ نساء (۴) آیت ۱۵۵، اعراف (۷) آیات ۱۰۰-۱۰۲، نحل (۱۶) آیات ۱۰۶-۱۰۸ اور صف (۶۱) آیت ۵۔

اِلَّآ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۲۵﴾ وَ ھُمۡ یَنۡھَوۡنَ عَنۡہُ وَ یَنۡءَوۡنَ عَنۡہُ ۚ وَ اِنۡ یُّھۡلِکُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَھُمۡ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾ وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذۡ وُقِفُوۡا عَلَی النَّارِ فَقَالُوۡا یٰلَیۡتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُکَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَ نَکُوۡنَ مِنَ

ہوئے آئیں گے تو یہ منکرین کہیں گے کہ یہ تو محض اگلوں کے افسانے ہیں[۳۳]۔ یہ اِس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی اِس سے گریز کر جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں، مگر اِس کا احساس نہیں کرتے۔ اگر تم اُس وقت کو دیکھ سکتے، جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے، پھر کہیں گے: کاش، ہم واپس بھیج دیے جائیں کہ تصدیق کریں اور اپنے پروردگار کی آیتوں کو نہ جھٹلائیں[۳۴] اور

۳۳؎ یعنی قرآن جب عاد و ثمود، مدین، سبا، قوم لوط اور قوم فرعون کی تباہی کے واقعات سنا کر انھیں خبردار کرتا ہے تو اُس سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے بوکھلا کر کہتے ہیں کہ کچھ نہیں، یہ تو پچھلی قوموں کے بے سروپا افسانے ہیں جو معاذ اللہ، ایک سرپھرا سناتا پھر رہا ہے۔

۳۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَ لَا نُکَذِّبَ'۔ یہ مضارع خفیف ہے، لیکن تمنی کا جواب نہیں ہے۔ اِس کا نصب دلیل ہے کہ تمنی کا جواب یہاں اِس کا معطوف علیہ ہے جو حذف کر دیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...تمنا کے جواب میں 'فنصدق' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ کا آنا بالکل واضح تھا، اِس وجہ سے اُس کو حذف کر دیا اور 'وَ لَا نُکَذِّبَ' میں جو حرف عطف ہے، اُس کے ذریعے سے محذوف کا پتا دے دیا۔ 'وَ لَا نُکَذِّبَ' کے اظہار میں جو بلاغت ہے، وہ یہ ہے کہ اِس سے اُن کی حسرت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور اعتراف جرم کا بھی۔ یعنی آج تو یہ اکڑ رہے ہیں اور قرآن کو ایک داستان پارینہ قرار دے رہے ہیں، لیکن کل حسرت کریں گے کہ کاش، ہم پھر دنیا میں جائیں کہ اپنے رب کی آیات کی تصدیق کریں اور اُن کی تکذیب نہ کریں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۶)

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٢٨﴾

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٣٠﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ

ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہ حقیقت اِن کے لیے بے نقاب ہوگئی ہے جو اِس سے پہلے چھپائے ہوئے تھے۔ اگر اِنھیں لوٹایا جائے تو وہی کریں گے جس سے روکے گئے تھے[35]، اِس لیے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۲۵-۲۸

کہتے ہیں[36] کہ زندگی تو یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد ہم ہرگز نہ اٹھائے جائیں گے۔ اگر تم اُس وقت کو دیکھ سکتے، جب یہ اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑے کیے جائیں گے۔ وہ اِن سے پوچھے گا: کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ جواب دیں گے: ہاں، ہمارے پروردگار کی قسم، یہ حقیقت ہے۔ وہ فرمائے گا: تو اپنے انکار کی پاداش میں

۳۵؎ اِس لیے کہ اِن کے جھٹلانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ بات اِن پر واضح نہیں ہوئی۔ یہ جان گئے تھے کہ خدا کے پیغمبر جو کچھ پیش کر رہے ہیں، وہ سراسر حق ہے۔ اِن کی آنکھوں پر اُس وقت بھی دنیا کی محبت اور غرور و حسد کے جذبات نے پردے ڈال دیے تھے اور اب بھی لوٹا دیے جائیں تو یہی چیزیں حجاب بن کر قبول حق سے اِنھیں روک دیں گی۔

۳۶؎ قرآن مجید کے مکذبین کے بعد اب آگے مکذبین قیامت کا انجام بیان کیا جا رہا ہے جو مرنے کے بعد اٹھائے جانے کو یا تو مانتے ہی نہیں تھے یا بعید از امکان کہہ کر گریز و فرار کے راستے نکال لیتے تھے۔

كَذَّبُوا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتۡهُمُ السَّاعَةُ بَغۡتَةً قَالُوۡا يٰحَسۡرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطۡنَا فِيۡهَا ۙ وَهُمۡ يَحۡمِلُوۡنَ اَوۡزَارَهُمۡ عَلٰى ظُهُوۡرِهِمۡ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوۡنَ ﴿۳۱﴾ وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهۡوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۲﴾

قَدۡ نَعۡلَمُ اِنَّهٗ لَيَحۡزُنُكَ الَّذِىۡ يَقُوۡلُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ لَا يُكَذِّبُوۡنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدۡ كُذِّبَتۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَصَبَرُوۡا عَلٰى مَا كُذِّبُوۡا وَاُوۡذُوۡا حَتّٰٓى اَتٰٮهُمۡ نَصۡرُنَا ۚ

الانعام
۶

اب چکھو عذاب کا مزہ۔ یقیناً گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے اِس ملاقات کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ اچانک جب وہ گھڑی اُن پر آ پہنچے گی تو کہیں گے: افسوس، ہماری اِس کوتاہی پر جو اِس معاملے میں ہم سے ہوئی ہے اور حال یہ ہوگا کہ اپنے بوجھ وہ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ سنو، نہایت ہی برا ہے وہ بوجھ جو یہ اٹھائے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل تماشا ہے۔ آخرت کا گھر، البتہ کہیں بہتر ہے اُن کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں۔ پھر کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ ۲۹-۳۲

ہم اِس بات سے واقف رہے ہیں[۳۷] کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں[۳۸]، اُس سے تمھیں رنج ہوتا ہے۔ تم اُس پر صبر کرو، (اے پیغمبر)، اِس لیے کہ یہ تمھیں نہیں جھٹلا رہے، یہ ظالم تو

۳۷؎ اصل میں 'قَدۡ نَعۡلَمُ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ درحقیقت 'قَدۡ كُنَّا نَعۡلَمُ' ہے۔ مضارع پر جب اِس طرح 'قَدۡ' آتا ہے تو اِس میں فعل ناقص عربیت کے قاعدے پر محذوف ہوتا ہے۔ یہاں اِس سے مضمون میں یہ اضافہ ہوگیا ہے کہ یہ بات برابر ہمارے علم میں رہی ہے اور ہے۔

۳۸؎ یہ اُنھی مطالبات کا ذکر ہے جو پیچھے بیان ہو چکے ہیں اور آگے بھی بیان ہوں گے۔

وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۴﴾

آیات الٰہی کا انکار کر رہے ہیں[۳۹]۔ تم سے پہلے بھی رسولوں کو اِسی طرح جھٹلایا گیا تھا تو اپنی تکذیب اور اپنی اذیتوں پر اُنھوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری مدد اُنھیں پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے اور (ہماری اِس سنت کو سمجھنے کے لیے) پیغمبروں کی کچھ سرگذشتیں تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں[۴۰]۔ ۳۳-۳۴

۳۹ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین اور تسلی کے لیے یہ نہایت دل نواز جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی طرف سے کوئی بات لے کر نہیں اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ہمارا کلام اور ہماری کتاب ہے جو ہمارے حکم سے اور ہماری ہدایت کے مطابق اِن کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اگر جھٹلا رہے ہیں تو تم کو نہیں، بلکہ ہمیں جھٹلا رہے ہیں۔ اِس لیے معاملے کو ہم پر چھوڑ و، اِن ظالموں سے ہم ہی نمٹیں گے۔

۴۰ یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام اور اُن کے پیرووں کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...انبیا اور اُن کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کی براہ راست مدد سے ہم کنار ہونے کے لیے ابتلا و امتحان کے ایک طویل اور صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اِس کے بغیر خدا کی نصرت ظاہر نہیں ہوتی۔ اِس دوران میں اِن انبیا کی قوموں کی طرف سے برابر اِن کی تکذیب ہوتی ہے۔ اِن کو ہر قسم کی ایذائیں دی جاتی ہیں اور ہر پہلو سے اِن کو زچ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اِس طرح جو کچھ حق کے مخالفین کے اندر ہوتا ہے، وہ بھی ابھر کر باہر آ جاتا ہے اور جو جو ہر نبی اور اُس کے ساتھیوں کے اندر ہوتا ہے، وہ بھی نکھر کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ منکرین حق پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور نبی اور اُن کے ساتھی سزاوار ہوتے ہیں کہ اُن کے لیے اللہ کی مدد ظاہر ہو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی سنت ہے اور اللہ کی سنت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ تمام رسولوں کی سرگذشتیں اِس سنت اللہ پر شاہد ہیں۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۴۴)

وَاِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكَ اِعۡرَاضُهُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِىَ نَفَقًا فِى الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاۡتِيَهُمۡ بِاٰيَةٍ‌ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمۡ عَلَى الۡهُدٰى فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ۝۳۵ اِنَّمَا يَسۡتَجِيۡبُ الَّذِيۡنَ يَسۡمَعُوۡنَ‌ ؕ وَالۡمَوۡتٰى يَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ ۝۳۶

الانعام
۶

(اِس کے باوجود)، اِن کا اعراض اگر تمھیں گراں گزر رہا ہے تو زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی زینہ ڈھونڈ سکتے ہو کہ اِن کے پاس کوئی نشانی لے آؤ تو ڈھونڈ لو۔[۴۱] اللہ چاہتا تو اِن سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا، اِس لیے ہرگز جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔[۴۲] (ہماری اِس دعوت کو) وہی قبول کریں گے جو سننے والے ہیں۔ رہے یہ مُردے تو (اِن کا انجام اب یہی ہے کہ) اللہ اِنھیں اٹھائے گا، پھر یہ اُس کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔۳۵-۳۶

---

[۴۱] اِس جملے میں جوابِ شرط محذوف ہے۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ ترجمے میں ہم نے اُسے کھول دیا ہے۔

[۴۲] مطلب یہ ہے کہ دنیا علم و عقل اور ارادہ و اختیار کے امتحان کے لیے بنی ہے۔ اللہ یہ کر سکتا تھا کہ بالجبر لوگوں کو ہدایت پر جمع کر دیتا یا کوئی ایسی صورت پیدا کرتا کہ سارے حجاب دور ہو جاتے اور لوگ حقیقت کو بچشم سر دیکھ لیتے، لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس کی اسکیم یہی ہے کہ لوگ اِس امتحان سے گزر کر کامیاب یا ناکام ہوں۔ لہٰذا اِن کے ایمان کی آرزو میں اِس طرح جذبات سے مغلوب نہیں ہونا چاہیے کہ یہ سنتِ الٰہی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ جذبات کوئی جذباتِ نفس نہیں تھے، بلکہ

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ

کہتے ہیں کہ اِس نبی پر اِس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی[۴۳]؟ کہہ دو: اللہ پوری قدرت رکھتا ہے کہ (جب چاہے)، کوئی نشانی اتار دے، مگر اِن میں سے اکثر (یہ مطالبہ اِس لیے کرتے ہیں کہ) اِس کے نتائج سے واقف نہیں ہیں[۴۴]۔ (دیکھتے نہیں ہو کہ) زمین پر جتنے جانور اپنے پاؤں سے چلتے ہیں اور فضا

سراسر جذبات خیر تھے، مگر حد مطلوب سے بڑھتے ہوئے محسوس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو روک دیا۔ آیت میں بظاہر عتاب ہے، لیکن یہ عتاب بڑا محبت آمیز ہے۔ اِس میں اگر کوئی تلخی ہے تو اُس کا رخ اُنھی بدبختوں کی طرف ہے جن کے ایمان کے لیے آپ اِس قدر بے تاب تھے۔

۴۳؎ آگے کی آیات سے بتدریج واضح ہو جائے گا کہ یہ مطالبہ کسی ایسی نشانی کے لیے تھا جو یہ ثابت کر دے کہ اگر یہ لوگ پیغمبر کی تکذیب پر قائم رہے تو اِن پر عذاب آ جائے گا۔

۴۴؎ اِس اجمال میں بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ یہ نادان اور مغرور لوگ اِس طرح کی نشانی کے ظہور کے نتائج سے آگاہ نہیں۔ اِن کے نزدیک یہ محض ایک کھیل تماشا ہے، حالاں کہ یہ نشانی اگر ظاہر ہو گئی تو سب کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔ دوسری یہ کہ یہ خدا کی اُس حکمت اور سنت سے واقف نہیں ہیں جو انبیا اور اُن کے مکذبین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو فوراً پکڑ لے، بلکہ وہ اُن کو ایک خاص مدت تک مہلت دیتا ہے جس میں اُن پر ہر پہلو سے خدا کی حجت پوری کر دی جاتی ہے۔ جب یہ حجت پوری ہو چکتی ہے، تب خدا اُن کو پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو پھر اُن کو کوئی چھڑا نہیں

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ

میں جتنے پرندے اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں[۴۵]، سب تمھاری ہی طرح امتیں ہیں (اور سمجھانے کی حد تک تو) ہم نے اپنی کتاب میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے[۴۶]۔ اِس کے بعد (یہی باقی ہے کہ ایک دن) یہ اپنے پروردگار کے حضور میں اکٹھے

سکتا۔ تیسری یہ کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ پیغمبر کی دھمکی جھوٹی ہے یا خدا کے ہاتھ ہی بے بس ہیں، حالاں کہ خدا سرکشوں کو جو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے تو اِس وجہ سے کہ اُس کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے۔ وہ رسی کتنی ہی دراز کر دے، لیکن اِس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی اُس کے قابو سے باہر نکل سکے۔ چوتھی یہ کہ یہ بدقسمت لوگ اُس رحمت سے نا آشنا ہیں جو اِس مہلت کے اندر مضمر ہے، بشرطیکہ اُس سے فائدہ اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ رحمت میں سبقت کرتا ہے، غضب میں سبقت نہیں کرتا۔ وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ وہ توبہ اور اصلاح کے دروازے اُس وقت تک کھلے رکھتا ہے، جب تک بندے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے خود اُن کو اپنے اوپر بند نہ کر لیں۔''

(تدبر قرآن ۳/ ۴۷)

۴۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ'۔ اِن میں مقابل کے بعض الفاظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گئے ہیں۔ مثلاً جملے کے پہلے حصے میں 'فِي الْاَرْضِ' ہے تو دوسرے حصے میں 'في السمآء' کا لفظ نہیں آیا۔ اِسی طرح دوسرے حصے میں 'يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ' کے الفاظ ہیں تو پہلے حصے میں 'تدب علی رجليها' یا 'أرجلها' کے الفاظ محذوف ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔

۴۶؎ مطلب یہ ہے کہ تم ایک نشانی مانگتے ہو، دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ خدا کی ایک عظیم نشانی ہے۔ پھر قرآن میں بھی ہم نے اِن حقائق کو سمجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حقیقت یہ ہے کہ نشانیوں سے تو صحیفۂ عالم بھی بھرا ہوا ہے اور صحیفۂ قرآن بھی، لیکن جو کسی بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہی نہ ہوں، اُن کا کیا کیا جائے؟

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ

کر دیے جائیں گے۔ ہماری آیتوں کو جن لوگوں نے جھٹلانے کا فیصلہ کر لیا ہے، وہ بہرے اور گونگے تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ (اپنے

آیت میں 'اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ' کے الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ یہاں جانوروں اور پرندوں کی زندگی کے جس پہلو کو نمایاں کر کے پیش کرنا مقصود ہے، وہ اُن کا نظم اجتماعی ہے۔ اِس کی ایک بہترین مثال شہد کی مکھی اور چیونٹی کا اجتماعی شعور ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِن کا مشاہدہ کیجیے تو آپ کی عقل دنگ رہ جائے گی۔ اِن کے اندر اولاد کی پرورش کا کیسا انتظام ہے، خطرات سے بچاؤ کے لیے کیسی بیداری ہے، مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیسی پیش بینی ہے، جماعتی فرائض کا کیسا شدید احساس ہے، کیسی اعلیٰ تقسیم کار ہے، کس درجہ مضبوط نظام امر و طاعت ہے، ضروریات کی فراہمی کے لیے کیسی ان تھک سرگرمی ہے، رہایش اور اپنے ذخائر کی حفاظت کے لیے تعمیر کا کیسا کمال فن ہے، تلاش و جستجو کا کیسا عمیق جذبہ اور حصول مطلوب کے لیے کیسی زیرکی و ہوشیاری اور پھر کتنی جان بازی و قربانی ہے۔"

(تدبر قرآن ۳/۴۸)

یہ اجتماعی شعور کسی نہ کسی درجے میں تمام جانوروں اور پرندوں میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اِس سے جو حقیقت واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ زمین و آسمان کی مخلوقات کسی اندھے بہرے قانون فطرت سے وجود پذیر نہیں ہوئیں، بلکہ ایک غایت ہے جس کو سامنے رکھ کر تخلیق کی گئی ہیں۔ یہ غایت ہر فرد نوع کی انفرادی زندگی سے بھی سمجھی جا سکتی ہے، لیکن اجتماعی زندگی کے لیے جب یہ جوڑے کا انتخاب کرتے، خاندان بناتے، دوسرے خاندانوں سے متعلق ہوتے اور اپنے بقا و تحفظ کا اہتمام کرتے ہیں تو اِس کا ظہور ایسا واضح ہوتا ہے کہ انسان کی عقل مفلوج نہ ہو گئی ہو تو کبھی اِس کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہ چیز کسی اندھے بہرے قانون فطرت سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن اِس کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اِس کے بعد بھی نہیں سمجھتے ہو کہ اِس کے پیچھے ایک خالق و مدبر کا ہاتھ ہے اور

وَمَن يَّشَاۡ يَجعَلهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّستَقِيمٍ ﴿۳۹﴾

قُل اَرَءَيتَكُم اِن اَتٰكُم عَذَابُ اللّٰهِ اَو اَتَتكُمُ السَّاعَةُ اَغَيرَ اللّٰهِ تَدعُونَ ۚ اِن كُنتُم صٰدِقِينَ ﴿۴۰﴾ بَل اِيَّاهُ تَدعُونَ فَيَكشِفُ مَا تَدعُونَ اِلَيهِ اِن شَآءَ وَتَنسَونَ مَا تُشرِكُونَ ﴿۴۱﴾

قانون کے مطابق[۴۷]) جسے چاہتا ہے، گم راہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔ ۳۷-۳۹

اِن سے کہو، ذرا بتاؤ، اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے یا قیامت کی گھڑی آپہنچے تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم (اپنے دعووں میں) سچے ہو؟ نہیں، بلکہ (ایسے ہر موقع پر) اُسی کو پکارتے ہو۔ پھر وہ چاہے تو اُس مصیبت کو ٹال دیتا ہے جس کے لیے پکارتے ہو، اور اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو (اُس وقت) تم بالکل بھول جاتے ہو[۴۸]۔ ۴۰-۴۱

یہ کائنات مختلف ارادوں، متضاد قوتوں اور تمھارے مزعومہ دیوی دیوتاؤں کی رزم گاہ نہیں ہے، بلکہ اُسی وحدہ لاشریک خالق و مدبر کے علم و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی جلوہ گاہ ہے۔

۴۷ یعنی اِس قانون کے مطابق کہ ہدایت وہی پائیں گے جو اپنے طرز عمل کی بنا پر اُس کے مستحق ہوں گے اور جو غلط روی پر اصرار کریں گے، وہ اُسی کے حوالے کر دیے جائیں گے، پھر کبھی راستہ نہ پا سکیں گے۔

۴۸ مطلب یہ ہے کہ اِس وقت تو بڑے طنطنے کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو، لیکن وہ آپہنچا تو اپنے سب شریکوں کو بھول جاؤ گے اور اُسی ایک خدا کو پکارو گے جس کے شریک ٹھیرا رہے ہو۔ تم جانتے ہو کہ نفس انسانی میں صرف اُس کی شہادت ثبت ہے۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ جب

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ فَاَخَذۡنٰہُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّہُمۡ یَتَضَرَّعُوۡنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوۡلَاۤ اِذۡ جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَا تَضَرَّعُوۡا وَلٰکِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَزَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُکِّرُوۡا بِہٖ فَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ اَبۡوَابَ کُلِّ

تم[۴۹] سے پہلے بھی ہم نے بہت سی قوموں کی طرف اپنے رسول بھیجے تھے (اور اُنھوں نے انکار کیا) تو ہم نے اُنھیں مصائب و آلام میں بھی مبتلا کیا تھا تاکہ عاجزی اختیار کریں[۵۰]۔ پھر جب ہماری طرف سے اُن پر سختی آئی تو اُنھوں نے کیوں عاجزی اختیار نہ کی[۵۱]؟ بلکہ اُن کے دل (اور بھی) سخت ہو گئے اور شیطان نے اُن کے لیے (اُن کے) اُسی عمل کو خوبی بنا کر پیش کر دیا جو وہ کر رہے تھے۔ پھر وہ چیز جب اُنھوں نے بھلا دی، جس سے اُنھیں یاددہانی کی گئی تھی[۵۲] تو ہم نے ہر طرح کی خوش حالیوں کے دروازے اُن پر

زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ آتا ہے جو اصل آزمایش کا ہوتا ہے تو اپنے تمام فرضی معبودوں کو بھول کر اُسی کو پکارتے ہو۔

۴۹؎ یہاں سے آگے اُس سنت الٰہی کا حوالہ ہے جس کے تحت رسولوں کے مکذبین ہلاک کر دیے گئے۔ اِس سے مقصود قریش کو توجہ دلانا ہے کہ جن قوموں نے عذاب کی نشانی کا مطالبہ کیا ہے، اُنھیں کبھی ایمان لانے کی توفیق نہیں ملی، بلکہ جس عذاب کا مطالبہ وہ کر رہے تھے، اُسی نے اُن کی جڑ کاٹ دی۔

۵۰؎ اصل میں لفظ 'تَضَرُّع' آیا ہے۔ یہ قرآن کی خاص تعبیر ہے جو دل کی خشیت اور انابت و عبدیت کے احساس کے ساتھ خدا کے آگے جھک جانے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

۵۱؎ یہ حسرت و افسوس کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سختی سے مقصود تو تنبیہ تھی، مگر کتنے بدقسمت تھے یہ لوگ کہ متنبہ ہونے کے بجائے اور سرکش ہو گئے۔

۵۲؎ یعنی اُن مصائب و آلام سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا جن میں مبتلا کیے گئے تھے، بلکہ

شَیۡءٍ ؕ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا اَخَذۡنٰہُمۡ بَغۡتَۃً فَاِذَا ہُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ؕ وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۵﴾

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَخَذَ اللّٰہُ سَمۡعَکُمۡ وَ اَبۡصَارَکُمۡ وَ خَتَمَ عَلٰی قُلُوۡبِکُمۡ مَّنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِہٖ ؕ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ

الانعام
۶

کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ہماری اُن بخششوں پر اترانے لگے جو اُن پر کی گئی تھیں تو اچانک ہم نے اُنھیں پکڑ لیا، اب حال یہ تھا کہ بالکل ششدر ہو کر رہ گئے۔ اِس طرح اُن لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی[۵۳] جنھوں نے (اپنی جان پر) ظلم ڈھایا تھا اور شکر اللہ ہی کے لیے ہے جو عالم کا پروردگار ہے (کہ اُس نے زمین کو اِن ظالموں سے پاک کر دیا)[۵۴]۔ ۴۲-۴۵

اِن سے پوچھو، کبھی سوچا ہے کہ اگر اللہ تمھاری سماعت و بصارت تم سے چھین لے اور تمھارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو اُس کو تمھیں واپس لا دے گا؟[۵۵]

اُنھیں بھلا کر بالکل نچنت ہو گئے۔

۵۳؎ یہ نہایت لطیف تعبیر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس سے پہلے اِس طرح کے مجرموں پر ابتلا کے جو جھونکے آتے ہیں، اُن سے اُن کے شجر ہستی کے صرف برگ و بار متاثر ہوتے ہیں اور وہ بھی وقتی طور پر، اُن کی جڑ محفوظ رہتی ہے، لیکن جب یہ وقت آ جاتا ہے تو خدا اُن پر عذاب بھیجتا ہے جو اُن کے وجود قومی ہی کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۵۲)

۵۴؎ یہ اُس احساس کا اظہار ہے جو خدا سے سرکشی کرنے والوں کے انجام پر ہر بندۂ مومن کے دل میں پیدا ہونا چاہیے۔

۵۵؎ مطلب یہ ہے کہ یہی وقت ہے کہ اِن قوتوں سے وہ کام لیا جائے جس کے لیے یہ دی گئی

ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿٤٦﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٤٩﴾

دیکھو، کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے (اِن کے سامنے) پیش کر رہے ہیں، پھر بھی یہ اعراض کرتے ہیں۔ پوچھو: کبھی سوچا ہے کہ اگر اللہ کا عذاب[٥٦] تم پر اچانک آدھمکے یا ہانکے پکارے آئے تو کیا ظالم لوگوں کے سوا کسی اور کو ہلاک کیا جائے گا؟ رسولوں کو تو ہم صرف اِس لیے بھیجتے ہیں کہ (لوگوں کے لیے) خوش خبری دینے والے اور (اُنھیں) خبردار کرنے والے ہوں[٥٧]۔ سو جنھوں نے مان لیا اور اصلاح کر لی تو اُنھیں کوئی اندیشہ اور کوئی غم نہ ہوگا۔ اِس کے برخلاف جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا، اُن کی نافرمانیوں کی پاداش میں ہمارا عذاب اُنھیں پکڑے گا۔ ۴۶-۴۹

ہیں۔ اگر اللہ نے اِنھیں سلب کر لیا تو دوبارہ کہاں سے حاصل کرو گے؟ اِس کے بعد تو صرف حسرتیں باقی رہ جائیں گی۔

٥٦۔ اِس سے مراد وہ عذاب ہے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر اتمام حجت کے بعد آتا ہے اور صرف اُنھی کو ہلاک کرتا ہے۔ اہل ایمان اُس سے لازماً بچا لیے جاتے ہیں۔

٥٧۔ یعنی وہ عذاب لانے یا معجزے دکھانے کے لیے نہیں بھیجے جاتے جس کا مطالبہ تم شب و روز کرتے ہو، بلکہ انذار و بشارت کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے مضمرات کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر)، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے کی جاتی ہے۔[۵۸] کہہ دو، (میرا سوال صرف یہ ہے)، کیا اندھے اور دیکھنے والے، دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ پھر کیا تم غور نہیں کرتے؟[۵۹] ۵۰

"...اِس سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ اللہ کے رسول خدا کی رحمت کے مظہر ہوتے ہیں، عذاب اُن کی بعثت کے مقاصد میں سے نہیں، بلکہ اُن کی تکذیب کے لوازم و نتائج میں سے ہے۔ دوسری یہ کہ رسولوں سے لوگوں کو چاہنی وہ چیز چاہیے جس کے لیے وہ آتے ہیں، یعنی ایمان اور عمل صالح کی ہدایت نہ کہ وہ چیز جس سے وہ لوگوں کو بچانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں، تیسری یہ کہ یہ خوارق وعجائب نہ رسولوں کے خصائص میں سے ہیں اور نہ اُن کی تعلیم و دعوت کے لوازم میں سے، بلکہ اِن کا ظہور اگر ہوتا ہے تو محض اتمام حجت کے طور پر ہوتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ چوتھی یہ کہ اِس میں رسول کے لیے پیام تسکین ہے کہ وہ اپنا تعلق اپنے اصل مقصد بعثت ــــ بشارت اور انذار ــــ سے رکھے، جو باتیں اُس کے فرائض سے غیر متعلق ہیں، اُن کو خدا پر چھوڑے، بلاوجہ اُن کے لیے پریشان نہ ہو۔" (تدبر قرآن ۳/۵۴)

۵۸ مطلب یہ ہے کہ بحث کرنی ہے تو اُس چیز پر کرو جو میں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ میں غیب نہیں جانتا یا فرشتہ نہیں ہوں، اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میری بحث کا موضوع اِن میں سے کوئی چیز کبھی نہیں رہی۔ میں تو وہی کہتا ہوں جو وحی کے ذریعے سے مجھے کہنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

۵۹ یعنی سمع و بصر کی صلاحیتوں سے کام لینے والوں اور آنکھیں بند کر کے زندگی بسر کرنے

وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ لَيۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۵۱﴾
وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ

(انھیں اب اِن کے حال پر چھوڑو) اور اِس قرآن کے ذریعے سے اُن لوگوں کو خبردار کرو جو اندیشہ رکھتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور میں اِس طرح پیش کیے جائیں گے کہ اُن کے لیے اُس کے سوا کوئی حامی اور کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا تاکہ پرہیزگاری اختیار کریں[۶۰]۔ ۵۱

(اِن کے ایمان کی آرزو میں) تم اُن لوگوں کو اپنے سے دور نہ کرو[۶۱] جو صبح و شام

والوں کا انجام خدا کے ہاں الگ الگ ہوگا یا دونوں برابر ہو جائیں گے؟ میں تم سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ تم اِس بات پر غور کیوں نہیں کرتے؟

۶۰۔ اِس آیت سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”ایک یہ کہ انذار کے لیے فطری اور عقلی چیز یہ قرآن ہے نہ کہ عذاب کی نشانیاں۔

دوسری یہ کہ یہ قرآن بھی نافع اُن لوگوں کے لیے ہے جن کے اندر فطرت کی صلاحیتیں زندہ ہیں۔ جن کی فطری صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہیں، اُن کو قرآن سے بھی نفع نہیں پہنچے گا۔

تیسری یہ کہ تقویٰ اور خدا ترسی کے لیے سب سے بڑا حجاب شفاعت باطل کا عقیدہ ہے۔“

(تدبر قرآن ۳/ ۵۸)

۶۱۔ اصل میں لفظ 'تَطۡرُد' آیا ہے۔ یہ معنی کے لحاظ سے ایک سخت لفظ ہے، لیکن سرداران قریش کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر اِس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ اُن کی خواہش یہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اُن ساتھیوں کو دھتکار دیں جو بالکل غربا اور عوام کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اِن غریبوں کے ساتھ بیٹھنا اُن کے شایان شان نہیں ہے۔ چنانچہ اُنھیں اراذل و

وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَیْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّیَقُوْلُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا ؕ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِیْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ

اپنے پروردگار کو اُس کی خوشنودی کی طلب میں پکارتے ہیں۔ اِن کی ذمہ داری کا کوئی حصہ تم پر نہیں ہے اور نہ تمھاری ذمہ داری کا کوئی حصہ اِن پر ہے[۶۲] کہ (اِن کی خواہش پر) تم اُن لوگوں کو دور کر کے ظالموں میں شامل ہو جاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اِسی طرح اِن میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے تاکہ یہ (بدبخت اُن غریبوں کو دیکھ کر) کہیں: کیا یہی لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل کے لیے چن لیا ہے[۶۳]؟

اجلاف قرار دیتے اور کہتے تھے کہ اسلام اگر کوئی فضیلت کی چیز ہے تو اِس طرح کے لوگ اُس کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں؟ آیت میں روے سخن اِنھی مغروروں کی طرف ہے، لیکن بات اِن کو مخاطب کر کے کہنے کے بجاے پیغمبر کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے، اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات اِس قابل بھی نہیں تھی کہ اِن کو مخاطب کر کے اِس کا جواب دیا جائے۔

۶۲ مطلب یہ ہے کہ اپنے اِس تکبر کے نتیجے میں یہ اگر جہنم کا ایندھن بنتے ہیں تو اِس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اِسی طرح اِن کے کہنے پر تم اگر اُن لوگوں کے حقوق تلف کرتے ہو جو تمھاری شفقت و محبت کے اصلی حق دار ہیں تو خدا کے حضور میں تمھاری طرف سے یہ اُس کے ذمہ دار نہیں ہو جائیں گے۔ خدا کا قانون یہی ہے کہ کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

۶۳ آیت میں 'لِیَقُوْلُوْا' آیا ہے۔ اِس میں لام عاقبت کا ہے جو علت کو نہیں، بلکہ نتیجے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اُس سنت الٰہی کا بیان ہے جس کے تحت لوگوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ اِس طرح کی باتیں کر کے اپنی بدبختی کا سامان کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا

بِاٰيٰتِنَا فَقُلۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۵۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ وَلِتَسۡتَبِيۡنَ

(اِن سے پوچھو)، کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو سب سے بڑھ کر نہیں جانتا؟[64] (اِن کی خواہش کے برخلاف)، ہماری آیتوں کو ماننے والے یہ لوگ جب تمھارے پاس آیا کریں تو اُن سے کہو کہ تم پر سلامتی ہو۔[65] تمھارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے کہ تم میں سے اگر کوئی نادانی کے ساتھ برائی کا ارتکاب کر بیٹھے گا، پھر اِس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لے گا تو اِس طرح ہے کہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ہے۔[66]

امتحان کے لیے بنائی ہے اور امتحان کے تقاضے سے یہ موقع دینا ضروری ہے۔

۶۴ یہ اُن کے تمرد کا جواب ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین سونا اور چاندی، ریشم اور مخمل نہیں ہے جس کی کاٹھی اور جس کے جھول گدھوں اور خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں پر بھی نظر آ جاتے ہیں۔ یہ تو آسمانی نعمت اور یزدانی رحمت ہے جو صرف اُن کا حصہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کے شکر گزار رہے، جنھوں نے خدا کی نعمتوں کی قدر کی، جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کا حق ادا کیا، جنھوں نے اپنے کان کھلے رکھے، جنھوں نے اپنی آنکھوں پر غرور کی پٹی نہیں باندھی اور جنھوں نے اپنے دلوں کو مردہ نہیں ہونے دیا۔ رہے وہ نابکار و ناشکرے لوگ جنھوں نے خدا کی بخشی ہوئی تمام ظاہری و باطنی نعمتوں کو خدا ہی کے خلاف استعمال کیا، اُن کے لیے اِس نعمت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ دنیا نیک و بد، دونوں کو مل جاتی ہے، لیکن دین کی نعمت صرف اُنھی کو ملتی ہے جو خدا کے شکر گزار ہوتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۳/۶۱)

۶۵ یہ جس طرح ملاقات یا رخصت کا کلمہ ہے، اُسی طرح خیر مقدم کا کلمہ بھی ہے۔ موقع کلام سے واضح ہے کہ یہاں یہ اِسی دوسرے مقصد سے آیا ہے۔

سَبِيۡلُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۵۵﴾
قُلۡ اِنِّیۡ نُهِيۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ قُلۡ
لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهۡوَآءَكُمۡ ۙ قَدۡ ضَلَلۡتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۵۶﴾ قُلۡ

ہم اِسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ نیکوکاروں کی روش بھی نمایاں ہو اور مجرموں نے جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ بھی بالکل واضح ہو جائے۔[۶۷] ۵۲-۵۵

(اے پیغمبر)، کہہ دو[۶۸] کہ مجھے تو اُن کی عبادت سے روکا گیا ہے جنھیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔[۶۹] کہہ دو، میں تمھاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چل سکتا۔[۷۰] اگر میں نے ایسا کیا

الانعام
۶

۶۶؎ یہ بشارت بتا رہی ہے کہ جن لوگوں کو دی گئی، وہ مال و جاہ کے نہیں، بلکہ اُسی رحمت و مغفرت کے طلب گار تھے جس کا ذکر بشارت میں ہوا ہے۔ دنیا کے سروسامان سے اُن کو کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اُن کے دل کی لگن یہی تھی کہ گناہ بخش دیے جائیں اور اُن کے پروردگار کی رضا اُنھیں حاصل ہو جائے۔

۶۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَلِتَسۡتَبِيۡنَ سَبِيۡلُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ'۔ اِس میں لام علت کا ہے اور اُس سے پہلے 'و' دلالت کر رہی ہے کہ 'لِتَسۡتَبِيۡنَ' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۶۸؎ یہ لفظ اِس آیت میں بھی ہے اور آگے کی آیتوں میں بھی بار بار آیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں اُن شبہات و اعتراضات کے جواب میں کہی گئی ہیں جو مخاطبین کی طرف سے پیش کیے جا رہے تھے۔

۶۹؎ یعنی دعا و استرحام کے لیے پکارتے ہو۔ یہ اُسی بات کو منفی پہلو سے دہرایا ہے جو پیچھے بیان ہوئی ہے کہ خدا کی شہادت جو قرآن کی صورت میں مجھ پر نازل ہوئی ہے، وہ تو یہی ہے کہ زمین و آسمان کا پروردگار وحدہ لاشریک ہے۔

اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ کَذَّبْتُمْ بِہٖ ط مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ ط اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط یَقُصُّ الْحَقَّ وَ ھُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ ط

تو گم راہی میں پڑا اور راستہ پانے والوں میں سے نہیں رہا۔ کہہ دو، میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل[71] پر ہوں اور تم نے اُسے جھٹلا دیا ہے۔[72] تم جس چیز کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہو، وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اُس کا فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی حق کو واضح فرمائے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ جس چیز کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو، اگر وہ میرے ہاتھ میں ہوتی تو میرے اور

الانعام ۶

۷۰؎ اصل میں لفظ 'اَھْوَآء' آیا ہے۔ اِس سے مراد مشرکانہ بدعات ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...'اَھْوَآء' کے لفظ سے تعبیر کر کے قرآن نے اِن کے بے بنیاد ہونے کو واضح فرمایا ہے کہ اِن کے شریک خدا ہونے کی کوئی شہادت نہ تو عقل و فطرت کے اندر موجود ہے، نہ خدا کے کلام و الہام میں، محض اپنے جی سے تم نے یہ چیزیں گھڑی ہیں اور چونکہ اِن کی موہوم شفاعت کی امید نے تمھیں ایمان و عمل اور فکر آخرت کی تمام ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے، اِس وجہ سے یہ تمھارے نفس کو بہت پسند ہیں۔ بہر حال تمھیں پسند ہیں تو ہوں، لیکن حقیقت اور خواہش میں بڑا فرق ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں حقیقت کو نظر انداز کر کے تمھاری جھوٹی آرزوؤں، باطل خواہشوں اور بے سند بدعات کی پیروی کروں۔" (تدبر قرآن ۳/۶۶)

۷۱؎ یعنی قرآن مجید جو توحید کی حقیقت کو ہر لحاظ سے واضح کر دیتا ہے۔

۷۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَ کَذَّبْتُمْ بِہٖ'۔ اِن میں ضمیر کا مرجع لفظ 'بَیِّنَۃ' ہے جس کا ترجمہ ہم نے روشن دلیل کے الفاظ سے کیا ہے۔ اِس کے لیے ضمیر مونث آنی چاہیے تھی، لیکن یہ لفظ کے بجائے مفہوم و مصداق کے لحاظ سے آ گئی ہے۔ اِس کا فائدہ یہ ہے کہ اِس سے قرآن کا ایک قطعی حجت اور

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ

تمھارے درمیان اِس معاملے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ (یہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے) اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ غیب کی کنجیاں[۳] اُسی کے پاس ہیں، اُنھیں اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے، اُس کے علم میں ہے۔ درخت سے کوئی ایسا پتا اور زمین کی تہوں میں کوئی ایسا دانہ بھی نہیں گرتا اور نہ کوئی خشک و تر ایسا ہے جسے وہ نہ جانتا ہو۔ یہ سب (اُس کے ہاں) ایک کھلی کتاب میں درج ہے[۴]۔ ۵۶-۵۹

وہی ہے جو رات میں تمھاری روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ دن میں کرتے ہو،

واضح شہادت ہونا بھی واضح ہوا اور یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ 'بَيِّنَة' سے مراد قرآن ہی ہے۔

[۳] یعنی وہ کنجیاں جن سے تمام غیب کے دروازے کھل جائیں۔

[۴] اوپر والے مضمون کی تقریب سے یہ علم الٰہی کی وسعت اور اُس کے احاطہ کو بیان فرمایا ہے جس سے ضمناً یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ خدا صرف کلیات ہی کا نہیں، بلکہ جزئیات کا بھی عالم ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اللہ تعالیٰ کے علم کی اِس وسعت کا اعتقاد ہی ہے جو اہل ایمان کے اندر کامل تفویض، کامل اعتماد اور کامل رضا بالقضا کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اِس میں معمولی غلط فہمی بھی شرک کی راہیں کھول دیتی ہے۔ یہی چیز آخرت پر سچے اور پکے ایمان کی بنیاد ہے اور اِسی کے صحیح تصور و تذکر سے انسان کے اندر وہ خشیت بھی پیدا ہوتی ہے جو زندگی میں اُس کو صحیح روش اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔" (تدبر قرآن ۳/ ۶۸)

يَبۡعَثُكُمۡ فِيۡهِ لِيُقۡضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيۡهِ مَرۡجِعُكُمۡ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۰﴾ وَهُوَ الۡقَاهِرُ فَوۡقَ عِبَادِهٖ وَيُرۡسِلُ عَلَيۡكُمۡ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡهُ رُسُلُنَا وَهُمۡ لَا يُفَرِّطُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ مَوۡلٰٮهُمُ الۡحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الۡحُكۡمُ ۟ وَهُوَ اَسۡرَعُ الۡحٰسِبِيۡنَ ﴿۶۲﴾

اُسے بھی جانتا ہے۔ پھر اُسی میں تمھیں اٹھا کھڑا کرتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری کی جائے۔ آخر کار تمھیں اُسی کی طرف لوٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا جو کچھ کرتے رہے ہو۔ وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور تم پر (اپنے) نگران مقرر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ہی اُس کی روح قبض کرتے ہیں اور (اِس کام میں) کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر سب کے سب اپنے حقیقی مولا کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں۔ سنو، فیصلے کا سارا اختیار اُسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ بہت تیزی کے ساتھ حساب چکانے والا ہے[۵۷]۔ ۶۰-۶۲

۵۷۔ بعث و نشر اور جزا و سزا کے بارے میں لوگوں کے مغالطے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ علم الٰہی کا صحیح تصور نہیں رکھتے۔ اوپر کی آیتوں میں اُس کی وضاحت فرمائی تو موقع پیدا ہو گیا کہ موت کے بعد زندگی اور حساب کتاب کی یاددہانی کر دی جائے۔ اِس کے لیے اُس تمثیلی مشاہدے کا حوالہ دیا ہے جو ہم میں سے ہر شخص کو ہر روز کرایا جا رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...قرآن نے یہاں ہر شب میں سونے کو 'وفات' سے اور ہر صبح کے اٹھنے کو 'بعث' سے تعبیر کر کے توجہ دلائی ہے کہ مرنا اور اٹھنا تو ہر روز ہو رہا ہے، جس طرح تمھارا سونا اور جاگنا ہے، اُسی

الانعام ۶

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ

الانعام
۶

اِن سے پوچھو کہ بحر و بر (میں آفات و مصائب) کی تاریکیوں سے کون تمھیں بچاتا ہے، جب کہ تم گڑگڑا کر اور چپکے چپکے اُسے پکار رہے ہوتے ہو[۶] کہ اگر اُس نے اِس مصیبت سے ہمیں بچا لیا تو ہم ضرور اُس کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے؟ کہہ دو، اِس سے اور ہر مصیبت سے اللہ ہی تمھیں نجات دیتا ہے، لیکن اِس کے بعد پھر شرک کرنے لگتے ہو[۷]۔ کہہ دو، وہ پوری قدرت رکھتا ہے کہ تم پر تمھارے اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے برپا کر دے یا تمھیں گروہ در گروہ کر کے گتھم گتھا کرے

طرح تمھارا مرنا اور اٹھنا ہے اور جس طرح تم میں سے کسی سونے والے کے دن کے اعمال سے خدا لاعلم نہیں ہوتا، اُسی طرح جب تم موت کی نیند سوؤ گے تو خدا تمھاری زندگی کے اعمال بھول نہیں جائے گا اور جس طرح تمھاری ہر شب کی نیند کے بعد صبح ہوتی ہے اور تم آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھتے ہو، اُسی طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئے گی اور تم ایسا محسوس کرو گے کہ یہ جو کچھ ہوا، سب صبح و شام کا قصہ ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۶۹)

۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً'۔ 'تَدْعُوْنَ'، 'يُنَجِّيْكُمْ' کی ضمیر مفعول سے حال واقع ہوا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۷؎ یہ اُن حقائق کی طرف متوجہ فرمایا ہے جو خدا کی توحید سے متعلق خود انسان کے اندر موجود ہیں۔

نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾
وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ
بِوَكِيْلٍ ﴿٦٦﴾ ؕ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٧﴾
وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى
يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ

الانعام
٦

اور ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو، کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ سمجھ لیں۔ ٦٣-٦٥

تمھاری قوم نے، (اے پیغمبر)، ہماری اِس وعید کو جھٹلا دیا ہے، دراں حالیکہ یہ بالکل حقیقت ہے۔ اِن سے کہہ دو کہ میں تمھارے اوپر کوئی داروغہ نہیں بنایا گیا ہوں (کہ تمھیں ضرور ہی سمجھا دوں)۔ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ (اِس کے باوجود عذاب ہی مانگتے ہو تو) عنقریب یہ حقیقت تمھیں بھی معلوم ہو جائے گی۔ ٦٦-٦٧

(اِنھیں اب اِن کے حال پر چھوڑو) اور جب دیکھو[۸] کہ لوگ ہماری آیتوں پر نکتہ چینیاں[۹] کر رہے ہیں تو اِن سے کنارہ کش ہو جایا کرو، یہاں تک کہ کسی دوسری بات میں لگ

۸؎ یہ خطاب اگرچہ واحد کے صیغے سے ہے، لیکن آگے کی آیتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اِس کے مخاطب تمام مسلمان ہیں جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہدایت کی گئی ہے کہ دعوت و تبلیغ کے مقصد سے بھی اُن لوگوں کی مجلس میں نہ بیٹھے رہیں جو خدا کے دین اور اُس کے پیغمبر کا مذاق اڑانے میں لگے ہوئے ہوں۔

۹؎ اصل میں لفظ 'یَخُوْضُوْنَ' آیا ہے۔ یہ اُس سخن گستری کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کا مقصد کسی بات کو ہنسی، دل لگی اور مذاق میں اڑا دینا ہو۔

بَعۡدَ الذِّكۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۶۸﴾ وَمَا عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّلٰكِنۡ ذِكۡرٰی لَعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۶۹﴾

جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان بھلا دے تو غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد اِن ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو۔[80] اِن کے حساب کی کوئی ذمہ داری اُن لوگوں پر نہیں ہے جو خدا سے

۸۰۔ اِس ہدایت کے دو پہلو ہیں اور دونوں نہایت اہم ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''ایک تو یہ کہ یہ رویہ اُس حکمت دعوت کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے پسند فرمائی ہے۔ جس وقت کسی گروہ پر کسی چیز کی مخالفت، اُس کی تضحیک اور اُس کی تردید کا بخار چڑھا ہوا ہو اور بخار کی شدت سے مریض کی کیفیت ہذیانی ہو رہی ہو، عین اُسی حالت میں اُس کے سامنے اُس چیز کو پیش کرنا گویا اُس کے بخار اور ہذیان، دونوں کو مزید بڑھا دینا ہے۔ اگر کوئی معالج مریض کی بیماری ہی میں اضافہ چاہتا ہو تو وہ تو آزاد ہے جو چاہے کرے، لیکن کوئی مہربان طبیب جو مریض کی صحت کا خواہاں ہے، وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ اِسی رعایت احوال کے پیش نظر یہاں مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ جب تم دیکھو کہ یہ اسلام کے مخالفین قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے، طنز و تضحیک کے ترکش سنبھالے ہوئے اور مخالفت کے لیے آستین چڑھائے ہوئے ہیں تو اُس وقت طرح دے جاؤ اور کسی ایسے وقت کا انتظار کرو، جب یہ بحرانی کیفیت ذرا دور ہو جائے تو اُس وقت اُن کو سنانے اور سمجھانے کی کوشش کرو۔

دوسرا یہ کہ یہ اُس غیرت حق کے منافی ہے جو اہل ایمان کے اندر ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ علانیہ خدا اور رسول کے خلاف بکواس کرتا ہے تو اُس سے لڑنا بھی ایک داعی کے لیے غلط، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور خاموش رہنا بھی غلط، اِس لیے کہ اِس سے وہ حمیت حق مجروح ہوتی ہے جو علامت ایمان ہے اور جس کا ضعف بالآخر درجہ بدرجہ آدمی کو اُس نفاق میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد اللہ، رسول، قرآن اور شریعت ہر چیز کی توہین و تذلیل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا ہے، لیکن اُس کو ایسا سانپ سونگھ جاتا ہے کہ

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ

ڈرنے والے ہیں۔ البتہ، یاددہانی اُن کا فرض ہے تاکہ یہ بھی ڈرنے والے بن جائیں۔[81] جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور جنھیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا ہے،[82] اُنھیں چھوڑ دو اور اِس قرآن کے ذریعے سے یاددہانی کرتے رہو کہ کہیں کوئی

زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۷۷)

۸۱۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم تبلیغ و دعوت کو کس درجے میں اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنھیں اطمینان دلایا ہے کہ مواخذہ اِس بات پر تو ضرور ہو گا کہ جنھیں تبلیغ کا حکم دیا گیا تھا، اُنھوں نے لوگوں کو تبلیغ و تذکیر کی یا نہیں، لیکن اِس بات پر ہرگز کوئی مواخذہ نہ ہو گا کہ لوگوں نے ہدایت قبول کیوں نہیں کی۔ لہٰذا محض اِس وجہ سے مذاق اڑانے والوں کی مجلس میں بیٹھے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اُنھیں ہر حال میں بات سمجھا کر ہی اٹھنا ہے۔ یاددہانی کرنا یقیناً فرض ہے، مگر اپنے آپ کو لوگوں کی ہدایت و ضلالت کا ذمہ دار سمجھ کر اُن کے درپے ہونا کسی پر فرض نہیں ہے۔

۸۲۔ یہ اُن کی شرارت کا اصل سبب بتایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اُن کا اصلی مغالطہ یہی ہے کہ جب ہماری زندگی کامیاب ہے تو ہمارا رویہ بھی لازماً صحیح ہے۔ وہ اِسی دنیا کی زندگی کو کل کی زندگی سمجھے بیٹھے ہیں اور یہ زندگی چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں چل رہی ہے، بلکہ امتحان و آزمایش کے اصول پر چل رہی ہے، یہاں حق کے ساتھ خدا نے باطل کو بھی ڈھیل دے رکھی ہے، اِس وجہ سے وہ اپنی خواہشوں کی پیروی میں باطل ہی کو اپنا دین بنا بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی زندگی اور یہی رویہ صحیح ہے اور قرآن اُن کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے، وہ محض ایک موہوم ڈراوا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۸۰)

دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ

شخص اپنے کرتوتوں کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے نہ کر دیا جائے[۸۳]۔ اور وہ بھی اِس حال میں کہ اللہ کے آگے نہ اُس کا کوئی حامی و مددگار ہو اور نہ سفارش کرنے والا، اور اگر ہر معاوضہ بھی دے تو اُس سے قبول نہ کیا جائے۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے کرتوتوں کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کیے جائیں گے۔ جس کفر کا ارتکاب یہ کرتے رہے ہیں، اُس کی پاداش میں اِن کے لیے کھولتا ہوا پانی اور ایک دردناک عذاب ہے[۸۴]۔ ۶۸-۷۰

اِن سے پوچھو، کیا ہم اللہ کے سوا اُنھیں پکاریں جو ہمیں نہ نفع دے سکتے ہیں، نہ نقصان[۸۵]؟ اور اِس کے بعد بھی کہ اللہ نے ہمیں ہدایت بخش دی ہے، کیا ہم الٹے پاؤں

۸۳؎ اصل میں 'اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'اَنْ' سے پہلے 'مخافة' یا اِس کے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ اِن میں عربیت کے قاعدے سے حذف ہو گیا ہے۔

۸۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ'۔ یعنی پہلی ضیافت ماء حمیم سے ہو گی، پھر عذاب الیم کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ سورۂ واقعہ (۵۶) کی آیت ۹۳ میں قرآن نے اِس کی تصریح کر دی ہے۔

۸۵؎ جن چیزوں کے نفع و نقصان کی نفی کی گئی ہے، اُن کے لیے اصل میں لفظ 'مَا' آیا ہے۔ یہ اُن کی تحقیر پر دلالت کرتا ہے۔

حَيْرَانَ ۜ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اَنْ

پھر جائیں[86]؟ اُس شخص کی طرح جسے شیطانوں[87] نے بیاباں[88] میں بہکا دیا اور حیران و سرگشتہ چھوڑ دیا ہو، دراں حالیکہ اُس کے ساتھی اُسے راہ ہدایت کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجاؤ[89]۔ کہہ دو، حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور ہمیں حکم دیا

۸۶۔ یعنی اِس سے پہلے اگر کسی گم راہی میں مبتلا رہے تو اُس کے لیے کچھ عذر ہو سکتا تھا، لیکن اب اگر اُسی حماقت کا ارتکاب کریں تو خدا کے حضور میں کیا عذر پیش کریں گے؟

۸۷۔ یعنی شیاطین جن و انس۔ حیران و سرگشتہ چھوڑ دینے کی نسبت اِن کی طرف اِس لیے کی گئی ہے کہ ایمان و اخلاق کی گم گشتگی کو یہی اُس درجے تک پہنچاتے ہیں جس کا ذکر تمثیل میں ہوا ہے۔

۸۸۔ اصل میں لفظ 'الْاَرْض' استعمال ہوا ہے جس کے معنی زمین کے ہیں، لیکن قرینہ موجود ہو تو اِس سے زمین کا کوئی خاص حصہ بھی مراد لے سکتے ہیں۔ یہاں گم گشتگی کی تمثیل بیان ہو رہی ہے، اِس لیے صحرا اور بیابان مراد ہے، جہاں راہ بھٹکنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

۸۹۔ یہ اُنھی لوگوں کی تمثیل ہے جن کا رویہ زیر بحث ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''اِس تمثیل کا اسلوب اگرچہ بظاہر ایک عمومی تمثیل کا ہے، لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت یہ اُن مخالفین اسلام کی تمثیل ہے جو یہاں زیر بحث ہیں۔ اِس تمثیل میں اُن کے سامنے یہ بات رکھی گئی ہے کہ تم صحرا میں بھٹکتے ہوئے مسافر کی مانند ہو، شیاطین اور گم راہ لیڈروں نے تمھاری مت ماردی ہے اور تمھارے کچھ راہ یاب ساتھی (اشارہ اہل ایمان کی طرف ہے) تمھیں اصل راہ کی طرف بلا رہے ہیں، لیکن تم اُن کی پکار نہیں سن رہے ہو۔''

(تدبر قرآن ۳/ ۸۲)

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۬ؕ

گیا ہے کہ اپنے آپ کو جہانوں کے پروردگار کے حوالے کر دیں[90] اور حکم دیا گیا ہے کہ نماز کا اہتمام کرو اور اُس سے ڈرتے رہو[91]، اِس لیے کہ وہی ہے جس کے حضور میں تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے[92]، اور وہی ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے[93]۔ جس دن

الانعام ۶

۹۰ اِس لیے کہ جب وہ عالم کا پروردگار ہے تو وہی حق دار ہے کہ اپنے آپ کو اُس کے حوالے کیا جائے۔

۹۱ پیچھے فرمایا ہے: 'وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'۔ یہ ٹکڑا بھی اُسی کے تحت ہے، لیکن اسلوب غائب کے بجائے حاضر کا ہو گیا ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ کلام میں براہ راست خطاب کا زور پیدا ہو جائے۔

۹۲ نماز اور تقویٰ کے بعد یہ توحید اور آخرت کا ذکر بھی ہے اور اُن کی دلیل بھی۔ مطلب یہ ہے کہ نماز کا اہتمام اور حدود الٰہی کا احترام اِس لیے ضروری ہے کہ ایک دن خدا کے آگے حاضر ہونا ہے۔

۹۳ یہ پچھلے جملے کی دلیل ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''آسمان و زمین میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار و دلائل موجود ہیں، وہ اِس حقیقت پر شاہد ہیں کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے جو اُس نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو، بلکہ یہ ایک قدیر، علیم، حکیم اور رحمٰن و رحیم ذات کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اگر یہ یونہی چلتی رہے، اِس کے اندر جو ظلم ہے، اُس کے انصاف کے لیے کوئی دن نہ آئے، جو عدل ہے، اُس کی داد کا کوئی وقت نہ آئے، اِس کے اندر جو برے، شریر اور نابکار ہیں، اُن کو کوئی سزا نہ ملے، جو نیک، حق شناس اور عدل شعار ہیں، اُن کو اُن کی نیکیوں کی جزا نہ ملے تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ سارا کارخانہ بالکل عبث، بے غایت اور باطل ہے جس کے بنانے والے

قَوْلُهُ الْحَقُّ ط وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ط عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ط وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۷۳﴾

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ج اِنِّيْٓ اَرٰىكَ

کہے گا کہ (حشر برپا) ہو جائے تو ہو جائے گا۔ اُس کی بات شدنی ہے۔ جس دن صور پھونکا جائے گا، اُس دن اُسی کی بادشاہی ہوگی۔ وہ غائب و حاضر، ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔[۹۴] ۷۱-۷۳

الانعام
۶

اِنھیں ابراہیم کا واقعہ سناؤ،[۹۵] جب اُس نے اپنے باپ آزر[۹۶] سے کہا تھا: کیا تم بتوں کو

کے نزدیک خیر اور شر، ظلم اور عدل، حق اور باطل میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ یہ بات انسان کی عقل و فطرت کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتی، اِس لیے کہ جس خالق کی خلقت کے ہر گوشے میں اُس کی حکمت، قدرت، رحمت اور ربوبیت کے آثار موجود ہیں اور اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ انسان کسی طرح اُن کا احاطہ نہیں کر سکتا، اُس کی نسبت وہ کس طرح یہ باور کر لے کہ اُس کو ہماری نیکی بدی اور ہمارے عدل و ظلم سے کوئی بحث نہیں ہے؟ اگر بحث ہے اور ضرور بحث ہے، اِس لیے کہ یہ بحث نہ ہو تو یہ دنیا بالکل کھیل، بلکہ نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے تو اِس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ اِس دنیا کے لیے ایک یوم انصاف آئے جس میں خدا کی کامل رحمت اور اُس کی کامل حکمت ظاہر ہو اور ہر نیکی اپنا صلہ پائے اور ہر بدی اپنی سزا۔"

(تدبر قرآن ۳/ ۸۳)

۹۴ اِس لیے ضروری ہے کہ اُس کا ہر فیصلہ عدل و حکمت پر مبنی ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی مغالطے میں پڑ جائے یا کسی باطل کو حق اور حق کو باطل بنا دے۔ اُس کے عدل و حکمت اور علم و خبر میں کوئی نقص نہیں ہے کہ اِس طرح کی کوئی چیز اُس سے صادر ہو جائے۔

۹۵ آگے دوسرے نبیوں کا بھی ذکر ہے، لیکن ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ خاص اہتمام کے ساتھ اِس لیے سنایا جا رہا ہے کہ بنی اسمٰعیل بھی اُنھیں اپنا خاندانی بزرگ اور مذہبی پیشوا مانتے تھے

وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٤﴾ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿٧٥﴾

معبود بنائے بیٹھے ہو؟ میں تو تمھیں اور تمھاری قوم کو کھلی گم راہی میں دیکھ رہا ہوں۔ ابراہیم کو ہم اِسی طرح زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مشاہدہ کراتے تھے[97] تاکہ وہ اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور خود بھی اُن لوگوں میں سے ہو جائے جو پورا یقین رکھنے والے ہوں[98]۔ ۷۴-۷۵

اور بنی اسرائیل بھی۔ پھر دونوں یہ دعویٰ بھی رکھتے تھے کہ جس دین پر وہ اِس وقت عمل پیرا ہیں، اُس کی وراثت اُنھوں نے سیدنا ابراہیم ہی سے پائی ہے۔

۹۶ یہود کے مذہبی لٹریچر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزر صرف بت پرست ہی نہیں، بت گر اور بت فروش بھی تھے۔ قرآن نے اپنے عام اسلوب کے خلاف اُن کے نام کی تصریح غالباً اِس لیے کی ہے کہ وہ اُس اختلاف کو رفع کرنا چاہتا ہے جو یہود و نصاریٰ کے ہاں اِس نام کے بارے میں پایا جاتا ہے۔

۹۷ اصل الفاظ ہیں: 'كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ'۔ یہ دراصل 'كُنَّا نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ' ہے۔ عربی زبان کے عام اسلوب کے مطابق فعل ناقص حذف ہو گیا ہے۔ ملکوت الٰہی کا یہی مشاہدہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اُس دلیل و حجت کی طرف رہنمائی دی جو اُنھوں نے اپنی قوم پر قائم فرمائی۔ اُن کی اِس حجت کا ذکر آگے آرہا ہے۔ یہ جملہ اُسی کی تمہید ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اِس ملکوت الٰہی کا مشاہدہ اُس نظر سے کرتے تھے جو درختوں کے ایک ایک پتے، زمین کے ایک ایک ذرے اور آسمان کے ایک ایک تارے کو معرفت کردگار کا دفتر بنا دیتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"جہاں تک غور کرنے کا تعلق ہے، اِس ملکوت پر غور تو ایک سائنس دان بھی کرتا ہے، لیکن وہ سارا غور و فکر اپنی ذات یا اپنے محدود ماحول کو محور بنا کر کرتا ہے۔ اُس کی نگاہ صرف اپنے نفع

عاجل پر ہوتی ہے۔ اِس وجہ سے وہ اُن حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا جو اُس کی نگاہ کو اُس کے مطلوب نفع عاجل سے ہٹا دیں۔ وہ چمن میں کھلے ہوئے گلاب کو اِس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اُس سے گل قند یا اِسی طرح کی کوئی اور چیز تیار ہو سکتی ہے جس سے فلاں فلاں فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اِس کے بعد وہ اِس چکر میں نہیں پڑتا کہ اُس پھول کے حسن و جمال، اُس کی رعنائی و دل کشی، اُس کی عطر بیزی و مشام نوازی میں اُس کے صانع کی قدرت، کاری گری، حکمت، رحمت اور ربوبیت کے جلوے دیکھنے کی کوشش کرے اور اِن جلووں سے بے خود ہو کر پھول سے گزر کر پھول کے پیدا کرنے والے کے جمال و کمال کے مشاہدے میں غرق ہو جائے:

اے گل بتو خرسندم تو بوے کسے داری

حالاں کہ ایک صاحب نظر کے لیے پھول کا یہی پہلو زیادہ جاذب نظر ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر پھول سے مقصود صرف گل قند ہی ہوتا تو صرف اِس مقصد کے لیے اُس کی ایک ایک پنکھڑی پر قدرت کو اِس فیاضی کے ساتھ گل کاری کی کیا ضرورت تھی؟ یہ گل کاری اور صنعت گری تو اِسی لیے فرمائی گئی ہے کہ پھول کی ایک ایک پتی معرفت کردگار کے دفتر کا کام دے۔''

(تدبر قرآن ۳/ ۹۰)

۹۸؎ اِس جملے کا معطوف علیہ اصل میں محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ آگے کی آیتوں میں 'تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ' کے الفاظ سے اُس کا تعین ہو جاتا ہے۔ اِس میں جس یقین کا ذکر ہے، وہ ایمان سے اوپر کا درجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...ایمان ایک عام چیز ہے جس کے لیے اگر فطرت سلیم ہو تو اندر کا وجدان بھی کافی ہوتا ہے، لیکن یقین فکر و نظر، تفکر و تدبر اور ملکوت الٰہی کے علم و مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے مراتب و مدارج کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ چنانچہ آگے 'نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ' میں اُسی کے مراتب عالیہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہی یقین جب ایمان کے اندر پیدا ہوتا ہے، تب اُس کا فیضان متعدی ہوتا ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات اُس سے دشت و جبل گونج اٹھتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۹۲)

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيۡهِ الَّيۡلُ رَاٰ كَوۡكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِيۡنَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَاَ الۡقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَـئِنۡ لَّمۡ يَهۡدِنِىۡ رَبِّىۡ لَاَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡقَوۡمِ الضَّآلِّيۡنَ ﴿٧٧﴾

چنانچہ[99] (ایک دن) جب اُس پر رات طاری ہوئی تو اُس نے تارا دیکھا (اور لوگوں کو متوجہ دیکھ کر) کہا: یہ میرا رب ہے۔ پھر (اِسی طرح کے ایک موقع پر) جب تارا ڈوب گیا تو اُس نے کہا: میں (خدائی کے لیے) اُن کو پسند نہیں کرسکتا جو ڈوب جاتے ہیں[100]۔ پھر (ایک دن) جب چاند کو چمکتے دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے۔ لیکن جب وہ بھی

۹۹۔ یہاں سے آگے اب اُس حجت ابراہیمی کا بیان ہے جو آں جناب نے زمین و آسمان میں ملکوت الٰہی کے مشاہدے سے اخذ کر کے اپنی قوم کے سامنے پیش فرمائی۔ اِس میں بنائے استدلال یہ حقیقت ہے کہ جن چیزوں کو معبود سمجھ کر لوگ اُن کی پرستش کرتے ہیں، وہ سب محکوم و مقہور، اپنی تقدیر کے پابند اور اپنے خالق کے احکام و قوانین کے تحت مسخر ہیں۔ اُن میں سے کوئی چیز اِن احکام و قوانین سے سرمو انحراف نہیں کرسکتی۔

۱۰۰۔ اصل میں یہ بات کہنا مقصود تھی، لیکن ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے مزاج کی رعایت سے استدراج کا طریقہ اختیار فرمایا۔ چنانچہ کسی مجلس میں پہلے ایک دن خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے وہ بات کہی جس سے اُن کی ستارہ پرست قوم کسی حد تک مطمئن ہو گئی کہ ہمارے معبودوں سے بے زار یہ شخص بھی اب شاید کچھ مان لینے پر آمادہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اپنی قوم کے کانوں میں یہ بات ڈال کر وہ کچھ دن خاموش رہے۔ پھر کسی دن صبح کے وقت جب تارے ڈوب گئے تو خود کلامی کے اُسی انداز میں دوسروں کو سناتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا کہ میں ڈوب جانے والوں کو خدائی کے لیے پسند نہیں کرسکتا۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ طلوع کے بعد اِن ستاروں کے غروب کو بھی دیکھو۔ یہ اپنے وجود سے شہادت دے رہے ہیں کہ اِنھیں جس قانون کا پابند بنایا گیا

الانعام ۶

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ

ڈوب گیا تو اُس نے کہا: اگر میرے پروردگار نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گم راہ لوگوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا۔[۱۰۱] پھر (ایک دن) جب سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔[۱۰۲] لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو اُس نے (اپنی قوم کو مخاطب کر کے) کہا: میری قوم کے لوگو، میں اُن سب سے بری ہوں جنھیں تم (خدا

الانعام ۶

ہے، اُس سے ذرہ برابر تجاوز نہیں کر سکتے۔ اِس لیے کوئی عاقل اِنھیں اپنا معبود کیسے بنا سکتا ہے؟ یہ منصب تو اُسی کے شایان شان ہے جو حی وقیوم اور قدیم ولا یزال ہو۔

۱۰۱۔ اِس میں تعلیم کا قدم مزید آگے بڑھ گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہاں صرف اتنی ہی بات نہیں ظاہر ہوئی کہ ڈوبنے والے سزاوار عبادت نہیں، بلکہ یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ اِن ڈوبنے والوں کو معبود بنانا کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ نیز یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ یہ ضلالت کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بلکہ بڑے حسرت واندوہ کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف خدا ہے، وہ ہدایت نہ بخشے تو انسان ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اُس کے درپے ہو جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں حضرت ابراہیم نے چونکہ اپنے آپ سے کہیں، اِس وجہ سے سننے والوں میں سے جس کے کان میں پڑی ہوں گی، اُس کے لیے اِن سے چڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، بلکہ جس کے اندر کچھ بھی غور وفکر کی صلاحیت رہی ہو گی، وہ اِس سوچ میں پڑ گیا ہو گا کہ ایک یہ شخص ہے جو طلب ہدایت میں اِس طرح بے قرار ہے اور ایک ہم ہیں کہ پتھر کی طرح اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔"

(تدبر قرآن ۳/ ۹۵)

۱۰۲۔ صاف واضح ہے کہ یہ بات اُنھوں نے طنز، تحقیر اور استہزا کے طور پر کہی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ خاص مزاج ہے۔ دوسروں کو مشتعل کیے بغیر اپنی بات اُن تک پہنچانے کے

فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾

کے) شریک ٹھیراتے ہو۔ میں نے یک سو ہو کر اپنا رخ اُس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں[۱۰۳]۔ ۷۶-۷۹

لیے توریہ، استدراج اور پاکیزہ ظرافت کے یہ انداز وہ بالعموم اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی اسلوب اُس جملے میں بھی ہے جو بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنی قوم کی پوچھ گچھ کے جواب میں فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...انبیا کے طریقۂ کار اور خطاب و استدلال میں استدراج، مزاح، طنز، توریہ اور تدریج وغیرہ کے انداز جو کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، یہ سب انسانی فطرت کے مقتضیات پر مبنی ہیں۔ اِن میں سے ہر اسلوب کا ایک محل ہوتا ہے اور ہر انداز اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ بسا اوقات ایک وقفہ جو بظاہر ٹھیراؤ ہوتا ہے، سفر کی ہزاروں منزلیں طے کرا دیتا ہے اور ایک دل آویز طنز جو بظاہر طنز ہوتا ہے، ہزاروں حجتوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔" (تدبر قرآن ۳/۹۹)

۱۰۳ 'وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ' کے جو الفاظ آیت میں آئے ہیں، اُن میں 'لِلَّذِيْ' کا لام دلیل ہے کہ 'وَجَّهْتُ' کا لفظ یہاں 'أسلمت' کے مضمون پر بھی مشتمل ہے۔ قوم کو مخاطب کیے بغیر ایک تدریج کے ساتھ اپنی بات اُس کے کانوں میں ڈالنے کے بعد اب اُس کو مخاطب کر کے ابراہیم علیہ السلام نے براہ راست اپنے عقیدے کا اعلان فرمایا ہے۔ یہ درحقیقت اسلام اور توحید کی دعوت ہے جو اِس اسلوب میں پیش کی گئی ہے۔ اوپر جس یقین کا ذکر تھا، یہ اُسی یقین کا اظہار ہے۔ اِس کا ایک ایک لفظ بتا رہا ہے کہ یہ اعلان کس اذعان اور کس شدت احساس کے ساتھ کیا گیا ہے۔ غروب آفتاب سے جب اُن کے سب سے بڑے معبود کی حقیقت بھی واضح ہو گئی تو یہی موقع تھا کہ یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کی جائے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، جن کی خدائی کی دلیل اُن کے وقتی کروفر ہی سے اخذ کی گئی ہو، اُن کی بے ثباتی اور ناپائداری پر

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّیْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ

اُس کی قوم (اِس بات پر) اُس سے جھگڑنے لگی۔ اُس نے جواب دیا: کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو، دراں حالیکہ اُس نے میری رہنمائی فرمائی ہے[104]؟ میں اُن سے نہیں ڈرتا جنھیں تم اُس کا شریک ٹھیراتے ہو[105]۔ ہاں، اگر میرا پروردگار ہی کچھ

سب سے موثر تقریر کا وقت وہی ہوتا ہے، جب اُن کی لاش اُن کے پرستاروں کے سامنے پڑی ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے ٹھیک اِسی موقع کا انتخاب کیا۔ اُن کی اِس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ معبود وہی ہوسکتا ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہو۔ انسان اپنے آپ کو اُسی کے حوالے کرسکتا ہے۔ جو خود فراخیِ افلاک میں خوار و زبوں ہیں، وہ کسی کو کیا دیں گے اور کوئی اپنے آپ کو اُن کے حوالے کیوں کرے گا؟ اِس لیے توحید پر ایمان کے ساتھ یہ اعلان بھی ضروری ہے کہ بندۂ مومن ہر شرک سے بری ہے اور وہ کبھی مشرکین میں سے نہیں ہوسکتا۔

۱۰۴؎ یعنی اُس اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جسے تم بھی مانتے ہو کہ زمین و آسمان کا خالق ہے۔ یہ اُنھوں نے اِس لیے فرمایا کہ اُن کی قوم خدا کی منکر نہ تھی، بلکہ اُس دور کی تمام دوسری قوموں کی طرح اُس کے شریک ٹھیراتی تھی۔ جملے کا آخری حصہ بتا رہا ہے کہ یہ تمام واقعہ نبوت کے بعد کا ہے۔

۱۰۵؎ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے بجائے اُن کی قوم نے اپنے اوہام سے اُنھیں ڈرانا شروع کر دیا۔ ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے یہ اُنھی ڈراووں کا جواب ہے۔ یہ ڈراوے کیا ہوسکتے تھے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...شرک کی بنیاد... چونکہ تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے، اِس وجہ سے قوم

شَیۡءٍ عِلۡمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۸۰﴾ وَکَیۡفَ اَخَافُ مَاۤ اَشۡرَکۡتُمۡ وَلَا تَخَافُوۡنَ اَنَّکُمۡ اَشۡرَکۡتُمۡ بِاللّٰہِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ عَلَیۡکُمۡ سُلۡطٰنًا ؕ فَاَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ اَحَقُّ بِالۡاَمۡنِ ۚ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَہُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ الۡاَمۡنُ

چاہے۔[۱۰۶] میرے پروردگار کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔[۱۰۷] پھر کیا تم دھیان نہیں کرتے؟ اور میں اُن چیزوں سے کیسے ڈروں جنھیں تم شریک ٹھیراتے ہو، جب کہ تمھارا حال یہ ہے کہ تم اِس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اُن چیزوں کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے جن کے حق میں اُس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے[۱۰۸]؟ سو (بتاؤ کہ) ہم دونوں فریقوں میں سے کون امن و اطمینان کا زیادہ مستحق ہے، اگر تم جانتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ امن و اطمینان تو اُنھی کے لیے ہے جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اپنے ایمان

کے لوگوں نے طرح طرح سے اُن کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ معبودوں سے نفرت و بغاوت کا اعلان کرتے ہو تو اُن کی پکڑ میں آ جاؤ گے، اندھے ہو جاؤ گے، اپاہج ہو جاؤ گے، تم پر بجلی گرے گی، بری موت مرو گے۔'' (تدبر قرآن ۳/۹۶)

۱۰۶؎ یہ استثنا تفویض الی اللہ کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، خدا کے اعتماد پر کہہ رہا ہوں۔ میرا ارادہ چاہے جتنا پاک اور عزم جتنا سچا ہو، اُس کی تکمیل اگر ہو سکتی ہے تو اُسی پروردگار کی توفیق سے ہو سکتی ہے۔ ہر راستے کی اپنی آزمایشیں ہیں اور بندۂ مومن اِن آزمایشوں میں اُس کی مدد اور توفیق کے بغیر کسی طرح پورا نہیں اتر سکتا۔

۱۰۷؎ اِس لیے مجھے یہ اندیشہ بھی نہیں ہے کہ اُس کی لاعلمی میں کوئی مجھے نقصان پہنچا دے گا۔

۱۰۸؎ یعنی خدا کے غضب اور اُس کے قہر سے ڈرنا تو تمھیں چاہیے کہ اُس کی سند کے بغیر اُس کے شریک ٹھیراتے اور اُس پر جھوٹ باندھتے ہو۔

وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ

کو ظلم[۱۰۹] سے آلودہ نہیں کیا اور وہی راستہ پانے والے ہیں۔ ۸۰-۸۲

یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو عطا فرمائی کہ اپنی قوم پر قائم کرے[۱۱۰]۔ ہم جس کو چاہتے ہیں، اُس کے درجے پر درجے بلند کر دیتے ہیں[۱۱۱]۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار حکیم و علیم ہے[۱۱۲]۔ (پھر یہی نہیں)، ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب عنایت فرمائے۔ اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت بخشی۔ اِس سے پہلے یہی ہدایت ہم نے نوح کو بخشی تھی اور (ابراہیم کے بعد) اُس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان،

۱۰۹؎ اِس سے مراد وہی شرک ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام کی قوم مبتلا تھی۔

۱۱۰؎ یہ قرآن نے خود واضح کر دیا ہے کہ اوپر نجوم و کواکب اور مہ و آفتاب کے طلوع و غروب کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنا کوئی فکری ارتقا نہیں، بلکہ اُن کے استدلال کا بیان ہے جو اُنھوں نے توحید کی دعوت کے لیے اختیار فرمایا۔ آیت میں 'عَلٰى قَوْمِهٖ' کے الفاظ اِس پر صریح دلیل ہیں۔

۱۱۱؎ اصل میں لفظ 'دَرَجٰتٍ' آیا ہے۔ یہ جمع بھی ہے اور اِس پر تنوین بھی ہے۔ ہم نے ترجمے میں یہ چیزیں ملحوظ رکھی ہیں۔

۱۱۲؎ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ چاہنا الل ٹپ نہیں ہوتا، بلکہ ہمارے علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ہم اپنے قرب کے یہ مدارج اُنھی کو عطا فرماتے ہیں جو اِن کے اہل ہوتے ہیں۔

وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٨٤﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٨٧﴾ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٨﴾

الانعام ٦

ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ ہم نیکو کاروں کو اِسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس[113] کو بھی۔ یہ سب نیکو کاروں میں سے تھے۔ اور اسمٰعیل، یسع[114]، یونس اور لوط کو بھی۔ اِن میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا فرمائی تھی[115]۔ نیز اُن کے آبا و اجداد، اُن کی اولاد اور اُن کے بھائی بندوں کو بھی ہم نے اپنی ہدایت سے نوازا، اُنھیں برگزیدہ کیا اور (توحید کی اِسی) صراط مستقیم[116] کی طرف اُن کی رہنمائی فرمائی تھی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے۔ اپنے بندوں میں سے وہ جسے چاہتا ہے،

۱۱۳۔ یہی وہ پیغمبر ہیں جن کا ذکر بائیبل کے مجموعۂ صحائف میں ایلیا کے نام سے ہوا ہے۔

۱۱۴۔ اِس سے ملتے جلتے نام کے جن دو پیغمبروں کا ذکر بائیبل میں ہوا ہے، اُن میں سے الیشع قرآن کے تلفظ سے قریب تر ہے۔ اِن کا زمانہ ۸۱۳ ق م بتایا جاتا ہے۔ دوسرے یسعیاہ ہیں جن کا زمانہ ۶۲۰ ق م بتایا گیا ہے۔

۱۱۵۔ یہ اُسی عمومی فضیلت کا ذکر ہے جو انبیا علیہم السلام کو اُن کے منصب کے لحاظ سے تمام انسانوں پر حاصل ہوتی ہے۔

۱۱۶۔ یہ لفظ اصل میں نکرہ آیا ہے، لیکن اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۗ

(اپنے قانون کے مطابق) اِس سے سرفراز فرماتا ہے۔ لیکن اگر کہیں یہ لوگ بھی شرک میں مبتلا ہو گئے ہوتے تو اِن کا سب کیا کرایا اِن سے اکارت ہو جاتا[۱۱۷]۔ یہی لوگ تھے جنھیں ہم نے کتاب اور حکم[۱۱۸] اور نبوت عطا کی تھی۔ سو تمھارے یہ مخاطبین اِس کا انکار کریں گے تو کچھ پروا نہیں کہ ہم نے یہ نعمت کچھ اور لوگوں کے سپرد کر دی ہے جو اِس کے منکر نہیں ہوں گے[۱۱۹]۔ (علم نبوت کے جن حاملین کا ہم نے ذکر کیا ہے)، وہی تھے جو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، سو اُنھی کے طریقے کی پیروی کرو۔ اِن لوگوں

۱۱۷؎ یعنی اِس مرتبے کے لوگ بھی اگر کہیں شرک میں مبتلا ہو جاتے تو اُن کا انجام یہی ہوتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...مجرد اِس بنیاد پر اُن کی برگزیدگی قائم نہ رہتی کہ یہ نوح یا ابراہیم کی اولاد ہیں۔ یہ تنبیہ اہل عرب کے لیے بھی ہے اور بنی اسرائیل کے لیے بھی کہ توحید سے منحرف ہو کر جو لوگ مجرد اُس نسبت پر برگزیدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں جو اُنھیں ابراہیم کی اولاد ہونے کے سبب سے حاصل ہے، وہ نری حماقت میں مبتلا ہیں۔ یہ تو درکنار اگر وہ بھی شرک میں آلودہ ہو جاتے تو خدا کے ہاں اُن کا بھی کوئی وزن باقی نہ رہ جاتا۔" (تدبر قرآن ۳/ ۱۰۲)

۱۱۸؎ اِس سے مراد وہ اختیار و اقتدار ہے جو اِن بزرگوں کو کسی نہ کسی حیثیت سے حاصل رہا اور جس کی بنا پر یہ موقع اِنھیں حاصل ہوا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق تمام معاملات کے فیصلے کتاب الٰہی کے مطابق کریں۔

۱۱۹؎ اصل میں 'وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ب' اِس بات کا قرینہ ہے

اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٰى لِلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿٩٠﴾

سے، البتہ کہہ دو کہ میں اپنی اِس دعوت پر تم سے کوئی صلہ نہیں چاہتا (کہ نہیں مانو گے تو میرا کوئی نقصان ہو جائے گا)۔ یہ تو محض ایک یاد دہانی ہے تمام دنیا والوں کے لیے۔[۱۲۰] ۸۳-۹۰

کہ 'وَكَّلْنَا' کے لفظ میں ذمہ دار بنائے جانے کے ساتھ امین اور ضامن بنائے جانے کا مفہوم بھی شامل ہو گیا ہے۔ 'قَوْمًا' سے صحابۂ کرام کی وہ جماعت مراد ہے جو یثرب سے آ کر اِس ہدایت سے بہرہ یاب ہوئی اور جس کی نصرت سے ایک ایسی قوم پیدا ہوئی جو پورے عالم کے لیے دعوت توحید کی علم بردار بن گئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس ٹکڑے میں صحابہ کی استقامت اور مستقبل میں امت کی کثرت کی پیشین گوئی ہے اور اِس پہلو سے یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم بشارت ہے جو اُس دور میں آپ کو دی گئی، جب آپ مخالفتوں کے طوفان سے گزر رہے تھے۔ الفاظ سے تقدیر الٰہی کا وہ اٹل فیصلہ بھی مترشح ہو رہا ہے جو اِس دعوت کو فتح مند کرنے کے لیے ہو چکا ہے اور یہ اشارہ بھی نکل رہا ہے کہ اللہ نے اپنے جن بندوں کو اِس کے لیے کھڑا کر دیا ہے، اُن کی قلت تعداد پر نہ جاؤ، یہی لوگ اِس دعوت کے علمبردار ہوں گے اور یہی قطرے ایک دن سمندر بنیں گے۔"

(تدبر قرآن ۳/۱۰۳)

۱۲۰۔ اصل میں لفظ 'ذِكْرٰى' استعمال ہوا ہے۔ یہ قرآن کے لیے آیا ہے اور دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...ایک تو اِس حقیقت کی طرف کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے، وہ کوئی اوپری اور انوکھی بات نہیں ہے، بلکہ اُنھی حقائق کی یاد دہانی ہے جو انسانی فطرت کے اندر ودیعت ہیں، لیکن لوگوں نے اُن کو اپنی خواہشات و بدعات کے نیچے دبا دیا ہے۔ دوسرے اِس حقیقت کی طرف کہ یہ اُسی ہدایت الٰہی کی یاد دہانی کر رہا ہے جس کو نوح، ابراہیم اور تمام انبیا لے کر آئے، لیکن اُن کے

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ

حقیقت یہ ہے کہ اِن لوگوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی، جب اِنھوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی انسان پر کچھ نازل نہیں کیا۔[121] اِن سے پوچھو، پھر اُس کتاب کو کس نے نازل کیا تھا جس کو موسیٰ لے کر آئے تھے، جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، جس کو ورق ورق کر کے اُنھیں دکھاتے اور زیادہ کو چھپا لیتے ہو[122] اور (جس کے

ساتھ نسبت کے مدعیوں نے اِس ہدایت الٰہی کی جگہ مختلف ناموں سے مختلف ضلالتیں ایجاد کر لیں اور اُنھی ضلالتوں کو اپنے بزرگوں کا دین سمجھ بیٹھے۔ قرآن اپنی اس تذکیر سے تاریخ کے فراموش کردہ اوراق کو بھی یاد دلا رہا ہے اور فطرت کے فراموش کردہ اسباق کو بھی۔ پس جس کا جی چاہے، اُس سے فائدہ اٹھائے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۰۴)

۱۲۱؎ آگے کے مضمون سے واضح ہے کہ یہ قول یہود کا ہے جو اُس زمانے میں قریش کو شہ دے رہے اور طرح طرح کے اعتراضات القا کر رہے تھے۔ اُن کے ذہن میں بات تو یہ رہی ہو گی کہ تورات کے بعد کسی نئی کتاب اور نئی شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی، اِس لیے اللہ اب کسی انسان پر کچھ نازل نہیں کرے گا، لیکن اُنھوں نے بات اِس طرح کہی جس سے عربوں کی قومی حمیت بھی نہ بھڑکے اور اُن کا مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ قرآن نے پہلے اُن کے اِس قول کے ظاہر کو سامنے رکھ کر تبصرہ کیا کہ جو لوگ خدا کو اپنی مخلوقات سے اِس قدر بے تعلق سمجھیں کہ اُن کے اندر طلب ہدایت کا نہایت قوی داعیہ پیدا کر کے اُس نے اِس داعیے کا کوئی جواب نہیں دیا، اُن کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ صدیوں تک دین و شریعت کا حامل رہنے کے باوجود اُنھوں نے خدا کی قدر نہیں پہچانی اور اُس علیم و حکیم ہستی کے بارے میں نہایت غلط اندازہ قائم کیا ہے۔

وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرۡهُمۡ فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ

ذریعے سے) تمھیں وہ علم دیا گیا جسے نہ تم جانتے تھے نہ تمھارے باپ دادا؟ کہہ دو، اللہ ہی نے، پھر اِنھیں اِن کی کج بحثیوں میں چھوڑ دو، کھیلتے رہیں۔ یہ[۱۲۳] (اُسی کتاب کی

الانعام
۶

۱۲۲؎ یہود نے تورات کی جو ناقدری کی یہ اُس کا اظہار بھی ہے اور اُن کی بات کے باطنی پہلو کا جواب بھی کہ خدا کی کتاب کے ساتھ جو سلوک اُنھوں نے کیا ہے، اُس کے بعد تو ناگزیر ضرورت تھی کہ ایک نئی کتاب اور نئی شریعت نازل کی جائے تاکہ لوگ تاریکی سے نکل کر روشنی میں آئیں اور گم راہی سے نجات حاصل کر لیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہود نے تورات اُس شکل میں جمع نہیں کی تھی جس شکل میں مسلمانوں نے قرآن کو مابین الدفتین جمع کیا، بلکہ اُنھوں نے اُس کو مختلف اجزا میں تقسیم کر لیا تھا اور ہر جزو کو الگ الگ قلم بند کیا تھا۔ اِس طرح اُن کو اُس کی اُن تعلیمات اور پیشین گوئیوں کے چھپانے کا آسانی سے موقع مل جاتا تھا جن کو وہ اپنی خواہشات اور مصالح کے خلاف پاتے۔ جب ایک کتاب کے اجزا الگ الگ کراسوں کی شکل میں ہوں اور اُس پر اجارہ داری بھی مخصوص ایک گروہ کی ہو تو وہ بڑی آسانی سے یہ کر سکتا ہے کہ اُس کے جس جزو کو چاہے، اپنے مخصوص حلقے سے باہر کے لوگوں کے علم میں نہ آنے دے۔ قرآن نے یہود پر کتاب الٰہی کے اخفا کا جو جرم عائد کیا ہے، اُس کی ایک نہایت سنگین شکل یہ بھی تھی اور قرآن کے انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس طرح کتاب الٰہی کا زیادہ حصہ یہود نے چھپا لیا تھا، صرف اُس کا تھوڑا حصہ وہ ظاہر کرتے تھے، اِس لیے کہ 'تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا' کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو حصہ چھپایا جاتا تھا، وہ زیادہ تھا۔ اِس کے معنی لازماً یہ بھی ہوئے کہ جو حصہ ظاہر کیا جاتا تھا، وہ تھوڑا تھا۔"

(تدبر قرآن ۳/ ۱۰۸)

۱۲۳؎ پہلے محض اشارہ فرمایا تھا۔ یہاں سے آگے اب قرآن کی مستقل حیثیت واضح کی جا رہی

الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾

طرح) ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے، بڑی خیر و برکت والی ہے،[۱۲۴] جو کچھ اِس سے پہلے آچکا ہے، اُس کی تصدیق کرتی ہے،[۱۲۵] اِس لیے کہ تم اِس کے ذریعے سے لوگوں کو خوش خبری دو اور اِس لیے کہ اُنھیں متنبہ کر دو جو ام القریٰ اور اُس کے گردو پیش کے رہنے والے ہیں۔[۱۲۶] (تم مطمئن رہو)، جو آخرت کو مانتے ہیں، وہی اِسے مانیں گے اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔[۱۲۷] ۹۱-۹۲

ہے کہ اِس کتاب کے نزول کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔

۱۲۴ یہ اُس عالمگیر خیر و برکت کی طرف اشارہ ہے جس کا ظہور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ پر قرآن کے نزول سے ہوا اور جس کی بشارت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اُس وقت دے دی گئی تھی، جب وہ خدا کے حکم پر اپنے بیٹے کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ بائیبل کی کتاب پیدایش میں ہے:

”خداوند فرماتا ہے: چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے، دریغ نہ رکھا، اِس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا... اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔“

(۲۲: ۱۶-۱۸)

۱۲۵ یعنی اُن پیشین گوئیوں کی مصداق ہے جو اِس کے متعلق پچھلے صحیفوں میں موجود ہیں اور اِس لیے نازل کی گئی ہے کہ اُس پورے سلسلۂ نبوت کی صداقت پر ایک برہان قاطع بن جائے جو تورات کے نزول سے لے کر اب تک جاری رہا ہے۔

۱۲۶ اِس کا عطف اُس مفہوم پر ہے جو پہلے جملے سے نکلتا ہے۔ وضاحت قرینہ کی بنا پر اصل میں

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ط وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ج

اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ پر جھوٹی تہمت باندھے[128] یا کہے کہ میری طرف وحی آئی ہے، دراں حالیکہ اُس کی طرف کوئی وحی نہ آئی ہو اور اُس سے بڑھ کر جو دعویٰ کرے کہ میں بھی اُس جیسا کلام نازل کیے دیتا ہوں، جیسا خدا نے نازل کیا ہے[129]؟ اور کبھی تم دیکھتے[130]، جب یہ ظالم موت کی بے ہوشیوں میں ہوں گے اور فرشتے

الانعام ٦

اُسے حذف کردیا ہے۔ قرآن کی یہ ضرورت قریش کے تعلق سے بیان ہوئی ہے، جن پر اتمام حجت کے لیے اُسے نازل کیا گیا اور جس کے نتیجے میں پورے عالم کے لیے اُس عظیم خیر و برکت کا ظہور ہوا جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔

۱۲۷؎ یہ اشارہ صالحین اہل کتاب کی طرف ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ اُن کی تعریف کی ہے اور ہر جگہ یہی شناخت بتائی ہے کہ وہ نماز کا اہتمام کرتے اور اُس میں شب و روز آیات الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں۔

۱۲۸؎ یعنی شرک کرے۔ اِسے جھوٹی تہمت سے اِس لیے تعبیر کیا ہے کہ مشرکین اپنے جی سے معبود گھڑتے اور اُن کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ اُنھیں خدا نے اپنا شریک قرار دیا ہے۔ یہ قریش کا سب سے بڑا جرم تھا۔ چنانچہ اہل کتاب کے مفسدین کا ذکر کرنے کے بعد قرآن نے اُن کی طرف توجہ فرمائی ہے تو سب سے پہلے اُن کے اِسی جرم کا ذکر کیا ہے۔

۱۲۹؎ یہ اُن ہفوات کا حوالہ ہے جو قریش کے لیڈر بکتے رہتے تھے تاکہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس دعوے کا کوئی اثر قبول نہ کریں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ آپ کی اپنی کوئی بات نہیں، بلکہ خدا کا کلام ہے جو خدا کی طرف سے اُس کے ایک فرشتے کے ذریعے سے نازل کیا

اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ اَلۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ بِمَا كُنۡتُمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَقِّ وَكُنۡتُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهٖ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقۡنٰكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكۡتُمۡ

ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ لاؤ، اپنی جانیں حوالے کر دو، آج تمھارے اِس جرم کی پاداش میں تمھیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا[131] کہ تم اللہ پر ناحق تہمت باندھتے تھے اور اُس کی آیتوں سے متکبرانہ اعراض کرتے تھے[132]۔ لو، بالآخر ویسے ہی اکیلے اکیلے ہمارے پاس آ گئے ہو،[133] جیسے پہلی مرتبہ ہم نے تمھیں پیدا کیا تھا۔

گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی صداقت ظاہر ہوتی ہے تو جن لوگوں کے پندار پر اُس کی زد پڑتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اُس کے مقابل میں بے بس محسوس کرتے ہیں تو اِسی طرح کی دھونس سے وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اُن کے دام فریب میں پھنسے ہوئے عوام اُن کی صلاحیتوں سے مایوس ہو کر اُس صداقت کو اختیار نہ کر لیں۔ لیکن اِس قسم کی نمایشی اور ادعائی شہ زوری اصل حقیقت کے مقابل میں کیا کام دے سکتی ہے اور کتنے دن کام دے سکتی ہے۔ بالآخر اِن زبان کے سورماؤں کو میدان چھوڑ کے بھاگنا پڑتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۱۱)

۱۳۰؎ یہ شرط ہے اور آگے اِسی کا بیان ہے۔ اِس کا جواب اِس لیے حذف کر دیا ہے کہ جس ہول ناکی کو چشم تصور کے سامنے لانا پیش نظر ہے، وہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آ سکتی تھی۔

۱۳۱؎ ذلت کا عذاب اِس لیے کہ اِن متمردین نے خدا اور اُس کے رسول کے مقابلے میں سرکشی اور تکبر کا رویہ اختیار کیا۔

۱۳۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَكُنۡتُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهٖ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ'۔ 'عَنۡ' کا صلہ دلیل ہے کہ 'تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ' کا لفظ یہاں اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔

۱۳۳؎ پیچھے غائب کا اسلوب تھا۔ اُس کے بجائے حاضر کا یہ اسلوب، اگر غور کیجیے تو اُن کے

مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ

جو کچھ (دنیا میں) تمھیں دیا تھا، وہ سب پیچھے چھوڑ آئے ہو، اور تمھارے ساتھ ہم تمھارے اُن سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھ رہے جن کے بارے میں تم سمجھتے تھے کہ تمھارے معاملے میں ہمارے شریک ہیں۔ تمھارے سب رشتے ٹوٹ گئے[۱۳۴] اور جو کچھ گمان تم کیے بیٹھے تھے، وہ سب تم سے جاتے رہے ہیں[۱۳۵]۔ ۹۳-۹۴

دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے[۱۳۶]۔ وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی

انجام کی ہول ناکی کو اِس طرح نگاہوں کے سامنے لے آیا ہے گویا قیامت آگئی اور اُن سے خطاب کیا جا رہا ہے۔

۱۳۴؎ اصل میں 'تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں فاعل ہمارے نزدیک حذف ہے، یعنی 'تَقَطَّعَ بَيْنَكُمُ الْحَبْلُ'۔

۱۳۵؎ یعنی ہمارے شریک ٹھیرا کر اور قیامت میں اُنھیں اپنا شفیع سمجھ کر جو گمان کیے بیٹھے تھے، وہ سب ہوا ہو گئے۔

۱۳۶؎ یعنی ایک چھوٹے سے دانے اور چھوٹی سی گٹھلی کو دیکھو، اُسے زمین کی تہوں میں پھاڑ کر اُس سے درختوں اور پودوں کی کونپلیں کون نکالتا ہے۔ یہ خدا ہی کی قدرت ہے کہ اُس نے ایک ایک بیج اور ایک ایک گٹھلی میں یہ صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ پھر وہی ہے جو اپنی کائنات کی ہر چیز کو اُن کی صلاحیتیں بروے کار لانے کے لیے امر فرماتا ہے۔ اِن سب چیزوں میں کیا اُس کے سوا کسی اور کا تصرف دیکھتے ہو؟ ہرگز نہیں، تم بھی جانتے ہو کہ تنہا اللہ ہے جو دانے اور گٹھلی سے لے

وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿٩٥﴾ فَالِقُ

مردہ کو زندہ سے نکال لانے والا ہے۔[137] یہ ہے اللہ، تو کہاں پھرے جاتے ہو؟[138] وہی صبح

کر پوری کائنات پر بلا شرکت غیرے حکومت کر رہا ہے۔ اِس میں کسی دوسرے کو اگر ادنیٰ اختیار بھی ہوتا تو اِن میں سے کوئی چیز نہ وجود پذیر ہو سکتی تھی اور نہ بروے کار آ سکتی تھی۔

۱۳۷؎ مردہ سے زندہ کو نکالنے کے لیے فعل استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مقصود تصویر حال ہے، لیکن زندہ سے مردہ کو نکالنے کے لیے فاعل کا صیغہ استعمال فرمایا ہے جس میں عزم اور فیصلے کا مفہوم بھی شامل ہو گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ کوئی چاہے یا نہ چاہے، خدا زندگی کو موت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اُس کا یہ قانون ایسا اٹل ہے کہ زندگی حاصل ہو جانے کے بعد کسی جان دار کو زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی، مگر خدا کا فیصلہ نافذ ہو کے رہتا ہے اور وہ اپنی یہ محبوب ترین چیز بھی اُس کے حوالے کر دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ موت اور زندگی کا یہ قانون جس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...آم کی بے جان گٹھلی اور گیہوں کے بے جان دانے سے ہرا بھرا درخت اور لہلہاتا ہوا پودا پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اِسی سبز و شاداب درخت اور لہلہاتے ہوئے پودے پر زردی، خشکی اور مردنی طاری ہونی شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ ایک دن وہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہی مشاہدہ ہم انسانوں اور حیوانوں میں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ قوموں اور ملتوں کے اندر بھی موت اور زندگی، عروج اور زوال کی یہی داستان برابر دہرائی جا رہی ہے۔ ایک قوم پردۂ عدم سے نکلتی ہے، ساری دنیا پر چھا جاتی ہے اور پھر وہی قوم، ایک دن آتا ہے کہ پردۂ عدم میں جا چھپتی ہے۔ موت اور زندگی کے اِس قانون سے کسی کے لیے مفر نہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی اور کا بھی اِس کائنات میں مالکانہ و خود مختارانہ تصرف ہے تو کسی ایک گوشے ہی میں وہ اِس قانون کو باطل کیوں نہیں کر دیتا اور اگر خدا سرے سے ہے ہی نہیں، بلکہ یہ سب کچھ مجرد مادے یا کسی اندھی بہری طاقت کا بروز ہے تو اِس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بروز قائم و دائم رہے، نہ اِس میں کبھی انقطاع ہو، نہ اِس کے رخ میں کوئی تبدیلی واقع ہو، نہ اس پر کوئی تغیر طاری ہو۔" (تدبر قرآن ۳/۱۱۷)

الْإِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٩٧﴾

نکالنے والا ہے[۱۳۹]۔ رات کو سکون کی چیز اُسی نے بنایا ہے[۱۴۰] اور سورج اور چاند ایک حساب سے رکھے ہیں[۱۴۱]۔ یہ اُسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں[۱۴۲]۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے تارے بنائے تاکہ صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں اُن سے رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے اپنی نشانیاں اُن لوگوں کے لیے

۱۳۸ یعنی خدا کی یہ شانیں دیکھتے ہو اور اِس کے باوجود اُس کے شرکا بنانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہو؟

۱۳۹ یعنی جو زمین کے اندر دفن ہونے والے دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر درخت اور سبزہ پیدا کرتا ہے، اُس کی شانیں آسمان میں بھی دیکھو، وہی پردۂ شب کو چاک کر کے اُس کے اندر سے صبح کو نمودار کرنے والا بھی ہے۔

۱۴۰ اِس سے یہ اشارہ خود بخود نکلا کہ رات انسان کے لیے راحت و سکون کا بستر اِسی لیے بچھاتی ہے کہ اُس کے بعد صبح ہونی ہے جس میں اُسے معاش اور معیشت کی سرگرمیوں میں مصروف ہو جانا ہے۔

۱۴۱ یعنی اُن کے لیے ایک ضابطہ اور نظام الاوقات مقرر کیا ہے جس سے وہ آسمان میں ہوتے ہوئے زمین والوں کے لیے موسم پیدا کرتے اور دن، مہینے اور سال معین کرتے ہیں۔

۱۴۲ یہ جملہ اِس طریقے سے آیا ہے گویا عقل سلیم کے ساتھ اِس کائنات پر غور کرنے والے ہر دل کی صدا ہے جو بے اختیار زبان پر آ گئی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾ وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ

کھول کر بیان کر دی ہیں جو جاننا چاہیں۔[۱۴۳] وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا ہے،[۱۴۴] پھر ہر ایک کے لیے ایک جاے قرار ہے[۱۴۵] اور اُس کے سپرد خاک کیے جانے کی جگہ بھی۔[۱۴۶] ہم نے اپنی نشانیاں اُن لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو سمجھنا

۱۴۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ'۔ اِن میں فعل ارادۂ فعل کے لیے ہے۔ مدعا یہ ہے کہ نشانیاں مانگتے ہو تو دیکھ لو، علم کے سچے طالبوں کے لیے یہ نشانیاں کیا کم ہیں جو ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں۔

۱۴۴؎ یعنی آدم سے پیدا کیا ہے۔ یہ اب خارجی عالم کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد انسان کو خود اُس کی خلقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ صورت، شکل، زبان اور لہجے کے اختلافات کے باوجود تمھارا وجود اپنے جبلی تقاضوں اور فطری داعیات سے شہادت دیتا ہے کہ تم سب ایک ہی آدم کی اولاد ہو اور تمھارا خالق بھی ایک ہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا ہے۔ آیت میں اِس کے لیے لفظ 'اَنْشَاَكُمْ' استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف پیدا کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ یہ بھی ہیں کہ تمھیں نشو و نما بخشی، پروان چڑھایا اور اِس طرح فروغ دیا ہے کہ اُس کی قدرت و حکمت کا ایک معجزہ بن گئے ہو۔

۱۴۵؎ یعنی رہنے بسنے کی جگہ ہے جس میں وہ اتنے دن لازماً گزارتا ہے جو اُس کے لیے مقدر ہوتے ہیں اور جو رزق لکھا ہوتا ہے، اُس سے متمتع ہو کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ چیز خود بتاتی ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے، یہ مستقر بھی اُسی کا دیا ہوا ہے، اِس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۱۴۶؎ اصل میں لفظ 'مُسْتَوْدَعٌ' آیا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: وہ جگہ جہاں کوئی چیز امانت و

مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ

چاہیں[۱۴۷]۔ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے ہر چیز کے انکھوے اُس سے نکالے[۱۴۸]، پھر اُس سے سرسبز شاخیں اٹھائیں جن سے ہم تہ بر تہ چڑھے ہوئے دانے پیدا کر دیتے ہیں[۱۴۹]۔ اور کھجور کے شگوفوں سے لٹکتے ہوئے گچھے بھی اِسی سے پیدا ہوتے ہیں[۱۵۰] اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار بھی ہم نے اِسی سے پیدا کیے ہیں، جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور الگ الگ بھی[۱۵۱]۔ (اِن میں سے) ہر ایک

ودیعت کے طور پر حفاظت سے رکھی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد کہاں رکھے جاؤ گے، اُس کی جگہ بھی اُسی پروردگار نے متعین کر رکھی ہے تاکہ جب چاہے، اپنی یہ امانت زمین کی تحویل سے واپس مانگ لے۔

۱۴۷؎ پہلے فرمایا تھا: ''جو جاننا چاہیں''۔ جاننے کی خواہش انسان کو حقائق کی طرف متوجہ کرتی ہے اور سمجھنے کی خواہش اُس کے اندر محسوسات سے آگے بڑھ کر دیکھنے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔

۱۴۸؎ غائب سے متکلم کی طرف یہ التفات نہایت دل نواز ہے۔ گویا کمال رافت و رحمت سے انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے کہ ادھر دیکھو، یہ ہمیں ہیں کہ آسمان کے پانی سے تمھارے لیے کیا کچھ پیدا کر دیتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس میں رافت، عنایت اور ربوبیت کا اظہار بھی ہے اور اِس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کہ آسمان و زمین اور ابر و ہوا، سب پر ہماری ہی حکومت ہے۔ اگر آسمان پر کسی اور کی حکومت ہوتی، زمین پر کسی اور کی تو یہ توافق کہاں سے ظہور میں آتا کہ آسمان سے پانی برستا اور زمین اپنے خزانے اگل دیتی؟'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۲۴)

اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰی ثَمَرِہٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَ یَنۡعِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکُمۡ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۹۹﴾

کے پھل کو دیکھو، جب وہ پھلتا ہے اور اُس کے پکنے کو دیکھو، جب وہ پکتا ہے۔[۱۵۲] اِن کے اندر اُن لوگوں کے لیے بڑی غیر معمولی نشانیاں ہیں جو ماننا چاہتے ہیں۔[۱۵۳] ۹۵-۹۹

الانعام ۶

۱۴۹؎ یعنی پہلے سرسبز خوشے اور بالیاں نکالتے ہیں، پھر اپنی قدرت و حکمت سے اُن پر تہ برتہ دانے جما دیتے ہیں۔

۱۵۰؎ غلے کے بعد پھلوں کا ذکر فرمایا ہے اور اُن میں سب سے پہلے کھجور کو لیا ہے جو اہل عرب کا عام پھل تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...کھجور کا ذکر اِس طرح فرمایا ہے کہ اُس کے درخت، اُس درخت کے اندر گابھے کا پیدا ہونا اور پھر اُس سے لٹکتے ہوئے بوجھل خوشوں کا ظہور میں آنا، ہر چیز کی طرف توجہ دلا دی ہے تاکہ اُس کاری گری پر انسان کی نظر پڑے جو اُس کے ابتدائے ظہور سے لے کر اُس کی تکمیل اور پختگی تک قدرت اُس پر صرف کرتی ہے۔ اِسی کاری گری اور صنعت پر غور کرنے سے انسان کو صانع کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اُس کی قدرت و حکمت اور اُس کی رحمت و ربوبیت کا کچھ اندازہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت کا منشا اِن قدرتوں اور حکمتوں کے اظہار سے یہی ہے کہ انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو، ورنہ جہاں تک کھجور کی ضرورت مجرد غذا کے لیے ہے، اُس کی فراہمی کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی گٹھلی سے درجہ بدرجہ ایک تناور درخت بنے، پھر ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر اُس کے اندر گابھے اور خوشے پیدا ہوں، پھر اُن کے اندر ننھی ننھی کیریاں بیٹھیں، پھر وہ درجہ بدرجہ پھل بنیں، پھر پک کر اور بوجھل ہو کر اُن کے خوشے زمین کی طرف لٹک آئیں اور انسان کو زبان حال سے دعوت شوق دیں۔ یہ سارا اہتمام، دل گواہی دیتا ہے کہ اِسی لیے ہے کہ انسان پر خدا کی قدرت، اُس کی ربوبیت اور اُس کی حکمت کے اسرار ظاہر ہوں۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۲۵)

۱۵۱۔ یہ اہل عرب کے معروف پھل تھے، اِس لیے صرف اِنھی کا ذکر کیا ہے اور اِن میں بھی خاص طور پر اُس گونا گونی اور بوقلمونی کی طرف توجہ دلائی ہے جس سے خدا کی ربوبیت، رحمت، فیاضی اور قدرت و حکمت کی شان نمایاں ہوتی ہے۔

۱۵۲۔ اصل الفاظ ہیں: 'اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ'۔ 'يَنْعِهٖ' کے بعد 'اِذَا اَيْنَعَ' کے الفاظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گئے ہیں۔ 'اِلٰى ثَمَرِهٖٓ' میں ضمیر کا مرجع اوپر کی سب چیزیں ہیں، لیکن یہ واحد اِس لیے لائی گئی ہے کہ ہر چیز کو الگ الگ لے کر اُس پر غور کرنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''فرمایا کہ اِن میں سے ایک ایک چیز کو لے کر اُس کے پھلنے سے لے کر اُس کے پکنے کے مراحل تک ہر مرحلے کو دیکھو اور اُس پر غور کرو تو خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت، صناعی، کاری گری، باریک بینی، فیض بخشی اور اُس کے حسن و جمال کی اتنی نشانیاں اور اتنی شہادتیں تمھارے سامنے آئیں گی کہ تم اُن کو شمار نہیں کر سکو گے۔ تم ایک نشانی اور ایک معجزہ مانگتے ہو، آنکھیں ہوں تو ہر شاخ معجزہ، ہر پھول معجزہ، ہر پھل معجزہ۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر قدرت کے اعجاز کے ہزاروں شاہ کار جلوہ نمانہ ہوں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ دنیا اپنے بقا کے لیے اِن تمام عجائب کی نمایش کی محتاج نہ تھی۔ یہ بالکل سادہ اور بے رنگ حالت میں بھی وجود میں آ سکتی اور باقی رہ سکتی تھی، لیکن خالق کائنات نے یہ پسند فرمایا کہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتی سے اُس کی عظیم قدرت و حکمت اور اُس کی بے نہایت رحمت و ربوبیت ظاہر ہو تاکہ انسان اُس کی معرفت حاصل کرے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب بدقسمتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی ذہانت کے مظاہرے کا اتنا شوقین ہے کہ اگر ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے مدفون کھنڈروں سے کوئی ٹوٹا ہوا مٹی کا مرتبان بھی اُس کو ہاتھ آ جائے تو اُس پر کھنچی ہوئی آڑی ترچھی لکیروں سے وہ اُس عہد کے آرٹ، اُس عہد کے کلچر، اُس عہد کی تہذیب، اُس دور کے مذہب، اُس دور کی سیاست، غرض ہر چیز پر ایک مزعومہ فلسفہ اور ایک فرضی تاریخ تیار کر دے گا، دوسری طرف اُس کی بلادت اور بدذوقی کا یہ عالم ہے کہ خالق کائنات نے ایک ایک پتی پر اپنی حکمت کے جو دفاتر رقم فرمائے ہیں، نہ اُن کا کوئی حرف اُس کی سمجھ میں آتا ہے، نہ اُن سے اُسے کوئی رہنمائی حاصل

وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَھُمْ وَخَرَقُوْا لَہٗ بَنِیْنَ

لیکن (اِن کی سفاہت کا یہ عالم ہے کہ) انھوں نے جنوں کو خدا کا شریک ٹھیرا لیا ہے،[154] دراں حالیکہ اُسی نے اُنھیں پیدا کیا ہے[155] اور بغیر کسی علم کے اُس کے لیے بیٹے

ہوتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۲۷)

۱۵۳؎ یعنی ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہیں۔ بات سمجھ میں آ جائے تو ماننے کے لیے تیار ہیں۔ علم اور تفقہ کے ساتھ یہ تیسری چیز بھی ضروری ہے۔ یہ نہ ہو تو آدمی سامنے پڑی ہوئی چیزوں کو بھی دیکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فرمایا کہ اِس طرح کے لوگوں کے لیے اِس بات کی غیر معمولی نشانیاں ہیں کہ اِس کائنات کی خدائی اگر مختلف دیوتاؤں اور خداؤں میں بٹی ہوئی ہوتی تو رائی کا ایک دانہ بھی اپنی صلاحیتیں اجاگر نہیں کر سکتا تھا؛ موت و حیات کا کارخانہ جس تواتر کے ساتھ اور ایک قانون اور قاعدے کے مطابق چل رہا ہے، ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتا تھا؛ رات اور دن میں یہ توافق اور سازگاری ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک انسان کے لیے راحت کا بستر بچھائے اور ایک اُس کے لیے معاش اور معیشت کی سرگرمیوں کا میدان گرم کر دے؛ آسمان کے تارے زمین والوں کے لیے شمع برداری کی خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے؛ انسان اُن تنوعات کے ساتھ جو ہر قوم اور قبیلے سے نمایاں ہیں، ایک ہی سمت میں تہذیب کا سفر جاری نہیں رکھ سکتے تھے؛ زندگی، رزق اور اسباب و وسائل میں ایک دوسرے کے لیے ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی تھی؛ کائنات کے اجزاے مختلفہ اِس قدر تدبیر و حکمت کے ساتھ انسان کی زندگی کے بقا کا ذریعہ نہیں بن سکتے تھے۔ یہ حقائق گواہی دیتے ہیں کہ سورج، چاند، ابر و ہوا، نور و ظلمت، سردی گرمی، بہار و خزاں، زمین و آسمان، غرض یہ کہ کائنات کی ہر چیز پر ایک ہی قادر و قیوم کی حکمرانی ہے۔ اِس کائنات کو بنانے اور اِس کو چلانے میں کوئی بھی اُس کا شریک نہیں ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ، تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔

۱۵۴؎ یعنی اِس کے باوجود کہ خدا کی یہ شانیں شب و روز دیکھتے ہیں، لیکن اِن احمقوں کی

وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٠٠﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ

اور بیٹیاں تصنیف کر لی ہیں[156]۔ وہ پاک اور بالاتر ہے اُن سب چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں[157]۔ وہ تو زمین اور آسمانوں کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ اُس کے

خرد باختگی، سفاہت اور بوالفضولی دیکھو کہ جنوں اور بھوتوں کو اُس کا شریک ٹھیراتے ہیں اور اِس طرح گویا اپنے توہمات کو خدا بنا کر اُن کی پرستش کر رہے ہیں۔

۱۵۵۔ یہ کلام کے بیچ میں ایک جملۂ معترضہ ہے جس سے بلاتاخیر اِس لغویت کی تردید فرما دی ہے کہ خدا کی ایک مخلوق اُس کی شریک بھی ہو سکتی ہے۔

۱۵۶۔ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کا درجہ دیتے اور اُن کی مورتیں بنا کر دیویوں کی حیثیت سے اُن کی پوجا کرتے تھے۔ یہی معاملہ مسیحیوں نے سیدنا مسیح کے ساتھ کیا اور اُنھیں خدا کا بیٹا بنا دیا۔ یہ سب بغیر کسی عقلی یا نقلی دلیل کے کیا گیا۔ نہ خدا نے کبھی اِس کی شہادت دی اور نہ عقل و فطرت کے اندر کوئی چیز کبھی اِس کے حق میں پیش کی جا سکی۔

۱۵۷۔ اصل میں لفظ 'سُبْحٰنَهٗ' آیا ہے۔ یہ تنزیہہ کا کلمہ ہے، لیکن اِس کے اندر توحید کی نہایت واضح دلیل بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...عقل و فطرت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ کسی چیز کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہ کی جائے جو اُس کی ثابت، مسلم اور بدیہی صفات کے ضد یا منافی ہو۔ اگر ایسا کیا جائے تو اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی مانی ہوئی ایک حقیقت اپنے ہی دوسرے مفروضے سے باطل ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص بادشاہ ہے تو اُس کی طرف غلامی کی صفات منسوب نہیں ہو سکتیں۔ فرشتہ ہے تو اُس کو شیطان کی صفات سے ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ اِسی طرح جو ذات خالق، مالک، قدیر، علیم اور کریم و رحیم ہے، اُس کو اُن صفات سے متصف کرنا جو مخلوق کی صفات ہیں، اُس کی اُن تمام صفات کی نفی کے ہم معنی ہے جن کا ماننا از روے عقل و فطرت واجب ہے اور جن کی نفی سے

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٠١﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيلٌ ﴿١٠٢﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٠٣﴾

اولاد کہاں سے آئی، جب کہ اُس کی کوئی بیوی ہی نہیں ہے؟[158] اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔[159] وہی اللہ تمھارا پروردگار ہے، اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا اُسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے۔ اُس کو نگاہیں نہیں پا سکتیں، لیکن وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔[160] وہ نہایت باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔[161] ۱۰۰-۱۰۳

انسان اُن تمام تاریکیوں میں پھر گھر جاتا ہے جن سے اِن صفات کے علم کی روشنی ہی نے اُس کو نکالا تھا۔ اگر خدا کو خدا ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اُس کا شریک قرار دے دیا گیا اور اُس کو بیٹوں اور بیٹیوں کا باپ بنا دیا گیا تو پھر وہ خدا کہاں رہا؟ پھر تو اُس کے کفو وہم سر بھی پیدا ہو گئے، اُس کی ذات برادری کے شریک بھی نکل آئے اور اُس کے مدمقابل اور حریف بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۳۰)

۱۵۸؎ یعنی جب اُس کی بیوی نہیں مانتے تو اولاد کہاں سے پیدا کر لیتے ہو؟ تمھیں بھی تسلیم ہے کہ وہی سب کا خالق ہے، پھر تعجب ہے کہ اُس کے پیدا کیے ہوئے فرشتوں، جنات اور انسانوں کو اُس کی ذات اور اُس کی خدائی میں شریک ٹھیراتے ہو۔

۱۵۹؎ یعنی جب اُس نے پیدا کیا ہے اور وہ اپنی مخلوقات کی ایک ایک چیز سے واقف بھی ہے تو اُس کو چھوڑ کر کسی اور کے آستانے پر جانے اور سر جھکانے کی کیا ضرورت ہے؟

۱۶۰؎ مطلب یہ ہے کہ تم اُسے نہیں دیکھ سکتے تو کیا ہوا۔ اِس کا نتیجہ کیا یہی ہونا چاہیے کہ اُس کی

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿۱۰۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

تمھارے پروردگار کی طرف سے بصیرت کی آیتیں تمھارے پاس آچکی ہیں۔ چنانچہ اب جو بصیرت حاصل کرے گا، اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنا رہے گا، اُس کا وبال بھی وہی اٹھائے گا اور (جہاں تک میرا تعلق ہے تو) میں تم پر کوئی نگران نہیں ہوں[۱۶۲]۔ ہم اپنی آیتیں اِسی طرح مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں، اِس لیے کہ اُن پر حجت قائم ہو[۱۶۳] اور اِس لیے کہ وہ بول اٹھیں[۱۶۴] کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور اِس لیے کہ ہم اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں، اِسے ہر لحاظ سے واضح کر دیں۔ ۱۰۴-۱۰۵

ذات کے مظاہر اور اوتار بنا کر اُنھیں پوجنا شروع کر دو اور اِس حماقت کی توجیہ یہ پیش کرو کہ خوگر پیکر محسوس ہے انساں کی نظر؟ ہرگز نہیں، اُس کی نگاہیں تو ہر جگہ اور ہر وقت دیکھتی ہیں، لہٰذا تمھارے ایمان، اعتماد اور بندگی و اطاعت کے لیے یہی کافی ہے اور یہی کافی ہونا چاہیے۔

۱۶۱؎ لہٰذا تم سے باخبر رہنے کے لیے اُسے اُن مزعومہ وسائل و وسائط کی کوئی ضرورت نہیں ہے جن پر تم بھروسا کیے بیٹھے ہو۔

۱۶۲؎ یہ الفاظ براہ راست لسان نبوت پر ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یوں ارشاد نہیں ہوا کہ اِن لوگوں سے کہہ دو، بلکہ کہنے کی بات پیغمبر نے خود براہ راست فرما دی۔ وحی کی یہ قسم روح نبوت کے غایت قرب و اتصال کی دلیل ہوتی ہے۔ گویا منبع فیض کا فیضان خود زبان رسالت سے چھلک پڑتا ہے۔ 'گفتۂ او گفتۂ اللہ بود' شاید اِسی حقیقت کی تعبیر ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۱۳۳)

۱۶۳؎ یہ 'وَلِیَقُوْلُوْا' کا معطوف علیہ ہے جو عربیت کے اسلوب پر اصل میں محذوف ہے۔ ہم

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا ؕ وَ مَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۱۰۷﴾

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدۡوًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ کَذٰلِکَ زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَہُمۡ ۪ ثُمَّ اِلٰی رَبِّہِمۡ

تم اُس چیز کی پیروی کرتے رہو، (اے پیغمبر)، جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر وحی کی جا رہی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور (یہ نہیں مانتے تو) اِن مشرکوں کو جانے دو۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ کبھی شرک نہ کر پاتے۔ ہم نے اِن پر تمھیں نگران مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم اِن کے ضامن ہو۔[165] ۱۰۶-۱۰۷

(یہ جس سفاہت میں مبتلا ہیں، اُس کے باوجود) تم لوگ اُنھیں گالی نہ دو جن کو اللہ کے سوا یہ پکارتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تجاوز کر کے یہ بن سمجھے اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔[166]

نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۱۶۴؎ یعنی زبان سے، بے شک اقرار نہ کریں، مگر اپنے دل میں پکار اُٹھیں کہ تو نے اِس طرح پڑھ کر سنایا ہے کہ گویا کتاب کو گھس ڈالا ہے اور اِس طرح احقاق حق کا حق ادا کر دیا ہے۔

۱۶۵؎ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا کہ اِنھیں جبراً شرک سے روک دے تو یہ کبھی شرک نہ کر پاتے، لیکن اُس کی مشیت یہی ہے کہ لوگوں کو اختیار دے کر اُن کا امتحان کرے کہ کون توحید کی صراط مستقیم پر چلتا ہے اور کون شرک کی راہ اختیار کرتا ہے؟ تم نہ اِن پر داروغہ مقرر کیے گئے ہو اور نہ اِن کے ضامن ہو کہ نہیں مانیں گے تو جواب دہ ٹھیرائے جاؤ گے۔ اِس لیے اپنی ذمہ داری ادا کرو اور اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑ دو، یہ اپنے کرتوتوں کا خمیازہ خود بھگت لیں گے۔

مَّرۡجِعُهُمۡ فَيُنَبِّئُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾

(اِس لیے کہ) ہر گروہ کے عمل کو ہم نے اِسی طرح اُس کے لیے خوش نما بنا رکھا ہے[۱۶۷]، پھر (ایک دن) اُنھیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے، اُس وقت وہ اُنھیں بتا دے گا جو وہ کرتے رہے ہیں[۱۶۸]۔ ۱۰۸

۱۶۶؎ یہ ایک برمحل ہدایت ہے اور اِس لیے کی گئی ہے کہ شرک پر جو تنقید اوپر ہوئی ہے، اُس کے زیر اثر مسلمان کہیں حدود سے تجاوز نہ کر بیٹھیں۔ عقل و انصاف یہی چاہتے ہیں کہ بات ہمیشہ اصول و عقائد اور افکار و نظریات کی تنقید و توضیح تک محدود رہے۔ پھر دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی صحیح طریقہ یہی ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ مخاطبین چونکہ خدا کی صفات اور اُس کے حقوق کا صحیح علم نہیں رکھتے، اِس لیے وہ بھی حدود سے تجاوز کریں اور جھوٹے خداؤں کی حمیت میں سچے خدا کو گالیاں دینے لگیں۔

۱۶۷؎ یہ مزید تنبیہ ہے۔ مدعا یہ ہے کہ رسوم، روایات اور معتقدات کی محبت خود اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی فطرت میں ودیعت فرمائی ہے۔ چنانچہ عقائد و اعمال کی تطہیر ضرور کی جائے، مگر اِس کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے جو اِن چیزوں کے لیے لوگوں کے جذبۂ حمیت کو بھڑکانے کا باعث بن جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''یہاں 'تزیین' کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے، یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قوم کے اندر اپنی مالوفات سے دل بستگی اور اپنی روایات ملی و اجتماعی کے لیے یہ عصبیت ایک حد تک فطری چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو قومی و ملی وحدت وجود ہی میں نہیں آ سکتی۔ خاندانوں، قوموں، وطنوں کی شیرازہ بندی اِسی چیز سے ہوئی ہے۔ یہ معدوم ہو جائیں تو افراد ہوا میں اڑتے ہوئے پتوں کے مانند ہو جائیں۔ اِس وجہ سے اِس چیز کا ایک مقام ہے جو تقاضاے فطرت ہے اور اِس کی رعایت ملحوظ ہونی چاہیے۔ اِس سے تعرض اُسی حد تک ہونا چاہیے جس حد تک یہ حق کے خلاف ہے اور اُس انداز میں ہونا چاہیے جس سے خود اِس کا واجبی حق مجروح نہ ہو۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۳۶)

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا

یہ اللہ کی کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی اِن کے پاس آ جائے تو یہ ضرور اُس پر ایمان لے آئیں گے۔[169] کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔[170] لیکن، (مسلمانو)، تمھیں کیا پتا کہ وہ آ بھی جائیں تو یہ نہیں مانیں گے۔[171] ہم اُس وقت بھی اِن

الانعام ۶

۱۶۸؎ یعنی مطمئن رہو، تمھارا کام اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہ حق واضح کر دیا جائے۔ یہ اپنی حماقتوں پر اصرار کریں گے تو خود مجرم ٹھیریں گے اور جواب دہی کے لیے ایک دن خدا کے حضور میں پیش ہو جائیں گے۔ وہاں جو کچھ بھگتنا ہے، اِنھیں بھگتنا ہے۔ اُس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہ ہو گی۔

۱۶۹؎ یہ مطالبہ محض پروپیگنڈے کے لیے تھا۔ اِس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ وہ اگر ایمان نہیں لا رہے تو اِس کی وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اُنھیں کوئی ایسی نشانی نہیں دکھائی جا رہی جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت کے باب میں فیصلہ کن ہو جائے۔ اُن کا یہ مطالبہ نہایت معقول ہے۔ اِسے پورا کر دیا جائے تو اُن کے ایمان لانے میں کوئی چیز مانع نہ ہو گی۔

۱۷۰؎ یعنی جس قسم کی نشانیوں اور معجزات کا مطالبہ تم کر رہے ہو، وہ خدا ہی کے پاس ہیں۔ چاہے تو دکھائے اور چاہے تو نہ دکھائے۔ اِس کا فیصلہ اپنے علم و حکمت کے مطابق وہی کرے گا۔ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ میرا اصلی فریضہ انذار و بشارت ہے۔ اِس سے آگے کوئی چیز میرے اختیار میں نہیں ہے۔

۱۷۱؎ یہ خطاب عام مسلمانوں سے ہے اور بتا رہا ہے کہ بار بار کے مطالبات کو سن کر اُن کے اندر بھی یہ خواہش پیدا ہو جاتی تھی کہ اللہ تعالیٰ آخر پہلے بھی تو پیغمبروں کو معجزے دیتے رہے ہیں،

لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿١١٠﴾
وَلَوۡ اَنَّنَا نَزَّلۡنَاۤ اِلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓـئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الۡمَوۡتٰى وَحَشَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ
كُلَّ شَىۡءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰـكِنَّ

کے دلوں اور اِن کی نگاہوں کو اُسی طرح الٹ دیں گے، جس طرح یہ پہلی بار اِس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے اور اِن کی سرکشی میں اِنھیں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیں گے۔[172] ہم اِن کی طرف فرشتے بھی اتار دیتے اور مُردے بھی اِن سے باتیں کرنے لگتے اور (دنیا کی) سب چیزیں اِن کے سامنے گروہ در گروہ جمع کر دیتے، جب بھی یہ ماننے والے

پھر اِن کے مطالبے پر کوئی معجزہ دکھا کیوں نہیں دیتے کہ ہمارے یہ بھائی راہ راست پر آ جائیں؟ فرمایا ہے کہ اِنھیں کوئی معجزہ دکھا بھی دیا جائے تو نہیں مانیں گے، اِس لیے کہ اِن کے نہ ماننے کی وجہ وہ نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہے ہیں۔

۱۷۲؎ یہ اُن کے ایمان نہ لانے کا اصلی سبب بیان کر دیا ہے کہ محض سرکشی، طغیان، غرور نفس اور پندار سیادت ہے جو ایمان نہ لانے کا باعث بن رہا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو پہلی بار ہی قرآن کی دعوت سن کر اُسے مان لیتے۔ اب اگر کوئی معجزہ دکھا بھی دیا جائے تو یہی چیز پھر حجاب بن جائے گی اور خدا کا قانون یہ ہے کہ جو غرور نفس کی بنا پر دل و نگاہ کا زاویہ غلط کر لیتے ہیں، اُنھیں وہ اُسی طرف پھیر دیتا ہے، جدھر وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سیدھے دیکھنے کے بجائے الٹے دیکھتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے الٹی راہ چلتے ہیں، اُن کے دل اور اُن کی فکر بھی کج کر دی جاتی ہے۔ پھر وہ احول کی طرح ہر چیز کو بس اپنے مخصوص زاویے ہی سے دیکھتے ہیں۔ اِسی سنت اللہ کی طرف ’فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ‘ میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہاں اِسی معروف سنت اللہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ کیسے باور کرتے ہو کہ اگر اِن کو اِن کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مومن بن جائیں گے؟ آخر وہ تمام نشانیاں جو آفاق و انفس میں موجود

اَكۡثَرَهُمۡ يَجۡهَلُوۡنَ ﴿١١١﴾
وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ
يُوۡحِىۡ بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ؕ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ مَا

نہیں تھے، اِلّا یہ کہ اللہ چاہے۔ مگر (کیا کیا جائے کہ) اِن میں سے اکثر جہالت میں مبتلا ہیں[۱۷۳]۔ ۱۰۹-۱۱۱

(یہ معاملہ صرف تمھارے ساتھ نہیں ہے[۱۷۴])۔ ہم نے انسانوں اور جنوں کے اشرار کو اِسی طرح ہر نبی کا دشمن بنایا[۱۷۵]۔ وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کو پرفریب باتیں[۱۷۶] القا

ہیں، جن کی طرف قرآن نے انگلی اٹھا اٹھا کر اشارہ کیا اور اُن کے مضمرات و دلائل واضح کیے، جب اُن میں سے کوئی چیز بھی اِن کے دلوں اور اِن کی نگاہوں کے زاویے کو درست کرنے میں کارگر نہ ہو سکی تو آخر کوئی نئی نشانی کس طرح اِن کا کایا کلپ کر دے گی؟ جو حجاب آج ہے، وہ کل کس طرح دور ہو جائے گا اور جو اندھاپن آج دیکھنے سے مانع ہے، وہ اِس نشانی کے ظہور کے وقت کہاں چلا جائے گا؟ جس طرح آج تک وہ ساری نشانیوں کو جھٹلا رہے ہیں، اُسی طرح اِس نشانی کو بھی جھٹلا دیں گے اور جو قلب ماہیت اِن کے دلوں اور اِن کی آنکھوں کی آج دیکھتے ہو، وہ قلب ماہیت اُس وقت بھی اپنا عمل کرے گی۔'' (تدبر قرآن ۱۴۱/۳)

۱۷۳؎ مطلب یہ ہے کہ اللہ اُنھی کو ایمان و ہدایت کی توفیق عطا فرماتا ہے جو حق کے سچے طالب ہوں۔ یہ جس جہالت میں مبتلا ہیں اور علم و استدلال سے فیصلہ کرنے کے بجائے جس طرح کی شرطیں عائد کر رہے ہیں، اُن کے ساتھ کسی کو ہدایت کی توفیق ارزانی نہیں ہوتی۔

۱۷۴؎ یعنی مخالفانہ شورش اور مخاصمانہ اعتراضات و مطالبات کا معاملہ جو قریش کے لیڈر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر رہے تھے۔

۱۷۵؎ یہ اُس سنت ابتلا کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت اشرار و شیاطین کو مہلت دی جاتی ہے کہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، کر لیں۔ اِس کے لیے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن میں فعل کی

فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ

کرتے رہتے ہیں۔ تیرا پروردگار چاہتا تو وہ کبھی ایسا نہ کر پاتے۔[۱۷۷] سو اِنھیں اِن کی افترا پردازیوں میں پڑا رہنے دو۔ اِس لیے دشمن بنایا کہ اِس سے حق پرستوں کی

نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اُسی اسلوب پر ہوئی ہے جو قرآن میں سنن الٰہیہ کے بیان کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اشرار و شیاطین کو یہ مہلت کیوں دی جاتی ہے؟ اِس کے وجوہ آگے بیان فرمائے ہیں۔

۱۷۶؎ اصل میں 'زُخْرُفَ الْقَوْلِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ صفت ہے جو اپنے موصوف کی طرف مضاف ہوگئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس سے مراد وہ مشرکانہ بدعات ہیں جو ہر دور کے شیاطین جن و انس نے باہمی گٹھ جوڑ سے ایجاد کیں، پھر اُن کے اوپر شریعت الٰہی کا لیبل لگا کر اُن کو رواج دیا اور جب انبیا و مصلحین نے اُن کی اصلاح کی دعوت دی تو اُن کی مخالفت میں بحث وجدال کا بازار گرم کیا۔ چنانچہ اِس موقع پر بھی یہی ہوا۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت دی اور اُن کے بتوں اور مشرکانہ عقائد کے تحت اُن کی حرام ٹھیرائی ہوئی چیزوں کی بے حقیقتی واضح فرمائی تو شرک کے یہ ائمہ آستینیں چڑھا چڑھا کے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جس پر اِن کا زور چلا، اُس کو اپنے دام فریب میں پھنسانے اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو ہمارے باپ دادا کے دین اور ابراہیم کی ملت سے ہٹا رہے ہیں۔"

(تدبر قرآن ۳/ ۱۴۳)

۱۷۷؎ یہ تسلی کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارا پروردگار اُن کی افترا پردازیوں کے آگے بے بس نہیں ہے۔ اِس کی آزادی اُس نے خود اُنھیں عطا فرمائی ہے۔ اِس سے مقصود امتحان ہے اور یہ دنیا اِسی امتحان کے لیے برپا کی گئی ہے، ورنہ اللہ چاہتا تو بالجبر سب اشرار و شیاطین کو اُن کی افترا پردازیوں سے روک دیتا۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ

حق پرستی واضح ہو جائے اور اِس لیے کہ قیامت کا انکار کرنے والوں کے دل اِسی طرف لگے رہیں، وہ اِس پر راضی رہیں اور جو کمائی اُنھیں کرنی ہے، کر لیں۔[۱۷۸] ۱۱۲-۱۱۳

(تم مجھ سے جھگڑ رہے ہو[۱۷۹]) تو (بتاؤ کہ) میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، دراں حالیکہ وہی ہے جس نے تمھاری طرف یہ کتاب اتاری ہے جس میں (دین و شریعت کے متعلق) ہر چیز کی تفصیل ہے۔ اور جنھیں ہم نے (اِس سے پہلے) کتاب عطا فرمائی،[۱۸۰] وہ جانتے ہیں، (اے پیغمبر) کہ یہ تمھارے پروردگار کی طرف

۱۷۸؎ یہ مہلت کے وجوہ ہیں۔ اشرار و شیاطین کو جو ڈھیل دی جاتی ہے، وہ اِسی لیے دی جاتی ہے کہ اُن کے اندر کا فساد پوری طرح سامنے آ جائے اور وہ اپنے اوپر اللہ کی حجت تمام کر لیں۔ آیت میں 'وَلِتَصْغٰٓی اِلَيْهِ' کا معطوف علیہ محذوف ہے اور شیاطین کے پیرووں کی صفت 'الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ' بتائی گئی ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ شیاطین کی جس دعوت کا ذکر ہوا ہے، وہ اُنھی کو اپیل کرتی ہے جو مرنے کے بعد جی اٹھنے کا عقیدہ نہیں رکھتے۔

۱۷۹؎ یعنی اِس معاملے میں جھگڑ رہے ہو کہ خدا کی خدائی تنہا اُسی کے ہاتھ میں ہے یا اُس میں کچھ دوسرے بھی شریک ہیں اور اُس نے کیا جائز رکھا اور کیا حرام ٹھیرایا ہے۔

۱۸۰؎ اِس سے صالحین اہل کتاب مراد ہیں۔ اُن کی شہادت کا ذکر قرآن کے بعض دوسرے مقامات میں بھی ہوا ہے۔

صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ مَنۡ

سے حق کے ساتھ اتاری گئی ہے، لہٰذا تم کہیں شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو جانا۔[۱۸۱] تمھارے پروردگار کی بات (اِن لوگوں کے حق میں) سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی ہے۔ اُس کی باتیں کوئی تبدیل نہیں کرسکتا اور وہ سمیع و علیم ہے۔[۱۸۲] زمین والوں میں زیادہ ایسے ہیں کہ اُن کی بات مانو گے تو تمھیں خدا کے راستے سے بھٹکا کر چھوڑیں گے۔[۱۸۳]

الانعام ۶

۱۸۱؎ یہ خطاب اگرچہ باعتبار الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن صاف واضح ہے کہ روے سخن اُنھی لوگوں کی طرف ہے جو سورہ کے مخاطبین ہیں۔

۱۸۲؎ یعنی وہ بات جو خدا نے اُسی وقت کہہ دی تھی، جب ابلیس نے دھمکی دی تھی کہ میں اولاد آدم کو شرک اور بت پرستی میں مبتلا کر کے چھوڑوں گا تو خدا نے فرمایا تھا کہ اگر ایسا ہے تو میں بھی تجھے اور تیری پیروی کرنے والوں کو دوزخ میں بھر کر رہوں گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ فیصلہ سچائی اور عدل، دونوں معیاروں پر پورا ہے۔ خدا نے جو بات فرمائی، وہ سچی بھی ہے اور مبنی بر عدل بھی۔ اِس لیے کہ خدا نے اِن پر اپنی حجت پوری کر دی ہے۔ اِس کے باوجود اگر یہ ہدایت الٰہی کی جگہ القاے شیطانی ہی کی پیروی پر بضد ہیں تو یہ اُسی انجام کے سزاوار ہیں جس کی خدا نے اِن کو خبر دی ہے۔ خدا کے فیصلے اُس کی مقررہ سنت کے تحت ہوتے ہیں، اُن کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔ اللہ سمیع و علیم ہے، نہ اُس کی کوئی بات بے خبری پر مبنی ہوتی، نہ اُس میں کسی خطا یا ناانصافی کا امکان ہے۔" (تدبر قرآن ۳/۱۴۶)

۱۸۳؎ اِس لیے کہ لوگوں کی اکثریت بالعموم غوغاے عام کی پیروی کرتی ہے، اُس کے فیصلے کسی دلیل و سند اور علم و حجت پر مبنی نہیں ہوتے۔

يَضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿١١٧﴾
فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٨﴾ وَمَا
لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ

یہ محض گمان پر چلتے اور اٹکل دوڑاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اُس کی راہ سے بھٹک چکا ہے اور جو سیدھی راہ پر ہیں، اُنھیں بھی وہ خوب جانتا ہے[184]۔ ۱۱۴-۱۱۷

سو (تم لوگ پروا نہ کرو[185] اور) اگر اُس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو[186] تو جن جانوروں کو

۱۸۴؎ مطلب یہ ہے کہ اللہ دونوں گروہوں سے واقف ہے۔ وہ اُن سے معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق کرے گا۔ اُس کی بارگاہ میں لوگوں کے دعوے اُن کے کچھ کام نہ آئیں گے۔

۱۸۵؎ یعنی اِن کے اُس پروپیگنڈے کی پروا نہ کرو جو یہ تمھاری اصلاحات کے خلاف کر رہے ہیں کہ یہ شخص وہ چیزیں بھی جائز ٹھیرا رہا ہے جو ہمارے بزرگوں ——— ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام ——— کے زمانے سے حرام چلی آ رہی تھیں۔ یہ اِن کے ظنون واوہام ہیں۔ ابراہیم و اسمٰعیل کا دین درحقیقت وہی تھا جو اِس وقت اِن کے سامنے شرک و بدعت کی تمام آلایشوں سے پاک کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۸۶؎ یہ تاکید اور تنبیہ، بلکہ ایک نوعیت کی تہدید بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...تحریم و تحلیل کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اگر کسی اور کے لیے بھی یہ حق تسلیم کر لیا جائے تو یہ خدا کے حقوق میں دوسرے کو حصہ دار بنانا ہے اور یہ شرک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مسئلہ صرف ایک چیز کے کھانے اور نہ کھانے کا نہیں ہے، بلکہ جن چیزوں کو مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھیرایا گیا ہے، اللہ کی طرف سے اُن کی حلت کے اعلان کے باوجود اُن سے اجتناب کرنا گویا بالواسطہ شرک کو تسلیم کرنا ہوا، اِس وجہ سے یہ مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ بن جاتا ہے۔" (تدبر قرآن ۳/ ۱۵۴)

عَلَيۡكُمۡ اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَيۡهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيۡرًا لَّيُضِلُّوۡنَ بِاَهۡوَآئِهِمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُعۡتَدِيۡنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ ذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡسِبُوۡنَ الۡاِثۡمَ سَيُجۡزَوۡنَ

اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، اُنھیں (بغیر کسی تردد کے) کھاؤ اور تم اُن چیزوں میں سے کیوں نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، دراں حالیکہ اُس نے جو کچھ تم پر حرام ٹھیرایا ہے، وہ (اپنی کتاب میں) تمھارے لیے تفصیل سے بیان کر دیا ہے[۱۸۷]، اِس استثنا کے ساتھ کہ تم کسی چیز (کو کھانے) کے لیے مجبور ہو جاؤ[۱۸۸]۔ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ لوگ بغیر کسی علم کے اپنی بدعتوں[۱۸۹] کے ذریعے سے گم راہی پھیلاتے ہیں۔ اِن حد سے بڑھنے والوں کو تیرا پروردگار خوب جانتا ہے۔ تم اِس گناہ کے ظاہر و باطن، دونوں کو چھوڑ دو[۱۹۰]۔ جو لوگ اِس گناہ کا

الانعام ۶

۱۸۷؎ یہ اُس تفصیل کی طرف اشارہ ہے جو اِس سورہ میں بھی ہے اور قرآن کے بعض دوسرے مقامات میں بھی کی گئی ہے۔

۱۸۸؎ اِس استثنا کے حدود و شرائط اِس سے پہلے سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ میں بیان ہو چکے ہیں۔

۱۸۹؎ اصل میں لفظ 'اَهْوَآء' آیا ہے۔ اِس کے معنی خواہشات کے ہیں، لیکن سیاق کلام سے واضح ہے کہ یہاں اِس سے مراد وہ مشرکانہ بدعتیں ہیں جو محض خواہشات کی بنیاد پر دین بنالی جاتی ہیں۔ 'بِغَيْرِ عِلْمٍ' کے الفاظ اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۹۰؎ یعنی شرک کے ظاہر و باطن کو چھوڑ دو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...شرک کی ایک تو حقیقت ہے، جو یہ ہے کہ خدا کی ذات یا صفات یا اُس کے حقوق میں کسی کو شریک ماننا۔ دوسرے اُس کے مظاہر و اشکال ہیں، مثلاً اصنام، انصاب، ازلام، بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام اور اِس نوع کی دوسری چیزیں جو کسی شرکیہ عقیدے یا تصور کا عملی مظہر اور نشان ہیں۔

بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ

اکتساب کرتے ہیں، وہ عنقریب اپنی اِس کمائی کا بدلہ پالیں گے۔ اُن جانوروں میں سے، البتہ ہرگز نہ کھاؤ جنھیں اللہ کا نام لے کر ذبح نہیں کیا گیا اور یاد رکھو کہ بلا شبہ یہ صریح نافرمانی ہے۔[۱۹۱] اور متنبہ رہو کہ شیاطین اپنے ایجنٹوں کو القا کر رہے ہیں کہ وہ (اِس معاملے

ظاہر ہے کہ اِن دونوں میں بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے سہارے سے پروان چڑھتی اور غذا و قوت حاصل کرتی ہیں۔ اِس وجہ سے اگر کسی برائی کا استیصال مقصود ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ اُس برائی کی حقیقت اور اُس کے مظاہر و اشکال، دونوں کا استیصال کیا جائے۔ اِس کے بغیر اُس کا استیصال ناممکن ہے۔ اگر یہ خیال کر کے اشکال و مظاہر سے چشم پوشی برتی جائے کہ جب اصل برائی پر ضرب لگا دی گئی تو اشکال و مظاہر میں کیا رکھا ہوا ہے تو وہ برائی انھی اشکال میں پھر اپنا نشیمن بنا کر اُس میں اپنے انڈوں بچوں کی پرورش شروع کر دیتی ہے اور آہستہ آہستہ اُس کا پورا کنبہ از سرِ نو آباد ہو جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۵۶)

۱۹۱ یہ مزید وضاحت ہے کہ جس ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام تو نہیں لیا گیا، مگر اللہ کا نام بھی نہیں لیا گیا، اُس کی حرمت کے متعلق، البتہ کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے، اِس لیے کہ وہ بھی اُسی حکم کے تحت ہے جو قرآن میں جانوروں کی حرمت سے متعلق بیان ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ جس طرح 'مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ' فسق، یعنی نافرمانی ہے، اُسی طرح یہ بھی فسق ہے۔ اِس کے وجوہ کیا ہیں؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اول یہ کہ اللہ کے نام اور اُس کی تکبیر کے بغیر جو کام بھی کیا جاتا ہے وہ، جیسا کہ ہم آیت بسم اللہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، برکت سے خالی ہوتا ہے۔ خدا کی ہر نعمت سے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، فائدہ اٹھاتے وقت ضروری ہے کہ اُس پر اُس کا نام لیا جائے تا کہ بندوں کی طرف سے اُس کے انعام و احسان کا اعتراف و اقرار ہو۔ اِس اعتراف و اقرار کے بغیر کوئی شخص

وَاِنۡ اَطَعۡتُمُوۡهُمۡ اِنَّكُمۡ لَمُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾

میں بھی) تم سے جھگڑیں۔[۱۹۲] اور متنبہ رہو کہ اگر اِن کا کہا مانو گے تو کچھ شک نہیں کہ تم بھی مشرک ہو کر رہ جاؤ گے۔[۱۹۳] ۱۱۸-۱۲۱

کسی چیز پر تصرف کرتا ہے تو اُس کا یہ تصرف غاصبانہ ہے اور غصب سے کوئی حق قائم نہیں ہوتا، بلکہ یہ جسارت اور ڈھٹائی ہے جو خدا کے ہاں مستوجب سزا ہے۔

دوم یہ کہ احترام جان کا یہ تقاضا ہے کہ کسی جانور کو ذبح کرتے وقت اُس پر خدا کا نام لیا جائے۔ جان کسی کی بھی ہو، ایک محترم شے ہے۔ اگر خدا نے ہم کو اجازت نہ دی ہوتی تو ہمارے لیے کسی جانور کی بھی جان لینا جائز نہ ہوتا۔ یہ حق ہم کو صرف خدا کے اذن سے حاصل ہوا ہے۔ اِس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ جس وقت ہم اُن میں سے کسی کی جان لیں، صرف خدا کے نام پر لیں۔ اگر اُن پر خدا کا نام نہ لیں یا خدا کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لے لیں یا کسی غیر اللہ کے نام پر اُن کو ذبح کر دیں تو یہ اُن کی جان کی بھی بے حرمتی ہے اور ساتھ ہی جان کے خالق کی بھی۔

سوم یہ کہ اِس سے شرک کا ایک بہت وسیع دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ادیان کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ جانوروں کی قربانی، اُن کی نذر اور اُن کے چڑھاوے کو ابتدائے تاریخ سے عبادات میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اِس اہمیت کے سبب سے مشرکانہ مذاہب میں بھی اِس کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ جو قوم بھی کسی غیر اللہ کی عقیدت و نیازمندی میں مبتلا ہوئی، اُس نے مختلف شکلوں سے اِس غیر اللہ کو راضی کرنے کے لیے جانوروں کی بھینٹ چڑھائی۔ قرآن میں شیطان کی جو دھمکی انسانوں کو گم راہ کرنے کے باب میں مذکور ہوئی ہے، اُس میں بھی، جیسا کہ ہم اُس کے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اِس ذریعۂ ضلالت کا شیطان نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اسلام نے شرک کے اِن تمام راستوں کو بند کر دینے کے لیے جانوروں کی جانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام کا قفل لگا دیا، جس کو خدا کے نام کی کنجی کے سوا کسی اور کنجی سے کھولنا حرام قرار دے دیا گیا۔ اگر اِس کنجی کے بغیر کسی اور کنجی سے اُس کو کھولنے یا اُس کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو یہ کام بھی ناجائز اور جس جانور پر یہ ناجائز تصرف ہوا، وہ جانور بھی حرام۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۵۷)

اَوَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا فِىۡ كُلِّ قَرۡيَةٍ

(تم اِن کی پروانہ کرو)۔ کیا جو مُردہ تھا، پھر ہم نے اُسے زندہ کر دیا اور اُس کو ایک ایسی روشنی عطا فرمائی جسے وہ لوگوں کے درمیان لے کر چل رہا ہے[۱۹۴]، اُس شخص کے مانند ہو جائے گا جس کا حال یہ ہے کہ تاریکیوں[۱۹۵] میں پڑا ہوا ہے، کسی طرح اُن سے نکلنے والا نہیں ہے[۱۹۶]؟ اِن منکروں کے اعمال اِن کے لیے اِسی طرح خوش نما بنا دیے گئے ہیں[۱۹۷]۔

۱۹۲ یعنی اُسی طرح کا غوغا برپا کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں جو اِن لوگوں نے اپنی قرارداده بعض حرمتوں کی حلت کا سن کر برپا کر رکھا ہے۔ چنانچہ اپنے ایجنٹوں کو بتا رہے ہیں کہ لو اب یہ نیا دین لے کر آنے والے تمھارے سب باپ دادوں کو حرام خور قرار دے رہے ہیں جو نذر اور چڑھاوے کے بعض جانوروں کو اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرتے اور اُن کا گوشت کھاتے رہے ہیں۔ آگے آیت ۱۳۸ میں مشرکین کے اِس عقیدے کا ذکر ہوا ہے کہ وہ اِن جانوروں پر اللہ کا نام لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔

۱۹۳ یعنی ایک مرتبہ اِن کے توہمات سے سمجھوتا کر لو گے تو آہستہ آہستہ شرک کے دوسرے مظاہر بھی تمھارے علم و عقیدہ میں در آئیں گے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بالآخر مشرک ہو کر رہ جاؤ گے۔

۱۹۴ یہ ایمان والوں کی تمثیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن پر کفر و جہالت کی موت طاری تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اُنھیں ایمان کی زندگی بخشی اور اُن کی رہنمائی کے لیے ایک ایسی کتاب اُنھیں عطا فرمائی جس کی روشنی میں اب وہ حق و باطل کو الگ الگ دیکھ سکتے، حق کے راستے پر چل سکتے اور دوسروں کو بھی یہی راہ دکھا سکتے ہیں۔

۱۹۵ اِس سے مراد ظنون و اوہام اور خواہشات و بدعات کی وہ تاریکیاں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٢٣﴾ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ

ہر بستی میں اُس کے بڑے بڑے مجرموں کو ہم نے اِسی طرح ڈھیل دی[198] کہ اُس میں اپنی چالیں چل لیں۔ وہ یہ چالیں اپنے ساتھ ہی چلتے تھے، مگر اُنھیں اِس کا احساس نہیں تھا۔[199] جب اُن کے سامنے کوئی آیت آتی تو کہتے تھے: ہم ہرگز نہ مانیں گے، جب تک وہی ہم کو نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا ہے۔[200] اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت

الانعام ٦

۱۹۶؎ یہ تمثیل اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے لیے بیان کی گئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اُنھیں جو کچھ عطا ہوا ہے، اُسے وہ کوئی معمولی چیز نہ سمجھیں، اُس کی قدر کریں اور اُس کا زندگی بخش پیغام دوسروں تک پہنچائیں اور اُن لوگوں کی خرافات پر کان نہ دھریں جو اپنے کرتوتوں کی بنا پر اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

۱۹۷؎ یعنی کفر و جہالت کی جس تاریکی کو اُنھوں نے اپنے لیے اختیار کیا ہے، خدا نے وہی تاریکی اُن کے لیے پسندیدہ بنا دی ہے۔

۱۹۸؎ اصل میں لفظ 'جَعَلْنَا' آیا ہے۔ یہ یہاں 'أمهلنا' کے مفہوم میں ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۱۹۹؎ مطلب یہ ہے کہ وہ یہ چالیں بظاہر حق کے خلاف، مگر حقیقت میں اپنے خلاف ہی چلتے تھے۔ اِس کے لیے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن میں فعل ناقص عربیت کے قاعدے سے محذوف ہے۔

۲۰۰؎ یہ اُن چالوں کی ایک مثال ہے جن کا ذکر ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...ٹھیک یہی بات، جیسا کہ قرآن میں تفصیل سے بیان ہوئی، قریش کے اکابر کہتے تھے۔

سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ

کا منصب کسے عطا فرمائے۔[201] اللہ کے ہاں یہ مجرم عنقریب اپنی مکاریوں کی پاداش میں ذلت سے اور سخت عذاب سے دوچار ہو جائیں گے۔ سو (یہ ہدایت پانے والے نہیں

اُن کو بھی وہی گھمنڈ تھا جو اُن کے پیش رو مستکبرین اور مکذبین انبیا کو تھا کہ اگر خدا کسی کو رسالت ہی دینے والا تھا تو کیا اِس تاج کے لیے اُس کو اِنھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا سر موزوں نظر آیا، آخر مکہ یا طائف کے کسی سردار پر اُس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ ظاہر ہے کہ یہ بات جو وہ کہتے تھے تو محض چالبازی کے طور پر کہتے تھے، اِس سے مقصود اُن کا محض اپنی انانیت اور خود فریبی کے لیے ایک پردہ فراہم کرنا اور اپنے عوام کو بے وقوف بنانا ہوتا تھا۔ سادہ لوح عوام دنیوی اسباب و وسائل کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ جن کو دنیا میں بڑا دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ خدا کے نزدیک بھی یہی بڑے ہوں گے۔ اِس ذہن کے لوگ آسانی سے اِس قسم کے چکموں میں آ جاتے ہیں۔ اِسی وجہ سے قرآن نے اِس بات کو مکر سے تعبیر کیا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۶۰)

[201] یہ جواب اگرچہ لفظاً سخت نہیں ہے، لیکن معنی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نہایت سخت ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ یہ منصب رسالت ایسی چیز نہیں ہے جس کا اہل ہر کس و ناکس بن جائے۔ یہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ یہ تاج وہ کس کے سر پر رکھے۔ یہ مخمل اور زربفت کی جھول نہیں ہے جو بسا اوقات گدھوں پر بھی نظر آ جاتی ہے، بلکہ یہ خلعت الٰہی اور تشریف آسمانی ہے جو اُنھی کو نصیب ہوتی ہے جن کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرمائے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۶۰)

اِس سے مزید یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اِس منصب کے لیے منتخب بھی اُنھی کو فرماتا ہے جو استاذ امام کے الفاظ میں اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کے لحاظ سے نوع انسانی کے گل سر سبد، نخل فطرت کے بہترین ثمر اور کمال انسانیت کا مظہر اتم ہوتے ہیں۔

لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسۡتَقِيۡمًا ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّذَّكَّرُوۡنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَهُوَ وَلِيُّهُمۡ

ہیں، اِس لیے کہ) اللہ (اپنے قانون کے مطابق[۲۰۲]) جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے، اُس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گم راہ کرنا چاہتا ہے، اُس کا سینہ تنگ کر دیتا اور ایسا بھینچتا ہے گویا اُسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے۔ اللہ اِسی طرح اُن لوگوں پر ناپاکی مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے[۲۰۳]۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ راستہ تیرے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے[۲۰۴]۔ (اِس کی وضاحت میں) اپنی آیتیں ہم نے اُن لوگوں

الانعام
۶

۲۰۲؎ یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق کہ ہدایت وہی پائیں گے جو ہدایت کے سچے طالب ہوں گے اور جو ہدایت سے گریز و فرار کے راستے تلاش کرنے میں زندگی بسر کر دیں گے، وہ لازماً گم راہ کر دیے جائیں گے۔

۲۰۳؎ مطلب یہ ہے کہ کفر و شرک کی نجاست کے جو ردے اِنھوں نے اپنے دل و دماغ میں جما رکھے ہیں، وہی اِن کے لیے قبول حق میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ چنانچہ اپنے مالوفات اور بدعات کو چھوڑنا اور اسلام کی سیدھی صاف راہ کو اختیار کرنا اِنھیں ایک کٹھن چڑھائی معلوم ہوتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اِنھیں توفیق ہدایت سے محروم کر دیا ہے۔ اُس کا قانون یہی ہے کہ اسلام کے لیے وہ اُنھی کا سینہ کھولتا ہے جو اِس طرح کی غلاظتوں سے اُسے پاک رکھتے اور حق کے سچے طالب بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اِس کے برخلاف جو تعصّبات کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں، اُن کا سینہ وہ اپنی ہدایت کے لیے تنگ کر دیتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہ

بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٧﴾

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ

کے لیے تفصیل سے بیان کردی ہیں جو یاددہانی حاصل کریں۔ اُن کے اعمال کے صلے میں اُن کے پروردگار کے ہاں اُن کے لیے سلامتی کا گھر ہے اور وہ اُن کا کارساز ہے۔[۲۰۵] ۱۲۲-۱۲۷

الانعام ٦

اُس دن کو یاد رکھو، جب وہ اِن سب (مجرموں) کو اکٹھا کرے گا،[۲۰۶] (پھر فرمائے گا): اے جنوں کے گروہ، تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا[۲۰۷] اور انسانوں

اُس کی سنت ہے اور وہ اپنی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔

۲۰۴۔ اصل الفاظ ہیں: 'هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا'۔ اسم اشارہ میں چونکہ فعل کے معنی ہوتے ہیں، اِس وجہ سے 'مُسْتَقِيْمًا' یہاں 'صِرَاطُ رَبِّكَ' سے حال واقع ہوگیا ہے۔

۲۰۵۔ اوپر فرمایا تھا: 'سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا'۔ یہ جملہ اُس کے بالکل بالمقابل آیا ہے۔ یعنی مجرم جس انجام کو پہنچیں گے، اُس کے بالمقابل اللہ کے فرماں بردار بندوں کا صلہ یہ ہے کہ اللہ اُن کا ساتھی ہوگا اور وہ ہمیشہ کے لیے سکھ اور چین کے گھر میں رہیں گے۔

۲۰۶۔ یعنی سب کو اکٹھا کرے گا، خواہ وہ انسانوں میں سے تھے یا جنوں کے اشرار و شیاطین میں سے جو انسانوں کو اپنی خرافات القا کرتے رہے، جیسا کہ اوپر آیت ۱۱۲ میں بیان ہوا ہے۔

۲۰۷۔ یہ ابلیس کے اُس قول کی طرف نہایت لطیف تلمیح ہے جس کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں ہوا ہے کہ آدم کی ذریت میں سے بہت تھوڑے میری تاخت سے محفوظ رہیں گے اور پروردگار، تو اِن میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یعنی اللہ تعالیٰ ابلیس کے اِن فرزندان معنوی کو خطاب کرکے فرمائے گا کہ تم نے تو اپنے

وَبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ

میں سے اُن کے ساتھی (فوراً) کہیں گے: پروردگار، ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے سے خوب حظ اٹھایا[208] اور (آج) اپنی اُس مدت کو پہنچ گئے ہیں جو تو نے ہمارے لیے مقرر کر دی تھی[209]... اللہ فرمائے گا: اب آگ تمھارا ٹھکانا ہے، تم اُس میں ہمیشہ رہو گے، مگر جو اللہ چاہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار حکیم و علیم ہے[210]۔ ہم ظالموں کو اُن کے

الانعام ۶

پیشوا ابلیس کا مشن بڑی کامیابی سے پورا کیا کہ ذریت آدم میں سے بہتوں کو اپنے فتراک ضلالت کا نخچیر بنا لیا اور بڑی سعادت مند نکلی یہ اولادِ آدم کہ سادہ لوحی کے ساتھ تمھارے دام فریب میں پھنس گئی۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۶۳)

۲۰۸ یعنی اُنھوں نے ہماری عبادت، نیاز مندی اور نذروں اور قربانیوں کے مزے لیے اور ہمارے ساحروں، کاہنوں اور سیانوں نے اپنے پیش نظر مقاصد کے لیے اُن کو طرح طرح سے استعمال کیا۔ چنانچہ جن و انس، دونوں ایک دوسرے سے حظ اٹھاتے رہے۔

۲۰۹ آگے کا جملہ بتا رہا ہے کہ شیاطین انس کی یہ بات بیچ ہی میں کاٹ دی جائے گی۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہاں بلاغت کلام کا ایک نکتہ قابل لحاظ ہے۔ شیاطین انس یہ بات بطور اعتراف جرم اور بقصد اظہار ندامت کہیں گے اور یہ تمہید باندھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرنا چاہیں گے، لیکن اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی بات تمہید پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دے گا اور اُن کو معذرت اور درخواست معافی کا موقع دیے بغیر ہی اپنا فیصلہ سنا دے گا کہ 'اَلنَّارُ مَثْوٰكُمْ، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا' بس اب تمھارا ٹھکانا یہی دوزخ ہے جس میں تمھیں ہمیشہ رہنا ہے، اب باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو، عذر، معافی، توبہ اور اصلاح، سب کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۶۳)

الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ

کرتوتوں کے باعث اِسی طرح ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، کیا تمھارے پاس خود تمھارے اندر سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو میری آیتیں تمھیں سناتے اور تمھارے اِس دن کی ملاقات سے تمھیں خبردار کرتے تھے؟[۲۱۱] وہ

۲۱۰؎ یہ استثنا قابل توجہ ہے۔مطلب یہ ہے کہ اِن مجرموں کے جہنم رسید ہو جانے کے بعد تمام معاملات صرف خدا کی مشیت پر منحصر ہوں گے اور اُس کی مشیت اُس کے علم و حکمت کے تحت ہے جس کا تقاضا ہوا تو وہ اُن کی سزا میں تخفیف بھی کر سکتا ہے اور اُنھیں خاک یا راکھ بنا کر ہمیشہ کے لیے اِسی جہنم کی مٹی میں دفن بھی کر سکتا ہے۔یہ سراسر اُس کی مشیت پر مبنی ہے۔اُس کے سوا کسی کے لیے امید کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رہے گا۔استاذ امام کے الفاظ میں کسی کی سعی، کسی کی سفارش، کسی کا زور، کسی کی فریاد کچھ کارگر نہ ہوگی، اختیار اور ارادے کی ساری حدیں ختم ہو جائیں گی، توبہ اور اصلاح اور حسرت و ندامت کی مہلتیں گزر جائیں گی، واحد چیز جو کارفرما ہوگی، وہ خدا کی مشیت ہے اور اپنی مشیت کے بھیدوں کو وہی جانتا ہے۔وہ 'فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ' اور حکیم و علیم ہے۔

۲۱۱؎ یہ سوال قطع عذر کے لیے ہوگا۔ضمناً یہ بات بھی اِس سے معلوم ہوئی کہ پیغمبر جس طرح انسانوں میں بھیجے گئے، اُسی طرح جنوں میں بھی اُن کے اندر سے بھیجے گئے۔اِس کے لیے اصل میں 'اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔یہ اِس باب میں بالکل صریح ہیں اور یہی بات اُس قاعدے کے مطابق بھی ہے جو نبیوں کی بعثت سے متعلق قرآن کے دوسرے مقامات میں بیان ہوا ہے کہ وہ جن کی طرف بھیجے جاتے ہیں، اُنھی کے اندر سے بھیجے جاتے ہیں۔

آیت میں لفظ 'يَقُصُّوْنَ' بھی قابل توجہ ہے۔اِس کے معروف معنی سرگذشتیں سنانے کے ہیں، لیکن یہاں یہ آیتیں سنانے کے لیے آیا ہے۔اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

يَوۡمِكُمۡ هٰذَا ؕ قَالُوۡا شَهِدۡنَا عَلٰٓى اَنۡفُسِنَا وَغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا وَشَهِدُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ اَنَّهُمۡ كَانُوۡا كٰفِرِيۡنَ ﴿۱۳۰﴾ ذٰلِكَ اَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ رَّبُّكَ مُهۡلِكَ الۡقُرٰى بِظُلۡمٍ وَّاَهۡلُهَا غٰفِلُوۡنَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ وَرَبُّكَ الۡغَنِىُّ ذُو الرَّحۡمَةِ ؕ اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ وَيَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡۢ بَعۡدِكُمۡ مَّا يَشَآءُ

کہیں گے: ہم خود اپنے خلاف گواہ ہیں۔ (اِن پر افسوس)، دنیا کی زندگی نے اِنھیں دھوکے میں ڈالے رکھا اور اب خود اپنے خلاف گواہی دے رہے ہیں کہ وہ منکر تھے۔ ہم نے یہ پیغمبر اِسی لیے بھیجے تھے کہ تمھارا پروردگار بستیوں کو اُن کے ظلم کی پاداش میں ہلاک کرنے والا نہیں ہے، جب کہ اُن کے باشندے (حقیقت سے) بے خبر ہوں۔ اِن میں سے ہر ایک کے درجے اب اُس کے عمل کے مطابق ہیں اور جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں، تمھارا پروردگار اُس سے ناواقف نہیں ہے۔ تمھارا پروردگار بے نیاز ہے، وہ رحمتوں والا ہے[۲۱۲]۔ اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور تمھارے بعد تمھاری جگہ جس کو

”...ہمارے نزدیک یہاں یہ لفظ اِس وجہ سے استعمال ہوا ہے کہ آیات سے یہاں مراد آیاتِ انذار ہیں جن کا غالب حصہ مکذبین و منکرین کے انجام اور اُن کی سرگذشتوں کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں موقع و محل اِسی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن سے جو سوال فرمائے گا، اُس کا مطلب یہی ہو گا کہ کیا تمھیں میرے رسولوں نے جھٹلانے والوں کے انجام اور اِس دن کی آمد سے خبردار نہیں کیا تھا کہ تم نے اپنے آپ کو اِس ابدی ہلاکت میں ڈالا؟“ (تدبر قرآن ۳/۱۶۶)

۲۱۲ آگے جو بات فرمائی ہے، یہ جملہ اُس کی تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ایک ہی وقت میں بے نیاز بھی ہے اور رحیم و کریم بھی۔ لوگوں کی ہدایت کا جو اہتمام اُس نے کیا ہے اور اپنے پیغمبر کے ذریعے سے ایمان و اسلام کی دعوت اُنھیں دی ہے تو اِس لیے نہیں دی کہ اِس کے بغیر اُس کا

كَمَآ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ ذُرِّيَّةِ قَوۡمٍ اٰخَرِيۡنَ ﴿۱۳۳﴾ اِنَّ مَا تُوۡعَدُوۡنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ ﴿۱۳۴﴾ قُلۡ يٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ

چاہے، لے آئے، جس طرح اُس نے دوسرے لوگوں کی نسل سے تمھیں اٹھایا ہے[۲۱۳]۔ (یاد رکھو)، جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، وہ آ کر رہے گی[۲۱۴] اور تم (خدا کو) عاجز نہیں کر

کوئی کام رکا ہوا ہے۔ کسی کے ماننے سے نہ اُس کا کچھ بنتا ہے اور نہ انکار کر دینے سے کچھ بگڑتا ہے۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز اور اپنی مخلوقات سے مستغنی ہے۔ اُس نے یہ اہتمام صرف اِس لیے کیا ہے کہ بے نیاز ہونے کے ساتھ وہ رحمت والا بھی ہے اور اُس کی اِس صفت کا تقاضا ہے کہ اتمام حجت کے بغیر کسی کو نہ پکڑے۔ چنانچہ وہ پوری مہلت دیتا، ہر لحاظ سے خبردار کرتا اور اُس کے بعد ہی لوگوں کی گرفت کا فیصلہ سناتا ہے۔

۲۱۳؎ مدعا یہ ہے کہ اپنی تاریخ سے سبق لو۔ خدا اگر تمھارے آبا کی نسل سے تمھیں پیدا کر سکتا ہے تو دوسروں کو تمھاری جگہ لے آنا بھی اُس کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ صرف اُس کی رحمت ہے جو تمھیں باقی رکھے ہوئے ہے۔ وہ پکڑ بھی سکتا ہے اور تمھیں فنا کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہے۔ اُسے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ تم نہ رہے تو اُس کی دنیا بے آباد ہو جائے گی۔ وہ اپنی دنیا کے لیے جو مخلوق چاہے گا اور جب چاہے گا، پیدا کر لے گا۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے آیت میں زبان کے ایک نکتے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... فرمایا کہ ’وَيَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡۢ بَعۡدِكُمۡ مَّا يَشَآءُ‘، حالاں کہ بظاہر ’من يشاء‘ ہونا تھا، اِس لیے کہ ’مَا‘ کا غالب استعمال بے جان چیزوں ہی کے لیے ہے۔ میرے نزدیک ’مَنۡ‘ کی جگہ ’مَا‘ کا استعمال اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل قدرت کے اظہار اور قریش کے غرور پر ضرب لگانے کے لیے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قوت و سطوت پر کیا اترا رہے ہو، خدا کی قدرت تو وہ

عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

سکتے۔ (اے پیغمبر)، کہہ دو کہ میری قوم کے لوگو، تم اپنے طریقے پر چلو، میں اپنے طریقے پر چل رہا ہوں۔[۲۱۵] سو عنقریب تم جان لو گے کہ اگلے گھر کا اچھا انجام کس کے لیے ہے۔[۲۱۶] حقیقت یہی ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔[۲۱۷] ۱۲۸-۱۳۵

ہے کہ وہ تمھارے اِس صحرا کی جس چیز کو چاہے، تمھاری جگہ لینے کے لیے اٹھا کھڑی کرے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی ایک جگہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم اِس بات پر گھمنڈ نہ کرو کہ تم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہو، میرا خداوند چاہے تو ریگستان کے ذروں سے ابراہیم کے لیے اولاد کھڑی کرے۔ بعینہٖ یہی زور قرآن کے اِس اسلوب میں مضمر ہے، بلکہ قرآن کا اسلوب اپنی تعمیم کے پہلو سے زیادہ زوردار ہے۔" (تدبر قرآن ۳/ ۱۶۸)

۲۱۴ یعنی وہ عذاب بھی جو رسول کے مکذبین پر اِسی دنیا میں آتا ہے اور وہ یوم الحساب بھی جس کے بوجھ سے آسمان پھٹا پڑ رہا ہے اور جس کے لیے کسی وقت بھی صور پھونکا جا سکتا ہے۔

۲۱۵ آیت میں ایک مقابل حذف ہو گیا ہے، یعنی 'اِنِّیْ عَامِلٌ عَلٰی مَكَانَتِیْ'۔ لفظ 'مَكَانَة' کے اصل معنی تو جگہ، منزلت اور مقام کے ہیں، لیکن طریقہ کا مفہوم چونکہ اِس کے لوازم میں سے ہے، اِس لیے موقع کلام کی رعایت سے اِس کے اندر آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ صاف صاف اعلان براءت اور نہایت واضح دھمکی ہے جو آگے کے جملوں سے بالکل نمایاں ہو جاتی ہے۔

۲۱۶ اصل میں لفظ 'عَاقِبَة' آیا ہے۔ اِس کے معروف معنی انجام کے ہیں، لیکن بعض اوقات یہ انجام خیر و فلاح کے معنی میں بھی آ جاتا ہے، اِس لیے کہ اصل انجام تو انجام فلاح و سعادت ہی ہوتا ہے۔

۲۱۷ یہ نہیں فرمایا کہ تم فلاح نہیں پاؤ گے یا ہم لازماً فلاح پائیں گے، بلکہ صرف یہ فرمایا ہے کہ

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ

(اِن کا ظلم اِس حد کو پہنچ چکا ہے کہ) اللہ کے لیے اِنھوں نے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور چوپایوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا ہے، بزعم خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے۔ پھر جو اِن کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے، وہ تو اللہ کو نہیں پہنچ سکتا اور جو اللہ کا ہے، وہ اِن کے شریکوں کو پہنچ سکتا ہے۔[۲۱۸] کیا ہی برے فیصلے ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اِسی طرح بہت سے مشرکوں

ظالم کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔ اِس اسلوب میں کیا بلاغت ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...یہ اسلوب بیان حکمت و دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت موثر ہے اور یہ اُس خشیت و توکل پر بھی دلیل ہے جو انبیا و صالحین کے اندر ہوتی ہے۔ جو چیز پردۂ غیب میں ہے، جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے، جس کی راہ میں ابھی معلوم نہیں کتنی دشوار گزار گھاٹیاں پار کرنی اور کتنی پرخطر وادیاں قطع کرنی ہیں، اُس کے باب میں جو بات کہی جا سکتی ہے، وہ اِسی حد تک کہی جا سکتی ہے۔ اِس سے آگے بڑھ کر کوئی دعویٰ کرنا بندگی اور خشیت الٰہی کے خلاف ہے۔''
>
> (تدبر قرآن ۳/ ۱۷۰)

۲۱۸۔ اِس کی صورت یہ تھی کہ بتوں کے نام کی بکری مر جائے یا چوری ہو جائے یا اُن کے نام کا غلہ چوہے کھا جائیں یا اور کوئی حادثہ ہو جائے تو اُس کی تلافی لازماً خدا کے حصے میں سے کر دی جائے گی، لیکن اگر اِس طرح کی کوئی آفت خدا کے نام پر نکالے ہوئے حصے پر آ جائے تو اُس کی

لِيُرۡدُوۡهُمۡ وَلِيَلۡبِسُوۡا عَلَيۡهِمۡ دِيۡنَهُمۡ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوۡهُ فَذَرۡهُمۡ وَمَا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۳۷﴾ وَقَالُوۡا هٰذِهٖۤ اَنۡعَامٌ وَّحَرۡثٌ حِجۡرٌ ٭ۖ لَّا يَطۡعَمُهَاۤ اِلَّا مَنۡ نَّشَآءُ بِزَعۡمِهِمۡ وَاَنۡعَامٌ حُرِّمَتۡ ظُهُوۡرُهَا وَاَنۡعَامٌ لَّا يَذۡكُرُوۡنَ اسۡمَ اللّٰهِ عَلَيۡهَا افۡتِرَآءً عَلَيۡهِ ؕ سَيَجۡزِيۡهِمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾

کے لیے اُن کی اولاد کے قتل کو اُن کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں نے خوش نما بنا دیا ہے[۲۱۹]، اِس لیے کہ اُن کو برباد کر ڈالیں اور اِس لیے کہ اُن کے دین کو اُن کے لیے مشتبہ بنا دیں[۲۲۰]۔ اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر پاتے[۲۲۱]۔ لہٰذا اُنھیں چھوڑو کہ اپنے اِسی افترا میں پڑے رہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ چوپایے اور یہ کھیتی ممنوع ہیں، اِنھیں صرف وہی کھا سکتے ہیں جنھیں ہم کھلانا چاہیں، اپنے گمان کے مطابق۔ اِسی طرح کچھ جانور ہیں جن کی پیٹھیں (اُن کے نزدیک) حرام کر دی گئی ہیں اور کچھ جانور ہیں جن پر محض اللہ پر جھوٹ باندھ کر اللہ کا نام نہیں لیتے۔

تلافی بتوں کے حصے میں سے نہیں ہوگی۔ گویا مرجح حق اُن کے نزدیک بتوں اور شریکوں ہی کا تھا اور کیوں نہ ہو، دنیا کے تمام مشرکین کی نقد ضروریات اُن کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ خدا سے اگر کچھ ملتا بھی ہے تو اُنھی کی وساطت سے ملتا ہے، بلکہ خدا نہ بھی دینا چاہے تو وہ دلوا کر چھوڑتے ہیں۔

۲۱۹ یہ سنگین جرم بعض مزعومہ جن بھوتوں کو راضی کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ عرب جاہلیت میں اُن کے استھان بنے ہوئے تھے اور اُن کے پروہت، کاہن اور مجاور لوگوں کو اُن کی ناراضی کا خوف دلا کر اِس طرح کے جرائم اُن سے کراتے رہتے تھے۔

۲۲۰ یعنی اُس دین کو مشتبہ بنا دیں جو اُنھیں ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی وراثت میں ملا تھا۔

۲۲۱ لیکن اللہ نے نہیں چاہا، اِس لیے کہ اِس طرح کا جبر اُس اسکیم ہی کو باطل کر دیتا جو

وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤی اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ یَّكُنْ مَّیْتَةً فَهُمْ فِیْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَی اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴿۱۴۰﴾

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ

الانعام ۶

اللہ عنقریب اُن کی اِن افترا پردازیوں کا بدلہ اُن کو دے گا جو وہ کرتے رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جو کچھ اِن جانوروں کے پیٹ میں ہے، وہ ہمارے مردوں کے لیے خاص ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے، لیکن اگر وہ مُردہ ہو تو دونوں اُس (کے کھانے) میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اللہ عنقریب اُن کی اِن باتوں کی سزا اُنھیں دے گا۔ بے شک، وہ حکیم و علیم ہے[۲۲۲]۔ یقیناً نامراد ہوئے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو محض بے وقوفی سے، بغیر کسی علم کے قتل کیا اور اللہ نے جو رزق اُنھیں عطا فرمایا تھا، اُسے اللہ پر جھوٹ باندھ کر حرام ٹھیرایا ہے[۲۲۳]۔ وہ یقیناً بھٹک گئے ہیں اور ہرگز راہ راست پر نہیں رہے۔ ۱۳۶-۱۴۰

(اِن کے ٹھیرائے ہوئے شریک نہیں، بلکہ) وہی اللہ ہے جس نے قسم قسم کے باغ

انسانوں کے امتحان کے لیے روبہ عمل ہے۔

۲۲۲ یعنی چونکہ حکیم و علیم ہے، اِس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ اُن لوگوں کو سزا نہ دے جو اُس کے نام پر اس طرح کے جھوٹ گھڑتے ہیں۔

۲۲۳ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اُن کے یہ خرافات اگرچہ مبنی تو تھے اُن کے مشرکانہ اوہام پر، لیکن اُنھیں منسوب بہر حال اللہ کی طرف کیا جاتا تھا۔

وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا

پیدا کیے ہیں، (اِن میں سے) کچھ ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں[۲۲۴] اور کچھ نہیں چڑھائے جاتے۔[۲۲۵] اِسی طرح کھجور پیدا کی اور کھیتیاں اگائی ہیں جن کے طرح طرح کے پھل ہیں اور زیتون اور انار جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور الگ الگ بھی[۲۲۶] — اِن کی پیداوار میں سے کھاؤ، جب یہ پھلیں[۲۲۷] اور اِن کا حق ادا کرو، جس دن یہ کاٹے

الانعام
۶

۲۲۴؎ یعنی انگور وغیرہ جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں۔

۲۲۵؎ یعنی خربوزے، تربوز اور ککڑیاں جن کی بیلیں زمین پر ہی پھیلتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ سورۂ عبس (۸۰) کی آیت ۲۸ میں یہی مضمون 'عِنَبًا وَّقَضْبًا' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

۲۲۶؎ یہاں چونکہ خدا کی توحید اور بندوں پر خدا کے حقوق کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، اِس لیے باغوں اور کھیتیوں کی گوناگونی و بوقلمونی اور اُن کی پیداوار کے تنوعات کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت، گوناگونی کے اندر ہم آہنگی، اختلاف کے اندر سازگاری، ہر گوشے میں نمایاں ہے۔ مٹی، پانی، ہوا ایک ہی، لیکن اشیا گوناگوں قسم کی، رنگ مختلف قسم کے، مزے، خوشبو، قد و قامت الگ الگ۔ پھر یہ سب انسان کے لیے نعمت و برکت، غذا اور لذت ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس خالق نے ہمارے جسم کے اندر گلوکوز اور فولاد کا تقاضا ودیعت کیا، اُسی نے انار اور انگور کے دانوں کے اندر رس بھرے۔ جس نے ہماری زبان کے اندر مختلف ذائقے ودیعت کیے، اُسی نے اِن اشیا کے اندر مختلف مزے پیدا کیے۔ جس نے ہماری نگاہوں کو حسن و جمال کا ذوق بخشا، اُسی نے ہر چیز کو حسن و رعنائی، دل کشی و دل ربائی کا پیکر بنا دیا۔ قرآن نے یہاں اشیا کے ظاہری تضاد و اختلاف کے اندر اِسی وحدت مقصد کی

طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہ چیز اِس کائنات کے خالق اور اِس کے مصرف کی توحید کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۸۳)

اِس کا لازمی نتیجہ ہے کہ بندہ اپنے پروردگار کا حق پہچانے اور اُس کا شکر گزار ہو کر زندگی بسر کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے، وہ بڑا ہی جواد و کریم، فیاض و مہربان، سخی اور بندہ نواز ہے۔ اُس نے بندوں میں رزق کی احتیاج رکھی تو یہ نہیں کیا کہ جیسا تیسا پیٹ بھرنے کا سامان پیدا کر دیا ہو، بلکہ الوان نعمت کے انبار لگا دیے۔ باغ اگائے تو گونا گوں قسم کے، کھجور اور غلے پیدا کیے تو بے شمار اقسام کے، زیتون، انار اور دوسرے پھل پھول عنایت کیے تو نت نئے انواع کے۔ آخر مجرد زندگی باقی رکھنے کے لیے تو یہ تنوعات، یہ بوقلمونیاں، شکلوں، رنگوں، ذائقوں اور مزوں کی یہ رنگ آرائیاں و رعنائیاں ناگزیر نہیں تھیں، لیکن اِس دنیا کے خالق نے بغیر اِس کے کہ اُس کی کوئی ضرورت ہم سے وابستہ ہو، ہمارے لیے اتنا وسیع دسترخوان بچھایا کہ ہم اُس کے لذائذ کے انواع و اقسام گننا چاہیں تو گن نہیں سکتے۔ سوچنے والوں کے لیے سوچنے کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اِس لیے ہے کہ انسان یہ جانے کہ اُس کا رب منعم و کریم اور فیاض و مہربان ہے، جس نے بلا کسی استحقاق کے اُس کے لیے یہ سارے سامان مہیا فرمائے ہیں اور پھر اِس کا فطری اثر اُس کے دل پر یہ طاری ہو کہ وہ اُس کا شکر گزار بندہ بنے اور اُس کا حق پہچانے۔ یہی شکر گزاری کا جذبہ اور حق شناسی کا احساس ہے جو تمام دین و شریعت کی... بنیاد ہے۔''

(تدبر قرآن ۳/ ۱۸۳)

۲۲۷ اصل الفاظ ہیں: 'كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ'۔ یہاں بھی اور اِس سے آگے 'يَوْمَ حَصَادِهٖ' میں بھی ضمیر واحد آئی ہے، لیکن اِس سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کا ذکر ہوا ہے۔ عربی زبان میں اِس طرح ضمیر یا فعل واحد آئے تو اِس سے مقصود ایک ایک چیز کا حکم فرداً فرداً بیان کرنا ہوتا ہے۔

الانعام ۶

تُسۡرِفُوۡا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ﴿۱۴۱﴾ وَمِنَ الۡاَنۡعَامِ حَمُوۡلَةً وَّفَرۡشًا ؕ كُلُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ ؕ

جائیں[۲۲۸] اور بے جانہ اڑاؤ[۲۲۹]۔ اللہ (اِس طرح) اڑا دینے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ سواری اور بار برداری کے چوپایے بھی اُسی نے پیدا کیے ہیں اور وہ بھی جو زمین سے لگے

۲۲۸۔ یعنی فصل کے درو کا وقت آئے تو اُس میں اللہ کا جو حق زکوٰۃ کی صورت میں قائم کیا گیا ہے، وہ ادا کرو۔ آیت سے واضح ہے کہ اِس سے کوئی پیداوار بھی مستثنیٰ نہیں ہے، الّا یہ کہ مسلمانوں کا نظم اجتماعی حالات کی رعایت سے کسی چیز کو مستثنیٰ قرار دے یا جن چیزوں پر زکوٰۃ وصول کرے، اُن کے لیے کوئی نصاب مقرر کر دے۔ یہ درحقیقت اُس نعمت الٰہی کا شکرانہ ہے جو کسان کو اُس کے پروردگار نے بخشی ہے۔ اِس زمانے میں پیداوار کی جو دوسری صورتیں وجود میں آ گئی ہیں، مثلاً صنعتی پیداوار، فیسیں، کرایہ اور معاوضۂ خدمات وغیرہ، اُن کو بھی اِس پر قیاس کرنا چاہیے اور زکوٰۃ کی وہی شرح اُن پر بھی عائد کرنی چاہیے جو زمین کی پیداوار کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

۲۲۹۔ اِس لیے کہ مال اللہ کی نعمت ہے اور اُس کے بارے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ آدمی اعتدال اور کفایت شعاری کے ساتھ اُسے اپنی جائز ضرورتوں پر خرچ کرے اور جو کچھ بچ جائے، اُسے حق داروں کی امانت سمجھے اور اِس امانت کو نہایت احتیاط کے ساتھ ادا کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...جو شخص مسرف اور فضول خرچ ہو، اُس کے اپنے ہی شوق پورے نہیں ہو پاتے، وہ دوسروں کے حقوق کیا ادا کرے گا۔ شیطان ارباب مال پر سب سے زیادہ حملہ اِسی راہ سے کرتا ہے۔ وہ اُن کو طرح طرح کی آرزوؤں اور خواہشوں میں پھنساتا ہے اور وہ اُن خواہشات و تعیّشات کے ایسے غلام ہو جاتے ہیں کہ اُن کے نزدیک اِن کا درجہ ضروریات سے بھی کچھ بڑھ کر ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بھلا کس طرح سوچ سکتے ہیں کہ جس مال میں اُن کے یہ اللّے تللّے ہیں، اُس میں خدا کے دوسرے بندوں کے بھی حقوق ہیں؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے کتے، باز، شکرے تو آسودہ رہتے ہیں، لیکن اُن کے پڑوسی بھوکے سوتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۱۸۵)

إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٤٢﴾

ثَمَٰنِيَةَ أَزْوَٰجٍ ۖ مِّنَ ٱلضَّأْنِ ٱثْنَيْنِ وَمِنَ ٱلْمَعْزِ ٱثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءَآلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ أَمِ ٱلْأُنثَيَيْنِ أَمَّا ٱشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ ٱلْأُنثَيَيْنِ ۖ نَبِّـُٔونِى بِعِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿١٤٣﴾ وَمِنَ ٱلْإِبِلِ ٱثْنَيْنِ وَمِنَ ٱلْبَقَرِ

ہوئے چلتے ہیں[230]۔ اللہ نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے، اُس سے فائدہ اٹھاؤ[231] اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو،[232] وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ ۱۴۱-۱۴۲

(تم اِن چوپایوں میں سے) آٹھ نر و مادہ کو لو، دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے، پھر اِن سے پوچھو[233] کہ اللہ نے اِن دونوں کے نر حرام کیے ہیں یا مادہ یا اُس بچے کو حرام ٹھیرایا ہے جو مادینوں کے پیٹ میں ہے[234]؟ مجھے کسی سند کے ساتھ بتاؤ، اگر تم سچے

۲۳۰؎ مثلاً، بھیڑیں اور بکریاں وغیرہ۔ باغات اور کھیتیوں کا ذکر کرتے ہوئے 'مَعْرُوْشٰتٍ وَّ غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اُس کے مقابل میں چوپایوں کے لیے یہاں 'حَمُوْلَة' اور 'فَرْش' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ نہایت حسین تقابل ہے۔ یعنی جس طرح باغوں میں ایسی بیلیں ہیں جو ٹٹیوں پر چڑھ جاتی ہیں، اور ایسی بھی جو زمین پر پھیلتی ہیں، اُسی طرح چوپایوں میں بڑے قد کے اونٹ، گھوڑے اور خچر بھی ہیں اور زمین سے لگ کر چرتے چگتے بھیڑ بکریوں کی قسم کے چھوٹے قد کے چوپایے بھی۔

۲۳۱؎ اصل میں لفظ 'کُلُوْا' آیا ہے۔ یہ یہاں اپنے محدود معنی میں نہیں، بلکہ برتنے اور فائدہ اٹھانے کے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

۲۳۲؎ یعنی اُس کی مشرکانہ وسوسہ اندازیوں سے متاثر ہو کر خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام نہ ٹھیراؤ۔

۲۳۳؎ 'ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ' میں فعل امر محذوف ہے اور مدعا یہ ہے کہ یہ آٹھ نر و مادہ ہیں، اِن

اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

ہو؟[۲۳۵] اِسی طرح دو اونٹ کی قسم سے اور دو گائے کی قسم سے، پھر پوچھو کہ اللہ نے اِن دونوں کے نر حرام کیے ہیں یا مادہ یا اُس بچے کو حرام ٹھیرایا ہے جو مادینوں کے پیٹ میں ہے؟ کیا تم اُس وقت حاضر تھے، جب اللہ نے تمھیں اِس کی ہدایت فرمائی تھی؟[۲۳۶] پھر اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے، اِس لیے کہ بغیر کسی علم کے لوگوں کو گم راہ کرے؟ اللہ ایسے ظالم لوگوں کو کبھی راستہ نہیں دکھائے گا۔[۲۳۷] ۱۴۳-۱۴۴

میں سے ایک ایک کو فرداً فرداً لے کر اِن سے پوچھو۔

۲۳۴؎ مطلب یہ ہے کہ جب یہ بھی مانتے ہیں کہ اصلاً یہ جانور حلال ہیں تو پھر وہ حرمتیں کہاں سے پیدا ہو جاتی ہیں جو اِن احمقوں نے اپنے مشرکانہ توہمات سے پیدا کر رکھی ہیں کہ کسی کا کھانا جائز نہیں ہے، کسی پر سواری حرام ہے، کسی کو صرف مرد کھا سکتے ہیں، عورتیں نہیں کھا سکتیں اور کسی کو فلاں اور فلاں صورت میں دونوں کھا سکتے ہیں؟

۲۳۵؎ یعنی اِس کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ تمھارے آبا اِن چیزوں کو حرام سمجھتے رہے ہیں، بلکہ کوئی واضح علمی دلیل ہونی چاہیے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ حرمتیں عقل و فطرت کا تقاضا ہیں یا خدا کے کسی پیغمبر نے تمھیں اِس کی ہدایت فرمائی تھی۔

۲۳۶؎ یہ اتمام حجت کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عقل و نقل میں تو کوئی چیز تمھارے دعووں کے حق میں نہیں ہے، پھر کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اُس وقت موجود تھے، جب اللہ نے اُن حرمتوں کا حکم دیا تھا جو تم نے اپنے مزعومات کے تحت قائم کر رکھی ہیں؟

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ

اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر کہ) جو وحی میرے پاس آئی ہے، اُس میں تو میں نہیں دیکھتا کہ کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام کی گئی ہے، جسے وہ کھاتا ہے[۲۳۸]، سوائے اِس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون ہو یا سؤر کا گوشت ہو، اِس لیے کہ یہ ناپاک ہیں[۲۳۹]، یا خدا کی نافرمانی کر کے کسی جانور کو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو[۲۴۰]۔ اِس پر

۲۳۷۔ یعنی نہ اِس پہلو سے راستہ دکھائے گا کہ اپنی ہدایت سے بہرہ یاب کرے اور نہ اِس پہلو سے کہ لوگوں کو گم راہ کر دینے کی جو مہم یہ چلا رہے ہیں، اُسے کامیابی سے ہم کنار کر دے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو یہ نہایت لطیف انداز میں دعوت حق کی کامیابی کی بشارت بھی ہے۔

۲۳۸۔ یعنی جو اصلاً من جملہ طیبات ہے اور کھانے والے اُسے کھانے کی چیز سمجھ کر ہمیشہ کھاتے رہے ہیں۔ اِس سے وہ چیزیں آپ سے آپ نکل گئیں جو ممنوعات فطرت ہیں اور انسان ہمیشہ سے جانتا ہے کہ وہ کوئی کھانے کی چیز نہیں ہیں، مثلاً شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ اور بچھو وغیرہ۔ یہی معاملہ بعض دوسرے خبائث کا بھی ہے۔

۲۳۹۔ اصل الفاظ ہیں: 'فَاِنَّهٗ رِجْسٌ'۔ اِن میں ضمیر اگرچہ واحد ہے، لیکن اِس کا تعلق تینوں ہی چیزوں سے ہے۔ یہ واحد اِس لیے آئی ہے کہ ایک ایک چیز کی طرف فرداً فرداً لوٹانا پیش نظر ہے۔

۲۴۰۔ لوگ جن چیزوں کو کھانے کی چیزیں سمجھ سکتے تھے، اُن میں سے یہی چار چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھیرائی ہیں۔ خون کو اِس لیے کہ درندگی کی طرف مائل کرتا ہے، مردار کو اِس لیے کہ طبعی موت مرنے سے خون رگوں ہی میں رہ جاتا ہے، سؤر کو اِس لیے کہ اگرچہ انعام کی قسم کے بہائم میں سے ہے، مگر درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے اور ذبیحہ لغیر اللہ کو اِس لیے کہ یہ صریح شرک

رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤٥﴾

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا

بھی جو مجبور ہو جائے ، نہ چاہنے والا ہو، نہ حد سے بڑھنے والا[241] تو تیرا پروردگار بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔۱۴۵

(یہ، البتہ ٹھیک ہے کہ) جن لوگوں نے یہودیت اختیار کر رکھی ہے، اُن پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے[242] اور گاے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی، سوائے اُس کے جو اُن کی پیٹھ یا انتڑیوں سے لگی ہو یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی رہ جائے[243]۔

ہے جس کا ارتکاب وہی کر سکتے ہیں جو خدا سے سرکش ہو گئے ہوں۔ چنانچہ جانور پاک بھی ہو تو علم وعقیدہ کی یہ نجاست اُسے ناپاک کر دیتی ہے۔ آیت میں 'فِسْقًا' کا لفظ اِسی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

۲۴۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ'۔ اِن میں 'بَاغٍ'، 'بغی یبغی' سے اسم فاعل ہے۔ اِس پر 'عَادٍ' کے عطف سے واضح ہے کہ اِس کے معنی یہاں چاہنے اور طلب کرنے ہی کے ہیں۔ یہ اُس حالت اضطرار کے لیے رخصت ہے جو کھانے کی کوئی چیز میسر نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔

۲۴۲؎ یعنی وہ جانور جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ سم کی صورت میں بند ہیں اور اُن کے سامنے کے حصے پر ناخن ہیں۔ چنانچہ تورات میں اونٹ، سافان اور خرگوش کی حرمت کا ذکر اِسی بنا پر ہوا ہے۔

۲۴۳؎ اِس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: احبار ۳: ۱۵-۱۷ اور احبار ۷: ۲۲-۲۵۔

الانعام ٦

لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

یہ ہم نے اُن کی سرکشی کی سزا اُنھیں دی تھی[۲۴۴] اور ہم بالکل سچے ہیں۔[۲۴۵] اِس کے بعد بھی اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمھارے پروردگار کی رحمت میں بڑی وسعت ہے، لیکن (اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اُس کی دی ہوئی مہلت ختم ہو گئی تو) مجرم لوگوں سے اُس کا عذاب ٹالا نہ جاسکے گا۔[۲۴۶] ۱۴۶-۱۴۷

الانعام ۶

۲۴۴؎ مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں نہ خبائث ہیں اور نہ اصلاً کبھی حرام رہی ہیں۔ یہود کی سرکشی اور گردن کشی تھی جس کی سزا کے طور پر یہ اُن پر حرام کی گئی تھیں۔ بائیبل کے صحیفوں میں اِس سرکشی کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے۔ سورۂ بقرہ میں گاے کا قصہ بھی اِسی کی مثال ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے جب اِن کا حکم اُنھیں دیا تھا تو اُسی وقت وعدہ کیا تھا کہ نبی امی کی بعثت ہو گی اور وہ اُن پر ایمان لائیں گے تو یہ اصر و اغلال بھی اُن کے اوپر سے اتار دیے جائیں گے۔ چنانچہ ٹھیک اُس وعدے کے مطابق اب دین کو اصل ملت ابراہیمی پر بحال کر دیا گیا ہے اور صرف وہی حرمتیں باقی رہ گئی ہیں جو دین حق میں ہمیشہ سے رہی ہیں۔

۲۴۵؎ یہ الفاظ نہایت بلیغ ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے ہونے پر جو اتنا زور دیا ہے تو مقصود صرف اپنے سچے ہونے کا اظہار نہیں ہے، بلکہ اِس میں حریف کے جھوٹے ہونے کا اعلان بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ملت ابراہیم اور شریعت بنی اسرائیل سے متعلق یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، ہم اُس میں بالکل سچے ہیں اور جو ژاژ خائی یہ قریش اور یہود کے مفسدین و اشرار کر رہے ہیں، یہ بالکل جھوٹے ہیں۔" (تدبر قرآن ۳/ ۱۹۳)

۲۴۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ'۔ 'رَبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ

الانعام ٦

(اِس کے جواب میں) یہ مشرک اب کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے، نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔[۲۴۷] اُن لوگوں نے بھی اِسی طرح جھٹلایا تھا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں، یہاں تک کہ اُنھوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا۔ اِن سے پوچھو، تمھارے پاس کوئی علم ہے کہ ہمارے سامنے اُسے پیش کر سکو؟ (حقیقت یہ ہے کہ) تم محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔ اِن سے کہو کہ اللہ کے پاس تو (تمھارے لیے) صرف حجت ہے، پہنچ جانے والی۔[۲۴۸] پھر (یہ بھی سوچو کہ) وہ اگر چاہتا تو تم سب کو ہدایت پر لے آتا، (کبھی شرک اور گم راہی

وّاسِعَةٍ' کے بعد یہ جملہ جس طریقے سے آیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ اِس کا عطف استدراک کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۲۴۷۔ یہ آخری بات ہے جو مشرکین بحث میں ہر طرف سے پسپا ہو جانے کے بعد کہتے تھے کہ اگر ہم غلطی کر رہے ہیں تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، وہ ہمیں اِس غلطی سے روک کیوں نہیں دیتا؟ جب اُس نے نہیں روکا تو اِس کے معنی یہی ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، خدا کی مرضی سے اور اُس کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں۔

۲۴۸۔ یعنی خدا کی اُس اسکیم میں جو دنیا میں تمھارے امتحان کے لیے جاری کی گئی ہے، خدا کے

يَشۡهَدُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنۡ شَهِدُوۡا فَلَا تَشۡهَدۡ مَعَهُمۡ ۚ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ وَهُمۡ بِرَبِّهِمۡ يَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾

قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔا

میں نہ ڈالتا[۲۴۹])۔ اِن سے کہو کہ لاؤ اپنے وہ گواہ جو (علم وعقل کی بنیاد پر) شہادت دیں کہ اللہ نے یہ چیز حرام ٹھیرائی ہے۔ پھر اگر وہ (ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹی) شہادت کے لیے کھڑے ہو جائیں تو تم اُن کے ساتھ یہ شہادت نہ دینا اور اُن لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا[۲۵۰] جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا ہے، جو آخرت کو نہیں مانتے اور اپنے پروردگار کے ہم سر ٹھیراتے ہیں۔ ۱۴۸-۱۵۰

اِن سے کہو کہ آؤ، میں تمھیں سناؤں کہ تمھارے پروردگار نے تم پر کیا حرام

پاس اب تمھارے لیے جبر نہیں، بلکہ صرف ایسی حجت ہے جو دل و دماغ میں اتر جانے والی ہے۔ اِس معاملے میں وہ تمھارے ارادہ واختیار میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ اُس نے تمھیں آزادی دے رکھی ہے۔ وہ صرف دلیل و حجت کے ذریعے سے رہنمائی فرماتا ہے۔

۲۴۹ یہ بر سبیل تنزل فرمایا ہے کہ اگر خدا کو کچھ چاہنا تھا تو وہ لوگوں کی ہدایت چاہتا یا اُنھیں اپنے شریک ٹھیرانے کے لیے مجبور کرتا یا اِس بات کے لیے مجبور کرتا کہ میرے پیدا کیے ہوئے طیبات کو حرام ٹھیراؤ؟ مطلب یہ ہے کہ احمقو، یہ تم کیسی باتیں کرتے ہو؟

۲۵۰ یعنی اُن خواہشوں کی پیروی نہ کرنا جو اُنھیں شرک و بدعت کی اِس ضلالت میں مبتلا کر دینے کا باعث ہوئی ہیں۔ یہاں مشرکین کی بدعتوں کو خواہشوں کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ جس چیز کے حق میں علم وعقل کی کوئی دلیل نہ ہو، اُس کی دلیل صرف خواہش ہی ہو سکتی ہے۔

وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ۚ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَ اِیَّاہُمۡ ۚ وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَہَرَ مِنۡہَا وَمَا بَطَنَ ۚ

ٹھیرایا ہے۔[251] یہ کہ کسی چیز کو اُس کا شریک نہ ٹھیراؤ[252] اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، (اُن کے ساتھ کبھی کوئی برا رویہ اختیار نہ کرو[253]) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم تمھیں بھی روزی دیتے ہیں اور اُن کو بھی دیں گے۔[254] اور فواحش کے

الانعام ۶

۲۵۱ مطلب یہ ہے کہ تمھارے پروردگار کی حرام کی ہوئی چیزیں وہ نہیں ہیں جو تم اپنے توہمات کی بنیاد پر حرام قرار دے رہے ہو، بلکہ اصل حرمتیں یہ ہیں جو اللہ نے اپنی شریعت میں قائم کی ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے جس دین پر تمھیں چھوڑا تھا، اُس میں بھی یہ سب چیزیں حرام تھیں۔ تمام شرائع الٰہیہ میں یہ ہمیشہ اِسی طرح حرام مانی گئی ہیں۔

۲۵۲ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو الٰہ مانا جائے تو قرآن اپنی اصطلاح میں اُسے شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو خدا کی ذات سے یا خدا کو اُس کی ذات سے سمجھا جائے یا خلق میں یا مخلوقات کی تدبیر امور میں کسی کا کوئی حصہ مانا جائے اور اِس طرح کسی نہ کسی درجے میں اُسے اللہ کا ہم سر بنا دیا جائے۔

پہلی صورت کی مثال سیدنا مسیح، سیدہ مریم اور فرشتوں کے بارے میں عیسائیوں اور مشرکین عرب کے عقائد ہیں۔ صوفیوں کا عقیدۂ وحدت الوجود بھی اِسی کے قبیل سے ہے۔

دوسری صورت کی مثال ہندوؤں میں برہما، وشنو، شیو اور مسلمانوں میں غوث، قطب، ابدال، داتا اور غریب نواز جیسی ہستیوں کا عقیدہ ہے۔ ارواح خبیثہ، نجوم وکواکب اور شیاطین کے تصرفات پر ایمان کو بھی اِسی کے ذیل میں سمجھنا چاہیے۔

۲۵۳ خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔ چنانچہ دوسرا حکم یہی بیان ہوا ہے۔ یہ اگرچہ 'مَا حَرَّمَ رَبُّکُمۡ' ہی کے تحت ہے، لیکن قرآن نے اِس کے لیے منفی کے بجائے مثبت اسلوب

اختیار کیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...زیر بحث آیات میں اسلوب کی یہ ندرت قابل لحاظ ہے کہ بعض باتیں منفی پہلو سے بیان ہوئی ہیں، بعض مثبت پہلو سے۔ مثلاً شرک، قتل اولاد، فحشا، قتل نفس اور اکل مال یتیم کا ذکر تو منفی پہلو سے ہے اور والدین کے ساتھ احسان، ایفاے کیل ومیزان، قول وعمل میں اہتمام عدل اور ایفاے عہد الٰہی کا ذکر مثبت اسلوب سے ہے۔ بعینہٖ یہی اسلوب، بعینہٖ اِنھی امور کے بیان میں بنی اسرائیل کی آیات ۲۲-۳۸ میں ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی کا استنباط ایک بدیہی چیز ہے۔ جب ایک شے کا اثباتی انداز میں حکم ہے تو اِس کے لازمی معنی یہ ہیں کہ جو چیز اُس کی ضد ہے، اُس کی لازماً ممانعت ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ایک چیز کی ممانعت ہے تو اِس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اُس کا مقابل پہلو مطلوب ہے۔ یعنی اگر شرک کی نہی ہے تو توحید مطلوب ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر والدین کے حقوق کی ادائیگی کا حکم ہے تو اُن کے ساتھ بدسلوکی اور اُن کی نافرمانی حرام ہے۔ اِس اسلوب کی روشنی میں وہ تمام باتیں جو بیان تو ہوئی ہیں اثبات کے الفاظ میں، لیکن ہیں ظاہری تالیف کلام کے اعتبار سے 'حَرَّمَ' ہی کے تحت، اُن سب کے ضد پہلو کو بھی مد نظر رکھیے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ 'نہ والدین کو اف کہو، نہ جھڑکو، بلکہ اُن کے ساتھ اچھا سلوک کرو'۔ اِس اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ اِس میں جو پہلو زیادہ زور و قوت سے ظاہر کرنے کا ہے، وہ تو الفاظ میں بیان ہو جاتا ہے اور اُس کا ضد پہلو بغیر الفاظ کی مدد کے مجرد فحواے کلام اور اقتضاے نظام سے سمجھ میں آجاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۹۸)

۲۵۴ یہ عرب جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ در گور کر دینے کی اُس سنگ دلانہ رسم کی طرف اشارہ ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ عورت چونکہ کوئی کماؤ فرد نہیں ہے، اِس لیے اُس کی پرورش کا بوجھ کیوں اٹھایا جائے۔ فرمایا ہے کہ اُنھیں قتل نہ کرو۔ تم اُن کے رازق نہیں ہو۔ اُن کا رزق تو درکنار، تم اپنا رزق بھی خدا ہی سے پاتے ہو۔ تمھاری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ پوری محنت کے ساتھ رزق کے اسباب پیدا کرو۔ اِس کے بعد یہ خدا کا کام ہے کہ وہ اِن اسباب سے تمھارے لیے کیا ثمرات و نتائج پیدا کرتا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ

قریب نہ جاؤ، خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے۔[۲۵۵] اور کسی جان کو، جسے اللہ نے حرام ٹھیرایا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔[۲۵۶] یہ باتیں ہیں جن کی اللہ نے تمھیں ہدایت کی ہے تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔[۲۵۷] اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر ایسے طریقے سے جو (اُس کے لیے)

الانعام ۶

۲۵۵ یعنی بدکاری علانیہ کی جائے یا چھپ کر، ہر حال میں حرام ہے۔ اِس کے لیے جمع کا لفظ اِس لیے استعمال فرمایا ہے کہ یہ زنا، لواطت، وطی بہائم اور اِس نوعیت کے تمام جرائم کو شامل ہو جائے۔ پھر روکنے کے لیے 'لَا تَقْرَبُوْا' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ ایسی تمام باتوں سے دور رہو جو بدکاری کی محرک، اُس کی ترغیب دینے والی اور اُس کے قریب لے جانے والی ہوں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...'لَا تَقْرَبُوْا' کا لفظ اُن برائیوں سے روکنے کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے جن کا پرچھاواں بھی انسان کے لیے مہلک ہے، جو خود ہی نہیں، بلکہ جن کے دواعی و محرکات بھی نہایت خطرناک ہیں، جو بہت دور سے انسانوں پر اپنی کمند پھینکتی ہیں اور پھر اِس طرح اُس کو گرفتار کر لیتی ہیں کہ اُن سے چھوٹنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی برائیوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے میں آدمی کو کامیابی صرف اُسی صورت میں حاصل ہوتی ہے، جب وہ اپنی نگاہ، اپنی زبان، اپنے دل کی پوری پوری حفاظت کرے اور ہر اُس رخنے کو پوری ہوشیاری سے بند رکھے جس سے کوئی ترغیب اُس کے اندر راہ پا سکتی ہو اور ہر ایسے مقام سے پرے پرے رہے، جہاں کوئی لغزش ہو سکتی ہے۔" (تدبر قرآن ۳/۲۰۱)

۲۵۶ انسانی جان کو جو حرمت ہر مذہب اور ہر اخلاقی نظام میں ہمیشہ حاصل رہی ہے، یہ اُس کا بیان ہے۔ سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۳۲ میں صراحت ہے کہ کسی انسان کی جان دو ہی صورتوں میں لی جا

اَحۡسَنُ حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّہٗ ۚ وَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَالۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ ۚ لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ۚ وَاِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا وَلَوۡ کَانَ

بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ سن رشد کو پہنچ جائے۔[258] اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری رکھو۔[259] ہم کسی جان پر اُس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔[260] اور جب بات

سکتی ہے: ایک یہ کہ وہ کسی کو قتل کردے، دوسرے یہ کہ نظم اجتماعی سے سرکشی کرکے وہ دوسروں کی جان و مال اور آبرو کے درپے ہو جائے۔ قرآن میں اِسے فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اِس کے سوا ہر قتل ایک ناحق قتل ہے جو قرآن کی رو سے شرک کے بعد دوسرا بڑا گناہ ہے۔

۲۵۷ مطلب یہ ہے کہ سمجھ سے کام لو اور اپنی طرف سے حلت و حرمت کے فیصلے کرنے کے بجائے اصل ملت ابراہیمی کی طرف رجوع کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ احکام دیے تھے۔

۲۵۸ اِس حکم کے الفاظ وہی ہیں جو اوپر فواحش سے روکنے کے لیے آئے ہیں۔ یعنی یتیم کی بہتری اور بہبود کے ارادے کے سوا اُس کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یاد رکھو کہ یتیم کے مال میں صرف وہی تصرف جائز ہے جو اُس کی حفاظت اور نشوونما کی غرض سے کیا جائے اور اُسی وقت تک کیا جائے، جب تک یتیم سن رشد کو پہنچ کر اپنے مال کی ذمہ داری خود سنبھالنے کے قابل نہیں ہو جاتا۔

۲۵۹ یہ ایک عظیم حکم ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے اُسی میزان انصاف کی فرع ہے جس پر یہ دنیا قائم ہے۔ چنانچہ اِس سے انحراف اگر کوئی شخص کرتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ عدل و قسط کے تصور میں اختلال واقع ہو چکا اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کا عقیدہ باقی نہیں رہا۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ معیشت اور معاشرت کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور تمدن کی کوئی اینٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہتی۔ سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۳۵ میں اِس کی برکات کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ نتیجے اور مآل کار کے لحاظ سے یہی بہتر ہے اور لوگوں کے لیے اِس میں بڑی برکتیں

ذَا قُرۡبٰی ۚ وَبِعَهۡدِ اللّٰهِ اَوۡفُوۡا ؕ ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِهٖ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۱۵۲﴾

کہو تو حق کی بات کہو، اگرچہ معاملہ اپنے کسی رشتہ دار ہی کا ہو۔[۲۶۱] اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔[۲۶۲] یہ چیزیں ہیں جن کی اللہ نے تمھیں ہدایت کی ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل

ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...آخرت میں اِس کی برکات تو واضح ہیں ہی، دنیا میں بھی باعتبار مآل...یہی رویہ معاش و معیشت، کاروبار اور تجارت اور عادلانہ تمدن کے فروغ کے نقطۂ نظر سے بابرکت ہے۔ کوئی ڈنڈی مارنے والی قوم دنیا میں نہ فروغ پائی ہے، نہ پائے گی۔ یہ برائی کوئی منفرد برائی نہیں ہے، بلکہ یہ بہت سی برائیوں کے پائے جانے کی ایک علامت ہے۔ جس قوم کے اندر یہ برائی پائی جاتی ہے، خبر دیتی ہے کہ یہ قوم عدل و قسط کے تصور سے خالی ہے۔ اِس وجہ سے یہ کسی صالح تمدن کے قیام کی صلاحیتوں سے نہ صرف محروم ہے، بلکہ یہ خدا کی زمین میں فساد کے بیج بونے والی ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۰۲)

۲۶۰؎ یہ ایک برسر موقع تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام بھی دیے ہیں، وہ لوگوں کی برداشت اور استطاعت سے زیادہ نہیں ہیں۔ اُس نے یہ احکام انسان کی صلاحیتوں اور اُس کی فطرت کو تول کر دیے ہیں۔ لہٰذا اِن کو نہ اپنی استطاعت کے حدود خود طے کر کے کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور نہ احتیاط کے نام پر خود اُن کے حدود سے آگے بڑھانا چاہیے۔

۲۶۱؎ یہ وہی بات ہے جسے سورۂ نساء (۴) کی آیت ۱۳۵ اور سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۸ میں قیام بالقسط سے تعبیر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن کو نہ صرف یہ کہ حق و انصاف پر قائم رہنا چاہیے، بلکہ یہ اگر گواہی کا مطالبہ کریں تو اِن کا یہ مطالبہ لازماً پورا کرنا چاہیے۔ رشتے، ناتے، جذبات اور خواہشات، کسی چیز کو بھی اِس میں رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیے۔

۲۶۲؎ یہ ایک جامع بات ہے۔ عہد اللہ سے کیا جائے یا بندوں سے یا فطری طور پر بندھ جائے، وہ اللہ ہی کا عہد ہے، اِس لیے کہ بندے عند اللہ اُس کے لیے مسئول ٹھیرائے گئے

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ

کرو[۲۶۳]۔ اور فرمایا ہے کہ یہی میرا راستہ ہے، سیدھا[۲۶۴]۔ سو اِسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھارے پروردگار کی راہ سے تمھیں الگ کر دیں۔ یہ باتیں ہیں جن کی اُس نے تمھیں ہدایت کی ہے تاکہ اُس کی گرفت سے بچے رہو۔ ۱۵۱-۱۵۳

(یہ ابراہیم کا دین ہے، اِس کے بعد) پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی، اُس پر

ہیں۔

۲۶۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ'۔ اوپر اِسی سیاق میں 'تَعْقِلُوْنَ' اور آگے 'تَتَّقُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...'تَعَقُّل'، 'تَذَكُّر' اور 'تَقْوٰی' میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے۔ انسان جب اندھی تقلید کی بیڑیوں سے آزاد ہو کر سنجیدگی سے ایک بات پر غور کرنے کا عزم کرتا ہے تو یہ 'تَعَقُّل' ہے۔ اِس 'تَعَقُّل' سے وہ حقائق آشکارا ہوتے ہیں جو فطرت انسانی کے اندر ودیعت ہیں، لیکن انسان کی غفلت کی وجہ سے اُن پر ذہول کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے، اِن حقائق کا آشکارا ہونا 'تَذَكُّر' ہے۔ یہ 'تَذَكُّر' انسان کی رہنمائی 'تَقْوٰی' کی منزل کی طرف کرتا ہے جو خلاصہ ہے تمام تعلیم و تزکیہ اور تمام قانون شریعت کا... اِس وجہ سے جہاں تک دین کے مبادی اور اصول کا تعلق ہے، وہ خارج سے نہیں آتے، بلکہ انسان کی فطرت ہی سے برآمد ہوتے ہیں، بشرطیکہ انسان خدا کی 'تَذْكِیْر' سے بیدار ہو کر 'تَذَكُّر' کرے۔ شریعت درحقیقت ہمارے ہی معدن فطرت کا برآمد شدہ خزانہ ہے جو ہماری گود میں ڈال دیا جاتا ہے، بشرطیکہ ہم اُس کی قدر کریں۔"
>
> (تدبر قرآن ۳/ ۲۰۴)

وَتَفۡصِيۡلًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً لَّعَلَّهُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّهِمۡ يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوۡهُ وَاتَّقُوۡا لَعَلَّكُمۡ

اپنی نعمت پوری کرنے کے لیے جس نے خوبی اختیار کی تھی،[۲۶۵] (دین و شریعت سے متعلق) ہر چیز کی تفصیل اور ہدایت و رحمت بنا کر، اِس لیے کہ لوگ اپنے پروردگار کی ملاقات پر ایمان لائیں۔[۲۶۶] ۱۵۴

اور اب یہ کتاب ہے، جو ہم نے اتاری ہے، خیر و برکت والی کتاب۔[۲۶۷] سو اِس کی

۲۶۴؎ اصل میں لفظ 'مُسْتَقِيْمًا' آیا ہے۔ اِس کا نصب حال کے لیے ہے جس میں اسم اشارہ فعل کا عمل کر رہا ہے۔

۲۶۵؎ یہ الفاظ موسیٰ علیہ السلام کی صفت کے طور پر بالکل اُسی طرح آئے ہیں، جس طرح سورۂ نجم (۵۳) کی آیت ۳۷ میں حضرت ابراہیم کے لیے 'الَّذِيْ وَفّٰى' کے الفاظ ہیں۔ اِن سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ اُن پر اگر اتمام نعمت ہوا ہے تو وہ اِس کے مستحق تھے۔ اللہ تعالیٰ جب منصب نبوت کے لیے کسی کا انتخاب فرماتا ہے تو ایسے ہی جلیل القدر انسانوں کا انتخاب فرماتا ہے جو ظاہر و باطن میں اُس کی عنایتوں کا حق پہچانتے اور اُسے خوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

۲۶۶؎ یعنی اپنے مقصد کے لحاظ سے ہدایت اور ثمرات و نتائج کے لحاظ سے رحمت بنا کر عطا فرمائی تاکہ دنیا میں لوگ اُس کے ذریعے سے خدا کی ملاقات پر ایمان کی ہدایت پائیں اور قیامت کے دن خدا کی رحمت و عنایت کے سزاوار ہوں۔

۲۶۷؎ تورات کے بعد اب یہ قرآن کا حوالہ دیا ہے اور اُس کی صفت کے طور پر اصل میں لفظ 'مُبٰرَكٌ' استعمال فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

تَرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

پیروی کرو اور (خدا سے) ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ اِس لیے اتاری ہے کہ مبادا[۲۶۸] تم کہو کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں پر اتاری گئی تھی اور ہم اُن کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر تھے۔ یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم اُن سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ سو تمھارے پروردگار کی طرف سے یہ ایک واضح حجت[۲۶۹] اور ہدایت و رحمت تمھارے پاس آگئی ہے، اب اُن سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو

"لفظ 'مُبٰرَك' اُس بارش کے لیے قرآن میں بار بار استعمال ہوا ہے جو زمین کی سیرابی، روئیدگی اور سرسبزی کا ذریعہ بنتی، اُس کے خزانوں اور اُس کی برکتوں کو ابھارتی اور اُس کے مردہ اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد اُس کو ازسرِنو حیات تازہ بخشتی ہے۔ قرآن کے لیے اِس لفظ کے استعمال میں یہ استعارہ ہے کہ یہ بھی دنیا کو اُس کی روحانی موت کے بعد ازسرِنو حیات تازہ بخشنے اور شریعت و ہدایت کے خزاں رسیدہ چمن کو پھر سے بہار کی رونقوں سے معمور کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔" (تدبر قرآن ۳/ ۲۰۶)

۲۶۸؎ اصل میں 'اَنْ تَقُوْلُوْا' کے الفاظ ہیں۔ اِن سے پہلے ایک مضاف عربیت کے قاعدے سے حذف ہو گیا ہے، یعنی 'كَرَاهَةَ اَنْ تَقُوْلُوْا'۔

۲۶۹؎ قرآن کے لیے یہ لفظ دو پہلوؤں سے استعمال ہوا ہے: ایک اِس پہلو سے کہ قرآن آپ اپنی صداقت کی دلیل اور اِس لحاظ سے بجائے خود حجت و برہان ہے۔ اُس کا کتاب الٰہی ہونا

وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِی الَّذِیْنَ یَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰیٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا یَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ یَاْتِیَ رَبُّكَ اَوْ یَاْتِیَ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ ؕ یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِیْۤ اِیْمَانِهَا خَیْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

الانعام
۶

اللہ کی آیتوں کو جھٹلا دیں اور اُن سے منہ موڑیں؟ جو لوگ ہماری آیتوں سے منہ موڑ رہے ہیں، اُنھیں اِس روگردانی کی پاداش میں ہم عنقریب نہایت بری سزا دیں گے۔ کیا وہ اِسی کے منتظر ہیں کہ اُن کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا پروردگار آجائے یا تیرے پروردگار کی نشانیوں میں سے کوئی خاص نشانی ظاہر ہو جائے؟ جس دن تیرے پروردگار کی نشانیوں میں سے (اِس طرح کی) کوئی نشانی ظاہر ہو جائے گی، اُس دن کسی ایسے شخص کو اُس کا ایمان کچھ نفع نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اپنے ایمان میں اُس نے کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔[۲۷۰] کہہ دو کہ (اِسی پر اصرار کرتے ہو تو) انتظار کرو، ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔[۲۷۱] ۱۵۵-۱۵۸

کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔ دوسرے اِس پہلو سے کہ اپنی بات وہ ایسے وضوح اور قطعیت سے اور ایسے عقلی و فطری اور مضبوط و مستحکم دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ اُس کے مخاطبین کے پاس اُس کے مقابل میں کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہیں رہ جاتا۔

۲۷۰۔ اِس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ کے نزدیک ایمان وہی معتبر ہے جو سمع و بصر اور دل و دماغ کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے لایا جائے نہ کہ خدا اور اُس کے فرشتوں کو سامنے دیکھ کر۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ مَنْ جَآءَ

(خدا کی بتائی ہوئی اِس سیدھی راہ کو چھوڑ کر، اے پیغمبر)، جن لوگوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور فرقوں میں بٹ گئے ہیں، اُن سے تمھارا کچھ واسطہ نہیں[۲۷۲]۔ اُن کا معاملہ بس اللہ کے حوالے ہے۔ سو وہی اُنھیں بتائے گا جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

انسان کو یہ صلاحیتیں اِسی لیے دی گئی ہیں کہ وہ بن دیکھے محض عقل وفطرت کے دلائل کی بنیاد پر ایمان لائے۔ قرآن میں اِسی کو ایمان بالغیب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ نجات کے لیے ایمان اور عمل لازم وملزوم ہیں۔ جس کے پاس عمل صالح کی کوئی کمائی نہیں ہے، اُسے اپنے ایمان سے بھی کسی نفع کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

۲۷۱؎ یعنی خدا کے اُس فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کے منکرین کے لیے لازماً صادر ہو جاتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... نبی اور اُس کے ساتھی جب اپنا حق ادا کر چکتے ہیں، لیکن ضدی اور سرکش لوگ کسی طرح اُن باتوں پر کان نہیں دھرتے تو اُنھیں بھی فیصلۂ الٰہی کا انتظار ہوتا ہے، کیونکہ اِسی فیصلے کے ظہور کے ساتھ حق کا غلبہ وابستہ ہوتا ہے۔ اِس انتظار میں اصلاً مخالفوں کی تباہی کی خواہش مضمر نہیں ہوتی، بلکہ حق کی فتح مندی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ انبیا علیہم السلام دنیا میں تزکیہ واصلاح کے مشن پر آتے ہیں۔ وہ اِس کام میں اپنی پوری قوت نچوڑ دیتے ہیں۔ جن کے اندر خیر کی ادنیٰ رمق بھی ہوتی ہے، وہ اصلاح قبول کر لیتے ہیں۔ جو بالکل اندھے بہرے بن جاتے ہیں، وہ مردوں کے حکم میں داخل ہیں جو زمین پر پڑے رہیں تو عفونت اور فساد کے سوا کچھ نہیں پھیلا سکتے۔ اِس وجہ سے اُن کے فنا ہو جانے میں ہی خلق کی بہبود ہوتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۲۰۸)

۲۷۲؎ مطلب یہ ہے کہ خدا کی سیدھی راہ تو یہی ملت ابراہیم ہے جسے قرآن نے ایک مرتبہ پھر

بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ۚ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجۡزٰٓى اِلَّا مِثۡلَهَا وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾

قُلۡ اِنَّنِىۡ هَدٰٮنِىۡ رَبِّىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۚ دِيۡنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلۡ اِنَّ صَلَاتِىۡ وَنُسُكِىۡ وَمَحۡيَاىَ وَمَمَاتِىۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ ۚ

(پھر اُس کے حضور) جو نیکی لے کر آئے گا، اُس کے لیے دس گنا بدلہ ہے[۲۷۳] اور جو برائی لے کر آئے گا، اُس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اُس کی برائی ہے اور اِن لوگوں پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ۱۵۹-۱۶۰

اِن سے کہہ دو کہ مجھے تو میرے پروردگار نے ایک سیدھا راستہ دکھا دیا ہے ـــــ دین قیم، یعنی ملت ابراہیم کا راستہ، جو بالکل یک سو تھا اور ہرگز مشرکوں میں سے نہیں تھا[۲۷۴]۔ کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب اللہ پروردگار عالم

واضح کر دیا ہے۔ اِس کے پیرو ایک ہی جماعت تھے۔ یہود و نصاریٰ اور عرب کے مشرکین اگر اُس میں پگ ڈنڈیاں نکال کر گروہ گروہ بن گئے ہیں تو اِن کو اب اِن کے حال پر چھوڑ و اور پوری مضبوطی کے ساتھ اِس راہ پر قائم رہو۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ یہ نہیں مانتے تو تمھیں اِس سے کچھ سروکار نہیں ہونا چاہیے۔

۲۷۳؎ یہ کم سے کم اجر ہے جس کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے۔ اِس سے اُن افضال و عنایات کی نفی نہیں ہوتی جو دوسرے مقامات میں مذکور ہیں۔

۲۷۴؎ یعنی میرا راستہ یہی ہے۔ تم اگر اپنے نکالے ہوئے راستوں پر چلنے کے لیے مصر ہو تو چلتے رہو۔ میری بات ختم ہوگئی۔ اب جس کو خدا توفیق دے، وہ اِس راستے پر آ جائے۔ مجھے تو

وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٦٣﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ

الانعام ۶

کے لیے ہے[۲۷۵]۔ اُس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اِسی کا حکم ملا ہے[۲۷۶] اور میں سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا ہوں۔ اِن سے پوچھو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور پروردگار تلاش کروں، جب کہ وہی ہر چیز کا پروردگار ہے[۲۷۷]؟ (میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ تم نہیں مانتے تو جان لو کہ) ہر شخص جو کچھ کماتا ہے، اُس کا ذمہ دار وہ خود ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تمھارے پروردگار ہی کی طرف تم سب کو پلٹنا

ہر حال میں اِسی پر چلنا ہے، اِس لیے کہ میرے پروردگار نے بتا دیا ہے کہ یہی دین قیم اور یہی ملت ابراہیم ہے۔

۲۷۵؎ یہ نہایت خوبصورت تقابل ہے۔ بندۂ مومن جیتا ہے تو روز و شب کی ہر کروٹ پر نماز میں ہوتا ہے اور مرتا ہے تو اِسی آرزو میں کہ جان و مال کی جس قربانی کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہا، اُس کا پروردگار اُسے قبول کر لے۔ چنانچہ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...یہ اشارہ ہے کہ جو اِس ملت پر ہے، وہ جیتا ہے تو خدا کے لیے اور مرتا ہے تو خدا کے لیے۔ اُس کی زندگی میں کوئی تقسیم نہیں ہے۔ یہ از ابتدا تا انتہا بالکل ہم رنگ اور ہم آہنگ ہے۔ خدا کا کوئی ساجھی نہیں، 'لَا شَرِيْكَ لَهٗ'۔ اِس وجہ سے بندے کی زندگی میں بھی کوئی ساجھی نہیں۔ یہ پوری کی پوری، بغیر کسی تقسیم و تجزیہ اور بغیر کسی تحفظ و استثنا کے صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہ کے لیے ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۲۱۱)

۲۷۶؎ یعنی یہی میری فطرت ہے اور اوپر سے بھی مجھے اِسی کی ہدایت کی گئی ہے۔

تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾

ہے۔اُس وقت وہ تمھیں بتادے گا جس چیز میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔(یاد رکھو کہ) وہی ہے جس نے تمھیں زمین کا اقتدار بخشا اور ایک کو دوسرے سے بلند درجے دیے تا کہ جو کچھ اُس نے تمھیں عطا فرمایا ہے، اُس میں تمھارا امتحان کرے[۲۷۸]۔ (تم مطمئن رہو، اے پیغمبر)، تمھارا پروردگار سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے[۲۷۹]۔۱۶۱-۱۶۵

۲۷۷؎ اوپر جو کچھ فرمایا ہے، یہ اُس کی دلیل بیان کر دی ہے۔

۲۷۸؎ زمین کی بادشاہی ہو جو انسان کو انسان کی حیثیت سے دی گئی ہے یا مختلف قوموں اور افراد کی ایک دوسرے پر برتری، یہ سب اُسی پروردگار کی عطا کی ہوئی اور محض امتحان کے لیے ہے۔لہٰذا نہ دینے میں کسی کا حصہ ہے کہ اُسے شریک ٹھیرایا جائے اور نہ استحقاق کی بنیاد پر ملی ہے کہ اِس کے بل بوتے پر اطاعت کے بجائے استکبار اور سرکشی کا رویہ اختیار کیا جائے۔

۲۷۹؎ یہ آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات اور تسلی کے جملے پر سورہ ختم کر دی ہے کہ مطمئن رہو، یہ نہیں مانیں گے تو بہت جلد خدا کی گرفت میں ہوں گے اور مان لیں گے تو وہ غفور و رحیم ہے۔ سچے دل سے اُس کی طرف لوٹیں گے تو اِن کے گناہ معاف کر دے گا اور اِنھیں اپنے دامن رحمت میں سمیٹ لے گا۔

سورة الاعراف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ فَلَا یَکُنۡ فِیۡ صَدۡرِکَ حَرَجٌ مِّنۡہُ لِتُنۡذِرَ بِہٖ وَ ذِکۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ 'الٓمّٓصٓ' ہے۔[۲۸۰] یہ کتاب ہے جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے۔ سو اِس سے، (اے پیغمبر)، تمھارے دل میں کوئی پریشانی نہ ہو۔[۲۸۱] اِس لیے نازل کی گئی ہے کہ اِس کے ذریعے سے (لوگوں کو) خبردار کرو[۲۸۲] اور ایمان والوں کو (اِس سے) یاددہانی ہو۔[۲۸۳] (لوگو)،

---

۲۸۰ اِس جملے میں مبتدا عربیت کی رو سے محذوف ہے۔ اِسے کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی: 'ھٰذِہٖ الٓمّٓصٓ'۔ اصطلاح میں اِنھیں حروف مقطعات کہا جاتا ہے اور سورتوں کے شروع میں یہ اُن کے نام کی حیثیت سے آئے ہیں۔ اِن کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی ابتدا میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۲۸۱ آیت کی ابتدا 'کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ' کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ یہاں بھی مبتدا محذوف ہے۔ مدعا یہ ہے کہ تم نے یہ کتاب خدا سے درخواست کر کے اپنے اوپر نہیں اتروائی، بلکہ خدا نے اپنے فیصلے سے اور تمھاری کسی خواہش اور تمنا کے بغیر تم پر نازل کی ہے، اِس لیے لوگ نہیں مانتے تو اِس کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، سو تمھیں کوئی پریشانی بھی نہیں ہونی چاہیے۔ جس نے اِسے نازل کیا ہے، وہی اِس کی دعوت کو اتمام تک پہنچائے گا اور وہ سب کچھ فراہم کرے گا جو اِس دعوت کو اتمام تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت 'مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی' میں ہے۔

مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿٣﴾
وَكَم مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ ﴿٤﴾
فَمَا كَانَ دَعْوَاهُمْ إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا إِلَّا أَن قَالُوا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٥﴾
فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ﴿٦﴾
فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِم بِعِلْمٍ ۖ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ ﴿٧﴾ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ

تمھارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تمھاری جانب اتارا گیا ہے، اُس کی پیروی کرو اور اپنے پروردگار کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کے پیچھے نہ چلو۔ (افسوس)، تم کم ہی یاددہانی حاصل کرتے ہو۔ (اِس سے پہلے) کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا تو ہمارا عذاب اُن پر رات میں اچانک ٹوٹ پڑا یا دن دہاڑے آ گیا، جب وہ آرام کر رہے تھے۔[۲۸۴] پھر جب ہمارا عذاب اُن پر ٹوٹ پڑا تو اِس کے سوا کچھ کہتے نہ بن پڑا کہ پکار اٹھے: بے شک، ہم ہی ظالم تھے۔ سو ہم اُن لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے بھی ضرور پوچھیں گے کہ اُنھوں نے ہمارا پیغام پہنچایا تو اُنھیں کیا جواب ملا؟[۲۸۵] پھر پورے علم کے ساتھ ہم تمام سرگذشت

۲۸۲۔ یعنی اِس بات سے خبردار کرو کہ خدا کے پیغمبر کو جھٹلانے کے نتائج دنیا اور آخرت میں اُن کے لیے کیا ہو سکتے ہیں۔

۲۸۳۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ'۔ اِس کا عطف 'لِتُنذِرَ بِهِ' پر ہے۔ یہ اضمار فعل سے منصوب اور 'تذکیر' کے معنی میں اسم ہے، یعنی 'لتنذر به وتذکر تذکیرًا'۔

۲۸۴۔ مطلب یہ ہے کہ رات کی تاریکیوں میں اور دن دہاڑے، جس وقت خدا نے چاہا، آ گیا۔ اُسے نہ کوئی روک سکا اور نہ اپنے آپ کو اُس سے بچانے میں کامیاب ہوا۔

الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٨ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝٩

اُنھیں کہہ سنائیں گے، آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔ اور تول اُس روز بالکل ٹھیک ہو گی۔ پھر جن کے پلڑے بھاری ہوئے، وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے رہے، وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا،[۲۸۶] اِس لیے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے اور اپنے اوپر ظلم ڈھاتے رہے۔[۲۸۷] ۱-۹

---

۲۸۵ پیچھے اُس عذاب کا ذکر تھا جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد دنیا میں خدا کی دینونت کے ظہور سے آتا ہے۔ اُس سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جس طرح وہ آیا تو مجرموں کے پاس اپنے جرم کا اقرار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا، اُسی طرح جزا و سزا کا دن بھی آکر رہے گا، جب لوگوں سے پرسش ہوگی اور رسولوں سے بھی پوچھا جائے گا کہ اُن کی دعوت کے جواب میں اُن کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا گیا؟

۲۸۶ یہ اِس لیے کہ برائی کے لیے اُس روز سرے سے کوئی وزن نہ ہوگا۔ دوسرے مقامات میں یہ صراحت بھی ہے کہ قیامت میں وزن رکھنے والی چیز صرف وہ اعمال ہوں گے جو خدا کے لیے اور آخرت میں اُس کی رضامندی حاصل کرنے کی خواہش اور ارادے کے ساتھ کیے گئے۔ اُن کے سوا تمام اعمال وہاں بے وزن ہو جائیں گے۔

۲۸۷ اصل الفاظ ہیں: 'بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ'۔ اِن میں تضمین ہے، اِس لیے کہ صلے اور فعل میں مناسبت نہیں ہے۔ اِسے کھول دیجیے تو پوری بات اِس طرح ہے: 'بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِنَا وَيَظْلِمُوْنَ اَنْفُسَهُمْ'۔ اِس کا فائدہ یہ ہے کہ تھوڑے الفاظ نے ایک وسیع مفہوم کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۰﴾

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ

(لوگو)، ہم نے اِس سرزمین میں[288] تمھیں اقتدار عطا فرمایا اور تمھارے لیے اِس میں معاش کی راہیں کھول دی ہیں،[289] پر تم کم ہی شکرگزار ہوتے ہو۔ ۱۰

(تمھاری سرگذشت یہ ہے کہ) ہم نے تمھیں پیدا کیا تھا، پھر تمھاری صورتیں بنائی تھیں،[290] پھر فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔[291] سو ابلیس[292] کے سوا سب

۲۸۸؎ یعنی سرزمین حرم میں، جہاں قریش کو اختیار و اقتدار حاصل تھا۔ سورہ کے مخاطب چونکہ وہی ہیں، اِس لیے یہاں سے تمہید اٹھائی ہے۔

۲۸۹؎ یہ اُن راہوں کی طرف اشارہ ہے جو ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی دعاؤں اور بیت اللہ کے طفیل اُن کے لیے کھولی گئیں۔

۲۹۰؎ اِس کی تفصیل قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ پہلے زمین کے پیٹ میں انسان کا حیوانی وجود تخلیق ہوا، پھر اُس میں اپنی نسل آپ پیدا کر لینے کی صلاحیت ودیعت ہوئی، پھر اُس کا تسویہ کیا گیا، اِس طریقے سے جو مخلوق وجود میں آئی، اُس میں سے دو کا انتخاب کر کے پھر اُن میں روح پھونکی گئی جس سے آدم و حوا کی صورت میں نطق و بیان کی صلاحیت اور عقل و شعور سے بہرہ یاب ایک نئی مخلوق، یعنی انسان کی ابتدا ہوگئی۔ یہ نوع انسانی پر گزرنے والے مختلف مراحل کی تفصیل ہے جن میں سے ہر مرحلے کی مدت ہزاروں سال ہو سکتی ہے۔ ہڈیوں، کھوپڑیوں اور ڈھانچوں کے اوراق میں سائنس دان جو کچھ پڑھ رہے ہیں، وہ یہی سرگذشت ہے، اِس کا ارتقا کے اُس تصور سے کوئی تعلق نہیں ہے جو ڈارون نے پیش کیا تھا۔

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسۡجُدَ اِذۡ اَمَرۡتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ ۚ خَلَقۡتَنِىۡ

سجدہ ریز ہو گئے۔ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا۔[۲۹۳] فرمایا: تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روک دیا،[۲۹۴] جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا؟[۲۹۵] بولا: میں اُس سے بہتر ہوں، تو نے

۲۹۱؎ یہ سجدہ تعظیم کے لیے تھا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا، اِس لیے اِس میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی اطاعت کا یہ امتحان جس وجہ سے لیا، وہ یہ تھی کہ اولاً، آدم پر واضح ہو جائے کہ اصلی سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہے۔ لہٰذا اُسے بھی اپنی انانیت کو ایک طرف رکھ کر ہمیشہ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ ثانیاً، وہ یہ سمجھ لے کہ اُسے جب اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا ہے کہ فرشتوں نے اُس کو سجدہ کیا تو یہ بات کسی طرح اُس کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ کسی برتر سے برتر مخلوق کو بھی خدا کا شریک سمجھ کر اُس کی پرستش کرے۔ بندگی اور پرستش اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ وہ اگر اِس حق میں کسی کو شریک کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی اہانت نہیں کرتا، بلکہ خود اپنی بھی اہانت کرتا ہے۔

۲۹۲؎ یہ 'أبلس' سے 'إفعیل' کے وزن پر اُس جن کا لقب ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ 'أبلس' کے معنی مایوس اور غم زدہ ہونے کے ہیں۔ بعض لوگ اِسے فرشتہ سمجھتے ہیں، لیکن قرآن میں صراحت ہے کہ یہ جنات میں سے تھا۔

۲۹۳؎ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات چونکہ اپنی خلقت کے لحاظ سے فرشتوں سے زیادہ دور نہیں ہیں، اِس لیے اُنھیں جب سجدہ کا حکم دیا گیا تو علیٰ سبیل التغلیب جنات بھی اِس حکم میں شامل تھے۔

۲۹۴؎ اصل میں 'مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسۡجُدَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'مَا مَنَعَكَ' کے بعد 'لَا' کا لانا ضروری نہیں تھا، اِس لیے کہ اُس میں خود 'لَا' کا مضمون موجود ہے، لیکن لایا گیا ہے تو اِس سے شدتِ نکیر کا مضمون پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اسلوب ہماری اپنی زبان میں بھی موجود ہے۔

مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهۡبِطۡ مِنۡهَا فَمَا يَكُوۡنُ لَكَ اَنۡ تَتَكَبَّرَ فِيۡهَا فَاخۡرُجۡ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيۡنَ ﴿۱۳﴾ قَالَ اَنۡظِرۡنِىۡۤ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الۡمُنۡظَرِيۡنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَاۤ

مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُس کو مٹی سے[۲۹۶]۔ فرمایا: اچھا تو یہاں سے اتر[۲۹۷]، اِس لیے کہ تجھے یہ حق نہیں کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے، سو نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے[۲۹۸]۔ بولا: مجھے اُس دن تک مہلت دے[۲۹۹]، جب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا: تجھے مہلت ہے[۳۰۰]۔ بولا:

الاعراف ۷

۲۹۵؎ مطلب یہ ہے کہ اِس سجدے کا حکم چونکہ میں نے دیا تھا، اِس لیے یہ سجدہ آدم کو نہیں، بلکہ درحقیقت مجھے تھا۔ لیکن اِس کے باوجود امتثال امر کے بجائے تو نے سرکشی اختیار کی، آخر کیوں؟

۲۹۶؎ اِس سے واضح ہے کہ عز و شرف کو نسل و نسب پر مبنی سمجھنے کا فلسفہ ابلیس کی ایجادات میں سے ہے۔ جو لوگ اِس بنیاد پر اکڑتے اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت اُسی کے پیرو ہیں۔

۲۹۷؎ یہ خدا کی بارگاہ سے اترنے کا حکم ہے، جہاں جنات اور فرشتے، سب اُس کے حضور میں اُس سے ہم کلام تھے۔

۲۹۸؎ مطلب یہ ہے کہ ہماری بارگاہ میں سرکشی اور تکبر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اِس جرم کا ارتکاب کر رہے ہو تو اِس کی سزا دائمی ذلت ہے۔ یہاں سے نکل جاؤ، اب اِسی ذلت میں رہو گے۔ ہماری بارگاہ کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے ہیں۔

۲۹۹؎ یعنی اِس بات کی مہلت کہ میں یہ ثابت کر سکوں کہ انسان کو جو شرف بخشا گیا ہے، وہ فی الواقع اُس کا اہل نہیں ہے۔

۳۰۰؎ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ابلیس اور اُس کی ذریت کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے یہ مہلت دے دی ہے کہ وہ انسان کو بہکانے اور ورغلانے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے، کر لے۔ انسان

اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ

پھر اِس لیے کہ تو نے مجھے گم راہی میں ڈالا ہے[۳۰۱]، اب میں بھی اولادِ آدم کے لیے ضرور تیری سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا[۳۰۲]۔ پھر اِن کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر

کے شرف و مزیت کے معاملے کا فیصلہ اِس کے نتیجے میں قیامت پر ملتوی ہو گیا ہے۔ اب وہیں معلوم ہوگا کہ اِس جنگ میں کون جیتتا اور کون ہارتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہی وہ موڑ ہے، جہاں سے انسان کی زندگی کارزار امتحان میں داخل ہوتی ہے۔ شیطان نے، جیسا کہ آگے آرہا ہے، اپنا پورا زور اِس بات کے لیے لگانے کا منصوبہ بنایا کہ وہ انسان کو نااہل و نالائق ثابت کر دے اور انسان کی سعادت و کامرانی اِس بات میں ٹھیری کہ وہ یہ ثابت کرے کہ فی الواقع وہ اِس کا اہل ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۳۲)

۳۰۱؎ یعنی میں خود گم راہ نہیں ہوا، بلکہ تو نے حکم ہی ایسا دیا تھا جس کا امتثال میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ میں اگر گم راہ ہوا ہوں تو اِس گم راہی پر، معاذ اللہ، تو نے مجھے مجبور کیا ہے۔ آگے کی آیات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی اِس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک کھلی ہوئی سفیہانہ بات تھی جس کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

۳۰۲؎ اِس سے توحید کی راہ مراد ہے اور ابلیس نے یہ چیلنج اللہ تعالیٰ کو دیا ہے کہ وہ جنت الفردوس کے لیے صالحین کے انتخاب کی اُس اسکیم کو ناکام بنا دے گا جو انسان کی تخلیق سے اللہ کے پیش نظر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...انسان کی فطرت اور خدا میں براہ راست ربط ہے۔ فطرت کی راہ میں غیر فطری کج پیچ نہ پیدا کر دیے جائیں تو انسان توحید کے سوا کوئی اور راہ نہیں اختیار کر سکتا۔ اِس وجہ سے توحید کو قرآن میں بھی اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی 'صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جب تک انسان اِس راہ پر قائم رہتا ہے، اُس وقت تک وہ سست رو اور آبلہ پا ہو کر بھی رو بمنزل

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

طرف سے ضرور اِن پر تاخت کروں گا[۳۰۳] اور تو اِن میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔[۳۰۴] فرمایا: نکل جا یہاں سے، ذلیل اور راندہ۔ (یاد رکھ کہ) اِن میں سے جو تیری پیروی کریں گے، میں بھی ضرور تم سب سے اکٹھے جہنم کو بھر دوں گا[۳۰۵]۔ ۱۱-۱۸

رہتا ہے، اِس وجہ سے دیر سویر منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ برعکس اِس کے، اگر وہ شرک کے کسی موڑ کی طرف مڑ جائے تو اصل منزل سے روگرداں ہو جاتا ہے اور پھر جتنے قدم بھی وہ آگے بڑھتا ہے، اُس کا سفر کسی 'ضَلَالٌ بَعِيْد' ہی کی راہ میں ہوتا ہے۔ یہ رمز ہے جس کے سبب سے شیطان کو انسان پر پوری فتح حاصل کرنے کا اُس وقت تک موقع نہیں ملتا، جب تک وہ اُس کو توحید کی شاہراہ سے ہٹا کر شرک کی کسی پگ ڈنڈی پر نہ ڈال دے۔ چنانچہ اُس نے اپنے چیلنج میں آشکارا الفاظ میں بتا دیا کہ وہ انسان کی گھات میں توحید کی راہ پر بیٹھے گا اور اِس راہ سے اُس کو بے راہ کرنے کی کوشش کرے گا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۳۲)

۳۰۳۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شیطان نے یہ چیلنج کس عزم و ارادے سے اور کس زور اور طنطنے کے ساتھ دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ بیان ہے شیطان کے حملے کی قوت، وسعت اور ہمہ گیری کا خود اُس کی زبان سے۔ وہ ہر جہت، ہر سمت، ہر پہلو سے انسان پر حملہ کرے گا۔ وہ اُس کے مشاہدات، احساسات، جذبات، خواہشات ہر منفذ سے اُس کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اُس کے فکر، فلسفہ، علم، ادراک ہر چیز کو مسموم کرے گا۔ وہ اُس کی تحقیق، تنقید، تصنیف، تالیف، ادب، آرٹ، لٹریچر، ہر چیز میں اپنا زہر گھولے گا، وہ اُس کے تہذیب، تمدن، معیشت، معاشرت، فیشن، کلچر، سیاست اور مذہب ہر چیز کے اندر فساد برپا کرے گا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۳۳)

۳۰۴۔ اِس جملے کا ٹھیک مطلب یہ ہے کہ تو اُن کی اکثریت کو توحید پر قائم نہیں پائے گا۔

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ

(ہم نے آدم سے کہا): اے آدم، تم اور تمھاری بیوی، دونوں اِس باغ[۳۰۶] میں رہو اور اِس میں سے جہاں سے چاہو، کھاؤ۔ ہاں، البتہ تم دونوں اِس درخت[۳۰۷] کے پاس نہ جانا، ورنہ ظالم ٹھیرو گے۔ پھر شیطان نے اُنھیں بہکایا کہ اُن کی شرم گاہوں میں سے جو چیز اُن

اِس لیے کہ وہ جب خدا کی نعمتوں اور اُس کے افضال وعنایات کے لیے اُس کے شکر گزار نہیں ہوں گے تو دوسروں کے ہوں گے اور اُنھیں معبود بنا کر اُن کی پرستش کرنے لگیں گے۔

۳۰۵؎ یہ پوری بے نیازی اور شان کبریائی کے ساتھ شیطان کے چیلنج کا جواب بھی ہے اور اُس فیصلے کا دوٹوک اظہار بھی جس میں کسی رو رعایت کی گنجایش نہیں ہے۔

۳۰۶؎ یہ غالباً اِسی دنیا کا کوئی باغ تھا جسے آدم وحوا کا مستقر قرار دیا گیا۔ اِس میں جو امتحان اُنھیں پیش آیا، اُس سے دونوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ شیطان اُن پر حملہ کرے گا تو کہاں سے کرے گا۔

۳۰۷؎ سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۱۲۰ میں اِسے 'شَجَرَةُ الْخُلْدِ' کہا گیا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ لفظ 'الشَّجَرَة' یہاں مجازی مفہوم میں ہے۔ 'شَجَرَةُ الْخُلْدِ' کے لفظ سے جو معنی ظاہر ہوتے ہیں اور اِس درخت کا پھل کھانے کے جو اثرات آگے بیان ہوئے ہیں، دونوں اِس بات کی طرف صاف اشارہ کرتے ہیں کہ اِس سے مراد وہی شجرۂ تناسل ہے جس کا پھل کھانے کے باعث انسان اِس دنیا میں اپنے آپ کو باقی رکھے ہوئے ہے، لیکن آج بھی دنیا میں اُس کے لیے سب سے بڑی آزمایش اگر کوئی ہے تو یہی درخت ہے۔ آگے کی آیتوں سے مزید واضح ہو جائے گا کہ شیطان سب سے بڑھ کر اِسی کو فتنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کو ایک

مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢١﴾

سے چھپائی گئی تھی، وہ اُن کے لیے کھول دے۔[308] اُس نے اُن سے کہا: تمھارے رب نے تمھیں اِس درخت سے صرف اِس وجہ سے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمھیں ہمیشہ کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔[309] اُس نے قسمیں کھا کر[310] اُن سے کہا کہ میں تمھارا سچا

دوسرے کا لباس قرار دیا اور اُنھیں اجازت دی کہ وہ یہ لباس پہن کر اِس درخت کا پھل کھائیں، لیکن شیطان ہمیشہ اُنھیں اِس لباس کے بغیر ہی اِس کا پھل کھانے کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔

۳۰۸۔ یعنی جنسی تلذذ جس سے آدم و حوا ابھی واقف نہیں ہوئے تھے۔

۳۰۹۔ ابلیس نے یہ لالچ دے کر آدم و حوا کو اُس درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی۔ چنانچہ اِس پھل کی خواہش میں جو غیر معمولی کیفیت انسان پر طاری ہو جاتی ہے، اُس سے مغلوب ہو کر وہ شیطان کے فریب میں آ گئے اور یہ پھل کھا بیٹھے۔ شیطان کی اِس بات میں، اگر غور کیجیے تو اتنی سچائی بھی ہے کہ یہ اُسی درخت کا پھل ہے جس کے کھانے سے دنیا میں انسان کی زندگی کا تسلسل قائم ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے ایک اور پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے سجدے سے مشرف ہونے کے باوجود آدم علیہ السلام فرشتوں کے مرتبے کو اپنے سے اونچا سمجھتے تھے۔ نیز وہ یہ جانتے تھے کہ یہ زندگی جو اُن کو حاصل ہوئی ہے، ابدی زندگی نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شیطان اُن کو اِن دونوں چیزوں کے نام پر ورغلانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوتا۔“ (تدبرقرآن ۳/ ۲۳۵)

۳۱۰۔ اصل میں ’قَاسَمَهُمَا‘ کا لفظ آیا ہے۔ ’أقسم‘ کے بجائے اِس لفظ کا استعمال یہاں تکثیر اور مبالغے کے لیے ہے، یعنی بار بار قسمیں کھا کر یقین دلایا۔ عربی زبان کے افعال میں حروف کی زیادتی جس طرح معنی میں فرق پیدا کرتی ہے، اُسی طرح لفظ کے معنی میں محض شدت،

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۗ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ

خیر خواہ ہوں۔ اِس طرح فریب دے کر اُس نے دونوں کو رفتہ رفتہ مائل کر لیا۔ پھر جب اُنھوں نے درخت کا پھل چکھا[۳۱۱] تو اُن کی شرم گاہیں اُن پر کھل گئیں[۳۱۲] اور وہ اُس باغ کے پتوں سے اپنے جسم ڈھانکنے لگے۔[۳۱۳] (اُس وقت) اُن کے پروردگار نے اُنھیں پکارا کہ کیا میں نے تمھیں اِس درخت سے روکا نہیں تھا اور تم سے کہا نہیں تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے[۳۱۴]؟ دونوں بول اٹھے: پروردگار، ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اب اگر تو

تکثیر اور مبالغے کا فائدہ بھی دیتی ہے۔

۳۱۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ'۔ اِن میں مضاف عربیت کے قاعدے سے محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۳۱۲؎ یعنی اُن کے بارے میں یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ صرف رفع حاجت کا ذریعہ نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسری چیز بھی اِن کے اندر چھپی ہوئی ہے جو اِن کا پھل کھانے کے بعد ہی کھلتی ہے۔

۳۱۳؎ اِس سے واضح ہے کہ جنس اور جنسی اعضا کے ساتھ شرم کا احساس انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ یہ کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے اور نہ تہذیب کے ارتقا سے مصنوعی طور پر پیدا ہوئی ہے، بلکہ ایک ایسا احساس ہے جو خدا نے انسان کے اندر الہام کر دیا ہے۔ جنس کے معاملات سے واقف ہوتے ہی یہ آپ سے آپ نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انسان اپنے اُن اعضا کو ڈھانکنے کی کوشش کرتا ہے جو اُس کے لیے جنسی تلذذ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

۳۱۴؎ یہ اُن تنبیہات کا حوالہ دیا ہے جو اوپر آیات ۱۷-۱۹ میں گزر چکی ہیں۔

الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾

ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ضرور نامراد ہو جائیں گے۔[۳۱۵]
فرمایا: (یہاں سے) اتر جاؤ[۳۱۶]، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو[۳۱۷] اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین پر ٹھیرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔ فرمایا: تم اِسی میں جیو گے، اِسی میں مرو گے اور اِسی سے نکالے جاؤ گے۔[۳۱۸] ۱۹-۲۵

الاعراف ۷

۳۱۵؎ یہ اُس توبہ کی بہترین مثال ہے جس کا ذکر سورۂ نساء (۴) کی آیت ۱۷ میں ہوا ہے اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ اُسے لازماً قبول کر لیتا ہے۔

۳۱۶؎ اصل میں لفظ 'اِهْبِطُوْا' استعمال ہوا ہے۔ اِس میں اترو کا مفہوم وہی ہے جو سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۶۱ کے الفاظ 'اِهْبِطُوْا مِصْرًا' میں ہے، یعنی اے آدم و حوا اور ابلیس، تم سب اِس باغ سے نکل کر زمین میں اتر جاؤ۔

۳۱۷؎ یعنی ابلیس تمھارا دشمن ہے اور تم اُس کے دشمن ہو۔ تمھارے اور اُس کے درمیان فطری تعلق دشمنی کا ہے، لہٰذا تم کو ہمیشہ اُسے اپنا دشمن ہی سمجھنا چاہیے۔

۳۱۸؎ آدم و ابلیس کی سرگذشت یہاں تمام ہوئی۔ اِس سے جو حقائق مخاطبین پر واضح کرنا مقصود ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ سرکشی اور تکبر خدا کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے۔ اِس کا ارتکاب کر لینے کے بعد انسان ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو سکتا ہے۔ ابلیس نے اِسی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ فرشتے اپنی خلقت کے لحاظ سے اُس سے برتر تھے، لیکن اُنھوں نے خدا کے حکم کو اِس سے بڑا سمجھا اور بغیر کسی تردد کے اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ خدا کی تمام مخلوقات کے لیے صحیح رویہ یہی ہے۔ دولت و ثروت اور

عز و جاہ، سب خدا کی عطا ہے۔ اِس کے زعم میں مبتلا ہو کر سرکشی اور تکبر کا رویہ اختیار کیا جائے گا تو یہ انسان کے لیے ابدی خسران کا باعث بن جائے گا۔

۲۔ ابلیس جس انجام کو خود پہنچا ہے، وہ انسان کو بھی اُسی انجام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اُس نے خدا سے اِسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مہلت لی ہے۔ اُس کا اصلی ہدف عقیدۂ توحید ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ مشرکین کے لیے خدا کی جنت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ یہ ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ جس کے سامنے اُسے جھکنے کے لیے کہا گیا تھا، وہ اِس کا اہل بھی نہیں ہے کہ اپنے پروردگار کی ذات وصفات کی صحیح معرفت کے ساتھ اُس کی بندگی کر سکے۔

۳۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری اُس کی جنسی جبلت ہے۔ ابلیس اِس بات سے واقف ہے کہ انسان کو اپنی گرفت میں لینے کا سب سے آسان راستہ یہی ہے کہ اُسے اِس جبلت کی تسکین پر خدا کی عائد کردہ پابندیوں کو توڑ دینے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ وہ آدم وحوا پر اِسی راستے سے حملہ آور ہوا تھا۔ اِس کے لیے وہ ہر داؤں، ہر فریب اور ہر چرتر استعمال کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اور لوگوں کو اُسی طرح شیشے میں اتار لیتا ہے، جس طرح ابدیت کا لالچ دے کر اُس نے آدم و حوا کو شیشے میں اتارا تھا۔ اپنے حریف کے محاذ میں یہ کمزور ترین مقام ہے جو اُس نے پہلے دن سے حملے کے لیے تلاش کر رکھا ہے۔

۴۔ غلطی ابلیس نے بھی کی اور غلطی آدم وحوا سے بھی ہوئی، لیکن دونوں میں فرق ہے۔ ابلیس کو غلطی پر توجہ دلائی گئی تو وہ اکڑ بیٹھا اور بندگی سے منہ موڑ کر سرکشی کا رویہ اختیار کر لیا۔ مگر آدم وحوا نے یہ نہیں کیا۔ اُنھیں جب احساس ہوا کہ اُنھوں نے نافرمانی کی ہے تو ندامت اور شرم ساری کے ساتھ وہ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے اور معافی مانگ کر اُس کے دامن رحمت میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔ چنانچہ ابلیس ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہے اور بنی آدم کے لیے جنت کے دروازے کھلے ہیں۔ وہ جب چاہیں، نیکی، خیر اور توبہ واستغفار کا زادراہ لے کر اُن میں داخل ہونے کے لیے سفر کی ابتدا کر سکتے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ

آدم کے بیٹو[319]، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے[320] جو تمھاری شرم گاہوں کو ڈھانکنے والا

۳۱۹ خطاب کے لیے یہ اسلوب، اگر غور کیجیے تو نہایت بلیغ اختیار فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... باپ کی زندگی کے حوادث و تجربات اولاد کے لیے سب سے زیادہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ اُس کی سرگذشت کسی دوسرے کی کہانی نہیں، بلکہ اپنی ہی حکایت ہوتی ہے۔ باپ کے دوستوں سے دوستی، اُس کے دشمنوں سے دشمنی باوفا اولاد خاندان کی ناقابل فراموش روایت کی طرح محفوظ رکھتی ہے۔ اخلاف اُس کو یاد رکھتے ہیں اور اپنے بعد والوں کی طرف اُس کو منتقل کرتے اور برابر منتقل کرتے رہنے کی وصیت کرتے ہیں۔ اہل عرب میں تو یہ روایت اتنی محبوب رہی ہے کہ اُس میں حق و باطل کا امتیاز بھی باقی نہیں رہا تھا۔ باپ دادا کا دشمن بہر حال پشت ہا پشت دشمن ہی سمجھا جاتا، اگرچہ اُس کی دشمنی برحق ہی کیوں نہ رہی ہو۔ پھر کس قدر حیف کی بات ہے کہ آدم کی اولاد اپنے باپ کے ساتھ شیطان اور اُس کی ذریت کی اِس دشمنی کو بھول جائے جو سراسر کینہ اور حسد پر مبنی تھی، جو مخفی نہیں، بلکہ بالکل علانیہ تھی اور جو صرف مخصوص آدم و حوا کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ قیامت تک کے لیے اُن کی تمام ذریت کے ساتھ تھی۔ پھر معاملہ صرف بھول جانے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اولاد کی ناخلفی، ناہنجاری اور نابکاری اِس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ کتنے ہیں جو اُس دشمن اور اُس کے ساتھیوں ہی کو اپنا دوست، خیر خواہ اور معتمد بنائے بیٹھے ہیں اور اُس کے کہے پر ٹھیک ٹھیک اپنے لیے اُنھی تباہیوں کے گڑھے کھود رہے ہیں جن میں اُس نے آدم کو گرانا چاہا تھا اور وہ اُس میں گر چکے تھے، اگر اللہ کی رحمت نے اُن کو بچایا نہ ہوتا ـــــ قرآن کی بلاغت بیان کے قربان جایئے کہ صرف 'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ' کے خطاب کے دو لفظوں کے اندر اُس نے یہ سارے مضمرات محفوظ کر دیے ہیں۔ آدم علیہ السلام کا جو غیور و باوفا بیٹا اِس خطاب کے ساتھ قرآن کی اِن یاددہانیوں کو سنتا ہے، اُس کی رگ رگ شیطان کے خلاف جوش حمیت و غیرت سے پھڑک اٹھتی ہے۔ صرف بے غیرت اور ناخلف ہی ہیں جو اِس خطاب کے

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ

بھی ہے اور تمھارے لیے زینت بھی[۳۲۱] اور تقویٰ کا لباس، وہ اِس سے بڑھ کر ہے۔[۳۲۲]

بعد بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔'' (تدبر قرآن ۳/۲۴۵)

۳۲۰ زمین کی ہر چیز خدا کے حکم سے پیدا ہوئی ہے، اِس لیے درحقیقت اُس کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ حدید (۵۷) کی آیت ۲۵ میں لوہے کے بارے میں بھی فرمایا ہے کہ 'اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ'۔

۳۲۱ پہلی چیز ضرورت ہے اور دوسری اتمام نعمت۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو چیزیں بھی بنائی ہیں، اُن میں بالعموم یہ دونوں پہلو ملحوظ ہیں۔ چنانچہ لباس ستر پوش بھی ہوتا ہے، سردی اور گرمی سے ہماری حفاظت بھی کرتا ہے اور ہمارے لیے ذریعۂ تزئین بھی ہے۔ ہم اِس سے اپنی شخصیت، اپنے حسن و وقار اور اپنی شان میں اضافہ کرتے ہیں۔

۳۲۲ مطلب یہ ہے کہ خدا نے جس طرح انسان کے لیے وہ چیزیں پیدا کی ہیں جن سے اُس کا ظاہری لباس تیار ہوتا ہے، اُسی طرح وہ چیزیں بھی اُس کے نفس میں الہام کر دی ہیں جن سے اُس کا باطنی لباس تیار ہوتا ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس ہے جو انسان کو پہنا کر دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ خدا نے اِس کے لیے اپنی خشیت، احساس عبدیت اور شرم و حیا کا جذبہ انسان کی فطرت میں ودیعت فرمایا ہے۔ یہ اِنھی اجزا سے بنتا ہے اور ظاہری لباس سے کہیں بڑھ کر ہے، بلکہ ظاہری لباس بھی اِسی باطن کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے تو انسانوں کو انسانیت کا حسن عطا کرتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...جس کے قامت پر اللہ اپنی عنایت کی یہ ردا ڈال دیتا ہے، دیکھنے کے قابل وقار و جمال اُسی کا ہوتا ہے، یہ انسانوں کے لباس میں مقدس فرشتہ ہوتا ہے۔ جو بھی اُس کو دیکھتا ہے، بے تحاشا 'مَا هٰذَا بَشَرًا، اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ' پکار اٹھتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۳/۲۴۵)

الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ

وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تاکہ لوگ یاددہانی حاصل کریں۔[۳۲۳] آدم کے بیٹو، ایسا ہرگز نہ ہو کہ شیطان تمھیں اُسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے، جس طرح اُس نے تمھارے ماں باپ کو اُس باغ سے نکلوا دیا، (جس میں خدا نے اُنھیں ٹھیرایا تھا)، اُن کا یہی لباس اتروا کر کہ اُن کی شرم گاہیں اُن پر کھول دے۔[۳۲۴] (یاد رکھو)، وہ اور اُس

الاعراف ۷

۳۲۳؎ یعنی اِس بات کی یاددہانی حاصل کریں کہ انسان کے ظاہری لباس کو بھی اِسی کے مطابق ہونا چاہیے۔ خدا کی آیتیں آفاق میں بھی ہیں اور انفس میں بھی۔ یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اُن سے رہنمائی حاصل کرے۔ قرآن کی آیتیں اُس کو جگہ جگہ اِنھی آیتوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

۳۲۴؎ پیچھے جس لباس تقویٰ کا ذکر ہے، یہ اُسی کی طرف اشارہ ہے۔ شیطان چاہتا تھا کہ آدم و حوا کی شرم گاہوں کا وہ پہلو اُن پر کھول دے جو اُن سے چھپایا گیا تھا۔ اُس نے اپنا یہ مقصد اُن کا یہی لباس اتروا کر حاصل کیا۔ چنانچہ تنبیہ فرمائی ہے کہ اپنے آپ کو بچا کر رکھو، وہ یہ کام آج بھی اِسی طریقے سے کرتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...وہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے پہلے لوگوں کو اُس لباس تقویٰ وخشیت سے محروم کرتا ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لیے اِس ظاہری لباس کے ساتھ ایک تشریف باطنی کی حیثیت سے اتارا ہے اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ جب یہ باطنی جامہ اتر جاتا ہے تو وہ حیا ختم ہو جاتی ہے جو اِس ظاہری لباس کی اصل محرک ہے۔ پھر یہ ظاہری لباس ایک بوجھ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بے حیائی صنفی اعضا میں، جن کا چھپانا تقاضاے فطرت ہے، عریاں ہونے کے لیے تڑپ پیدا کرتی ہے، پھر فیشن اُس کو سہارا دیتا ہے اور وہ لباس کی تراش خراش میں نت نئی اختراعات سے ایسے ایسے اسلوب پیدا کرتا ہے کہ آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کپڑے پہن کر بھی لباس کے بنیادی مقصد، یعنی ستر پوشی کے اعتبار سے گویا ننگے ہی رہتے ہیں۔ پھر لباس میں صرف زینت اور

لِلَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۷﴾

کے ساتھی تم کو وہاں سے دیکھتے ہیں، جہاں سے تم اُنھیں نہیں دیکھ سکتے۔[۳۲۵] حقیقت یہ ہے کہ اِن شیطانوں کو ہم نے اُن لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔[۳۲۶] ۲۶-۲۷

آرایش کا پہلو باقی رہ جاتا ہے اور اُس میں بھی اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ بے حیائی زیادہ سے زیادہ دل کش زاویے سے نمایاں ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ عقل اِس طرح ماؤف ہو جاتی ہے کہ عریانی تہذیب کا نام پاتی ہے اور ساتر لباس وحشت و دقیانوسیت کا۔ پھر پڑھے لکھے شیاطین اٹھتے ہیں اور تاریخ کی روشنی میں یہ فلسفہ پیدا کرتے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت تو عریانی ہی ہے۔ لباس تو اُس نے رسوم و رواج کی پابندیوں کے تحت اختیار کیا ہے۔ یہ مرحلہ ہے جب دیدوں کا پانی مر جاتا ہے اور پورا تمدن شہوانیت کے زہر سے مسموم ہو جاتا ہے۔'' (تدبرقرآن ۳/۲۴۶)

۳۲۵ مطلب یہ ہے کہ اُن راستوں سے حملہ آور ہوتے ہیں، جہاں سے تم سوچ نہیں سکتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ شیطان اور اُس کے جتھے کی چالاکی، کیادی اور فتنہ سامانی کی طرف اشارہ ہے کہ اُن کے حملے کے راستے اور اُن کے ظہور کے بھیس اتنے بے شمار ہیں کہ تم اُن سارے راستوں پر نہ پہرا بٹھا سکتے، نہ ہر بھیس میں اُن کو پہچان ہی سکتے۔ اُس کے لشکر میں جن بھی ہیں اور انسان بھی۔ وہ وہاں سے گھات لگائیں گے، جہاں سے تم دیکھ نہیں سکو گے اور تمھارے لیے وہ بہروپ بھریں گے کہ تم پہچان نہ سکو گے۔ تم اُنھیں دوست، ناصح، خیر سگال، مرشد، لیڈر اور نہ جانے کیا کیا سمجھو گے اور وہ تمھارے دین و ایمان کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں گے۔ تم گمان کرو گے کہ وہ تمھارے لیے تہذیب و ترقی کی راہیں کھول رہے ہیں، لیکن وہ تم کو وہاں لے جا کر ماریں گے، جہاں پانی بھی نہ پاؤ گے۔ اُن کو تمھارے باطن کی ساری کمزور رگیں معلوم ہوں گی اور وہ اپنی اندرونی وسوسہ اندازیوں سے بھی تم کو شکار کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنی ظاہری عشوہ گریوں سے بھی تم پر اپنے جال پھینکیں گے ـــــــ مطلب یہ ہے کہ اِس دشمن کو معمولی دشمن نہ سمجھنا، ہر وقت اِس سے چوکنے رہنا۔'' (تدبرقرآن ۳/۲۴۷)

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْهَاۤ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا

(یہ اِسی رفاقت کا نتیجہ ہے، اے پیغمبر کہ تمھاری قوم کے) یہ لوگ جب کسی بے حیائی[۳۲۷] کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو اِسی طریقے پر

الاعراف ۷

۳۲۶۔ یعنی شیطان کے یہ داؤں اُنھی پر چلتے ہیں جو خدا اور اُس کی ہدایت پر ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ زخرف (۴۳) کی آیت ۳۶ میں اِس طرح بیان ہوئی ہے کہ جو رحمٰن کی یاد سے بے پروا ہو جاتے ہیں، اُن پر ہم ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پھر وہی اُن کا رفیق بن جاتا ہے۔ اِس سے آپ سے آپ واضح ہوا کہ خدا کے جو بندے ایمان و ہدایت پر مضبوطی سے جمے رہتے ہیں، اُن پر شیطان کا کوئی داؤں نہیں چلتا۔ اُن کا پروردگار اُنھیں اُس سے اور اُس کے ساتھیوں کے حملوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے: 'اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ'*۔

۳۲۷۔ اصل میں لفظ 'فَاحِشَۃ' استعمال ہوا ہے۔ آگے کی آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اِس سے بے حیائی کے اُن کاموں کی طرف اشارہ کیا ہے جو مذہب کے نام پر کیے جاتے تھے۔ اِس طرح کی چیزیں مشرکین کے معبدوں اور صوفیانہ مذاہب کی درگاہوں اور عبادت گاہوں میں عام رہی ہیں۔ یہ پروہتوں، پجاریوں اور مجاوروں کی شیطنت سے وجود میں آتی تھیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب جاہلی میں بھی اِسی نوعیت کی ایک بدعت بیت اللہ کے برہنہ طواف کی رائج تھی۔ لوگ اِسے مذہبی فعل سمجھ کر کرتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ اُنھیں خدا نے اِس کا حکم دیا ہے۔ قریش بیت اللہ کے پروہت تھے اور اُنھوں نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ اُن سے باہر کے عرب اپنے کپڑوں میں کعبے کا طواف نہیں کر سکتے۔ اُن کے لیے ضروری ہے کہ یا قریش میں سے کسی سے اِس کام کے لیے کپڑے مستعار لیں یا ننگے طواف کریں۔ گویا دوسروں کے کپڑے ایسی آلایش ہیں جن کے ساتھ یہ غیر معمولی عبادت نہیں ہو سکتی۔

* النحل ۱۶: ۹۹۔

بِهَا ؕ قُلۡ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸﴾ قُلۡ اَمَرَ رَبِّىۡ بِالۡقِسۡطِ ۟ وَاَقِيۡمُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ ؕ ﴿۲۹﴾

پایا ہے اور خدا نے ہمیں اِسی کا حکم دیا ہے۔ اِن سے کہو، اللہ کبھی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا[۳۲۸]۔ کیا تم اللہ پر افترا کر کے ایسی باتیں کہتے ہو جنھیں تم نہیں جانتے؟ اِن سے کہو، میرے پروردگار نے (ہر معاملے میں) راستی[۳۲۹] کا حکم دیا ہے۔ اُس نے فرمایا ہے کہ ہر مسجد کے پاس اپنا رخ اُسی کی طرف کرو[۳۳۰] اور اطاعت کو اُس کے لیے خالص

۳۲۸؎ اِس لیے کہ جس چیز کو کوئی سلیم الفطرت انسان گوارا نہیں کر سکتا، اُسے خداوند قدوس کس طرح گوارا کر سکتا ہے، کجا یہ کہ وہ اُس کا حکم دے۔ اُس کے تمام احکام اُس کی صفات اور انسان کی فطرت کے تقاضوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ کسی بے ہودگی کا حکم نہیں دے سکتا۔

۳۲۹؎ اصل میں لفظ 'قِسۡط' آیا ہے، یعنی ٹھیک انصاف کی بات۔ یہ ظاہر ہے کہ وہی بات ہو سکتی ہے جو خدا کی صفات اور انسان کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہو، جس میں کوئی افراط و تفریط نہ ہو اور جو اُن مقاصد کو پورا کر دے جن کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پوری شریعت اِسی قسط پر مبنی ہے۔ وہ خود قائم بالقسط ہے اور اپنی کتابوں کے بارے میں بھی اُس کا ارشاد ہے کہ وہ اِس لیے نازل کی گئی ہیں کہ اُن کے ذریعے سے لوگ دین کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔ چنانچہ آگے کے تمام احکام اِسی پر مبنی کر کے بیان فرمائے ہیں۔

۳۳۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَاَقِيۡمُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ'۔ اِن کے بعد 'اِلَى اللّٰه وحده' یا اِن کے ہم معنی الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ اگلے جملے میں 'مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ' کے الفاظ اِسی کے مقابل میں آئے ہیں۔ اوپر جس قسط کا ذکر ہے، یہ اُس کا اولین تقاضا بیان ہوا ہے کہ ہر مسجد اللہ کی عبادت کے لیے خاص رہنی چاہیے اور بندۂ مومن کو بھی اپنا رخ ہر مسجد میں

فَرِيۡقًا هَدٰى وَفَرِيۡقًا حَقَّ عَلَيۡهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿۳۰﴾ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا وَلَا تُسۡرِفُوۡا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ

رکھ کر اُسی کو پکارو۔ تم (اُس کی طرف) اُسی طرح لوٹو گے، جس طرح اُس نے تمھاری ابتدا کی تھی۔[۳۳۱] ایک گروہ کو اُس نے ہدایت بخشی، (وہ اِن سب باتوں کو مانتا ہے) اور ایک گروہ پر گم راہی مسلط ہو گئی، اِس لیے کہ اُنھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق بنا لیا اور سمجھتے یہ ہیں کہ راہ ہدایت پر ہیں۔[۳۳۲] آدم کے بیٹو، ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنی زینت کے ساتھ آؤ،[۳۳۳] اور کھاؤ پیو، مگر حد سے آگے نہ بڑھو۔[۳۳۴] اللہ

الاعراف ۷

صرف اللہ وحدہ لاشریک کی طرف رکھنا چاہیے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، جب خالق و مالک خدا ہے تو یہ قسط کے خلاف ہے کہ عبادت کی پیشانی کسی اور کے سجدے سے آلودہ ہو۔

۳۳۱؎ یہ توحید کے مضمون کی توثیق مزید ہے۔ یعنی جس طرح تنہا آئے تھے، اُسی طرح تنہا خدا کی طرف لوٹو گے۔ جن کو تم شریکوں اور سفارشیوں کی حیثیت دیے بیٹھے ہو، اُن میں سے کوئی بھی تمھارے ساتھ نہیں ہوگا۔ آیت میں اِس کے لیے 'كَمَا بَدَاَكُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ' کے الفاظ ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...قرآن کی اِس بلاغت کے قربان جایئے کہ کل دو لفظ ہیں اور دو لفظوں میں اُس نے آخرت اور توحید، دونوں کا تعلق بھی واضح کر دیا اور آخرت کی ایک نہایت واضح دلیل بھی بیان فرما دی۔" (تدبر قرآن ۲۵۰/۳)

۳۳۲؎ اِس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ 'اِنَّا جَعَلۡنَا الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ' سے اوپر کا مضمون کس طرح پیدا ہوا تھا اور یہ بھی کہ اللہ شیاطین کو اُنھی کا رفیق بناتا ہے جو اللہ کو چھوڑ کر خود شیاطین کی رفاقت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ

حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[۳۳۵] اِن سے پوچھو، (اے پیغمبر)، اللہ کی اُس زینت کو کس نے حرام کر دیا جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی تھی اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو کس نے ممنوع ٹھیرایا ہے؟[۳۳۶] اِن سے کہو، وہ دنیا کی زندگی میں بھی

۳۳۳۔ یعنی مسجد خدا کے کسی پیغمبر نے بنائی ہو یا عام انسانوں نے، اُس میں اپنا لباس پہن کر آؤ۔ لباس میں سادگی اور درویشی احرام کے آداب میں سے ہے اور جتنی مطلوب ہے، حج وعمرہ میں اختیار کر لی گئی ہے۔ خدا کے دین میں اِس کے سوا ہر موقع کے لیے یہی حکم ہے کہ معمول میں جو لباس پہنتے ہو، اُسے پہن کر عبادت کے لیے آؤ۔ ایسی کوئی مسجد نہیں ہے جس کی حاضری کے لیے یہ شرط ہو کہ لوگ کپڑے اتار کر حاضر ہوں۔

۳۳۴۔ مطلب یہ ہے کہ پہننا ہو یا کھانا پینا، اِن میں سے کوئی چیز بھی ممنوع نہیں ہے۔ خدا کی شریعت میں ممنوع صرف اسراف ہے، اُس سے ہر حال میں بچنا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اللہ تعالیٰ 'قَائِمٌ بِالْقِسْطِ' ہے۔ اِس وجہ سے وہ 'مُقْسِطِيْن'، یعنی عدل واعتدال پر قائم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے، 'مُسْرِفِيْن'، یعنی عدل واعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بے اعتدالی افراط کی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے، تفریط کی نوعیت کی بھی، اور یہ دونوں ہی باتیں خدا کی پسند کے خلاف ہیں۔ نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ آدمی کھانے پینے پہننے ہی کو مقصود بنا لے اور رات دن اِسی کی سرگرمیوں میں مشغول رہے اور نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ اِن چیزوں کو راہبوں اور جوگیوں کی طرح تیاگ دے۔ تبذیر اور تفریط، دونوں ہی شیطان کی نکالی ہوئی راہیں ہیں۔ خدا زندگی کے ہر پہلو میں عدل واعتدال کو پسند فرماتا ہے۔''
>
> (تدبرقرآن ۳/۲۵۱)

۳۳۵۔ یہ الفاظ معمولی نہیں ہیں، اِس لیے کہ خدا جس کو پسند نہیں کرتا، لازماً اُسے مبغوض رکھتا

الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾ قُلْ اِنَّمَا

ایمان والوں کے لیے ہیں، (لیکن خدا نے منکروں کو بھی اُن میں شریک کر دیا ہے) اور قیامت کے دن تو خاص اُنھی کے لیے ہوں گی، (منکروں کا اُن میں کوئی حصہ نہ ہو گا)[۳۳۷]۔ ہم اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں، اپنی آیتوں کی اِسی طرح تفصیل کرتے ہیں۔

ہے۔

۳۳۶۔ زینت کا لفظ عربی زبان میں اُن چیزوں کے لیے آتا ہے جن سے انسان اپنی حس جمالیات کی تسکین کے لیے کسی چیز کو سجاتا بناتا ہے۔ چنانچہ لباس، زیورات وغیرہ بدن کی زینت ہیں؛ پردے، صوفے، قالین، غالیچے، تماثیل، تصویریں اور دوسرا فرنیچر گھروں کی زینت ہے؛ باغات، عمارتیں اور اِس نوعیت کی دوسری چیزیں شہروں کی زینت ہیں؛ غنا اور موسیقی آواز کی زینت ہے؛ شاعری کلام کی زینت ہے۔ دین کی صوفیانہ تعبیر اور صوفیانہ مذاہب تو اِن سب چیزوں کو مایا کا جال سمجھتے اور بالعموم حرام یا مکروہ یا قابل ترک اور ارتقاے روحانی میں سدراہ قرار دیتے ہیں، مگر قرآن کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے۔ اُس نے اِس آیت میں نہایت سخت تنبیہ اور تہدید کے انداز میں پوچھا ہے کہ کون ہے جو رزق کے طیبات اور زینت کی اُن چیزوں کو حرام قرار دینے کی جسارت کرتا ہے جو خدا نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں؟ یہ آخری الفاظ بطور دلیل ہیں کہ خدا کا کوئی کام عبث نہیں ہوتا۔ اُس نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں تو اِسی لیے پیدا کی ہیں کہ حدود الٰہی کے اندر رہ کر اُس کے بندے اِنھیں استعمال کریں۔ اِن کا وجود ہی اِس بات کی شہادت ہے کہ اِن کے استعمال پر کوئی ناروا پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔

۳۳۷۔ اِن فقروں میں مقابل کے الفاظ عربیت کے اسلوب پر حذف کر دیے گئے ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اِنھیں کھول دیا ہے۔ اِس سے مزید وضاحت ہو گئی ہے کہ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا نہ ایمان کے منافی ہے، نہ دین داری کے، نہ تقویٰ کے۔ اللہ نے تو یہ چیزیں پیدا ہی اہل ایمان کے

حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا

کہہ دو، میرے پروردگار نے تو صرف فواحش کو حرام کیا ہے، خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے[۳۳۸] اور حق تلفی اور ناحق زیادتی[۳۳۹] کو حرام کیا ہے اور اِس کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیراؤ، جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی[۳۴۰] اور اِس کو کہ تم اللہ پر افترا کر کے

الاعراف ۷

لیے کی ہیں، لہٰذا اصلاً اُنھی کا حق ہیں۔ اُس کے منکروں کو تو یہ اُن کے طفیل اور اُس مہلت کی وجہ سے ملتی ہیں جو دنیا کی آزمایش کے لیے اُنھیں دی گئی ہے۔ چنانچہ آخرت میں یہ تمام تر اہل ایمان کے لیے خاص ہوں گی، منکروں کے لیے اِن میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، وہ ہمیشہ کے لیے اِن سے محروم کر دیے جائیں گے۔

قرآن کا یہ اعلان، اگر غور کیجیے تو ایک حیرت انگیز اعلان ہے۔ عام مذہبی تصورات اور صوفیانہ مذاہب کی تعلیمات کے برخلاف قرآن دینی زندگی کا ایک بالکل ہی دوسرا تصور پیش کرتا ہے۔ تقرب الٰہی اور وصول الی اللہ کے لیے دنیا کی زینتوں سے دست برداری کی تلقین کے بجائے وہ ایمان والوں کو ترغیب دیتا ہے کہ اسراف وتبذیر سے بچ کر اور حدود الٰہی کے اندر رہ کر زینت کی سب چیزیں وہ بغیر کسی تردد کے استعمال کریں اور خدا کی اِن نعمتوں پر اُس کا شکر بجا لائیں۔

۳۳۸؎ یعنی بدکاری علانیہ کی جائے یا چھپ کر، ہر حال میں حرام ہے۔ اِس کے لیے جمع کا لفظ اِس لیے استعمال فرمایا ہے کہ یہ زنا، لواطت، وطی بہائم اور اِس نوعیت کے تمام جرائم کو شامل ہو جائے۔ جنسی اعضا دوسروں کے سامنے کھولے جائیں، جنسی معاملات کا افشا کیا جائے یا بدکاری کا ارتکاب ہو، لفظ 'فَوَاحِش' اِن سب کا احاطہ کرتا ہے۔

۳۳۹؎ زیادتی کے ساتھ ناحق کا اضافہ اُس کے گھنونے پن کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی زیادتی برحق بھی ہوتی ہے۔ ہر زیادتی بجائے خود ناحق ہے۔ چنانچہ انبیا

عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

کوئی ایسی بات کہو جسے تم نہیں جانتے[۳۴۱]۔ (اِس وقت بے خوف ہو رہے ہو، لیکن اِن سب حرمتوں کے معاملے میں تمھاری سرکشی پر وہ تمھیں بھی ایک دن لازماً پکڑے گا، اِس لیے کہ) ہر قوم کے لیے ایک مدت مقرر ہے، پھر جب اُن کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکتے ہیں، نہ آگے بڑھ سکتے ہیں[۳۴۲]۔ ۲۸-۳۴

علیہم السلام کے قتل کے جرم کے ساتھ بھی یہ لفظ اِسی طرح استعمال ہوا ہے۔

۳۴۰؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ شرک کے حق میں کوئی عقلی یا نقلی یا فطری دلیل نہ کبھی پیش کی جا سکی ہے اور نہ پیش کی جا سکتی ہے۔

۳۴۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ'۔ 'تَقُوْلُوْا' کے بعد 'عَلٰى' کا صلہ بتا رہا ہے کہ یہاں تضمین ہے، یعنی 'مُفْتَرِيْنَ عَلَى اللّٰهِ'۔ اپنی طرف سے حلال وحرام کے فتوے دیے جائیں یا اپنی خواہشات کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کی جائیں یا اپنی طرف سے شریعت تصنیف کی جائے اور اُسے خدا سے منسوب کر دیا جائے تو یہ سب چیزیں اِسی کے تحت ہوں گی۔

زینتوں کے بارے میں اوپر جو حکم بیان ہوا ہے، اُس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی شریعت میں حرام پھر کیا ہے؟ آیۂ زیر بحث میں قرآن نے اِس سوال کا جواب دیا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ اللہ نے صرف پانچ چیزیں حرام قرار دی ہیں: ایک فواحش، دوسرے حق تلفی، تیسرے ناحق زیادتی، چوتھے شرک اور پانچویں بدعت۔

خدا کی شریعت میں یہی پانچ چیزیں حرام ہیں۔ اِن کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ حلال وحرام کے معاملے میں یہ خدا کا اعلان ہے، لہٰذا کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اِن کے علاوہ کسی چیز کو حرام ٹھیرائے۔ چنانچہ اب اگر کوئی چیز حرام ہو گی تو اُسی وقت ہو گی، جب اِن میں سے کوئی چیز اُس میں

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا

آدم کے بیٹو، (میں نے پہلے دن تمھیں بتا دیا تھا کہ) اگر تمھارے پاس خود تمھارے اندر سے پیغمبر آئیں تم کو میری آیتیں سناتے ہوئے تو اُن کی بات ماننا، اِس لیے کہ جو خدا سے ڈرے اور اُنھوں نے اپنی اصلاح کر لی، اُن کے لیے پھر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔[۳۴۳] اِس کے برخلاف جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور تکبر کر کے

پائی جائے گی۔ روایتیں، آثار، حدیثیں اور پچھلے صحیفوں کے بیانات، سب قرآن کے اِسی ارشاد کی روشنی میں سمجھے جائیں گے۔ اِس سے ہٹ کر یا اِس کے خلاف کوئی چیز بھی قابل قبول نہ ہوگی۔

۳۴۲؎ اِس سے معلوم ہوا کہ جس طرح افراد کے لیے اجل ہے، اُسی طرح قوموں کے لیے بھی اجل ہے۔ یہ اجل علم و اخلاق میں اُن کے اضمحلال کی رعایت سے مقرر کی جاتی ہے۔ رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت ہو جائے تو اللہ اُن پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں اور نہ ہو تو علم و اخلاق میں زوال کی آخری حد کو پہنچ جانے کے بعد اُسی طرح ہلاک ہو جاتی ہیں، جس طرح افراد مرتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۵۸ میں اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب نہ دیں۔ یہ نوشتۂ الٰہی میں لکھا ہوا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پہلے حام اور سام کی اولاد اِس قانون کی زد میں آئی اور اب یافث کی اولاد معرض امتحان میں ہے۔ یہ آخری اقوام ہیں جن پر تاریخ کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اِس کے بعد قیامت برپا ہو جائے گی۔ یہاں مخاطب قریش ہیں۔ اُن کے لیے یہ فیصلہ اُس وقت صادر ہوا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد سورۂ توبہ (۹) میں اُن کے استیصال کا حکم دے دیا گیا۔

خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یَنَالُہُمْ نَصِیْبُہُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ ؕ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَتْہُمْ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوْنَہُمْ ۙ قَالُوْٓا اَیْنَ مَا کُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَ شَہِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ اَنَّہُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِکُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِی النَّارِ ؕ کُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّۃٌ لَّعَنَتْ اُخْتَہَا ؕ حَتّٰٓی اِذَا ادَّارَکُوْا فِیْہَا جَمِیْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىہُمْ

اُن سے منہ موڑ لیا،[۳۴۴] وہی دوزخ کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ سو اُن سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھیں یا اُس کی آیتوں کو جھٹلا دیں۔ اُن کے نوشتے میں جو حصہ اُن کے لیے (دنیا کی زندگی میں لکھ دیا گیا) ہے، وہ اُنھیں پہنچے گا۔ یہاں تک کہ جب ہمارے فرشتے اُن کی روحیں قبض کرنے کے لیے اُن کے پاس آئیں گے تو پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے، وہ کہاں ہیں[۳۴۵]؟ وہ کہیں گے کہ وہ سب تو ہم سے کھوئے گئے اور اپنے خلاف خود گواہی دیں گے کہ وہ فی الواقع منکر تھے۔ اللہ فرمائے گا: جنوں اور انسانوں میں سے جو گروہ تم سے پہلے گزرے ہیں،

۳۴۳؎ یہ اُس وعدے کی یاددہانی ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۳۸ میں ہوا ہے۔ یہاں مخاطب چونکہ قریش ہیں، اِس لیے مدعا یہ ہے کہ اُسی وعدے کے مطابق تمھارے اندر بھی ایک رسول کی بعثت ہو چکی ہے، لہٰذا شیطان کے فتنوں سے امان چاہتے ہو تو اُس کی پیروی کرو۔

۳۴۴؎ اصل میں 'اِسْتِکْبَار' کا لفظ آیا ہے جس کے ساتھ 'عَنْ' کا صلہ ہے۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ یہاں تضمین ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے کھول دیا ہے۔

۳۴۵؎ اوپر جس 'اِفْتِرَاءً عَلَی اللّٰہِ' کا ذکر ہے، یہ اُس کی وضاحت ہو گئی ہے۔

لِاُوۡلٰىهُمۡ رَبَّنَا هٰۤؤُلَاۤءِ اَضَلُّوۡنَا فَاٰتِهِمۡ عَذَابًا ضِعۡفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعۡفٌ وَّلٰـكِنۡ لَّا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتۡ اُوۡلٰىهُمۡ لِاُخۡرٰٮهُمۡ فَمَا كَانَ لَـكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا

اُن کے ساتھ تم بھی دوزخ میں داخل ہو جاؤ۔[۳۴۶] اِن میں سے ہر گروہ جب داخل ہو گا تو اپنے ساتھی گروہ پر لعنت کرے گا، یہاں تک کہ جب سب وہاں اکٹھے ہو جائیں گے تو اُن کے پچھلے اگلوں کے بارے میں کہیں گے:[۳۴۷] پروردگار، یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہمیں گم راہ کیا، اِس لیے اِنھیں آگ کا دہرا عذاب دے۔ ارشاد ہوگا: تم سب کے لیے دہرا عذاب ہے، مگر تم جانتے نہیں ہو۔[۳۴۸] اِس پر اگلے پچھلوں سے کہیں گے: (ہم

۳۴۶؎ یعنی شیطان کے یہ پیرو تمھارے ساتھی ہوں گے اور تمھارا ٹھکانا بھی اِنھی کے ساتھ دوزخ ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، گویا ساتھی بھی بدترین اور جگہ بھی بدترین۔

۳۴۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوۡا فِيۡهَا جَمِيۡعًا، قَالَتۡ اُخۡرٰٮهُمۡ لِاُوۡلٰٮهُمۡ'۔ اِن میں 'اِدَّارَکُوۡا' عربیت کے قاعدے سے 'تدارکوا' میں تبدیلی سے بنا ہے اور 'قَالَتۡ اُخۡرٰٮهُمۡ لِاُوۡلٰٮهُمۡ' میں 'ل'، 'فی' کے معنی میں ہے۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ پہلی مرتبہ دیکھیں گے تو ایک دوسرے پر لعنت کریں گے اور جب اکٹھے ہو جائیں گے تو اخلاف اپنے اسلاف کے بارے میں استغاثہ پیش کر دیں گے۔ آگے اِسی کی وضاحت ہے۔

۳۴۸؎ یعنی ایک عذاب خود گم راہی اختیار کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو گم راہ کرنے اور جرائم پیشگی کی میراث چھوڑنے کا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ نیکی اور بدی، دونوں متعدی چیزیں ہیں۔ اِن کے اثرات سلف سے خلف تک منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہر قتل جس طرح قاتل کے حساب میں درج ہوتا ہے، اُسی طرح آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل کے حساب میں بھی آپ سے آپ درج ہو جاتا ہے، جس نے خدا کی زمین پر پہلا قتل کیا تھا۔ پھر یہ قاتل بعد میں آنے والوں

كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٣٩﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ

مجرم ہیں) تو تمھیں بھی ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی[۳۴۹]، سو چکھو اپنے کیے کی پاداش میں عذاب کا مزہ۔ ۳۵-۳۹

یہ قطعی ہے کہ جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور تکبر کر کے اُن سے منہ موڑا ہے[۳۵۰]، اُن کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے[۳۵۱] اور وہ ہرگز جنت میں داخل نہیں

الاعراف ۷

کے لیے قابیل بن جاتا ہے اور سلف سے خلف تک یہ سلسلہ اِسی طرح چلتا رہتا ہے۔ اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ ہر ایک کے لیے دہرا عذاب ہے۔ ہر گروہ کو اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ اُن گناہوں کا حصہ بھی لینا ہے جن کے ارتکاب سے اُس نے دوسروں کے لیے بری مثال قائم کی۔ اسلاف اگر اپنی چھوڑی ہوئی میراث کے برے نتائج سے نہیں بچ سکتے تو اخلاف کو بھی اپنے اُس تخم فساد کی فصل لازماً کاٹنی ہے جو اُنھوں نے دوسروں کے لیے بویا ہے، اِس لیے کہ ہر گروہ کسی کا خلف ہے تو کسی کا سلف بھی ہے۔

۳۴۹۔ اِس لیے کہ تم نے بھی اُسی جرم کا ارتکاب کیا جو ہم نے کیا تھا۔ ہمارے مقابل میں تم یقیناً ترجیح اور فضیلت کے حق دار ہوتے، اگر تم نے کوئی اچھی مثال قائم کی ہوتی۔ لیکن جب تم بھی وہی کچھ کر کے آئے ہو جو ہم کر کے آئے ہیں تو کسی فضیلت یا رعایت کا تقاضا کس طرح کر سکتے ہو؟

۳۵۰۔ لفظ 'اِسْتِکْبَار' کے ساتھ یہاں بھی 'عَنْ' کا صلہ ہے۔ اِس کا فائدہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔

۳۵۱۔ یہ نفس فعل کی نہیں، بلکہ اُس کے لازم کی نفی ہے۔ یعنی آسمان میں اُن کا خیر مقدم نہیں ہوگا کہ اُس کے دروازے سلام و تحیت اور اہلاً و سہلاً کے ساتھ اُن کے لیے کھولے جائیں، بلکہ

الْخِيَاطِ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ

ہوں گے، جب تک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہ گزر جائے[۳۵۲]۔ (سن لو)، ہم مجرموں کو اِسی طرح سزا دیتے ہیں۔ اُن کے لیے دوزخ کا بچھونا اور اوپر سے اُسی کا اوڑھنا ہوگا۔ (سن لو)، ہم ظالموں کو اِسی طرح سزا دیتے ہیں۔ اِس کے برخلاف جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے اچھے کام کیے ہیں ـــــ اور ہم (اِس باب میں) کسی جان پر اُس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے[۳۵۳] ـــــ وہی جنت کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن

ذلت و فضیحت کے ساتھ وہ اُس کے پھاٹکوں میں دھکیل دیے جائیں گے۔

۳۵۲؎ یہ تعلیق بالمحال کا اسلوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کا جنت میں جانا اتنا ہی محال ہے، جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا محال ہے۔ قرآن نے یہ بات اُن کے اصل جرم، یعنی استکبار کے حوالے سے کہی ہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام نے سبب استکبار، یعنی دولت کے حوالے سے۔ اُن کا ارشاد ہے:

> ”...میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونا مشکل ہے۔ اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اِس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔“ (متی ۱۹: ۲۳-۲۴)

۳۵۳؎ یہ جملۂ معترضہ ہے جس سے برسر موقع اطمینان دلا دیا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی جو ذمہ داری بندوں پر ڈالی گئی ہے، وہ اُسی حد تک ہے، جس حد تک اُن کے امکان میں ہے۔ وہ اُن کی حد وسع سے زیادہ نہیں ہے۔

مِّنۡ غِلٍّ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهِمُ الۡاَنۡهٰرُ ۚ وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَمَا كُنَّا لِنَهۡتَدِیَ لَوۡلَاۤ اَنۡ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ ؕ وَنُوۡدُوۡۤا اَنۡ تِلۡكُمُ الۡجَنَّةُ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾

کے دلوں کی ہر رنجش ہم نکال دیں گے۔[۳۵۴] اُن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی اور وہ کہیں گے: اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں اِس راستے کی ہدایت بخشی، اور اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ بخشتا تو ہم یہ راستہ خود نہیں پا سکتے تھے۔[۳۵۵] حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے۔ (اُس وقت) اُنھیں ندا آئے گی کہ یہی جنت ہے، اِس کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث بنائے گئے ہو۔[۳۵۶] ۴۰-۴۳

۳۵۴؎ یہاں بھی لازم مراد ہے، یعنی دوزخ میں تو ایک دوسرے پر لعنت ملامت ہو رہی ہو گی، لیکن جنت میں اِس کے برخلاف لوگ آپس میں تبادلۂ مہر و محبت کریں گے، دنیا کی رنجشیں اور کدورتیں دور ہو چکی ہوں گی، ایک دوسرے کے لیے تپاک اور محبت کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

۳۵۵؎ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ حاصل ہوا ہے، خدا کی توفیق اور پیغمبروں کی تذکیر سے حاصل ہوا ہے۔ یہ عنایت اور یہ اہتمام نہ ہوتا تو ہم جنت کا یہ راستہ نہیں پا سکتے تھے۔ دنیا کا سفر ایک پر صعوبت سفر تھا، بہ خیر و خوبی انجام کو پہنچ گیا۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ آج اُن نعمتوں سے بہرہ یاب ہو رہے ہیں جو ہماری توقعات، قیاسات اور اندازوں سے اتنی زیادہ ہیں کہ اپنی سعی و عمل سے ہم کسی طرح اُن کا استحقاق پیدا نہیں کر سکتے تھے۔

۳۵۶؎ یہ شاباش کا جملہ ہے کہ بے شک، تم نے بازی جیت لی اور اپنے باپ کی کھوئی ہوئی جنت دوبارہ حاصل کر لی۔ یہ تمھاری میراث تھی اور اپنی جد و جہد سے تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم حق دار

وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَہَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ فَاَذَّنَ

جنت کے لوگ (اِس موقع پر) دوزخ والوں کو پکار کر پوچھیں گے کہ ہم نے تو اُس وعدے کو بالکل سچا پایا جو ہمارے پروردگار نے ہم سے کیا تھا، پھر کیا تم نے بھی اُس وعدے کو سچا پایا جو تمھارے پروردگار نے تم سے کیا تھا؟[۳۵۷] وہ جواب دیں گے:

الاعراف ۷

ہو کہ تمھاری یہ میراث تمھیں لوٹا دی جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... اہل جنت کا خود اپنا احساس تو اوپر یہ نقل ہوا ہے کہ وہ اِس جنت کو اپنی سعی و عمل کے بجائے صرف خدا کے فضل و احسان کا ثمرہ سمجھیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ اِس کو اُن کے سعی و عمل کا ثمرہ قرار دے گا۔ یہ تکمیل نعمت کی معراج ہے۔ بندوں کے اعمال کا درجہ اِس آیت نے اتنا اونچا کر دیا ہے کہ اِس سے زیادہ اونچے درجے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں ہم جو کچھ پاتے ہیں، خدا کے فضل ہی سے پاتے ہیں۔ آخرت میں بھی خدا کے فضل ہی سے پائیں گے، لیکن رب کریم اِس کو ہمارا حق اور ہماری محنت کا ثمرہ قرار دے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اُس ابدی بادشاہی کا جس کے متعلق ہر شخص کا شعور یہ ہو گا کہ یہ اُس نے اپنی کوششوں سے بنائی ہے اور یہ لازوال ہے! انسان صرف یہی نہیں چاہتا کہ اُس کو نعمتیں حاصل ہوں، بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ نعمتیں اُس کی اپنی ہوں۔ اِس احساس کے بغیر وہ کسی نعمت کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اُس کی فطرت کا یہ تقاضا بھی پورا کر دے گا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۵۹)

۳۵۷؎ یہ سوال تفضیح کے لیے ہے۔ آگے اِس کا جواب نقل ہوا ہے۔ وہ بھی، اگر غور کیجیے تو مجرموں کا آخری اعتراف ہے جس کے بعد اُن کے اور اُن کی سزا کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں رہ جائے گی۔ جنت اور دوزخ کے لوگوں میں اِس سوال و جواب سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہاں پہنچ کر انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں میں کیا انقلاب برپا ہو جائے گا کہ لوگ جب چاہیں گے اور جہاں سے چاہیں گے، ایک دوسرے کو مخاطب کر لیں گے۔

مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا

ہاں۔ پھر ایک پکارنے والا اُن کے درمیان پکارے گا کہ خدا کی لعنت اِن ظالموں پر (فرمایا): اِن پر جو (آج) اللہ کی راہ سے روکتے [۳۵۸] اور اُس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں [۳۵۹] اور آخرت کے منکر ہیں [۳۶۰]۔ ۴۴-۴۵

اِن دونوں گروہوں کے درمیان پردے کی دیوار ہوگی [۳۶۱] اور دیوار کی برجیوں پر کچھ

۳۵۸؎ اصل میں لفظ 'یَصُدُّوْنَ' آیا ہے۔ یہ لازم اور متعدی، دونوں معنوں میں آتا ہے۔ ترجیح کا قرینہ نہ ہو تو اِسے متعدی مفہوم میں لینا چاہیے، اِس لیے کہ متعدی لازم کو بھی شامل ہو جاتا ہے۔

۳۵۹؎ قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ توحید کی صراط مستقیم میں کجی پیدا کر کے شرک کی پگ ڈنڈیاں نکالنے کی تعبیر ہے۔

۳۶۰؎ 'اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ' سے یہاں تک یہ پورا ٹکڑا منادی کے اعلان کا حصہ نہیں ہے۔ اُس کا اعلان آیت میں 'الظّٰلِمِيْنَ' پر ختم ہو گیا ہے۔ اُس کے بعد یہ ٹکڑا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور تضمین ہے جس نے کلام کو بالکل مطابق حال کر دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...اِس تضمین سے گویا یہ وضاحت ہو گئی کہ ظالمین سے مراد کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا کہ وہی لوگ جو آج اللہ کی راہ سے لوگوں کو روک رہے ہیں، جو اُس میں کجی پیدا کرنے کے لیے ساعی ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔ اِس وضاحت کے بعد آخرت میں ہونے والی منادی وقت کے قریش پر ٹھیک ٹھیک اِس طرح چسپاں ہو گئی، گویا جامۂ بود کہ بر قامت او دوختہ بود۔" (تدبر قرآن ۳/ ۲۶۵)

بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ

نمایاں اور ممتاز لوگ ہوں گے[362] جو ہر ایک کو اُس کی علامت[363] سے پہچانیں گے اور جنت کے لوگوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو ــــــ یہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے، مگر امیدوار ہوں گے (کہ داخل ہو جائیں گے[364])۔ اُن کی نگاہیں جب دوزخ

۳۶۱؎ اصل میں لفظ 'حِجَاب' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد وہ دیوار ہے جو دوزخ اور جنت کے درمیان کھڑی کر دی جائے گی۔ سورۂ حدید (۵۷) کی آیت ۱۳ میں اِس کا ذکر ہے۔

۳۶۲؎ آیت کے الفاظ ہیں: 'وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ'۔ لفظ 'اَعْرَاف' کے معنی بلندیوں کے ہیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں یہ اُن برجیوں اور دیدبانوں کے لیے آیا ہے جو اطراف و جوانب کو دیکھنے کے لیے اُس دیوار پر بنی ہوں گی جو دوزخ اور جنت کے درمیان کھڑی کی جائے گی۔ لفظ 'رِجَال' جب اِس طریقے سے آتا ہے، جس طرح یہاں آیا ہے تو اِس سے نمایاں اور ممتاز شخصیتیں مراد ہوتی ہیں۔ یہاں اِس سے امتوں کے رجال مراد ہیں جو دنیا میں حق کے علم بردار اور خیر کے داعی بن کر کھڑے ہوئے۔

۳۶۳؎ یعنی اُس علامت سے جو لوگوں کے اعمال کے اثرات سے اُن کے چہروں پر نمایاں ہو جائے گی۔ روایتوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو وضو کے آثار سے پہچانیں گے، جن سے اُن کی پیشانیاں اور چہرے چمک رہے ہوں گے۔* اِس نوعیت کے بعض اشارات قرآن میں بھی ہیں۔

۳۶۴؎ یہ الفاظ اُن کی ذہنی کیفیت کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں کہ یہ سارا اعزاز و اکرام دیکھنے کے باوجود اپنی تواضع اور فروتنی کے سبب سے وہ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ پروردگار کا فیصلہ

* مسلم، رقم ۵۰۳۔

قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ

والوں کی طرف پھیری جائیں گی تو[۳۶۵] (بے اختیار) کہیں گے: پروردگار، ہمیں اِن ظالم لوگوں کا ساتھی نہ بنانا[۳۶۶]۔ (اِس کے بعد) یہ برجیوں والے (دوزخ کے) کچھ نمایاں لوگوں[۳۶۷] کو پکاریں گے، جنھیں یہ اُن کی علامت سے پہچانتے ہوں گے۔ یہ اُن سے کہیں گے: تمھارے کیا کام آئے تمھارے جتھے اور تمھارا وہ تکبر جو تم کیا کرتے تھے! (ذرا

الاعراف ۷

جب تک صادر نہیں ہو جاتا، اُس کی رحمت کی امید ہی کی جا سکتی ہے۔

۳۶۵؎ آیت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ جنت کے نظارے میں اُن کی محویت کو دیکھ کر اُنھیں توجہ دلائی جائے گی کہ ذرا ایک نظر اِن اہل دوزخ پر بھی ڈال لیجیے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جنت اور دوزخ کا یہ مشاہدہ اُنھیں اِس لیے کرایا جائے گا کہ حق و باطل، دونوں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اہل حق کو بشارت دیں اور حق کے دشمنوں کی فضیحت کے لیے اُن کو سرزنش کریں۔

۳۶۶؎ یہ تعوذ کے الفاظ ہیں جو دوزخ والوں پر نظر پڑتے ہی بے اختیار اُن کی زبان سے نکلیں گے۔ اِن سے جہنم کے مناظر کی ہول ناکی بھی ظاہر ہوتی ہے اور وہ کمال خشیت بھی جس کے ساتھ وہ اِن مناظر کو دیکھ رہے ہوں گے۔

۳۶۷؎ یہاں بھی اصل میں وہی لفظ 'رِجَال' ہے جس کے بارے میں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ جب اِس طریقے سے آتا ہے، جس طرح اِن آیتوں میں آیا ہے تو اِس سے کسی گروہ یا جماعت کے بڑے اور نمایاں لوگ مراد ہوتے ہیں۔ آگے وضاحت ہے کہ اِن کی علامتیں اِنھیں دوسروں سے ممتاز کر دیں گی، لہٰذا پہچانے جائیں گے کہ یہ فرعون ہے، یہ ابوجہل اور ابولہب ہے اور

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ

الاعراف ۷

جنت کی طرف دیکھو)، کیا یہی ہیں وہ لوگ جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ اللہ کی کسی رحمت کے مستحق نہیں ہو سکتے؟[۳۶۸] (جنت کے لوگو)، تم (اپنی اِس) جنت میں داخل رہو،[۳۶۹] اب نہ تمھارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ تم کبھی غم زدہ ہو گے۔ ۴۶-۴۹

اہل جنت کو (دیکھ کر) یہ دوزخ والے آواز دیں گے کہ اپنے ہاں کا کچھ پانی ہم پر بھی انڈیل دو یا کچھ روزی جو اللہ نے تمھیں عطا فرمائی ہے، ہمیں بھی عنایت کرو۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں منکروں کے لیے حرام کر رکھی ہیں[۳۷۰]۔۔۔۔

یہ فلاں اور فلاں ہے۔

۳۶۸؎ قرآن میں کئی جگہ بیان ہوا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے منکرین نے اُن کے پیرووں کو اُن کی غریبی اور کمزوری کے سبب سے بالعموم اِسی نظر سے دیکھا اور اُن کے بارے میں اِسی اعتماد سے دعوے کیے ہیں کہ جنھیں خدا نے دنیا میں کچھ نہیں دیا، وہ آخرت میں اُس کی رحمتوں کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں؟

۳۶۹؎ اصل میں لفظ 'اُدْخُلُوْا' آیا ہے۔ یہ اپنے ابتدائی معنی میں نہیں، بلکہ تمکن و استمرار کے مفہوم میں ہے۔ سورۂ یوسف کی آیت 'اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ'* میں بھی یہی مفہوم

* یوسف ۱۲: ۹۹۔

نَنۡسٰهُمۡ كَمَا نَسُوۡا لِقَآءَ يَوۡمِهِمۡ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَجۡحَدُوۡنَ ﴿۵۱﴾ وَلَقَدۡ جِئۡنٰهُمۡ بِكِتٰبٍ فَصَّلۡنٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ هُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۲﴾ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا تَاۡوِيۡلَهٗ ؕ يَوۡمَ يَاۡتِىۡ تَاۡوِيۡلُهٗ يَقُوۡلُ

(فرمایا)[۳۷۱]: اُن کے لیے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنالیا اور جنھیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں مبتلا کیے رکھا[۳۷۲]۔ سو آج ہم اُنھیں اُسی طرح بھلا دیں گے[۳۷۳]، جس طرح وہ اپنے اِس دن کی ملاقات کو بھولے رہے اور جس طرح وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے[۳۷۴] ـــــ (اِس وقت[۳۷۵]، اے پیغمبر)، ہم (تیری قوم کے) اِن لوگوں کے پاس ایک ایسی

ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے تمھیں جنت سے سرفراز فرمایا ہے، تم اِس میں سرفراز رہو، تمھارے لیے اب نعمت ہی نعمت ہے۔

۳۷۰۔ مطلب یہ ہے کہ اُنھیں حتمی طور پر اِن سے محروم رکھنے کا فیصلہ کر دیا ہے، اِس لیے یہ نعمتیں نہ اُن کو پہنچ سکتی اور نہ وہ کسی طرح اِنھیں پا سکتے ہیں۔

۳۷۱۔ یہاں سے آگے پھر ایک تضمین ہے۔ قریش کی تنبیہ کے لیے اہل جنت کے جواب کے ساتھ ملا کر اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرما دی ہے کہ منکرین سے کون لوگ مراد ہیں۔

۳۷۲۔ یہ وجہ بیان ہوئی ہے کہ اُنھوں نے اِس طرح کا لاابالیانہ طرز عمل کیوں اختیار کیا۔ فرمایا: اِس لیے کہ دنیا میں عیش اور آزادی کے ساتھ جینے کی جو مہلت اُنھیں دی گئی، وہی اُنھیں دھوکے میں ڈالنے کا باعث بن گئی اور اُنھوں نے خیال کیا کہ دنیا بس اِسی لیے پیدا ہوئی ہے کہ بابر بہ عیش کوش۔

۳۷۳۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو بھولتا نہیں، چنانچہ لازم مقصود ہے، یعنی نظر انداز کر دیں گے۔

۳۷۴۔ اصل الفاظ ہیں: 'مَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَجۡحَدُوۡنَ'۔ پچھلے جملے پر عطف نے اِس فقرے میں 'کما کانوا' کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ج فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ط قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

کتاب لے آئے ہیں، جس کی تفصیل ہم نے علم قطعی کی بنیاد پر کی ہے[۳۷۶]، اُن لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت بنا کر جو ایمان لائیں[۳۷۷]۔ کیا یہ اِسی کے منتظر ہیں کہ جس چیز کی خبر دی جا رہی ہے، اُس کی حقیقت سامنے آ جائے؟ جس دن اُس کی حقیقت سامنے آ جائے گی تو یہی لوگ جنھوں نے اِس سے پہلے اُسے نظر انداز کر دیا تھا، کہیں گے کہ بے شک، ہمارے پروردگار کے بھیجے ہوئے پیغمبر بالکل سچی بات لے کر آئے تھے۔ پھر کیا ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہمارے حق میں سفارش کر دیں یا ہے کوئی صورت کہ ہمیں لوٹا دیا جائے کہ ہم اُس کے خلاف عمل کریں جو پہلے کرتے رہے ہیں! (افسوس)، اِن لوگوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال لیا اور جو کچھ افترا یہ کرتے رہے ہے[۳۷۸]، وہ سب اِن سے جاتے رہے ہیں۔ ۵۰-۵۳

۳۷۵؎ یہاں سے آگے روے سخن قریش کی طرف ہے۔ یہ انذار کی سورہ ہے اور اِس کے مخاطب بھی وہی ہیں، اِس لیے کلام بار بار اُن کی طرف لوٹتا ہے۔

۳۷۶؎ یعنی ایسے علم کی بنیاد پر جو ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے اور بالکل اٹل ہے۔ آیت میں اِس کے لیے لفظ 'عِلْم' آیا ہے جس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کی صورت میں ایک ایسی کتاب اِن کے پاس آئی ہے جس میں ہم نے اپنے علم قطعی کی روشنی میں اُن تمام امور کی تفصیل کر دی ہے جن کو ماننا اور جن پر عمل کرنا آخرت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

۳۷۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'۔ اِن میں فعل ارادۂ فعل کے

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ قف یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا لا

(لوگو)، حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا[۳۷۹]، پھر اپنے عرش پر متمکن ہوا[۳۸۰]۔ وہ رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے جو

معنی میں ہے، یعنی جو ماننا چاہیں، اُن کے لیے دنیا میں ہدایت اور نتیجے کے طور پر آخرت میں رحمت بنا کر۔

۳۷۸؎ یعنی خدا پر جھوٹ باندھ کر اُس کے شریک ٹھیراتے اور اپنی طرف سے بدعتیں ایجاد کرتے رہے۔

۳۷۹؎ یہ اللہ کے ایام ہیں جن کے بارے میں قرآن نے صراحت فرمائی ہے کہ ہمارے حساب سے ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اور پچاس ہزار سال کے برابر بھی۔ مدعا یہ ہے کہ جس کو کائنات کا خالق مانتے ہو، وہی کائنات کا رب بھی ہے۔ اُس نے دنیا کو پیدا کر کے تمھارے مزعومہ شرکا وشفعا کے حوالے نہیں کر دیا جنھیں تم رب بنائے بیٹھے ہو اور اِسی بنا پر اُن کی عبادت کرتے ہو۔ وہ اُس کا انتظام وانصرام خود دیکھ رہا ہے۔ اِس عالم کو وہ اپنے کلمۂ 'کُنْ' سے چشم زدن میں بھی پیدا کر سکتا تھا، مگر اُس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اِسے اہتمام و تدریج کے ساتھ اور چھ ادوار میں پیدا کرے تاکہ اُس کے کمال قدرت کے ساتھ اُس کی ربوبیت اور رحمت کی شانیں بھی نمایاں ہوں اور تم اپنے خالق کو اُس کی ابدی رحمتوں کے ساتھ اپنے پروردگار کی حیثیت سے بھی پہچان لو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...خدا کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں تھی کہ ہماری غذا کے لیے براہ راست آسمان سے روٹی برستی، پھر یہ کیوں ضروری ہوا کہ ہوائیں چلیں، بادل اٹھیں، مینہ برسے، کھیتوں میں ہل چلیں، گندم بوئی جائے، انکھوے نکلیں، ڈنٹھل پیدا ہوں، اُس میں برگ و بار نمایاں ہوں، فصل اپجے، خوشے نمودار ہوں، پھر اُن میں دانے بیٹھیں، پھر گرم وخشک ہوائیں چلیں جو اِن دانوں کو

وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ وَالنُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمۡرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۵۴﴾ اُدۡعُوۡا رَبَّكُمۡ تَضَرُّعًا وَّخُفۡيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ

اُس کے پیچھے دوڑتی چلی آتی ہے۔ اور اُس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے ہیں جو اُس کی حکم برداری میں لگے ہوئے ہیں۔[۳۸۱] سنو، خلق بھی اُسی کی ہے اور حکم بھی اُسی

پکائیں اور اِس طرح کہیں چھ مہینے کے گرم و سرد مراحل سے گزر کر گندم کا دانہ کھیت سے کسان کے کھتے تک پہنچے؟ یہ سب اِس لیے ہے کہ اِس طرح اِس کائنات کی ایک ایک چیز خدا کی آیات خلق و تدبیر اور اُس کے عجائب قدرت و حکمت کا ایک دفتر بن گئی ہے۔ انسان اِس کے جس گوشے پر بھی نظر ڈالتا ہے، اگر آنکھیں کھلی ہوئی اور عقل بیدار ہو تو معرفت الٰہی کا ایک دبستان کھل جاتا ہے۔ ایک ایک شے نہ جانے کتنے بھیس بدلتی اور کتنے جامے تبدیل کرتی ہے تاکہ وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرے اور ہم اُن کے اندر خدا کی نشانیوں کو دیکھیں اور اُن سے سبق حاصل کریں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۷۷)

۳۸۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ'۔ یہ خدا کے اقتدار کی تعبیر ہے اور 'اِسۡتَوٰی' کے ساتھ 'عَلٰی' نے اِس میں تمکن کے معنی پیدا کر دیے ہیں۔ اِس سے وہ بات مزید واضح ہو گئی ہے جو پچھلے جملے میں مضمر تھی کہ خدا محض علت العلل نہیں ہے کہ محرک اول کی حیثیت سے اُس نے ایک حرکت تو پیدا کر دی، مگر اِس کے بعد کسی گوشے میں جا کر بیٹھ گیا ہے۔ ہرگز نہیں، وہ اپنی کائنات کے تخت حکومت پر متمکن ہے اور اُس کے تمام معاملات براہ راست اُس کی نگرانی میں انجام پا رہے ہیں۔

۳۸۱؎ یہ اُس تدبیر و انتظام کی وضاحت کی ہے جو 'اِسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ' کے جملے میں بالاجمال بیان ہوا ہے۔ یعنی ہر چیز اپنے مفوضہ فرائض پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ انجام دے رہی ہے۔ نہ کوئی چیز اپنی ذمہ داری سے غافل ہو سکتی ہے اور نہ بال برابر اپنے حدود سے تجاوز کرتی ہے۔ مہ و آفتاب ہوں یا نجوم و کواکب، سب اپنے خالق کے فرماں بردار ہیں، اُس کے حکم

الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا

کا ہے۔[۳۸۲] بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، جہانوں کا پروردگار۔[۳۸۳] تم اپنے پروردگار کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے پکارو،[۳۸۴] اُس کے سامنے یہی زیبا ہے، اِس لیے کہ وہ حد سے بڑھنے

سے سرمو انحراف نہیں کرتے۔

۳۸۲؎ یعنی نہ خلق میں اُس کا کوئی شریک ہے اور نہ مخلوقات کی تدبیر امور میں۔ وہی خالق ہے، وہی مالک ہے اور اُسی کا امر و حکم کائنات کے گوشے گوشے میں جاری ہے۔ کسی فرشتے، کسی جن، کسی پیغمبر، کسی ولی کا اِس معاملے میں کوئی حصہ نہیں ہے، سب اُس کے حکم کے پابند اور اُس کے سامنے مجبور محض ہیں۔

۳۸۳؎ چنانچہ اِس کی کوئی ضرورت نہیں کہ اُس کی بارگاہ تک رسائی کے لیے وسائل و وسائط تلاش کیے جائیں۔ اُس کی عظمت و جبروت کے ساتھ اُس کی رحمت و برکت بھی بے پایاں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ خدا کے باب میں اُس غلط فہمی کا ازالہ ہے جس میں مشرک قومیں بالعموم مبتلا ہوئیں کہ اُنھوں نے خدا کی عظمت و جبروت کا تصور اِس قدر بڑھایا کہ اُس کی صفات رحمت و برکت کا تصور اُس کے نیچے بالکل دب کر رہ گیا۔ اِس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بندوں کے لیے خدا سے براہِ راست تعلق و توسل ناممکن سمجھ لیا گیا اور پھر ایسے وسائل و وسائط کی تلاش ہوئی جو خدا سے مقصد برآری کا ذریعہ بن سکیں... صفات الٰہی کے باب میں یہ گم راہی شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل ہے۔ مشرکین نے بہت سے فرضی معبودوں کی پرستش، بالخصوص ملائکہ کی پرستش، اِسی وجہ سے کرنی شروع کی کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، یہ ہم سے راضی رہیں تو یہ اپنے باپ کو ہم سے راضی رکھیں گی اور پھر سارا جہان ہم پر مہربان ہو جائے گا۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۷۹)

۳۸۴؎ مطلب یہ ہے کہ جب خلق بھی اُسی کی ہے اور امر و حکم بھی اُسی کا ہے تو اُس کے حضور میں رعونت اور استکبار کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ اِس کے بعد تو ہر سلیم الفطرت انسان کو اپنا فرض سمجھنا

وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٦﴾

والوں کو پسند نہیں کرتا[385]۔ اور زمین کی اصلاح کے بعد اُس میں فساد برپا نہ کرو[386] اور اُسی کو پکارو، بیم و رجا، دونوں حالتوں میں[387]۔ یہی خوبی کا راستہ ہے، تم اِسی پر چلو، اِس لیے کہ اللہ کی رحمت اُن لوگوں سے قریب ہے جو خوبی اختیار کرنے والے ہیں[388]۔ ۵۴-۵۶

چاہیے کہ اُسے کمال عاجزی اور لجاجت کے ساتھ پکارے۔ اُس کی اداؤں اور حرکات سے بھی اِسی کا اظہار ہونا چاہیے اور الفاظ و عبارات سے بھی۔ پھر اِس عاجزی اور لجاجت میں وقار بھی ہونا چاہیے اور اخلاص بھی۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ لوگوں کو دکھا کر نہیں، اُسے چپکے چپکے پکارو۔ وہ تمھارے دلوں کی حالت کو جانتا اور تمھاری سرگوشیوں کو سنتا ہے۔ اُس کے حضور نہ چیخنے چلانے کی ضرورت ہے اور نہ دکھاوے کا کوئی موقع، وہ سمیع و علیم ہے۔

۳۸۵؎ یعنی اُن کو پسند نہیں کرتا جو اکڑیں اور اپنے حدود سے تجاوز کر کے اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھنے لگیں۔ اُس کے سامنے عاجزی اور تضرع ہی زیبا ہے۔

۳۸۶؎ قرآن مجید میں یہ تعبیر نظم اجتماعی کے خلاف سرکشی کے لیے بھی اختیار کی گئی ہے اور خدا اور اُس کے رسولوں کے مقابلے میں سرکشی کے لیے بھی۔ یہاں اِسی دوسرے مفہوم میں ہے۔ انسان نے زمین پر زندگی کی ابتدا کی تو وہ اِس فساد سے پاک تھی۔ بعد کے زمانوں میں بھی رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اِسے بار بار پاک کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اِس کی اصلاح کے بعد اِس میں فساد برپا نہ کرو۔

۳۸۷؎ یعنی جن چیزوں کے آرزومند ہو، اُن کے لیے بھی اُسی کو پکارو اور جن سے بچنا چاہتے ہو، اُن کے لیے بھی اُسی کی پناہ ڈھونڈو۔ پیچھے خدا کو پکارنے کی ہیئت بتائی تھی۔ یہ اُس کا محرک بتا دیا ہے کہ خوف و طمع کی ہر حالت میں تمھارا مرجع و مولیٰ صرف اُسی پروردگار کو ہونا چاہیے جو تمھارا اور تمھارے گردوپیش میں پھیلی ہوئی کائنات کا خالق بھی ہے اور اپنی مخلوقات کی تدبیر امور کرنے والا بھی۔

وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ

وہی ہے جو اپنی رحمت (برسانے) سے پہلے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں تو ہم اُسے کسی مردہ زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں اور وہاں مینہ برسا دیتے ہیں، پھر اُس سے طرح طرح کے پھل پیدا کرتے ہیں۔ اِسی طرح ہم مردوں کو بھی اٹھا کھڑا کریں گے،[۳۸۹] شاید تم یاددہانی حاصل کرو۔[۳۹۰] جو زمین اچھی ہوتی ہے، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے خوب

۳۸۸؎ اِس سے معلوم ہوا کہ خوبی اور احسان کے مقام پر فائز رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بیم و رجا، دونوں حالتوں میں اپنے پروردگار کی طرف یک سو رہے اور ہر مشکل کے وقت اُسی سے دعا و مناجات کرے۔

۳۸۹؎ اوپر فرمایا تھا کہ ہر حال میں اللہ ہی سے لو لگاؤ، اُس کی رحمت اُن لوگوں کے قریب ہے جو اللہ سے لو لگاتے ہیں۔ یہ اُس کی تمثیل بیان کر دی ہے کہ جس دن پورے عالم کے لیے اِس رحمت خداوندی کا ظہور ہوگا، اُسے دور نہ سمجھو۔ جس کی ہوائیں چل رہی ہیں، وہ ابر رحمت بھی عنقریب برس جائے گا اور اُس سے فیض یاب ہونے کے لیے ہم مردوں کو اُسی طرح اٹھا کھڑا کریں گے، جس طرح بارش سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتے ہیں۔

آیت میں 'سُقْنٰهُ' کی ضمیر 'سَحَاب' کے لیے ہے۔ یہ اگرچہ 'سحابة' کی جمع ہے، مگر صورت کے لحاظ سے واحد ہے، اِس لیے ضمیر واحد آ گئی ہے۔ 'اَنْزَلْنَا بِهِ' میں 'ب' ظرفیہ ہے۔

اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿٥٨﴾

پھل پھول لاتی ہے اور جو ناقص ہوتی ہے، اُس کی پیداوار بھی ناقص ہی ہوتی ہے۔ (یہی تمھارا معاملہ ہے)[۳۹۱]۔ ہم (اِس قرآن کی آیتوں میں) اپنی نشانیاں اِسی طرح گوناگوں پہلوؤں سے دکھاتے ہیں، اُن لوگوں کے لیے جو شکر گزار بننا چاہیں[۳۹۲]۔ ۵۷-۵۸

ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳۹۰؎ یعنی زمین کی اِن نشانیوں میں سے اُس دن کی یاددہانی حاصل کرو جس میں مردے زندہ کیے جائیں گے۔

۳۹۱؎ یہ اُسی تمثیل کو آگے بڑھا کر اُس رحمت کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو قرآن کی صورت میں نازل ہوئی ہے کہ اُس کا فیض بھی ہر شخص کو یکساں نہیں پہنچے گا۔ دلوں کی زمین زرخیز ہو گی تو باغ و چمن لہلہا اُٹھیں گے اور شور زمینوں سے اگر کچھ اگا بھی تو یونہی کچھ خاروخس اگ جائیں گے۔ اِس سے زیادہ کچھ نہ ہو گا۔ آخر میں 'لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا' کے الفاظ ہیں۔ جملے کے پچھلے حصے میں 'نَكِد' کا مقابل لفظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گیا ہے۔ اُس سے جو مفہوم پیدا ہوتا ہے، ہم نے ترجمے میں اُسے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ تمثیل کس قدر حقیقت افروز اور قرآن کی بلاغت کا کیسا عمدہ نمونہ ہے؟ استاذ امام نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...ایک ہی بارش کی تمثیل سے کتنے حقائق آشکارا ہو گئے! توحید کی دلیل بھی سامنے آ گئی، امکان معاد اور وقوع قیامت کی نظیر بھی مل گئی اور ہدایت و ضلالت کے باب میں جو سنت اللہ مقرر ہے، وہ بھی نمایاں ہو گئی۔ گویا سورہ کے آغاز سے یہاں تک جو مسائل زیر بحث آئے تھے، اصولاً وہ سب ہی بے نقاب ہو گئے... یہ کائنات پروردگار نے بنائی ہی ایسی شکل میں ہے کہ اگر انسان دیدۂ بینا رکھتا ہو تو پتا پتا، بوٹا بوٹا اُن حقائق کی شہادت دے رہا ہے جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے، لیکن دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان کہاں ہیں؟" (تدبر قرآن ۳/ ۲۸۵)

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَقَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الۡمَلَاُ

(تمھاری تاریخ بھی اِنھی حقائق کی گواہی دیتی ہے[۳۹۳])۔

ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا تو اُس نے اُنھیں دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے[۳۹۴]۔ میں

۳۹۲ اصل الفاظ ہیں: 'لِقَوۡمٍ یَّشۡکُرُوۡنَ'۔ اِن میں فعل ارادۂ فعل کے لیے ہے۔ شکر کی حقیقت قدردانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن میں خدا نے اپنی نشانیوں کی طرف گوناگوں پہلوؤں سے جو توجہ دلائی ہے، یہ اُس کا بہت بڑا احسان ہے۔ تم اِس کی قدر کرو گے اور اِس کے نتیجے میں خدا کے شکر گزار بننا چاہو گے تو تمھارے دلوں کی زمین بھی سرسبز و شاداب ہو جائے گی۔

۳۹۳ سورہ کے مخاطب چونکہ قریش ہیں، اِس لیے آگے استدلال کے غرض سے اُنھی قوموں کی سرگذشتیں سنائی ہیں جن سے وہ واقف تھے اور اُن کی سرگذشتوں میں سے بھی صرف اتنا حصہ نمایاں کیا ہے جو انذار کے مقصد سے ضروری تھا۔ مدعا یہ ہے کہ عقل و فطرت کے دلائل سے نہیں مانو گے تو ہمارے پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد تم بھی اُسی انجام کو پہنچ جاؤ گے جس کو تم سے پہلے رسولوں کی قومیں پہنچی ہیں۔

۳۹۴ یہی دعوت پیچھے قریش کو دی گئی ہے۔ انبیا علیہم السلام کی تمام جدوجہد کا مقصود اِسی توحید کا قیام تھا۔ وہ اِسی لیے بھیجے گئے کہ خدا کے بندوں کو دوسروں کی بندگی سے چھڑا کر خالص خدا کے بندے بنا دیں۔ قرآن نے سب سے زیادہ تاکید اور وضاحت کے ساتھ اِسی کو بیان کیا ہے، یہاں تک کہ اِس صحیفۂ آسمانی کا آخری باب اپنے مضمون کے لحاظ سے جس سورہ پر ختم ہوا ہے، اُس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو یہی ہدایت فرمائی ہے کہ لوگوں کے سامنے برملا اعلان کر دیا جائے کہ اللہ یکتا، یگانہ اور بے ہمتا ہے، سب کے لیے پناہ کی چٹان ہے، وہ نہ باپ ہے نہ بیٹا اور

مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦٠﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦١﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ

تم پر ایک ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں[۳۹۵]۔ اُس کی قوم کے بڑوں نے جواب دیا: ہم تو تمھیں صریح گم راہی میں دیکھ رہے ہیں[۳۹۶]۔ اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، میں کسی گم راہی میں نہیں ہوں، بلکہ رب العٰلمین کا رسول ہوں، تمھیں اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا رہا ہوں، تمھاری خیر خواہی کر رہا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا

نہ زمین و آسمان میں کوئی اُس کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہ توحید تقاضا کرتی ہے کہ لوگ بالکلیہ اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیں، اُس کی ذات و صفات اور اُس کے حقوق میں اُس کی یکتائی تسلیم کریں، اُسی سے مدد چاہیں، نعمت ملے تو اُسی کا شکر ادا کریں، مصیبت آئے تو اُسی سے فریاد کریں، بیم و رجا، ہر حال میں اُسی کو پکاریں اور کسی فرشتے، جن، پیغمبر، ولی یا کسی بھی مخلوق کو کسی پہلو سے اُس کا شریک نہ ٹھیرائیں۔

۳۹۵؎ یہ اُس عذاب سے انذار ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں لازماً آتا ہے اور اُن کی قوموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت زمین پر خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک قیامت صغریٰ لوگوں کو اِسی دنیا میں برپا کر کے دکھا دی جاتی ہے تاکہ آخرت کا تصور بھی اُسی معیار پر ثابت کر دیا جائے جس معیار پر سائنسی حقائق معمل (laboratory) کے تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں۔

۳۹۶؎ اِس لیے کہ تم اُس راستے سے منحرف ہو گئے ہو جس پر ہمارے باپ دادا ہمیشہ سے چلتے آئے ہیں۔ تم اُن کے دین کی تحقیر کر رہے ہو اور مزید یہ کہ ہمیں عذاب کی دھمکیاں بھی سنا رہے ہو۔ یہ صریح گم راہی ہے جس میں تم مبتلا ہو گئے ہو۔

الاعراف ۷

مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ لِيُنۡذِرَكُمۡ وَلِتَتَّقُوۡا وَلَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوۡهُ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ فِى الۡفُلۡكِ وَاَغۡرَقۡنَا الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا عَمِيۡنَ ﴿۶۴﴾

ہوں جو تم نہیں جانتے۔ کیا اِس بات پر تعجب کر رہے ہو کہ تمھارے پاس خود تمھارے اندر کے ایک شخص کے ذریعے سے تمھارے پروردگار کی یاددہانی آئی ہے، اِس لیے کہ تمھیں خبردار کرے اور اِس لیے کہ تم (اللہ سے) ڈرو اور اِس لیے کہ تم پر رحم کیا جائے؟[۳۹۷] اُنھوں نے پھر بھی اُسے جھٹلا دیا تو ہم نے اُسے اور جو کشتی میں اُس کے ساتھ تھے، اُنھیں نجات دی اور اُن سب لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا۔[۳۹۸] یقیناً وہ (دل و دماغ کے) اندھے لوگ تھے۔۵۹-۶۴

۳۹۷؎ قرآن نے سوال اٹھایا ہے، لیکن جواب نہیں دیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس لیے کہ انداز کلام اظہار حسرت و افسوس کا ہے۔ اِس اسلوب بیان میں یہ بات مضمر ہے کہ اگر تم سوچتے، غرور و انانیت کو راہ نہ دیتے تو یہ چیز تمھارے لیے تعجب اور استکبار کے بجائے ممنونیت اور شکرگزاری کا باعث ہوتی کہ خدا نے تمھارے ہی اندر سے ایک شخص کو تمھیں نجات کی راہ دکھانے کے لیے اٹھایا۔ میں تمھارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں، میرا ماضی و حاضر اور میرا اخلاق و کردار، سب تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میری زبان تمھاری زبان اور میرا دل تمھاری اپنی فطرت کا ترجمان ہے تو کیا یہ بہتر ہوتا کہ تم پر اتمام حجت کے لیے آسمان سے کوئی فرشتہ اترتا یا یہ بہتر ہے کہ تمھاری اپنی ہی زبان اور تمھارا اپنا ہی دردآشنا دل تم پر گواہی دے؟ اسلوب کلام میں یہ ساری داستان مضمر ہے اور یہ اضمار ہی اِس محل میں تقاضاے بلاغت ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۹۵)

۳۹۸؎ اِس سے واضح ہے کہ یہ عذاب اُسی علاقے میں اور اُنھی لوگوں پر آیا جن پر نوح علیہ السلام

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

عاد کی طرف ہم نے اِسی طرح اُن کے بھائی ہود کو بھیجا تھا۔[۳۹۹] اُس نے دعوت دی

نے اتمام حجت کیا تھا۔ یہ دجلہ و فرات کے دوآبے کا علاقہ تھا۔ چنانچہ آرمینیا کی سرحد پر کوہ ارارط کے نواح میں لوگ اب بھی نوح علیہ السلام کے بعض آثار کی نشان دہی کرتے ہیں۔ قرآن میں اِس کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم میں رہے اور پوری دردمندی کے ساتھ اُسے متنبہ کرتے رہے۔ لیکن اِس طویل جدوجہد کے بعد بھی جب قوم نے اُن کی تکذیب کر دی اور اپنے رویے کی اصلاح پر آمادہ نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک کشتی بنائی جائے۔ یہ قوم کے لیے گویا الٹی میٹم تھا کہ کشتی کی تکمیل کے ساتھ ہی اُس کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہو جائے گا۔ چنانچہ کشتی بن گئی اور ماننے والے اُس میں سوار ہو گئے تو ایک عظیم طوفان ابل پڑا۔ زمین کو حکم دیا گیا کہ اپنا سارا پانی اگل دے اور آسمان کو حکم دیا گیا کہ اپنا سارا پانی برسا دے۔ پھر جو نشان مقرر کر دیا گیا تھا، پانی اُس پر جا کر ٹھیر گیا اور پوری قوم اُس میں غرق ہو گئی، یہاں تک کہ نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان بھی اپنی ہٹ دھرمی کے باعث اُس کی نذر ہو گیا۔ یہ ایک عبرت انگیز منظر تھا۔ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کی طرح موجیں اٹھ رہی تھیں۔ نوح کی کشتی اُن کے تھپیڑوں سے نبرد آزما تھی کہ اتنے میں باپ نے دیکھا کہ سامنے بیٹا حیران و ششدر کھڑا ہے۔ اُس کو دیکھ کر شفقت پدری نے جوش مارا، پکار اٹھے کہ جان پدر، اب بھی موقع ہے، اِن منکروں کو چھوڑ کر کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ لیکن اِس ہول ناک منظر کو دیکھ کر بھی اُس کی ضد میں کچھ فرق نہیں آیا۔ اُس نے کہا: میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا۔ نوح علیہ السلام نے کہا: یہ پانی نہیں، قہر الٰہی ہے۔ اِس سے خدا کے سوا آج کوئی بچانے والا نہیں ہو سکتا۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اچانک ایک موج اٹھی اور بیٹے کو بہا لے گئی۔

۳۹۹؎ عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے۔ یہ سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن کا مسکن احقاف

غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا
لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ
بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ
رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَاۗءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا ڈرتے نہیں ہو؟[۱۰۰] اُس کی قوم کے بڑوں نے جو منکر ہو رہے تھے، اُسے جواب دیا: ہم تو یقیناً تمھیں حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہمارا پختہ خیال ہے کہ تم جھوٹے ہو۔[۱۰۱] اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، میں کسی حماقت میں مبتلا نہیں ہوں، بلکہ رب العٰلمین کا رسول ہوں، تمھیں اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور پوری

الاعراف ۷

کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عرب کے لٹریچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنی قوت وشوکت کے لیے بھی۔ حضرت ہود اِنھی کے ایک فرد تھے جنھیں رسول کی حیثیت سے اِن کی طرف مبعوث کیا گیا۔ قرآن نے امتنان واحسان کے لیے فرمایا ہے کہ عاد کی طرف ہم نے کسی اجنبی شخص کو نہیں، بلکہ اُنھی کے بھائی ہود کو بھیجا تا کہ اُن پر ہماری حجت ہر لحاظ سے پوری ہو جائے۔

۱۰۰؎ یعنی کیا ڈرتے نہیں ہو کہ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد بھی شرک پر اصرار کرو گے تو اِس کا انجام کیا ہوگا؟

۱۰۱؎ مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ شان وشوکت اور ترقی واستحکام دیکھ رہے ہو اور اِس کے باوجود ہمیں عذاب کی وعیدیں سناتے ہو۔ اِس کے معنی اِس کے سوا کیا ہیں کہ خرد باختہ ہو چکے ہو اور جھوٹی باتیں سنا کر ہمیں ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔

عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ

دیانت کے ساتھ تمھاری خیر خواہی کرنے والا ہوں۔ کیا اِس بات پر تعجب کر رہے ہو کہ تمھارے پاس خود تمھارے اندر کے ایک شخص کے ذریعے سے تمھارے پروردگار کی یاددہانی آئی ہے کہ تمھیں خبردار کرے؟ یاد کرو، جب اُس نے نوح کی قوم کے بعد تمھیں بادشاہی دی[202] اور تمھاری ساخت میں تمھیں خوب محکم اور تنومند کیا[203]۔ سو اللہ کی شانوں کو یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ[204]۔ اُنھوں نے جواب دیا: کیا ہمارے پاس اِس لیے آئے ہو کہ ہم اکیلے خدا کی عبادت کریں اور اُنھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے

۲۰۲؎ اصل میں لفظ 'خُلَفَآء' استعمال ہوا ہے۔ یہ جس طرح نائب اور جانشین کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح نیابت اور جانشینی کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض صاحب اقتدار کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سورۂ ص (۳۸) کی آیت ۲۶ میں اِس کی نظیر موجود ہے۔ ہم نے اِسی لحاظ سے اِس کا ترجمہ بادشاہی کیا ہے۔ لفظ کے اِس طرح اپنے معنی کے کسی پہلو سے مجرد ہو کر آنے کی مثالیں عربی زبان میں اور بھی ہیں۔

۲۰۳؎ یعنی عقلی لحاظ سے محکم اور جسمانی لحاظ سے تنومند۔ اِس کے لیے اصل میں 'زَادَکُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْطَةً' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'خَلْق' کے معنی یہاں ساخت کے ہیں جو باطنی اور ظاہری، دونوں طرح کی ہو سکتی ہے۔ عرب کی روایتوں سے بھی اِس کی تصدیق ہوتی ہے کہ قوم عاد دونوں ہی اعتبارات سے بڑی نمایاں تھی۔

۲۰۴؎ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ پیچھے جو بات کہی گئی ہے، وہ اپنے اندر امتنان اور تنبیہ، دونوں ہی کے پہلو رکھتی ہے۔

يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ

ہیں؟[705] یہی بات ہے تو جس عذاب کی دھمکی ہمیں سنا رہے ہو، اُسے ہم پر لے آؤ، اگر تم سچے ہو۔ اُس نے کہا: تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر گندگی آپڑی اور (اُس کا) غضب ٹوٹ پڑا ہے۔[706] کیا تم مجھ سے اُن ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں،[707] جن کے لیے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟[708] اچھا، انتظار کرو، میں

۷۰۵؎ اِس میں غصہ بھی ہے اور طنز بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اِس لیے پیغمبر بن کر کھڑے ہو گئے ہو کہ ہم اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر تمھارے پیرو بن جائیں؟

۷۰۶؎ یعنی فیصلہ ہو گیا کہ کفر و شرک کی اِسی گندگی میں پڑے رہو گے اور اِس کے نتیجے میں خدا کے غضب کے مستحق ٹھیرو گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اب اِس میں دیر نہیں ہے، اِس کو آیا ہی سمجھو، اِس لیے کہ جس ناپاکی و گندگی سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے، اُس کی بہت بڑی کھیپ تم نے اپنے اوپر لاد لی ہے۔ ’رِجْس‘ کا اتنا بڑا انبار جمع کر لینے کے بعد اب خدا کے صاعقۂ عذاب کو دور نہ سمجھو۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۹۹)

۷۰۷؎ لوگ جن ہستیوں کو معبود بناتے اور اُن سے حاجتیں طلب کرتے ہیں، وہ درحقیقت اُن کے رکھے ہوئے نام ہی ہوتے ہیں جن کے پیچھے کوئی مسمّٰی نہیں ہوتا۔ اپنی طرف سے نام دے کر ایسے ایسے بت تراش لیے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے پوری کائنات کا نظم وہی چلا رہے ہیں، جب کہ درحقیقت اُن میں نہ کوئی بارش کا رب ہوتا ہے، نہ ہوا کا، نہ دولت کا، نہ صحت اور تندرستی کا اور نہ کوئی مشکل کشا، گنج بخش، داتا اور غریب نواز ہوتا ہے کہ اُنھیں کچھ دے سکے یا اُن کے کسی کام آسکے۔

فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَیْنٰہُ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ بِرَحْمَۃٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَمَا کَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۲﴾

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاہُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ ؕ ہٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ لَکُمْ اٰیَۃً

بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ آخر کار ہم نے اُس کو اور اُنھیں جو اُس کے ساتھ تھے، اپنی رحمت سے بچا لیا اور اُن لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ۶۵-۷۲

اِسی طرح ثمود[۱۰۹] کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالح کو بھیجا تھا۔ اُس نے دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمھارے پاس تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح نشانی آگئی ہے۔ یہ

۱۰۸؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ شرک کے حق میں کوئی عقلی یا نقلی یا فطری دلیل نہ کبھی پیش کی جا سکی ہے اور نہ پیش کی جا سکتی ہے۔

۱۰۹؎ یہ عاد کے بقایا میں سے ہیں۔ اِسی بنا پر اِنھیں عاد ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ عرب کی قدیم اقوام میں سے یہ دوسری قوم ہے جس نے عاد کے بعد غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اِن کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ ہے جسے الحجر کہا جاتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...ہو سکتا ہے کہ قوم عاد کی تباہی کے وقت جو لوگ عذاب سے محفوظ رہے ہوں، اُنھوں نے جنوب سے شمال مغرب کی طرف ہجرت کی ہو اور پھر حجر میں سکونت اختیار کر لی ہو۔ عاد و ثمود کے اوصاف قرآن میں بھی اور عرب کی روایات میں بھی تقریباً ایک ہی سے بیان ہوئے ہیں۔ بعض شاعر تو اِن دونوں قوموں کا ذکر اِس طرح کرتے ہیں، گویا اِن کے درمیان کوئی فرق سرے سے ہے ہی نہیں۔ دونوں کے لیڈر — قیل اور قدار — جن کے ہاتھوں اِن قوموں

فَذَرُوۡهَا تَاۡكُلۡ فِیۡۤ اَرۡضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَیَاۡخُذَكُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۷۳﴾ وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمۡ فِی الۡاَرۡضِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡ سُهُوۡلِهَا قُصُوۡرًا وَّتَنۡحِتُوۡنَ الۡجِبَالَ بُیُوۡتًا ۚ فَاذۡكُرُوۡۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِمَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ

اللہ کی اونٹنی ہے، تمھارے لیے نشانی کے طور پر، لہٰذا اِس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے اور کسی برے ارادے سے اِس کو ہاتھ نہ لگانا، ورنہ ایک دردناک عذاب تمھیں آپکڑے گا۔[۱۱۰] یاد کرو، جب قوم عاد کے بعد اللہ نے تمھیں بادشاہی دی اور زمین میں تمکن عطا فرمایا، تم اُس کے میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور پہاڑوں کو گھروں کی صورت میں تراش لیتے ہو۔[۱۱۱] سو اللہ کی شانوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد نہ مچاتے پھرو۔[۱۱۲] اُس کی قوم کے بڑوں نے جو متکبر ہو چکے تھے، اپنی قوم کے اُن زیردستوں[۱۱۳] سے

پر تباہی آئی، عربی ادب میں ضرب المثل ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بالکل ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔'' (تدبر قرآن ۳/۳۰۰)

۱۱۰؎ یہ قوم کے مطالبۂ عذاب کا جواب ہے کہ خدا کے حکم پر میں نے اپنی اونٹنیوں میں سے ایک اونٹنی نامزد کر دی ہے۔ یہ خدا کی نذر ہے، چنانچہ اِس لحاظ سے اللہ کی اونٹنی ہے۔ تمھارے لیے یہ خدا کے عذاب کی نشانی ہے۔ اِس کو گزند پہنچاؤ گے تو سمجھ لو کہ امان کی دیوار گر گئی۔ اِس کے بعد قہر الٰہی کے سیلاب کو کوئی چیز تمھاری بستیوں میں داخل ہونے سے نہیں روک سکے گی۔

۱۱۱؎ اپنے اِس فن میں یہ لوگ جس کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اُس کے آثار آج بھی مدائن صالح میں موجود ہیں۔ یہ آثار ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں اور کم و بیش ویسے ہی ہیں،

اَتَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرۡسَلٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلَ بِهٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا بِالَّذِیۡۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ کٰفِرُوۡنَ ﴿۷۶﴾

جو ایمان لے آئے تھے، کہا: کیا تم سمجھتے ہو کہ صالح اپنے رب کا بھیجا ہوا ہے[۲۱۴]؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہم تو اُس پیغام کو مانتے ہیں جس کے ساتھ اُسے بھیجا گیا ہے[۲۱۵]۔ اِس پر اُن متکبروں نے کہا: (لیکن) ہم اُس کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لے آئے

جیسے ہندوستان میں ایلورا، ایجنٹا اور بعض دوسرے مقامات میں پائے جاتے ہیں۔

۲۱۲؎ یعنی اِس ترقی و کمال اور عروج و اقتدار کو خدا کی شان کا ظہور سمجھ کر اُس کا شکر بجا لاؤ اور اُس کے مقابلے میں تمرد اور سرکشی کا رویہ اختیار نہ کرو۔ اِس سے معلوم ہوا کہ مادی ترقی کوئی جرم نہیں ہے اور نہ فلک بوس عمارتیں بنانا کسی فساد کی نشانی ہے۔ اِس میں فساد اُس وقت پیدا ہوتا ہے، جب انسان اِن کمالات میں خدا کی شانیں دیکھنے کے بجائے خدا فراموشی کا رویہ اختیار کر لیتا اور خدا کے قائم کردہ حدود سے تجاوز کر کے سرکشی اور تمرد پر اتر آتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو سیدنا سلیمان علیہ السلام کے 'صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِیۡرَ' کی طرح یہی عمارتیں معرفت الٰہی کی نشانی بن جاتی ہیں۔

۲۱۳؎ انبیا علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے میں بالعموم غریبوں، ضعیفوں اور دبے ہوئے لوگوں ہی نے سبقت کی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن میں دولت و اقتدار کا غرور نہیں ہوتا کہ قبول حق میں رکاوٹ بن جائے۔

۲۱۴؎ یہ سوال استنکار کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا فی الواقع اُسے خدا کا رسول سمجھتے ہو؟ اِس کے معنی تو ہیں کہ بالکل ہی بے وقوف ہو گئے ہو۔

۲۱۵؎ یعنی صرف یہی نہیں، بلکہ اُس پیغام کو بھی پورے شرح صدر کے ساتھ مان چکے ہیں جو خدا نے اُس کے ذریعے سے بھیجا ہے اور اب عزم و جزم کے ساتھ اُس کی گواہی دے رہے ہیں۔ ہمارے لیے اِس پیغام کی قوت و حجت ہی کافی تھی۔ ہم تمھاری طرح معجزوں اور کرشموں کے منتظر

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ

ہو۔[۲۱۶] پھر انھوں نے اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی[۲۱۷] اور کہہ دیا کہ اے صالح، اگر تم خدا کے بھیجے ہوئے ہو تو ہم پر لے آؤ وہ عذاب جس کی تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو۔ آخر ایک سخت تھرتھراہٹ[۲۱۸] نے اُنھیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اُس وقت[۲۱۹] صالح یہ کہتا ہوا

الاعراف ۷

نہیں رہے کہ بدبختی کے اُس مقام تک پہنچ جاتے، جہاں تم کھڑے ہو۔

۲۱۶؎ یہ آخری جھنجلاہٹ کا اظہار ہے کہ مانتے ہو تو مانتے رہو۔ تمھارے ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ ماننا تو درحقیقت ہمارا ماننا ہے اور ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اِس کا انکار ہی کریں گے۔ ہم اِس شخص کو ہرگز ماننے والے نہیں ہیں۔

۲۱۷؎ اصل میں لفظ 'عَتَوْا' آیا ہے اور اُس کے ساتھ 'عَنْ' کا صلہ ہے۔ اُس سے یہ سرکشی اور سرتابی، دونوں کے مفہوم پر متضمن ہو گیا ہے۔ اونٹنی کو مارنے کا جرم اگرچہ اُن کے ایک سرکش سردار نے کیا تھا، مگر قرآن نے اُسے پوری قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ باقی متمردین بھی اِس پر راضی تھے۔ یہ اونٹنی اُن کی سرکشی کو جانچنے کا ایک پیمانہ تھی۔ اِس کے مارنے سے واضح ہو گیا کہ اُنھیں مزید مہلت دی گئی تو اُن کا اگلا ہدف خود حضرت صالح ہوں گے۔

۲۱۸؎ اِس لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ زلزلے کا عذاب تھا۔ قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد پر آنے والے عذاب کی طرح یہ بھی رعد و برق کا عذاب تھا جس میں شمال کی بادصرصر کئی دنوں تک مسلط رہی اور بادلوں کی ہول ناک کڑک اور بہرا کر دینے والی چیخوں نے ہر چیز کو ہلا کر رکھ دیا۔ امام حمید الدین فراہی نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں اِس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٧٩﴾
وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ

اُنھیں چھوڑ کر چل دیا کہ میری قوم کے لوگو، میں نے تو اپنے پروردگار کا پیغام تمھیں پہنچا دیا اور تمھاری بہت خیر خواہی کر دی، مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔[۴۲۰] ۷۳-۷۹

اِسی طرح لوط کو بھیجا، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا:[۴۲۱] کیا اِس بے حیائی کا

الاعراف ۷

۴۱۹؎ یعنی عذاب سے ذرا پہلے جب قوم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترتیب بیان میں اِس بات کو عذاب کے ذکر کے بعد کیوں کر دیا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ ترتیب میں یہ تقدیم و تاخیر تقاضاے بلاغت سے ہوئی ہے۔ ارتکاب جرم اور اُس کے نتیجہ کے فوری ظہور کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں عذاب کو قتل ناقہ کے ساتھ متصل کر دیا اور حضرت صالح کی ہجرت کے ذکر کو پیچھے کر دیا۔ گویا جوں ہی اُنھوں نے ناقہ کو گزند پہنچا کر خدا کو چیلنج کیا، عذاب آ دھمکا۔ عذاب کی یہ سبقت و مبادرت اچھی طرح ظاہر نہ ہو سکتی، اگر اِس بیچ میں کوئی اور بات ذکر میں آ جاتی۔''

(تدبر قرآن ۳/ ۳۰۵)

۴۲۰؎ کسی قوم کے بگاڑ کی یہی وہ آخری حد ہوتی ہے جس کے بعد اُس کی اصلاح کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اُس وقت خیر خواہ ہدف ملامت اور بدخواہ اُس کے لیڈر اور ہیرو بن جاتے ہیں۔

۴۲۱؎ حضرت لوط سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اُن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔ بائیبل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔ لوط علیہ السلام اُن کے اندر رہ تو

اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿٨١﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ

ارتکاب کرتے ہو؟[۲۲۲] تم سے پہلے دنیا میں کسی قوم نے اِس کا ارتکاب نہیں کیا۔[۲۲۳] تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ (حقیقت یہ ہے کہ تم بڑے

رہے تھے، لیکن اُن کے اندر سے نہیں تھے۔ اُن کا تعلق اُس قوم کے ساتھ وہی تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قوم فرعون کے ساتھ تھا۔ آگے اُن کی بیوی کا ذکر جس اسلوب میں ہوا ہے، اُس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اُن کی شادی اُسی قوم کے اندر ہوئی تھی اور اِس لحاظ سے وہ اُنھی کے ایک فرد بن چکے تھے۔ قوم لوط کے الفاظ قرآن میں اِسی رعایت سے آئے ہیں۔

۲۲۲؎ یہ استفہام اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے اور آیت میں 'اَلْفَاحِشَة' کا لفظ بتا رہا ہے کہ بدکاری کی یہ صورت اُس قوم میں اِس درجہ عام تھی کہ متکلم اور مخاطب، دونوں نام لیے بغیر محض حرف تعریف سے سمجھ سکتے تھے کہ اِس سے کیا مراد ہے۔

۲۲۳؎ پہلے جملے کی طرح یہ جملہ بھی اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے اور اسلوب تعجب کا ہے۔ آیت میں 'مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ' کے جو الفاظ آئے ہیں، یہ افراد میں سے کسی فرد کے معنی میں بھی آسکتے ہیں اور قوموں میں سے کسی قوم کے معنی میں بھی۔ یہاں قوم کے لیے ہیں اور استاذ امام کے الفاظ میں مدعا یہ ہے کہ تم سے پہلے کوئی شامت زدہ سوسائٹی ایسی نہیں گزری جس نے اِس غلاظت کو تمھاری طرح اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہو۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس برائی نے اُن کے اندر ایک فیشن اور تہذیبی روایت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اِس کے مرتکبین اپنی محافل میں برملا اِس کا اظہار کرتے اور اِس پر کوئی شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح توحید سے اپنی بات کی ابتدا کرنے کے بجائے لوط علیہ السلام نے سب سے پہلے اِسی پر تنبیہ فرمائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنۡجَيۡنٰهُ

اوندھے)، بلکہ بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔[۲۲۴] مگر اُس کی قوم نے جواب

”...ایک برائی تو وہ ہوتی ہے، جو خواہ کتنی ہی سنگین ہو، لیکن وہ انسانی عوارض میں سے ہے اور انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے، دوسری برائی وہ ہے جس کا گھنونا پن اِس قدر واضح ہے کہ کسی انسان کے اندر عادت کی حیثیت سے اور کسی سوسائٹی کے اندر فیشن کی حیثیت سے اُس کا پایا جانا بغیر اِس کے ممکن نہیں کہ اُس انسان یا اُس سوسائٹی کی فطرت بالکل مسخ ہو گئی ہو۔ جہاں اِس طرح کے لوگوں سے سابقہ ہو، وہاں اصل قابل توجہ چیز وہی برائی ہوتی ہے، دوسری باتیں، خواہ کتنی ہی اہمیت رکھنے والی ہوں، سب ثانوی درجے میں آ جاتی ہیں۔ آپ ایک شخص کے پاس اُس کی اصلاح کی غرض سے جائیں اور دیکھیں کہ وہ کھڑا ہوا غلیظ کھا رہا ہے تو آپ اُس کو ایمان و اسلام کی تلقین کریں گے یا سب سے پہلے اُس کی یہ عبرت انگیز حالت آپ کو متوجہ کرے گی؟ حضرت لوط علیہ السلام کو اِسی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ اُن کی قوم کے اندر شرک و کفر کی برائی بھی موجود تھی اور دوسری تمام برائیاں بھی، جو شرک و کفر کے لوازم میں سے ہیں، موجود تھیں، لیکن جن کی فطرت اتنی اوندھی ہو گئی ہو کہ مرد مردوں ہی کو شہوت رانی کا محل بنائے ہوئے ہوں، اُن کو تو سب سے پہلے اِس غلاظت کی دلدل سے نکالنے کی ضرورت تھی، اُن سے کوئی دوسری بات کرنے کا مرحلہ تو بہر حال اِس کے بعد ہی آ سکتا تھا۔“

(تدبر قرآن ۳/ ۳۰۷)

۲۲۴؎ یہ تیسرا جملہ ہے جس سے لوط علیہ السلام نے اپنی نفرت و کراہت اور قوم کی دیوثیت پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے اِس مقصد کے لیے زن و مرد کے جوڑے پیدا کیے تھے۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر کس اوندھی فطرت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ پھر لڑکے تو لڑکے، تمھارے مرد تک اِسی لعنت میں گرفتار ہیں۔ یہ کیسا فساد طبیعت ہے جس نے تمھیں اِس مرض خبیث میں مبتلا کر دیا ہے؟ اِس قدر شدید نفرت و کراہت اور اظہار تعجب کی وجہ یہ ہے کہ زنا اپنے تمام مفاسد کے باوجود نفس انسانی کی بنیادی ترکیب میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا، لیکن یہ بیماری لاحق ہو جائے تو اِسی

وَ اَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۖ٭ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۸۳﴾ وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا ؕ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۸۴﴾

دیا تو یہ دیا کہ اِنھیں اپنی بستی سے نکالو، یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔[۴۲۵] سو ہم نے اُسے اور اُس کے گھر والوں کو بچا لیا،[۴۲۶] اُس کی بیوی کے سوا، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں رہ گئی،[۴۲۷] اور اُس قوم پر (پتھروں کی) بارش برسا دی،[۴۲۸] جس طرح کہ برسانے کا حق تھا۔ پھر دیکھو کہ اُن مجرموں کا کیا انجام ہوا۔ ۸۰-۸۴

ترکیب میں خلل عظیم برپا کر دیتی ہے۔

۴۲۵؎ یہ کسی معاشرے کے بگاڑ کی آخری حد ہے جس تک پہنچ جانے کے بعد برائی تہذیب اور فیشن کا تقاضا اور نیکی باعث طعن بن جاتی ہے۔ لوگ یہ جاننے کے باوجود کہ پاکیزگی کیا ہے، اُسے اپنے اندر برداشت نہیں کرتے اور اُس کے علم برداروں کو اپنی بستیوں سے نکال پھینکنا چاہتے ہیں تاکہ جس طرح اُنھوں نے کپڑے اتار دیے ہیں، باقی سب بھی ننگے ہو جائیں اور کوئی یہ احساس دلانے والا نہ ہو کہ لباس بھی کوئی چیز ہوتی ہے جسے انسان کبھی پہنا کرتے تھے۔

۴۲۶؎ پیچھے 'اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ کچھ ایمان والے بھی تھے، مگر یہ آیت بتاتی ہے کہ یہ ایمان والے بھی اُن کے اہل و عیال ہی تھے۔ اُن سے باہر کا کوئی شخص اُن پر ایمان نہیں لایا۔

۴۲۷؎ یہ خدا کے بے لاگ انصاف کا اظہار ہے۔ لوط علیہ السلام کی بیوی غالباً اپنی قوم اور خاندان کی عصبیت کے باعث حق کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئی تو پیغمبر کی بیوی ہونا اُس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکا۔ حضرت نوح کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے باپ کی طرح وہ بھی اُسی انجام کو پہنچ گئی جو اُس کی قوم کے لیے مقرر ہو چکا تھا۔

۴۲۸؎ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قومیں بالعموم کنکر پتھر برسانے والی

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ

اور مدین[429] کی طرف اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اُس نے دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس ایک واضح حجت آگئی ہے[430]، لہٰذا وزن اور پیمانے پورے رکھو، لوگوں کو اُن کی چیزیں گھٹا کر نہ دو[431] اور زمین کی اصلاح کے بعد اُس میں فساد برپا نہ

آندھی سے تباہ کی گئی ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ اِسے 'حَاصِب' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اُسی کا بیان ہے۔

۴۲۹؎ یہ بستی ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے مدیان کے نام پر مدین یا مدیان کہلاتی تھی، جو اُن کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے۔ اِس میں زیادہ تر اُنھی کی نسل آباد تھی۔ اِس کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا، مگر اِس کا کچھ سلسلہ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ اُس زمانے کی دو بڑی تجارتی شاہ راہیں اِسی علاقے سے گزرتی تھیں، اِس وجہ سے مدین کے لوگوں نے بھی تجارت میں بہت ترقی کر لی تھی۔

۴۳۰؎ یعنی خدا کے پیغمبر کی دعوت جو اپنے ساتھ خدا کی معیت کے ناقابل تردید شواہد لے کر آتی ہے۔ اِسے واضح حجت اِسی بنا پر کہا ہے۔

۴۳۱؎ یہ چونکہ تجارت پیشہ قوم تھی، اِس لیے اِس کے باطنی فساد کا ظہور ناپ تول میں خیانت کی صورت میں بھی ہوا۔ یہ اِس بات کی علامت تھی کہ پوری قوم کے اندر عدل و قسط کا تصور مختل ہو چکا اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کا عقیدہ باقی نہیں رہا۔

اِصۡلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۚ‏ ﴿۸۵﴾ وَلَا تَقۡعُدُوۡا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ وَتَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ كُنۡتُمۡ قَلِيۡلًا فَكَثَّرَكُمۡ‌ ۖ وَانْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِيۡنَ‏ ﴿۸۶﴾ وَاِنۡ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنۡكُمۡ اٰمَنُوۡا بِالَّذِىۡۤ

کرو۔[۴۳۲] تمھارے حق میں یہی بہتر ہے، اگر تم ایمان لائے ہوئے ہو۔[۴۳۳] اور نہ ہر راستے پر اِس طرح بیٹھو کہ لوگوں کو ڈرا رہے ہو اور خدا کی راہ سے اُس پر ایمان لانے والوں کو روک رہے ہو اور اُس کی راہ میں عیب ڈھونڈ رہے ہو۔[۴۳۴] یاد کرو، جب تم تھوڑے تھے، پھر خدا نے تمھیں بڑھا دیا اور دیکھو کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو فساد کرنے والے تھے۔[۴۳۵] اگر تم

۴۳۲؎ یعنی خدا کے مقابلے میں سرکشی اور تمرد اختیار نہ کرو، جب کہ رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد خدا کی زمین کو یہ رویہ اختیار کرنے والوں سے کئی مرتبہ پاک کر کے اُس کی اصلاح کی جا چکی ہے۔

۴۳۳؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ مدین کے لوگ نہ صرف یہ کہ حضرت ابراہیم کے خاندان سے نسبت رکھتے تھے، بلکہ نبیوں کی تعلیم کے حامل ہونے کے مدعی بھی تھے۔ یہ ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم تھی اور شعیب علیہ السلام کی بعثت کے وقت اِس کی حالت وہی تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے ظہور کے وقت بنی اسرائیل کی حالت تھی۔

۴۳۴؎ یہ اُن سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے جو اُس قوم کے اشرار شعیب علیہ السلام کے ساتھیوں کو ڈرانے دھمکانے اور ایمان کی راہ سے روکنے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔

۴۳۵؎ یعنی خدا کی نعمتوں پر اُس کا شکر ادا کرو اور پیغمبر کی دعوت کے جواب میں وہ رویہ اختیار نہ کرو جو تم سے پہلی قوموں نے اختیار کیا تھا۔ اُن کا انجام پیش نظر رکھو کہ جب وہ خدا اور اُس کے رسولوں کے مقابلے میں سرکشی پر اتر آئے تو کس طرح تباہ و برباد کر دیے گئے۔

أُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٧﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿٨٨﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ

میں سے ایک گروہ اُس چیز پر ایمان لے آیا ہے جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔[۴۳۶] اُس کی قوم کے بڑوں نے، جو متکبر ہو چکے تھے، اُس سے کہا کہ اے شعیب، ہم تمھیں اور (تمھارے) اُن لوگوں کو جو تمھارے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی اِس بستی سے نکال باہر کریں گے یا تم کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔ اُس نے جواب دیا: کیا اُس صورت میں بھی کہ ہم اُس سے بے زار ہوں؟ اگر ہم تمھاری ملت میں لوٹ آئیں، اِس کے بعد کہ اللہ ہمیں اُس سے نجات دے چکا ہے تو (اِس کے معنی یہ ہیں کہ) ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔[۴۳۷] (نہیں)، یہ ہمارے لیے

۴۳۶؎ مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ ایمان لے آئے ہیں اور کچھ نہیں لائے تو کیا بعید ہے کہ جو ایمان نہیں لائے، اُن کو بھی اللہ تعالیٰ توفیق دے اور وہ ایمان کی نعمت سے بہرہ یاب ہو جائیں۔ لہٰذا عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ تمھیں یہ مہلت اِسی توقع کے پیش نظر ملی ہوئی ہے۔ پیغمبر کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تو ہر حال میں صادر ہونا ہے۔ ذرا صبر کرو، ابھی کچھ بلونے اور پھٹکنے کا کام باقی ہے۔ یہ ہو جائے گا تو خدا کا فیصلہ بھی اپنے وقت پر اور ٹھیک انصاف کے ساتھ صادر ہو جائے گا۔

اِنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ
رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ﴿۸۹﴾
وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا
لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ

ممکن نہیں ہے کہ ہم اُس میں لوٹ آئیں، الّا یہ کہ اللہ، ہمارا پروردگار ہی چاہے۔ ہمارے پروردگار کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔[۴۳۸] ہم نے اللہ ہی پر بھروسا کیا ہے۔ پروردگار، ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے، تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اُس کی قوم کے بڑوں نے، جو انکار کا فیصلہ کر چکے تھے، لوگوں کو تنبیہ کی کہ شعیب کی پیروی کرو گے تو سمجھ لو کہ پھر تم بڑے خسارے میں جا پڑے۔[۴۳۹] آخر ایک سخت تھرتھراہٹ[۴۴۰]

۴۳۷ یعنی اِس وقت جو کچھ کہہ رہے اور جن حقائق پر اپنے ایمان کا اظہار کر رہے ہیں، وہ محض جھوٹ اور افترا ہے۔ ہم تمھاری ملت کی طرف لوٹتے ہیں تو اِس کے معنی یہی ہوں گے۔ حالاں کہ جھوٹ اور افترا کا مجموعہ تمھاری یہ ملت ہے۔ حق و صداقت کو چھوڑ کر ہم اِس کی طرف کیسے لوٹ سکتے ہیں؟ ہم تو آخری درجے میں اِس سے بے زار ہیں۔ شعیب علیہ السلام نے یہ جواب اپنے ساتھیوں کی طرف سے بھی دیا ہے، اِس لیے فرمایا ہے کہ 'بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا'، ورنہ انبیا علیہم السلام تو بعثت سے پہلے بھی ہدایت فطرت پر ہوتے ہیں۔

۴۳۸ یہ تفویض الی اللہ کے جملے ہیں۔ بندۂ مومن عزم و جزم کے ساتھ کسی فیصلے کا اظہار تو کر سکتا ہے، مگر اِس حقیقت سے کبھی غافل نہیں ہو سکتا کہ خدا کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے۔ اُس کا علم ماضی، حال اور مستقبل کے تمام معاملات پر حاوی ہے۔ صرف وہی جانتا ہے کہ کس کے لیے کیا مقدر ہے اور کس کا انجام کیا ہونا ہے۔ لہٰذا اُس کے نیک ارادوں کا پورا ہونا بھی خدا کی مشیت پر موقوف ہے۔ وہ توفیق بخشے گا تو کامیابی حاصل ہوگی، ورنہ ہر شخص ناکام رہ جائے گا۔

دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٩١﴾ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚۛ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٩٢﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿٩٣﴾

نے اُنھیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا، وہ ایسے تھے کہ گویا اُس بستی میں کبھی بسے ہی نہیں تھے۔ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا، بالآخر وہی نامراد ہوئے۔[441] اُس وقت شعیب یہ کہتا ہوا اُنھیں چھوڑ کر چل دیا کہ میری قوم کے لوگو، میں نے اپنے پروردگار کے پیغامات تمھیں پہنچا دیے اور تمھاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔[442] اب میں اُن لوگوں پر افسوس کیا کروں جو منکر ہو چکے ہیں! ۸۵-۹۳

۴۳۹؎ اِس میں تنبیہ و تہدید بھی ہے اور ہم دردی کی نمایش بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے نیک و بد تمھیں سمجھا دیا ہے۔ اِس کے بعد بھی نہیں مانتے ہو تو قوم کے زعما اور لیڈروں کو چھوڑ کر اِس شخص کی پیروی کے نتائج عنقریب بھگت لو گے۔

۴۴۰؎ یہ مجرد عذاب کی تعبیر ہے۔ اِس کی تفصیل ہم پیچھے قوم صالح کی سرگذشت میں بیان کر چکے ہیں۔

۴۴۱؎ یہ عذاب کا نتیجہ بیان ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس کے دونوں فقروں میں اُن دونوں دھمکیوں کی طرف تلمیح ہے جو قوم شعیب علیہ السلام کے کفار نے حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کو دی تھیں۔ اُنھوں نے دھمکی دی تھی کہ ہم تم کو اپنی بستی سے نکال کر چھوڑیں گے۔ اِس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ خود اِس دیار سے اِس طرح مٹے: گویا کہ اِن تلوں میں کبھی تیل ہی نہ تھا۔ اُنھوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھیوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم اِس شخص کی پیروی سے دست کش نہ

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَہۡلَہَا بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّہُمۡ یَضَّرَّعُوۡنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلۡنَا مَکَانَ السَّیِّئَۃِ الۡحَسَنَۃَ حَتّٰی عَفَوۡا وَّ قَالُوۡا قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذۡنٰہُمۡ بَغۡتَۃً

ہم نے جس بستی میں بھی کسی نبی کو رسول بنا کر بھیجا ہے، اُس کے لوگوں کو مالی اور جسمانی مصیبتوں[443] میں مبتلا کیا ہے تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں[444]۔ پھر اُن کے دکھ کو ہم نے سکھ میں بدل دیا، یہاں تک کہ وہ خوب پھولے پھلے اور کہنے لگے کہ اچھے اور برے

ہوئے تو بڑے خسارے میں پڑو گے۔ اِس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا، وہی خسارے میں پڑے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۱۴)

۴۴۲؎ یہی مضمون اوپر قوم صالح کی سرگذشت میں بھی گزر چکا ہے۔ ہم نے وہاں اِس کی وضاحت کر دی ہے۔

۴۴۳؎ اصل میں 'بَاْسَآء' اور 'ضَرَّآء' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ جب ایک دوسرے کے ساتھ آتے ہیں تو پہلے سے مالی اور دوسرے سے جسمانی آفتیں مراد ہوتی ہیں۔

۴۴۴؎ یہ اُس سنت الٰہی کا بیان ہے جو رسولوں کی بعثت کے ساتھ لازماً ظاہر ہوتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...وہ سنت یہ ہے کہ جب نبی توبہ و استغفار اور جزا و سزا کی منادی شروع کرتا ہے تو اُس کے محرکات و مویدات اِس کائنات میں بھی ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ ایک طرف پیغمبر لوگوں کو غفلت و خدا فراموشی کے انجام، فساد فی الارض کے نتائج اور دنیا اور آخرت میں خدا کی پکڑ سے ڈراتا ہے، دوسری طرف اللہ تعالیٰ لوگوں کو سیلاب، قحط، وبا، طوفان کی آزمایشوں میں بھی مبتلا کرتا ہے تاکہ لوگ آنکھوں سے بھی، اگر اُن کے پاس دیدۂ عبرت نگاہ ہو، دیکھیں کہ اِس طرح اللہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے، اُن کو پکڑ سکتا ہے اور پھر خدا کے سوا کوئی اُن کو بچانے والا

وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩٥﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ

دن تو ہمارے باپ دادوں پر بھی آتے رہے ہیں۔ بالآخر ہم نے اُنھیں اچانک پکڑ لیا اور اُنھیں خبر تک نہ ہوئی۔[445] حقیقت یہ ہے کہ اگر اِن بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اُن پر ہم زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے،[446] مگر

نہیں بن سکتا۔ اِس طرح گویا دعوت کے ساتھ واقعات کی تائید اور عقل وفطرت کی شہادت کے ساتھ مشاہدے کی اثر انگیزی بھی جمع ہو جاتی ہے۔ نبی جو کچھ کہتا ہے، آسمان و زمین، دونوں مل کر اپنے اسٹیج پر گویا اُس کے مناظر دکھا بھی دیتے ہیں تاکہ جن کے اندر اثر پذیری کی کچھ بھی رمق ہو، وہ خدا کے آگے جھکیں اور توبہ و اصلاح کریں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۱۷)

۴۴۵ یہ اُسی سنت کا ایک دوسرا پہلو ہے۔ اوپر جن آزمایشوں کا ذکر ہوا ہے، جب لوگ اُن سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے دل و دماغ کو بند کر لیتے ہیں تو اللہ اُنھیں ڈھیل دیتا ہے تاکہ جو لوگ تنبیہات سے نہیں جاگے، وہ رفاہیت کی لوری سے اور گہری نیند سو جائیں اور خدا کا عذاب اُن کو ایسی حالت میں پکڑے کہ اُنھیں خبر تک نہ ہو کہ یہ آفت کب اور کہاں سے نازل ہوئی ہے۔ اِس کی صورت کیا ہوتی ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... بدحالی کی جگہ خوش حالی آجاتی ہے، دنیوی اسباب و وسائل کے ہر گوشے میں ترقی و فراخی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، آزمایشوں اور تکلیفوں کے دن ذہنوں سے نکل جاتے ہیں، پھر سرکش لوگ چہکنا اور نبی اور اُس کے ساتھیوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ عقل کے کوتاہ لوگ، پچھلے قحط یا گذشتہ سیلاب یا فلاں آفت کو ہمارے اعمال و عقائد کی خرابی پر خدا کی تنبیہ سمجھتے تھے اور اپنے وعظوں میں طرح طرح سے ہم کو ڈراتے اور پست ہمت کرتے رہے، حالاں کہ اِن باتوں کو ایمان و اخلاق سے کیا تعلق؟ اِس قسم کی گردشیں قوموں کی زندگی میں آیا ہی کرتی ہیں۔ ایسے دن، کچھ ہمارے ہی اوپر تو نہیں گزرے ہیں، ہمارے باپ دادوں

بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾
اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۹۷﴾
اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾
اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾

اُنھوں نے جھٹلا دیا تو اُن کے کرتوتوں کی پاداش میں ہم نے بھی اُن کو پکڑ لیا۔۹۴-۹۶

پھر (بتاؤ کہ) اِن بستیوں کے لوگ کیا اِس سے مامون رہے تھے کہ اُن پر ہمارا عذاب رات میں آ جائے، جب وہ سوتے پڑے ہوں؟ یا اِن بستیوں کے لوگ اِس سے مامون رہے تھے کہ ہمارا عذاب اُن پر دن دہاڑے آ جائے، جب وہ کھیل میں لگے ہوں[۴۴۷]؟ پھر کیا وہ خدا کی تدبیر[۴۴۸] سے مامون رہے تھے؟ سو (یاد رکھو کہ) خدا کی تدبیر سے وہی لوگ

پر بھی گزرے ہیں جو بڑے اچھے اور نیک نہاد لوگ تھے۔ یہ تو زمانے کے اتفاقات ہیں۔ کبھی تنگی ہے، کبھی فراخی؛ کبھی فصل اچھی ہوئی، کبھی ماری گئی؛ کبھی سیلاب آ گیا، کبھی قحط پڑ گیا۔ اِن چیزوں کو اعمال و اخلاق سے باندھ دینا محض خرد باختگی اور وہمی پن ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۳۱۸)

۴۴۶؎ مطلب یہ ہے کہ رسولوں کو جھٹلا دیا جائے تو اِس کا لازمی نتیجہ جس طرح عذاب کی صورت میں نکلتا ہے، اُسی طرح اُن کی دعوت قبول کر لی جائے تو اِس کے نتیجے میں زمین و آسمان کی برکتیں اور فیروزمندیاں بھی لازماً حاصل ہوتی ہیں۔ یہ خدا کی سنت ہے اور خدا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک اِسی طریقے سے جاری رہی ہے۔ یہ اِس کا آخری ظہور تھا جس سے یہ حقیقت پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہو گئی ہے کہ آخرت کا عذاب و ثواب بھی ایک دن اِسی طرح واقع ہو جائے گا۔

۴۴۷؎ یعنی رات اور دن میں جس وقت بھی آیا، وہ اپنے آپ کو بچا نہیں سکے تو یہی آفت تم پر ٹوٹ پڑی تو تم کیا کرو گے؟

اَوَلَمۡ يَهۡدِ لِلَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِ اَهۡلِهَاۤ اَنۡ لَّوۡ نَشَآءُ اَصَبۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ‌ ۚ وَنَطۡبَعُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

اپنے آپ کو مامون سمجھتے ہیں جو نامراد ہونے والے ہوں۔ کیا اِس چیز نے اُن لوگوں کو کوئی سبق نہیں دیا جو زمین کے اگلے رہنے والوں کے بعد اُس کے وارث بنتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو اُن کے گناہوں کی پاداش میں اُن کو بھی آ پکڑتے[۴۴۹]؟ (نہیں، وہ کبھی سبق نہیں لیتے) اور (اِس کے نتیجے میں) ہم اُن کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سنتے[۴۵۰]۔

الاعراف ۷

۴۴۸؎ اصل میں لفظ 'مَکر' آیا ہے۔ اِس کے معنی خفیہ تدبیر کے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...خفیہ تدبیر کا مطلب یہ ہے کہ خدا وہاں سے پکڑتا ہے، جہاں سے کسی کو پکڑے جانے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اوپر تنبیہ کے بعد ڈھیل کی جو سنت بیان ہوئی، وہ اِس خفیہ تدبیر الٰہی کی ایک مثال ہے۔ قوم تو سمجھتی ہے کہ اب اُس نے پالا مار لیا، لیکن درحقیقت وہیں اُس کی ہلاکت کا کھڈ ہوتا ہے۔" (تدبر قرآن ۳/۳۲۰)

۴۴۹؎ اشارہ اگرچہ قریش کی طرف ہے، لیکن عام اسلوب میں فرمایا ہے کہ بعد میں آنے والوں نے اگلوں کے انجام سے سبق کیوں نہیں لیا اور کیوں نہیں سوچا کہ خدا نے جس طرح اُن کو پکڑا تھا، وہ اُن کے وارثوں کو بھی جب چاہے، اُسی طرح پکڑ سکتا ہے؟

۴۵۰؎ اِس لیے کہ اُن کے اِس جرم کی پاداش میں اُن کے دل پر مہر لگ چکی ہوتی ہے کہ اگلوں کی تاریخ سے اُنھوں نے کوئی سبق نہیں لیا اور اُسی راہ پر گام زن رہے جو خدا سے پھرے ہوئے لوگوں نے ہمیشہ اختیار کی ہے۔ یہ مہر عذاب الٰہی کا مقدمہ ہوتی ہے۔ اِس کے بعد انسان اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے الجھاؤ میں الجھتا ہی چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آیات الٰہی کو بچشم سر دیکھ لینے کے بعد بھی اُس کے دل کا دروازہ قبول حق کے لیے نہیں کھلتا اور وہ پیغمبر کی بات کو بھی سننے سے انکار کر دیتا ہے۔

تِلۡكَ الۡقُرٰى نَقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۱﴾ وَمَا وَجَدۡنَا لِاَكۡثَرِهِمۡ مِّنۡ عَهۡدٍ ۚ وَاِنۡ

یہ بستیاں ہیں جن کی سرگذشتوں کا کچھ حصہ ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ اِن کے رسول اِن کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر ایسا نہیں ہوا کہ یہ ایمان لاتے، اِس لیے کہ پہلے جھٹلاتے رہے تھے۔ اللہ منکروں کے دلوں پر اِسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔[۴۵۱] حقیقت یہ ہے کہ اِن میں سے اکثر میں ہم نے کسی عہد[۴۵۲] کا پاس نہیں دیکھا، بلکہ اکثر کو عہد

۴۵۱؎ یہ مزید وضاحت فرمائی ہے کہ دلوں پر مہر کب لگتی ہے اور کس طرح کے لوگوں کے دلوں پر لگتی ہے؟ فرمایا کہ اُن کے دلوں پر لگتی ہے جو پہلے سے خدا کی آیتوں اور نشانیوں کو جھٹلاتے رہے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی عام آیات سے روگردانی کا عادی ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ اُس کا دل ایسا پتھر ہو جاتا ہے کہ رسولوں کے ذریعے سے خاص نشانیاں بھی ظاہر ہوتی ہیں تو وہ بھی اُس پر کارگر نہیں ہوتیں۔ فرمایا کہ یہ طریقہ ہے ہمارے ہاں دلوں پر مہر لگانے کا۔ دل کا کام عبرت پذیری، تفکر اور تعقل ہے۔ اگر کوئی گروہ اِس طرح اپنی خواہشوں کا اندھا بہرا مرید بن جاتا ہے کہ تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی وہ دل کی آنکھیں نہیں کھولتا تو ایسے لوگوں کے دل بالآخر بالکل جیاٹ ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ ’بِمَا كَذَّبُوْا‘ یہاں ’يُؤْمِنُوْا‘ کا مفعول نہیں ہے، بلکہ ’ب‘ بیان سبب کے لیے ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۲۱)

۴۵۲؎ اِس سے وہ عہد مراد ہیں جو اُن بستیوں کے لوگوں نے، جن کا ذکر ہوا ہے، اپنے پیغمبروں سے باندھے کہ فلاں شرط پوری کر دی جائے تو مان لیں گے اور فلاں معجزہ دکھا دیا جائے تو ایمان لے آئیں گے۔ آگے آیات ۱۳۴-۱۳۵ میں یہی مضمون حضرت موسیٰ اور فرعون کی

وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ

توڑنے والا ہی پایا ہے[۴۵۳]۔ ۹۷-۱۰۲

اِن قوموں کے بعد، (جن کا ذکر اوپر ہوا ہے)، ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ[۴۵۴] فرعون[۴۵۵] اور اُس کے سرداروں کے پاس (رسول بنا کر) بھیجا، مگر اُنھوں نے اپنی

سرگذشت میں بھی بیان ہوا ہے۔ سورۂ انعام (۶) کی آیات ۱۰۹-۱۱۰ میں قرآن نے اِس کی مزید وضاحت کر دی ہے کہ اِس طرح کے عہد باندھ لینے کے بعد وہ بار بار توڑتے رہے اور کسی طرح ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

۴۵۳؎ اصل میں لفظ 'فَاسِق' آیا ہے۔ اِس کے معنی نافرمان کے ہیں، لیکن موقع کلام سے واضح ہے کہ یہاں نافرمانی سے عہد شکنی مراد ہے۔

۴۵۴؎ اصل میں لفظ 'اٰیت' آیا ہے۔ اِس سے مراد وہ عقلی اور فطری دلائل بھی ہیں جو حضرت موسیٰ اور ہارون نے فرعون اور اُس کے سرداروں کے سامنے پیش کیے اور وہ حسی معجزات بھی جو اُنھوں نے فرعون اور اُس کی قوم کو دکھائے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں اُن کی تفصیل کی گئی ہے۔

۴۵۵؎ لفظ فرعون 'رع' کی طرف منسوب ہے۔ قدیم اہل مصر سورج کو اپنا رب اعلیٰ یا مہا دیو قرار دیتے اور اُسے 'رع' کہتے تھے۔ چنانچہ لفظ 'فرعون' کے معنی ہیں: سورج دیوتا کی اولاد۔ مصر کے بادشاہ اُس زمانے میں اپنے آپ کو 'رع' کے جسمانی مظہر اور اُس کے ارضی نمائندے کی حیثیت سے پیش کرتے اور لوگوں کو یقین دلاتے تھے کہ اُن کے رب اعلیٰ یا مہا دیو وہی ہیں۔ دور حاضر کے محققین کا عام میلان ہے کہ یہ فرعون منفتہ یا منفتاح تھا۔

مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ

جانوں پر ظلم کیا اور اِن نشانیوں کا انکار کر دیا۔[۴۵۶] پھر دیکھو کہ اِن مفسدوں کا انجام کیا ہوا![۴۵۷] موسیٰ نے کہا: اے فرعون، میں جہانوں کے پروردگار کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ مجھے یہی چاہیے اور میں اِسی کا حریص ہوں[۴۵۸] کہ خدا کی طرف سے حق کے سوا کوئی

الاعراف ۷

۴۵۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'فَظَلَمُوْا بِهَا'۔ اِن میں 'ب' کا صلہ دلیل ہے کہ 'ظَلَمُوْا' یہاں 'کفروا' یا 'جحدوا' کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۴۵۷۔ سورہ کے مخاطبین کو یہ اِس سرگذشت کے سنانے کی اصل غایت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ خدا اور اُس کے رسولوں کے مقابلے میں سرکشی اختیار کی جائے تو قرآن اِسے بھی فساد سے تعبیر کرتا ہے۔ فرعون اور اُس کے سرداروں کے لیے 'مُفْسِدِيْنَ' کا لفظ یہاں اِسی مفہوم میں ہے۔

۴۵۸۔ اصل میں 'حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ' کے الفاظ ہیں۔ اہل اور سزاوار کے معنی میں 'حقیق به' یا 'هو حقیق أن یفعل كذا' کے الفاظ آتے ہیں۔ یہاں اِس کے ساتھ 'علٰی' ہے۔ اِس سے یہ حریص کے معنی پر متضمن ہو گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...ظاہر ہے کہ جو خدا کا رسول اور سفیر ہو، وہی سب سے زیادہ اہل اِس بات کا ہو سکتا ہے کہ خدا کی صحیح صحیح ترجمانی کرے، اُس پر کوئی من گھڑت بات نہ لگائے، اِس لیے کہ اُس کا علم ظن و قیاس پر نہیں، بلکہ براہ راست خدا کی وحی اور خطاب پر مبنی ہوتا ہے اور اپنے منصب کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے وہ اِس بات کا نہایت حریص بھی ہوتا ہے کہ اُس کی زبان سے کوئی کلمہ حق کے خلاف نہ نکلے، اِس لیے کہ جس پرسش کا خوف اُسے ہوتا یا ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہ ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۴۰)

فَاَرۡسِلۡ مَعِیَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنۡ کُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰیَۃٍ فَاۡتِ بِہَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلۡقٰی عَصَاہُ فَاِذَا ہِیَ ثُعۡبَانٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّ نَزَعَ یَدَہٗ فَاِذَا ہِیَ بَیۡضَآءُ لِلنّٰظِرِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾

بات نہ کہوں۔ تمھارے پروردگار کی طرف سے میں تمھارے پاس (اپنے اِس منصب کی) صریح نشانی[۴۵۹] لے کر آیا ہوں، سو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دو[۴۶۰]۔ اُس نے جواب دیا: اگر کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اُسے پیش کرو، اگر تم سچے ہو۔ اِس پر موسیٰ نے اپنی لاٹھی (زمین پر) ڈال دی تو یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدہا تھا[۴۶۱] اور اُس نے اپنا

۴۵۹؎ اِس سے مراد عصا اور ید بیضا کا وہ معجزہ ہے جس کا ذکر آگے ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے باجبروت بادشاہ کے پاس بھیجنے کے لیے ضروری تھا کہ اُنھیں ایسے غیر معمولی معجزات دیے جائیں اور وہ شروع ہی میں اُن کا مظاہرہ بھی کر دیں تاکہ فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر اُن کی بات سننے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔

۴۶۰؎ دوسرے مقامات میں تصریح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے صرف یہ مطالبہ ہی نہیں کیا، اِس کے ساتھ انبیا علیہم السلام کے عام طریقے کے مطابق فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر کو توحید اور معاد پر ایمان اور خشیت و تذکر کی دعوت دی اور اپنے غیر معمولی معجزات سے اُن پر اتمام حجت بھی کر دیا جس کے نتیجے میں وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کا یہ مطالبہ بھی، معاذ اللہ کسی قوم پرست لیڈر کی طرف سے اپنی قوم کو غلامی سے چھڑانے کا مطالبہ نہیں تھا، بلکہ خدا کی اُس اسکیم کو بروے کار لانے کے لیے کیا گیا تھا جس کے تحت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو عالمی سطح پر ابلاغ دعوت اور اتمام حجت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اِس اسکیم کے مطابق یہ ضروری تھا کہ اُنھیں ایک خاص علاقے میں آباد کر کے وہاں دعوت حق کا مرکز قائم کیا جائے۔ بائیبل کی کتاب خروج کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٩﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿١١٠﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ

ہاتھ (آستین سے) کھینچا تو دیکھنے والوں کے لیے وہ دفعتاً چمکتا ہوا نکلا۔[۴۶۲] فرعون کی قوم کے سرداروں نے (یہ دیکھا تو) کہا: یہ شخص تو بڑا ماہر جادوگر ہے، تمھیں تمھارے ملک سے نکال دینا چاہتا ہے،[۴۶۳] سو بتاؤ، کیا راے دیتے ہو؟ پھر سب نے (فرعون کو) مشورہ دیا

الاعراف ۷

پوری اسکیم فرعون اور اُس کے درباریوں کے سامنے واضح نہیں فرمائی، بلکہ صرف اتنا کہا کہ وہ قربانی کی عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جانا چاہتے ہیں، اِس لیے کہ جس چیز کی قربانی کرنا پیش نظر ہے، اُس کی قربانی اگر مصر میں کی گئی تو وہاں کے لوگ اُنھیں سنگ سار کر دیں گے۔

۴۶۱؎ یعنی ایسا کھلا اژدہا کہ جس میں ذرا کسی شبہے کی گنجایش نہ ہو۔ آیت میں 'ثُعْبَان' کے ساتھ 'مُبِيْن' کی صفت اِسی مفہوم کے لیے لائی گئی ہے۔

۴۶۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ'۔ 'نَظَر' کا لفظ عربی زبان میں اصلاً غور و تامل کے ساتھ دیکھنے کے لیے آتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہاتھ میں جو چمک ظاہر ہوئی، وہ محض فریب نظر کی نوعیت کی نہیں تھی، بلکہ غور و تامل سے دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا تھا کہ اُس کی تابانی بالکل اصلی اور حقیقی ہے۔

۴۶۳؎ یعنی کچھ ایسا ویسا جادوگر نہیں ہے، بلکہ بڑا ماہر جادوگر ہے اور بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کا مطالبہ اِس لیے کر رہا ہے کہ اُنھیں منظّم کر کے اپنی فوج بنائے اور تم پر حملہ کر کے تمھیں اِس ملک سے نکال دے اور یہاں اپنی حکومت قائم کر لے۔ موسیٰ علیہ السلام کی غیر معمولی شخصیت اور بنی اسرائیل کی کثیر تعداد کے پیش نظر یہ بات بالکل قرین قیاس تھی۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ فرعون کے درباریوں نے فی الواقع یہی سمجھا ہو اور اِس کا بھی امکان ہے کہ اُنھوں نے اپنے لوگوں کو آں جناب کی دعوت سے برگشتہ کرنے کے لیے یہ اشغلا اُسی طریقے پر چھوڑا ہو، جس طرح کہ ہر دور

وَاَرۡسِلۡ فِی الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِیۡنَ ﴿۱۱۱﴾ یَاۡتُوۡکَ بِکُلِّ سٰحِرٍ عَلِیۡمٍ ﴿۱۱۲﴾
وَجَآءَ السَّحَرَۃُ فِرۡعَوۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ لَنَا لَاَجۡرًا اِنۡ کُنَّا نَحۡنُ الۡغٰلِبِیۡنَ ﴿۱۱۳﴾
قَالَ نَعَمۡ وَاِنَّکُمۡ لَمِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾
قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِیَ وَاِمَّاۤ اَنۡ نَّکُوۡنَ نَحۡنُ الۡمُلۡقِیۡنَ ﴿۱۱۵﴾
قَالَ اَلۡقُوۡا ۚ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا سَحَرُوۡۤا اَعۡیُنَ النَّاسِ وَاسۡتَرۡہَبُوۡہُمۡ وَجَآءُوۡ

کہ ابھی اِس کو اور اِس کے بھائی کو ٹال دیجیے[۴۶۴] اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیجیے جو سب ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے آپ کے پاس لے آئیں۔ (چنانچہ ایسا ہی کیا گیا) اور جادوگر فرعون کے پاس آ گئے۔ اُنھوں نے کہا: اگر ہم ہی جیت گئے تو بڑا صلہ تو ہمیں یقیناً ملے گا[۴۶۵]؟ فرعون نے جواب دیا: ہاں، ضرور اور تم ہمارے مقربین میں بھی شامل ہو جاؤ گے۔ ۱۰۳-۱۱۴

اِس پر جادوگروں نے کہا: اے موسیٰ، تم پھینکو گے یا (اگر تم چاہو تو) ہم پھینکتے ہیں[۴۶۶]؟ اُس نے کہا: تم ہی پھینکو[۴۶۷]۔ چنانچہ اُنھوں نے جب پھینکا تو لوگوں کی آنکھیں باندھ

کے ارباب اقتدار کا شیوہ رہا ہے۔

۴۶۴؎ اصل میں 'اَرۡجِهۡ وَاَخَاهُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'اَرۡجِهۡ' درحقیقت 'أرجئه' ہے۔ لفظ کو ہلکا کرنے کے لیے اِس طرح کے تصرفات عربی زبان میں عام ہو جاتے ہیں۔

۴۶۵؎ قرآن نے یہ جملہ ساحروں کی اخلاقی پستی اور دناءت کو ظاہر کرنے کے لیے نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیشہ وروں کے عام طریقے کے مطابق اُنھوں نے اِس خوشامدانہ انداز میں انعام کی توقع کا اظہار کیا۔

۴۶۶؎ یہ بات اُنھوں نے پیشہ ورانہ اخلاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہی، لیکن جملے کا اسلوب ایسا

بِسِحۡرٍ عَظِيۡمٍ ﴿١١٦﴾ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰۤى اَنۡ اَلۡقِ عَصَاكَ‌ۚ فَاِذَا هِىَ تَلۡقَفُ مَا يَاۡفِكُوۡنَ‌ۚ ﴿١١٧﴾ فَوَقَعَ الۡحَـقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ‌ۚ ﴿١١٨﴾ فَغُلِبُوۡا هُنَالِكَ وَانۡقَلَبُوۡا صٰغِرِيۡنَ‌ۚ ﴿١١٩﴾ وَاُلۡقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيۡنَ‌ۚ‌ۖ ﴿١٢٠﴾

دیں[٤٦٨] اور اُن پر دہشت طاری کر دی اور بڑا زبردست جادو بنا لائے۔ ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ اپنا عصا پھینکو۔ پھر اُس کا پھینکنا تھا کہ وہ اُن کے اُس طلسم کو نگلتا چلا گیا جو وہ بنا لائے تھے۔ سو حق ظاہر ہوا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے، سب باطل ہو گیا۔[٤٦٩] فرعون اور اُس کے ساتھی (اُس روز) وہاں مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے اور جادوگر

الاعراف ۷

ہے کہ اُن کی یہ خواہش بھی اُس سے ظاہر ہو رہی ہے کہ حضرت موسیٰ چاہیں تو وہ پہل کرنے کے لیے تیار ہیں۔

٤٦٧؎ موسیٰ علیہ السلام کو پورا اعتماد تھا کہ اُن کا پروردگار اُن کے ساتھ ہے، اِس لیے اُنھوں نے پہلے اُنھی کو موقع دیا کہ وہ اپنا ہنر دکھائیں۔ جادوگر جب اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں تو جوے کے تیروں کی طرح کوئی چیز دیکھنے والوں کے سامنے پھینکتے اور اُس پر اپنا جادو دکھاتے ہیں۔ آیت میں 'اِلْقَاء' یعنی پھینکنے کا لفظ اِسی مناسبت سے آیا ہے۔

٤٦٨؎ یہ قرآن نے جادو کی حقیقت واضح کر دی ہے کہ اُس سے کسی چیز کی حقیقت و ماہیت نہیں بدلتی۔ وہ محض نگاہ اور قوت متخیلہ کو متاثر کرتا ہے جس سے انسان وہی کچھ دیکھنے لگتا ہے جو جادوگر دکھانا چاہتا ہے۔

٤٦٩؎ یعنی عصا کا سانپ جدھر جدھر گیا، اُس نے سانپوں کی طرح لہراتی ہوئی ہر رسی اور لاٹھی کو اُسی طرح رسی اور لاٹھی بنا دیا، جس طرح وہ حقیقت میں تھی اور سارا طلسم نابود ہو گیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ بالکل ویسی ہی بات ہے کہ مہ نخشب کے مقابلے میں خورشید جہاں تاب نکل آئے۔

قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ

(خدا کی اِس نشانی کو دیکھ کر) سجدے میں گر پڑے[۱۷۰]۔ اُنھوں نے (بے اختیار) کہا: ہم جہانوں کے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے[۱۷۱]۔ ۱۱۵-۱۲۲

فرعون نے کہا: تم میری اجازت کے بغیر اُس پر ایمان لے آئے ہو؟ یہ ضرور ایک

ظاہر ہے کہ ہزاروں مصنوعی چاند، سورج ہوں، جب بھی حقیقی سورج کے نکلتے ہی اُن کی چمک دمک ملمع کی طرح غائب ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ کے معجزے کے ظاہر ہوتے ہی ساحروں کا سارا طلسم غائب ہو گیا۔'' (تدبر قرآن ۳/۳۴۷)

۱۷۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ'۔ 'اُلْقِیَ' مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ جادوگروں کے جذبۂ تعظیم و اکرام کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ سحر و ساحری اور اِس طرح کے دوسرے علوم وفنون کو اُن کے ماہرین ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اِن میں اور معجزے میں فرق کے لیے یہ نہایت واضح معیار ہے کہ اِن علوم وفنون کے ماہرین بھی اُس کے سامنے اعتراف عجز پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

۱۷۱؎ یہ صاف فرعون کی خدائی سے انکار تھا۔ سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۷۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقابلے پر آنے سے پہلے ہی جادوگر کسی حد تک سمجھ چکے تھے کہ معاملہ اُن کے کسی ہم پیشہ سے نہیں ہے۔ آیت میں 'مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ' کے الفاظ اِسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کے اندر دبی ہوئی روشنی اِسی کی منتظر تھی کہ کوئی آگ دکھائے اور وہ بھڑک اٹھے۔ استاذ امام کے الفاظ میں سعادت کا کوئی شمہ بھی انسان کے اندر موجود ہو تو بتوفیق الٰہی وہ اپنا اثر دکھا ہی جاتا ہے۔

مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

سازش ہے جو تم لوگوں نے اِس شہر میں اِس لیے کی ہے کہ اِس کے باشندوں کو وہاں سے نکال دو۔[۲۷۲] سو (اِس کا نتیجہ) تمھیں ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا، پھر تم سب کو لازماً سولی پر چڑھا دوں گا۔ اُنھوں نے جواب دیا: (پھر کیا ہے)، ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹیں گے! تم صرف اِس غصے میں ہمارے درپے آزار ہو رہے ہو کہ ہمارے پروردگار کی نشانیاں جب ہمارے پاس آگئیں تو ہم اُن پر ایمان لے آئے۔ پروردگار، (اب) تو ہم پر صبر کا فیضان فرما اور ہمیں اِس حال میں دنیا سے اٹھا کہ ہم مسلمان ہوں۔[۲۷۳] ۱۲۳-۱۲۶

۲۷۲؎ جادوگروں کے اعتراف حق سے مجمع پر جو اثر پڑا اور فرعون اور اُس کے درباری جس طرح رسوا ہو کر رہ گئے، اُس کی خفت مٹانے اور بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالنے کے لیے اُس نے کائیاں سیاسیوں کی طرح فوراً اُن پر سازش کا الزام رکھ کر سزا سنا دی کہ یہ سب تمھاری اور موسیٰ کی ملی بھگت ہے۔ تم سب مل کر ہمارے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے میری اجازت کا انتظار بھی نہیں کیا اور موسیٰ پر ایمان کا اعلان کر دیا ہے۔ اب میں تمھیں وہی سزا دوں گا جو سلطنت کے باغیوں کو دی جاتی ہے۔

۲۷۳؎ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سچا ایمان آن کی آن میں انسان کو کس بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا

فرعون سے اُس کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا تم موسیٰ اور اُس کی قوم کو اِسی طرح چھوڑے رکھو گے کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور تمھیں اور تمھارے (ٹھیرائے ہوئے) معبودوں کو ٹھکرائیں[۴۷۷]؟ فرعون نے جواب دیا: ہم اُن کے بیٹوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ماریں گے اور اُن کی عورتوں کو جیتا رہنے دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اُن پر

’’...یہ وہی جادوگر ہیں جن کی دناءت اور پست ہمتی کا ابھی چند منٹ پہلے یہ حال تھا کہ اپنے کرتب دکھانے کے لیے فرعون کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو بھانڈوں، نقالوں اور مسخروں کی طرح اپنے فن کے مظاہرے پر بھرپور انعام کی التجا پیش کرتے ہیں یا اب یہ حال ہے کہ ایمان کی روشنی دل میں داخل ہوتے ہی اُن کے باطن کا ہر گوشہ اِس طرح جگمگا اٹھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تاریکی کی کوئی پرچھائیں اُن کے دلوں پر کبھی پڑی ہی نہیں تھی اور یہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان نہیں بلکہ یہ عزیمت واستقامت کے پہاڑ اور پاکیزگی و قدوسیت کے ملائک صفت پیکر ہیں۔ غور کیجیے، فرعون نے کتنی بڑی دھمکی اُن کو دی، لیکن اُنھوں نے اِس کے جواب میں فرمایا تو یہ فرمایا کہ کچھ غم نہیں، اگر تم نے ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی دے دی تو ہم کہیں اور نہیں جائیں گے، اپنے رب ہی کے پاس جائیں گے اور جب تیرا سارا غضب ہمارے اوپر اِس جرم میں ہے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر، جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے تو جو کچھ تو کر سکتا ہے، وہ کر گزر، اگر اِس جرم کی یہ سزا ہے تو ہم اِس سزا کا خیر مقدم کرتے ہیں۔‘‘ (تدبر قرآن ۳/۳۴۸)

۴۷۷؎ اِس سے مراد خود فرعون کے بت ہیں جو سورج دیوتا کے اوتار کی حیثیت سے خود اُس کے حکم سے پورے ملک میں پوجے جا رہے تھے۔ عربی زبان میں اضافت اِس طرح کے مفہوم

بِاللّٰهِ وَاصۡبِرُوۡا ۚ اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰهِ ۙ يُوۡرِثُهَا مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوۡۤا اُوۡذِيۡنَا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَاۡتِيَنَا وَمِنۡۢ

پوری طرح حاوی ہیں[475]۔ اِس پر موسیٰ نے اپنی قوم کو نصیحت کی: تم اللہ سے مدد چاہو[476] اور ثابت قدم رہو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اُس کا وارث بنا دیتا ہے اور (یاد رکھو کہ) آخر میں کامیابی اُنھی کی ہے جو اُس سے ڈرنے

کے لیے بھی آجاتی ہے۔

۴۷۵؎ بنی اسرائیل کی نسل کشی کے لیے یہی اسکیم حضرت موسیٰ کی پیدایش سے پہلے رعمیس دوم کے زمانے میں بھی جاری رہی تھی۔ اپنے ہی منتخب کیے ہوئے میدان میں شکست کھا کر جب درباریوں نے موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کے خلاف سخت اقدام کا مطالبہ کیا تو فرعون نے ظلم وستم کی وہی اسکیم دوبارہ جاری کرنے کا اعلان کر دیا۔ نیز یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ اس کے نتیجے میں کسی بغاوت کا اندیشہ نہیں ہے، ہمارا اقتدار اُن کے اوپر پوری طرح مستحکم ہے۔

۴۷۶؎ یعنی نماز میں اُس کے سامنے سربہ سجود ہو کر اُس سے مدد کی درخواست کرو۔ اللہ سے مدد چاہنے کا یہی طریقہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... فتنوں اور آزمایشوں میں استقامت بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ کام اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اِسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے کہ 'وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ'* (اور تمھیں صبر نہیں حاصل ہو سکتا، مگر اللہ ہی کی مدد سے)۔ اللہ کی یہ مدد حاصل کرنے کا واسطہ نماز ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اِس نماز سے مراد صرف عام نماز نہیں ہے، بلکہ وہ خاص نماز بھی ہے جس کی تاکید آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو مکی زندگی کے ابتدائی پرمحن دور میں کی گئی تھی۔ اِسی چیز کی تاکید حضرت موسیٰ اور ہارون کو بھی کی گئی۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۵۱)

* النحل ۱۶: ۱۲۷۔

بَعۡدِ مَا جِئۡتَنَا ؕ قَالَ عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّہۡلِکَ عَدُوَّکُمۡ وَ یَسۡتَخۡلِفَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۹﴾

وَ لَقَدۡ اَخَذۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ بِالسِّنِیۡنَ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا جَآءَتۡہُمُ الۡحَسَنَۃُ قَالُوۡا لَنَا ہٰذِہٖ ۚ

والے ہوں[۴۷۷]۔ اُنھوں نے کہا: ہم تمھارے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمھارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں[۴۷۸]۔ موسیٰ نے جواب دیا: امید ہے کہ تمھارا پروردگار تمھارے دشمن کو ہلاک کرے اور تمھیں زمین میں اقتدار عطا فرمائے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو[۴۷۹]۔ ۱۲۷-۱۲۹

ہم نے فرعون کے لوگوں کو قحط میں اور پیداوار کی کمی (کے عذاب) میں مبتلا رکھا تاکہ وہ متنبہ ہوں[۴۸۰]۔ لیکن (ہوا یہ کہ) جب اُن کے اچھے دن آتے تو کہتے: یہ ہمارا حق

---

۴۷۷ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے، لہٰذا یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اُس کے ساتھیوں کو اُن کے دشمنوں پر لازماً غلبہ عطا فرماتے ہیں۔

۴۷۸ بنی اسرائیل کا یہ جواب اُن کی روایتی بے یقینی اور ضعیف الاعتقادی کا اظہار ہے۔

۴۷۹ یہ برسر موقع تنبیہ ہے کہ خدا کے پیغمبر کا ساتھ دو گے تو بادشاہی ضرور مل جائے گی، مگر برقرار اُسی صورت میں رہے گی، جب اُس کا حق ادا کیا جائے گا۔ پچھلے رسولوں کی امتوں کی طرح بدمست ہو کر زمین میں فساد برپا کرو گے تو اُنھی کی طرح یہ تم سے بھی چھین لی جائے گی۔

۴۸۰ رسولوں کے باب میں یہ سنت الٰہی پیچھے بیان ہوئی ہے کہ اُن کی دعوت جب انذار عام کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو اِس طرح کی آزمایشیں لوگوں کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کے لیے آسمان سے نازل کی جاتی ہیں۔

وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوۡا بِمُوۡسٰى وَمَنۡ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۱﴾ وَقَالُوۡا مَهۡمَا تَاۡتِنَا بِهٖ مِنۡ اٰيَةٍ لِّتَسۡحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳۲﴾ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمُ الطُّوۡفَانَ وَالۡجَـرَادَ وَالۡقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَكَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۳۳﴾ وَلَمَّا

ہے اور اگر کبھی برے دن آتے تو اُس کو موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کی نحوست بتاتے تھے۔ سنو، اِن لوگوں کی نحوست تو اللہ ہی کے پاس ہے، مگر اِن میں سے اکثر نہیں جانتے۔[۴۸۱] اُنھوں نے یہی کہا کہ تم خواہ کوئی نشانی ہمارے پاس لے آؤ کہ اُس سے ہمیں مسحور کردو، ہم تمھاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ سو ہم نے اُن پر طوفان بھیجا، ٹڈیاں، جوئیں اور مینڈک چھوڑ دیے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں تھیں، بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جن کی تفصیل کر دی گئی ہے۔[۴۸۲] اِس پر بھی وہ تکبر ہی کرتے رہے اور حقیقت

۴۸۱؎ مطلب یہ ہے کہ اپنی نحوست دوسروں کے طالع میں ڈھونڈتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ خدا کا فیصلہ ہے جو اُن کی بداعمالیوں کے نتیجے میں اُن کے خلاف صادر ہو گیا ہے۔

۴۸۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ'۔ یہ حال واقع ہوئے ہیں اور قرینہ دلیل ہے کہ 'مُفَصَّلٰت' کا ظرف یہاں محذوف ہے، یعنی اُن کی تفصیل بنی اسرائیل کے صحیفوں میں کر دی گئی ہے۔ چنانچہ بائیبل کی کتاب خروج میں طوفان کی تفصیل اِس طرح آئی ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا تاکہ سب ملک مصر میں انسان اور حیوان اور کھیت کی سبزی پر جو ملک مصر میں ہے، اولے گریں۔ اور موسیٰ نے اپنی لاٹھی آسمان کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد اور اولے بھیجے اور (بجلیوں کی) آگ زمین تک آنے لگی اور خداوند نے ملک مصر پر اولے برسائے۔ پس اولے گرے اور اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی

تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی، ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے اور اولوں نے سارے ملک مصر میں اُن کو جو میدان میں تھے، کیا انسان کیا حیوان، سب کو مارا اور کھیتوں کی ساری سبزی کو بھی اولے مار گئے اور میدان کے سب درختوں کو توڑ ڈالا۔'' (۹: ۲۲-۲۵)

ٹڈی دل کے حملے کی تفصیل اِس طرح بیان ہوئی ہے:

''تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ملک مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تا کہ ٹڈیاں ملک مصر پر آئیں اور ہر قسم کی سبزی کو جو اِس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے، چٹ کر جائیں۔ پس موسیٰ نے ملک مصر پر اپنی لاٹھی بڑھائی اور خداوند نے اُس سارے دن اور ساری رات پروا آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوتے پروا آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے ملک مصر پر چھا گئیں اور وہیں مصر کی حدود میں بسیرا کیا اور اُن کا دَل ایسا بھاری تھا کہ نہ تو اُن سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں اور نہ اُن کے بعد پھر آئیں گی۔ کیونکہ اُنھوں نے تمام روے زمین کو ڈھانک لیا، ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور اُنھوں نے اُس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے، چٹ کر لیا اور ملک مصر میں نہ تو کسی درخت کی، نہ کھیت کی کسی سبزی کی ہریالی باقی رہی۔'' (۱۰: ۱۲-۱۵)

جوؤں کا حملہ جس طرح ہوا، اُس کی تفصیل یہ ہے:

''تب خداوند نے موسیٰ سے کہا: ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مار تا کہ وہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کی گرد کو مارا اور انسان اور حیوان پر جوئیں ہو گئیں اور تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی۔'' (۸: ۱۶-۱۷)

مینڈکوں کے عذاب کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے:

''پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ فرعون کے پاس جا اور اُس سے کہہ، خداوند یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تا کہ وہ میری عبادت کریں۔ اور اگر تو اُن کو جانے نہ دے گا تو دیکھ میں تیرے ملک کو مینڈکوں سے ماروں گا اور دریا بے شمار مینڈکوں سے بھر جائے گا اور وہ آ

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَىِٕنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ

یہ ہے کہ وہ مجرم لوگ تھے۔ جب اُن پر آفت ٹوٹ پڑتی[483] تو کہتے: اے موسیٰ، اپنے پروردگار سے تم اُس عہد کی بنا پر جو اُس نے تم سے کر رکھا ہے،[484] ہمارے لیے دعا کرو۔

کر تیرے گھر میں اور تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں اور آٹا گوندھنے کے لگنوں میں گھستے پھریں گے اور تجھ پر اور تیری رعیت اور تیرے نوکروں پر چڑھ جائیں گے۔ اور خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں پر بڑھا اور مینڈکوں کو ملک مصر پر چڑھا لا۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا، اُس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مینڈک چڑھ آئے اور ملک مصر کو ڈھانک لیا۔'' (۸: ۱-۶)

خون کا عذاب جس صورت میں ظاہر ہوا، اُس کی تفصیل یہ ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے اور مصر میں جتنا پانی ہے، یعنی دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں اور تالابوں پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ وہ خون بن جائیں اور سارے ملک مصر میں پتھر اور لکڑی کے برتنوں میں بھی خون ہی خون ہوگا۔ اور موسیٰ اور ہارون نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا۔ اُس نے لاٹھی اٹھا کر اُسے فرعون اور اُس کے خادموں کے سامنے دریا کے پانی پر مارا اور دریا کا پانی سب خون ہو گیا اور دریا کی مچھلیاں مر گئیں اور دریا سے تعفن اٹھنے لگا اور مصری دریا کا پانی پی نہ سکے اور تمام ملک مصر میں خون ہی خون ہو گیا۔'' (۷: ۱۹-۲۱)

۴۸۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَمَّا وَقَعَ عَلَیْهِمُ الرِّجْزُ'۔ اِن میں 'لَمَّا'، 'كُلَّمَا' کے معنی میں ہے۔ تصویر حال مقصود ہو تو یہ اِس معنی میں بھی آتا ہے۔ آگے آیت ۱۸۹ میں اِس کی نظیر موجود ہے۔

۴۸۴؎ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے تمھاری بات سننے اور اُس کی حرمت قائم رکھنے کا

الاعراف ۷

اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُمُ الرِّجۡزَ اِلٰۤی اَجَلٍ هُمۡ بٰلِغُوۡهُ اِذَا هُمۡ یَنۡكُثُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ فِی الۡیَمِّ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ كَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ اَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ الَّذِیۡنَ كَانُوۡا یُسۡتَضۡعَفُوۡنَ مَشَارِقَ الۡاَرۡضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِیۡ

اگر یہ آفت تو نے (اِس وقت) ہم سے ہٹا دی تو ہم تمھاری بات ضرور مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی ضرور تمھارے ساتھ جانے دیں گے۔ پھر جب کچھ مدت کے لیے، جس تک اُنھیں بالآخر پہنچنا ہی تھا،[۴۸۵] وہ آفت ہم اُن سے ہٹا دیتے تو اُسی وقت عہد کو توڑ دیتے تھے۔[۴۸۶] سو ہم نے اُن سے انتقام لیا[۴۸۷] اور اُنھیں سمندر میں غرق کر دیا، اِس لیے کہ اُنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اُن سے بے پروا بنے رہے۔ اِس کے برخلاف اُن کو جو دبا کر رکھے گئے تھے، ہم نے اُس سرزمین کے مشرق و مغرب کی وسعتوں کا وارث

جو عہد کر رکھا ہے۔

۴۸۵؎ یعنی جو بہر حال ختم ہو جانا تھی اور اُن کے جھوٹ اور فریب کا پردہ جس کے بعد لازماً چاک ہو جانا تھا۔

۴۸۶؎ اِس کا ذکر بائیبل میں بھی ہوا ہے۔ کتاب خروج میں ہے:

”تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا کہ خداوند سے شفاعت کرو کہ مینڈکوں کو مجھ سے اور میری رعیت سے دفع کرے اور میں اِن لوگوں کو جانے دوں گا تا کہ وہ خداوند کے لیے قربانی کریں۔“ (۸:۸)

”فرعون نے کہا: میں تم کو جانے دوں گا تا کہ تم خداوند اپنے خدا کے لیے بیابان میں قربانی کرو، لیکن تم دور مت جانا اور میرے لیے شفاعت کرنا... پر فرعون نے اِس بار بھی اپنا دل سخت کر لیا اور اُن لوگوں کو جانے نہ دیا۔“ (۸:۲۸-۳۲)

بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝ ۱۳۷

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي

بنا دیا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں۔[۴۸۸] بنی اسرائیل پر تیرے پروردگار کا وعدۂ خیر اِس طرح پورا ہوا[۴۸۹] کیونکہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اُس کی قوم کا سب کچھ برباد کر دیا جو وہ (اپنے شہروں میں) بناتے اور جو کچھ (دیہات کے باغوں اور کھیتوں میں ٹٹیوں پر) چڑھاتے تھے۔[۴۹۰] ۱۳۰-۱۳۷

دوسری طرف بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر کے پار اتار دیا۔[۴۹۱] پھر اُن کا گزر ایک

۴۸۷؎ یعنی اُن جرائم کا انتقام لیا جن پر وہ اتمام حجت کے باوجود جمے رہے۔

۴۸۸؎ اِس سے فلسطین کی سرزمین مراد ہے جسے بنی اسرائیل کے لیے توحید کے مرکز کی حیثیت سے منتخب کیا گیا اور جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص عنایت سے مادی اور روحانی، دونوں قسم کی برکتیں اُن کے لیے رکھ دی تھیں۔ آیت میں 'مَشَارِق' اور 'مَغَارِب' کے الفاظ اِس سرزمین کی وسعت اطراف کو بیان کرنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ اِس بات کی واضح نظیر ہے کہ عربی زبان میں جمع اِس مفہوم کے لیے بھی آتی ہے۔

۴۸۹؎ اُس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو پیچھے آیات ۱۲۸-۱۲۹ میں مذکور ہے۔

۴۹۰؎ یعنی انگور جس کی پیداوار میں مصر کو اُس زمانے میں امتیاز حاصل تھا۔ یہ جز و غالب کے ذکر سے کسی چیز کی تعبیر کا اسلوب ہے، ورنہ مدعا یہی ہے کہ اُن کے تمام شہر اور باغ ملیا میٹ کر دیے گئے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اتمام حجت کے بعد صرف فرعون اور اُس کے لشکر ہی غرقاب نہیں ہوئے، بلکہ پورے ملک پر تباہی آئی جس سے محل اور ایوان بھی منہدم

اَصۡنَامٍ لَّهُمۡ ۚ قَالُوۡا يٰمُوۡسَى اجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمۡ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمۡ قَوۡمٌ تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰۤؤُلَاۤءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمۡ فِيۡهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا

ایسی قوم پر ہوا جو (اِس قدر احمق تھی کہ) اپنے کچھ بتوں کی پرستش میں لگی ہوئی تھی[۴۹۲]۔ بنی اسرائیل نے (یہ دیکھا تو) کہا: اے موسیٰ، جس طرح اِن کے معبود ہیں، اُسی طرح کا ایک معبود ہمارے لیے بھی بنا دو[۴۹۳]۔ موسیٰ نے کہا: تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔ یہ جس

الاعراف ۷

ہوئے اور ہر قسم کے باغات بھی اجڑ گئے۔

۴۹۱؎ فرعون کا انجام بیان کرنے کے بعد یہاں سے اب بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جو خدائی دینونت کے عالمی ظہور کی سرگذشت ہے۔

۴۹۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'يَعۡكُفُوۡنَ عَلٰٓى اَصۡنَامٍ لَّهُمۡ'۔ یہ اسلوب بیان اپنے اندر تحقیر کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسی کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اِس جملے میں 'عَكَفَ' 'عَلٰى' کے ساتھ آیا ہے۔ اِس سے کسی چیز پر جمے ہونے اور اپنے آپ کو اُس سے وابستہ کر لینے کا مفہوم اِس میں پیدا ہو گیا ہے۔ یہ غالباً موجودہ شہر طور اور ابوزینمہ کے قریب کسی مقام کا ذکر ہے جس سے بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف جاتے ہوئے گزرے۔ مصریوں کا ایک بہت بڑا بت خانہ اور قدیم زمانے سے سامی قوموں کی چاند دیوی کا معبد اِسی علاقے میں تھا۔

۴۹۳؎ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اُن سے بھی زیادہ احمق ثابت ہوئے اور خدا کے جلال و جمال کی اتنی شانیں دیکھ لینے کے بعد بھی اُس ذہنی پستی سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہوئے جس میں مصر کی غلامی نے اُنھیں ڈال رکھا تھا۔ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام مصر کے دوران میں وہ اُن کے دیوتاؤں کی پرستش بھی کرنے لگے تھے۔ چنانچہ وہاں سے نکلنے کے فوراً بعد ہی جو بت کدہ سامنے آیا، اُس کو دیکھ کر اُن کی پیشانیاں اپنے پرانے معبودوں کے آستانے پر سجدے

يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡغِيۡكُمۡ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۴۰﴾ وَاِذۡ اَنۡجَيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ‌ۚ يُقَتِّلُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ‌ؕ وَفِىۡ ذٰلِكُمۡ بَلَاۤءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ ﴿۱۴۱﴾

وَوٰعَدۡنَا مُوۡسٰى ثَلٰثِيۡنَ لَيۡلَةً وَّاَتۡمَمۡنٰهَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِيۡقَاتُ

کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ برباد ہونے والا ہے اور جو کچھ کر رہے ہیں، وہ سراسر باطل ہے۔ اُس نے کہا: کیا میں تمھارے لیے خدا کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں، دراں حالیکہ وہی ہے جس نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت بخشی ہے؟ یاد کرو، جب ہم نے فرعون کے لوگوں سے تمھیں نجات عطا فرمائی جو تمھیں سخت عذاب میں ڈالے ہوئے تھے۔ وہ تمھارے بیٹوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مارتے اور تمھاری عورتیں جیتی رکھتے تھے اور اِس میں تمھارے پروردگار کی طرف سے (تمھارے لیے) بڑی عنایت تھی۔[۴۹۴] ۱۳۸-۱۴۱

(بنی اسرائیل وہاں سے آگے بڑھے تو) ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ

کے لیے بے تاب ہو گئیں۔

۴۹۴؎ اِس میں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ لڑکوں کو ذبح کرنے کا ذکر بیٹوں کے لفظ سے ہوا ہے اور لڑکیوں کو زندہ رکھنے کا ذکر کرتے ہوئے تمھاری عورتوں کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ پہلی تعبیر، اگر غور کیجیے تو شفقت پدری کا جذبہ ابھارتی ہے اور دوسری غیرت کو حرکت میں لانے کا باعث بنتی ہے۔ جملے کا اسلوب بھی قابل توجہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی بات کے ساتھ ملا کر گویا اللہ تعالیٰ نے اپنی بات اُن کی زبان پر جاری کر دی ہے۔

رَبِّهٖٓ اَرۡبَعِيۡنَ لَيۡلَةً ۚ وَقَالَ مُوۡسٰى لِاَخِيۡهِ هٰرُوۡنَ اخۡلُفۡنِىۡ فِىۡ قَوۡمِىۡ وَاَصۡلِحۡ وَلَا تَتَّبِعۡ سَبِيۡلَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ مُوۡسٰى لِمِيۡقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِىۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَيۡكَ‌ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰٮنِىۡ وَلٰـكِنِ انْظُرۡ اِلَى الۡجَـبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوۡفَ

ٹھیرایا اور دس مزید راتوں سے اُس کو پورا کیا تو اِس کے نتیجے میں اُس کے پروردگار کی ٹھیرائی ہوئی مدت، چالیس راتیں پوری ہو گئی۔[495] (اِس وعدے کے لیے جاتے ہوئے) موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرو گے اور لوگوں کی اصلاح کرتے رہو گے اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہیں چلو گے۔[496] جب موسیٰ ہمارے ٹھیرائے ہوئے وقت پر پہنچ گیا اور اُس کے پروردگار نے اُس سے کلام کیا تو اُس نے التجا کی کہ پروردگار، مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھوں۔[497] فرمایا: تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ البتہ، اِس پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ

۴۹۵؎ یہ اُس وعدے کا ذکر ہے جو دریا پار کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی شریعت دینے کے لیے فرمایا۔ چالیس راتوں کی یہ مدت اُس ذہنی اور قلبی تیاری کے لیے تھی جو کتاب الٰہی کا حامل بننے کے لیے ضروری تھی۔ پہلے یہ وعدہ تیس دنوں کا تھا، لیکن سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۸۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام شوق ملاقات میں وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے۔ چنانچہ اُن کی اِس جلد بازی کے باعث اللہ تعالیٰ نے اُن کی تربیت کے لیے یہ مدت تیس دنوں سے بڑھا کر چالیس دن کر دی۔

۴۹۶؎ موسیٰ علیہ السلام نے جانے سے پہلے اپنی قوم کی نگرانی کے لیے جو اہتمام فرمایا، یہ اُس کا بیان ہے۔ اِسے خاص طور پر نمایاں کیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی کی

تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٤٣﴾ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ

اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو آگے تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ پھر جب اُس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی کی تو اُس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش آیا تو بولے: تو پاک ہے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور (گواہی دیتا ہوں کہ) سب سے پہلے ماننے والا میں ہوں۔[498] فرمایا: اے موسیٰ، میں نے اپنے پیغام اور

الاعراف ۷

جو لعنت اختیار کی، وہ اِس سارے اہتمام کے علی الرغم اختیار کی۔

۴۹۷؎ یہ شوق ایک فطری شوق ہے، اِس وجہ سے آں جناب کو اللہ تعالیٰ نے اِس پر کوئی ملامت نہیں فرمائی، بلکہ صرف سمجھا دیا ہے۔

۴۹۸؎ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سمجھانے کے لیے یہ طریقہ کیوں اختیار فرمایا؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ مشاہدہ حضرت موسیٰ کی اطمینان دہانی کے لیے کرایا گیا کہ خدا کی تجلی ذات کی تاب تو کوہ و جبل بھی نہیں لا سکتے جو جامد اور ٹھوس ہونے کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہیں تو تم انسان ضعیف البنیان ہو کر کس طرح لا سکو گے؟ انسان کی قوت برداشت محدود ہے۔ اُس کی نگاہیں روشنی کو دیکھتی ہیں، لیکن یہ روشنی ایک حد خاص سے متجاوز ہو جائے تو آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں، بلکہ بعض اوقات بینائی ہی سلب ہو جاتی ہے۔ اُس کے کان آواز کو سنتے ہیں، لیکن اُن کے سننے کی تاب بھی بس ایک مقررہ حد ہی تک ہے، بجلی کا کڑکا ہی ذرا حد سے متجاوز ہو جائے تو سرے سے کان کے پردے ہی بے کار ہو جائیں۔ آفتاب اُس کی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، مگر اُس کی روشنی اور حرارت اُسی وقت تک اُس کے لیے حیات بخش ہے، جب تک وہ نہایت ہی طویل فاصلے سے، نہ جانے کتنے فضائی پردوں کی اوٹ سے اور کتنی چھلنیوں

فَخُذۡ مَاۤ اٰتَیۡتُکَ وَکُنۡ مِّنَ الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۴۴﴾ وَکَتَبۡنَا لَہٗ فِی الۡاَلۡوَاحِ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ مَّوۡعِظَۃً وَّتَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ ۚ

کلام سے تمھیں لوگوں پر سرفرازی بخشی ہے، اِس لیے جو کچھ میں نے تمھیں دیا ہے، اُسے لو اور شکر گزار بن کر رہو۔[499] اور اُس کے لیے ہر قسم کی نصیحت اور (دین و شریعت سے متعلق) ہر چیز کی تفصیل ہم نے تختیوں پر لکھ دی۔[500] (فرمایا: یہ ہم نے لکھ دی

سے گزار کر اپنی روشنی اور حرارت اُس کو پہنچا رہا ہے۔ اگر کسی دن ذرا کرۂ ارض سے قریب آ کر اُس پر ایک نظر ڈال دے تو سارے جان دار جل بھن کر خاک اور راکھ ہو جائیں۔ تو جب اِس کائنات کی مخلوق کے مقابل میں انسان کی قوت برداشت اتنی ناتواں ہے تو وہ خدا کی ذات بحت کی تاب کس طرح لا سکتی ہے جو نور مطلق اور تمام چون و چگوں سے ماورا اور بالاتر ہے؟''

(تدبر قرآن ۳/۳۶۰)

۴۹۹؎ یہ انداز کلام بھی قابل توجہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اِس میں نہایت لطیف طریقے سے توجہ دلائی گئی ہے کہ جو کچھ عطا کیا جا رہا ہے، وہی کم نہیں ہے، اُس پر قناعت کرو، مجھے دیکھنے کی خواہش نہ کرو۔

۵۰۰؎ اصل میں 'مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ' اور 'لِکُلِّ شَیۡءٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس طرح کے سیاق و سباق میں یہ پیش نظر موضوع ہی سے متعلق ہو کر آتے ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اِسے واضح کر دیا ہے۔ تختیوں پر اللہ تعالیٰ نے خود لکھا یا اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت موسیٰ علیہ السلام نے لکھا، بائیبل کے بیان سے دونوں ہی باتیں نکلتی ہیں۔ اِن میں سے جس کو بھی مانیے، قرآن کے الفاظ اُس کے محتمل ہیں:

''اور موسیٰ نے لوگوں کے پاس جا کر خداوند کی سب باتیں اور احکام اُن کو بتا دیے اور سب لوگوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں، ہم اُن سب کو مانیں گے اور موسیٰ نے خدا کی سب باتیں لکھ لیں۔'' (خروج ۲۴: ۳-۴)

فَخُذۡهَا بِقُوَّةٍ وَّاۡمُرۡ قَوۡمَكَ يَاۡخُذُوۡا بِاَحۡسَنِهَا ؕ سَاُورِيۡكُمۡ دَارَ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۱۴۵﴾ سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِىَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا ۚ وَاِنۡ

ہیں)، سو اِنھیں مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ اِن کے (اندر لکھے ہوئے) احسن طریقے کی پیروی کریں[۵۰۱]۔ (اپنی قوم کو لے کر ذرا آگے بڑھو)، میں عنقریب تمھیں نافرمانوں کے گھر دکھاؤں گا[۵۰۲]۔ (تم دیکھو گے کہ) میں عنقریب اُن لوگوں کو اپنی نشانیوں سے پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور (ایسے ہیں کہ) اگر

الاعراف ۷

''اور موسیٰ شہادت کی دونوں لوحیں ہاتھ میں لیے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور وہ لوحیں اِدھر سے اور اُدھر سے، دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں۔ اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی ہوئی تھیں اور جو لکھا ہوا تھا، وہ بھی خدا ہی کا لکھا اور اُن پر کندہ کیا ہوا تھا۔'' (خروج ۳۲: ۱۵-۱۶)

یہ امر، البتہ ملحوظ رہے کہ قرآن کے الفاظ سے اِس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ تختیوں پر صرف احکام عشرہ لکھے ہوئے تھے، بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ دین و شریعت کی جو باتیں اُس مرحلے میں بتانی پیش نظر تھیں، وہ سب اُن میں درج کر دی گئی تھیں۔

۵۰۱ اصل میں 'يَاۡخُذُوۡا بِاَحۡسَنِهَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں تفضیل مطلق ہے اور لوگ جو طریقے اُس زمانے میں اختیار کیے ہوئے تھے، اُن کے مقابل میں آئی ہے۔ عربی زبان میں تفضیل کے صیغے اِس پہلو سے بھی آجاتے ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں مدعا یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے کہو کہ بت پرست قوموں کی خرافات پر نہ رہیجھیں، بلکہ اُس پاکیزہ اور اعلیٰ و احسن طریقے کو اپنائیں جو اِن الواح میں اُن کو بتایا گیا ہے۔

۵۰۲ اُن قوموں کی طرف اشارہ ہے جن کے علاقوں سے بنی اسرائیل فلسطین کی طرف اپنے سفر کے دوران میں گزرنے والے تھے۔

يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾
وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا

ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں، پھر بھی اُن پر ایمان نہ لائیں۔ اگر ہدایت کی راہ دیکھیں تو اُسے اختیار نہ کریں اور اگر گم راہی کی راہ دیکھیں تو اُس پر چل پڑیں۔ یہ اِس لیے کہ اُنھوں نے (اِس سے پہلے) ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اُن سے بے پروا بنے رہے[۵۰۳]۔ ہماری نشانیوں کو جن لوگوں نے بھی جھٹلایا اور آخرت کی ملاقات کا انکار کیا ہے، اُن کے اعمال ضائع ہو گئے۔ اب کیا بدلے میں اُس کے سوا کچھ پائیں گے جو کرتے رہے ہیں[۵۰۴]؟ ۱۴۶-۱۴۷

موسیٰ (خدا کے حضور میں تھا کہ اُس) کی قوم نے اُس کے پیچھے اپنے زیوروں سے[۵۰۵]

۵۰۳؎ آگے جو کچھ پیش آنے والا تھا، اُس کی مثال سے ہدایت و ضلالت کا قانون سمجھا دیا ہے کہ تمھارے جلو میں یہ قومیں خدائی دینونت کے ظہور کی عظیم نشانیاں دیکھیں گی، لیکن اِس کے باوجود انکار کر دیں گی، اِس لیے کہ اِن میں زیادہ متکبرین ہیں اور اِس سے پہلے بھی ہماری نشانیوں کو جھٹلا چکے ہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو لوگ تکبر کے ساتھ ہماری نشانیوں کو جھٹلا دیتے ہیں، اُنھیں ہم ہدایت سے محروم کر دیتے ہیں۔

۵۰۴؎ مطلب یہ ہے کہ وہی پائیں گے جو کچھ کرتے رہے ہیں۔

۵۰۵؎ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیورات لوگوں نے چندے میں دیے تا کہ جس طرح کا

لَهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ

ایک بچھڑا بنالیا، ایک دھڑ جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔[۵۰۶] کیا اُنھوں نے دیکھا نہیں کہ وہ نہ اُن سے بولتا ہے، نہ اُن کو کوئی راستہ دکھا سکتا ہے؟[۵۰۷] (اِس کے باوجود) اُنھوں نے اُسے معبود ٹھیرایا اور وہ سخت ظالم تھے۔ پھر جب اُن کا کیا اُن کے آگے آگیا (کہ پچھتائیں) اور اُنھوں نے دیکھا کہ گم راہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ اگر ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم

الاعراف ۷

معبود وہ چاہتے ہیں، اُن سے بنا دیا جائے۔

۵۰۶؎ اُس زمانے کے مصر میں بت گری کا فن جس درجے کو پہنچا ہوا تھا، اُس سے واقف کسی شخص کے لیے ایک ایسا بچھڑا ڈھال لینا کچھ مشکل نہ تھا جس میں سے اُس کے ڈکرانے کی آواز نکلتی ہو۔ چنانچہ اِس بچھڑے کی مورت بناتے وقت یہ صنعت گری بھی کی گئی تھی کہ اُس میں سے جب ہوا گزرتی تو جس طرح بچھڑے ڈکرتے ہیں، اُسی طرح کی آواز اُس سے نکلتی تھی۔

۵۰۷؎ یہ بنی اسرائیل کی بلادت پر تبصرہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''قرآن نے یہ ساری تصریح بنی اسرائیل کی بلادت، عقلی بے مایگی اور ساتھ ہی اُن کی ناقدری و ناسپاسی ظاہر کرنے کے لیے کی ہے کہ جس خداے بے ہمتا و بے مثال نے اُن کو اپنے جلال و جمال کی وہ شانیں دکھائیں جو اوپر مذکور ہوئیں، اُس کی قدر اُنھوں نے یہ کی کہ اپنے ہی زیوروں سے ایک بچھڑا بنایا، بچھڑا بھی کوئی سچ مچ کا نہیں، بلکہ صرف ایک جسد، ایک قالب، ایک دھڑ جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی اور اُس کے متعلق یہ باور کر لیا کہ یہی وہ خداوند خدا ہے جو بنی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے چھڑا کر لایا اور یہی اپنی رہنمائی میں بنی اسرائیل کو ارض موعود کی بادشاہی دلائے گا! اِس طرح اُنھوں نے اپنا وہ شوق پورا کر لیا جس کا اظہار

مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿١٤٩﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ؕ قَالَ

نہ فرمایا اور ہماری غلطی معاف نہ کی تو ہم نامراد ہو کر رہ جائیں گے۔[۵۰۸] (اِس کے بعد) جب موسیٰ غصے اور رنج سے بھرا ہوا اپنی قوم کی طرف پلٹا[۵۰۹] تو (آتے ہی) کہا: تم نے میرے پیچھے میری بہت بری جانشینی کی ہے۔ کیا تم اپنے پروردگار کے حکم سے پہلے ہی جلدی کر بیٹھے؟[۵۱۰] اُس نے تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی (ہارون) کا سر پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔[۵۱۱]

اُنھوں نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے اُن کے طور پر جانے سے پہلے کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰ نے اُن کو ڈانٹ بتائی تھی۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۶۵)

۵۰۸۔ یعنی بنانے کو تو بنا بیٹھے، مگر جب بھاں بھاں کرتا ہوا بچھڑا بن کر سامنے آیا اور یہ معلوم ہوا کہ اب یہ بنی اسرائیل کا خدا ہے تو حضرت ہارون اور دوسرے مصلحین کے توجہ دلانے پر بہت سے لوگ جن کے اندر کچھ سوجھ بوجھ تھی، سخت نادم ہوئے اور اپنے پروردگار سے معافی کی درخواست کرنے لگے۔

۵۰۹۔ اِس حادثے کی خبر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ پر ہی دے دی تھی۔ چنانچہ جب وہ پلٹے ہیں تو مفسدین کی اِس کامیاب شرارت پر نہایت غصے میں اور اپنی قوم کی نادانی اور جہالت پر نہایت غم و افسوس کی حالت میں پلٹے ہیں۔

۵۱۰۔ استفہام یہاں سرزنش اور ملامت کے لیے ہے۔ یعنی اِس سے پہلے کہ خدا تمھیں اپنی شریعت دے اور بتائے کہ تم اُس کا معبد کس طرح بناؤ گے اور کس طریقے سے اُس کی عبادت کرو گے، تم اپنا خدا خود تراش کر بیٹھ گئے؟

۵۱۱۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کے غلبۂ حال اور جوش حمیت کی تصویر ہے کہ اُنھوں نے تختیاں ایک

ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ

ہارون نے کہا: میری ماں کے بیٹے، اِن لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالیں۔[۵۱۲] اِس لیے دشمنوں کو میرے اوپر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھے اِن ظالم لوگوں کے ساتھ نہ ملا۔[۵۱۳] (تب) موسیٰ نے دعا کی: میرے رب، تو مجھے اور میرے بھائی کو معاف

طرف پھینکیں اور حضرت ہارون کے بال پکڑ کر اُنھیں جھنجھوڑنے لگے کہ اصل ذمہ داری تمھاری تھی، تم نے اِس فتنے کو کیوں سر اٹھانے دیا؟

۵۱۲؎ یہ حضرت ہارون نے اپنی صفائی پیش کی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...انداز خطاب بہت پیارا ہے۔ 'یا أخی' نہیں کہا، بلکہ 'ابْنَ اُمَّ' ''اے میرے ماں جائے'' کہا جس سے شفقت اور استمالت، دونوں چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ حضرت ہارون نے صفائی میں فرمایا کہ ''قوم نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ لوگ مجھے قتل کر دیں''۔ اِس سے واضح ہے کہ اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ اُس فتنہ سے لوگوں کو روکا، بلکہ اُس کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی، لیکن قوم کی بھاری اکثریت سامری کے چکمے میں آ گئی اور خود اُن کے ساتھ اتنی قلیل تعداد رہ گئی کہ طاقت کے زور سے اُن کے لیے اُس کو روکنا ممکن نہیں رہا۔ اِس وجہ سے اُنھوں نے... مصلحت اِسی میں دیکھی کہ حضرت موسیٰ کی واپسی کا انتظار کریں کہ مبادا اُن کا کوئی اقدام کسی مزید مضرت کا باعث ہو جائے۔'' (تدبر قرآن ۳/۳۶۸)

۵۱۳؎ مطلب یہ ہے کہ میں اِس فتنے سے بالکل بری ہوں۔ یہ تمام شرارت ہمارے دشمنوں کی ہے۔ مجھ پر عتاب ہوا تو یہ اُن کے لیے خوشی کا باعث ہو گا کہ فتنہ تو اُنھوں نے اٹھایا اور ذمہ دار مجھے ٹھیرا دیا گیا۔ اِس سے ضمناً اُس الزام کی بھی تردید ہو گئی ہے جو بائیبل کی کتاب خروج میں اُن پر لگایا گیا ہے کہ گوسالہ سازی کا یہ سارا کام اُنھی کے اہتمام میں ہوا تھا۔* قرآن نے دوسرے

* ۳۲:۱-۶۔

وَلِاَخِیۡ وَ اَدۡخِلۡنَا فِیۡ رَحۡمَتِکَ ۚۖ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۱۵۱﴾
اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ سَیَنَالُہُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ ذِلَّۃٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ؕ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُفۡتَرِیۡنَ ﴿۱۵۲﴾
وَ الَّذِیۡنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہَا وَ اٰمَنُوۡۤا ۫ اِنَّ رَبَّکَ مِنۡۢ بَعۡدِہَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۵۳﴾

کر دے[۵۱۴] اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ ۱۴۸-۱۵۱

(ارشاد ہوا): جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ہے، اُن کے پروردگار کا غضب البتہ، اُنھیں پہنچ کر رہے گا اور وہ اِسی دنیا کی زندگی میں ذلت سے دوچار ہوں گے۔ (یہ اِس لیے کہ) ہم جھوٹ باندھنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں[۵۱۵]۔ ہاں، جن لوگوں نے برے کام کیے، پھر اُن کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لائے[۵۱۶] تو اِس کے بعد تیرا پروردگار

مقامات میں صراحت فرمائی ہے کہ اِس جرم عظیم کا مرتکب خدا کا پیغمبر ہارون نہیں، بلکہ بد بخت سامری تھا جس نے اپنی کیادی اور منافقت سے یہ فتنہ پیدا کیا۔

۵۱۴۔ یعنی اگر بھائی سے فیصلہ کرنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے یا میں نے آکر مواخذہ کرنے میں کوئی زیادتی کر دی ہے تو ہمیں معاف فرما دے۔

۵۱۵۔ بنی اسرائیل نے بچھڑے کو معبود بنا کر پوجنے کا جرم پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اور اُس کی موجودگی میں کیا تھا۔ پھر وہ جس منصب کے لیے منتخب کیے گئے تھے، اُس کے حاملین کو اُن کے جرائم کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی لازماً دیتا ہے۔ اِس لیے فرمایا ہے کہ اِس افترا کا بدلہ اُنھیں ہر حال میں دیا جائے گا تاکہ اُس جماعت کی تطہیر ہو جائے جو خدا کے دین کی شہادت کے لیے منتخب

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚۖ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿١٥٤﴾ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا

الاعراف ۷

یقیناً بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔۱۵۲-۱۵۳

پھر جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا[517] تو اُس نے وہ تختیاں اٹھا لیں[518]۔ اُن سے جو کچھ منقول ہے[519]، اُس میں اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت تھی[520] جو اپنے پروردگار سے ڈرنے والے ہوں۔ اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی منتخب کیے تاکہ وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں[521]۔ پھر جب (وہ حاضر ہوئے اور) اُن کو زلزلے نے آ

کی گئی ہے۔

۵۱۶؎ یعنی تجدید ایمان کی، اِس لیے کہ بنی اسرائیل کا یہ گناہ اُن گناہوں میں سے تھا جن سے آدمی کا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ اگر گناہ کی نوعیت یہ نہ ہوتی تو صرف رویے کی اصلاح کافی تھی۔

۵۱۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ'۔ 'سَكَتَ' کے بعد 'عَنْ' ہے۔ یہ اِس بات پر دلیل ہے کہ یہاں یہ فعل 'زال' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ خاموش ہوئے اور اُن کا غصہ دور ہو گیا۔

۵۱۸؎ اِس سے ضمناً بائیبل کی اُس روایت کی تردید ہو جاتی ہے کہ تختیاں پھینکنے سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔

۵۱۹؎ یعنی تورات میں منقول ہے۔ اصل میں لفظ 'نُسْخَة' آیا ہے۔ یہ کسی تحریر کی حرف حرف نقل کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں یہ اِسی معنی میں ہے۔

۵۲۰؎ یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ آئیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں اِس سے ہدایت

بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ

پکڑا[۵۲۲] تو موسیٰ نے کہا: پروردگار، اگر تو چاہتا تو پہلے ہی اِن کو اور مجھے ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ایک ایسے کام پر ہمیں ہلاک کرے گا جو ہمارے اندر کے احمقوں نے کیا ہے؟ یہ سب تیری آزمایش ہی تھی۔ تو اِس سے جس کو چاہے، (اپنے قانون کے مطابق)، گم راہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے، ہدایت بخش دے[۵۲۳]۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ سو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔ (پروردگار)، تو ہمارے لیے اِس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی۔ ہم نے تیری طرف رجوع کر لیا ہے۔ فرمایا:

حاصل ہو گی اور قیامت میں خدا کی رحمت و عنایت جو اُس ہدایت پر عمل کا نتیجہ ہے۔

۵۲۱۔ بنی اسرائیل کا جرم چونکہ اجتماعی نوعیت کا تھا، اِس لیے اُن کے ستر آدمی منتخب کیے گئے جو اجتماعی توبہ کے لیے اُن کی نمائندگی بھی کریں اور اِس موقع پر اپنے پروردگار سے ازسرنو اطاعت کا عہد بھی استوار کر لیں۔

۵۲۲۔ یہ زلزلہ خدا کے جلال کا ظہور تھا تاکہ بنی اسرائیل اِس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ معاملہ کر رہے ہیں، اُس کی قدرت کتنی بے پناہ ہے اور اُنھوں نے اگر دوبارہ اِسی طرح کے کسی جرم کا ارتکاب کیا تو اُن کے ساتھ وہ کیا معاملہ کر سکتا ہے۔

۵۲۳۔ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی کا حوالہ بھی ہے اور نہایت لطیف طریقے سے اِس بات کی طرف اشارہ بھی کہ پروردگار، تیری آزمایشوں میں پورا اترنا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ بندہ صرف ارادہ اور اُس ارادے کو بروے کار لانے کی سعی کر سکتا ہے۔ اُس کی کامیابی

وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٥٦﴾ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ

میں اپنے عذاب میں تو اُسی کو مبتلا کرتا ہوں، جسے میں (اپنے قانون کے مطابق) مبتلا کرنا چاہتا ہوں، مگر میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔[۵۲۴] سو (قیامت کے لیے) میں اُس کو اُن لوگوں کے حق میں لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور اُن کے حق میں جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے[۵۲۵] — (اُن[۵۲۶] لوگوں کے حق میں) جو

الاعراف ۷

کا انحصار تمام تر تیری عنایت اور توفیق بخشی پر ہے اور ہم اُسی کی درخواست کر رہے ہیں۔

۵۲۴۔ یعنی ہر ایک کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا، صرف اُنھی کو کرتا ہوں جنھیں اپنے قانون عدل کے مطابق چاہتا ہوں کہ اُن کو مکافات عمل سے دوچار کر دیا جائے۔ مگر جہاں تک رحمت کا تعلق ہے، وہ ہر کافر و مومن کے لیے عام ہے اور اِس دنیا میں ہر ایک کو پہنچ رہی ہے۔

۵۲۵۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا پوری قوم کے لیے تھی اور تعمیم کے ساتھ مانگی گئی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کے جواب میں اصل ضابطہ بیان فرما دیا ہے کہ اُس کا عذاب کن لوگوں پر آتا ہے اور دنیا اور آخرت میں اُس کی رحمت سے کون بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ اِس جواب کا آخری فقرہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یوں نہیں فرمایا کہ 'يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا'، بلکہ اسلوب بدل کر فرمایا: 'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ'۔ اسلوب کی اِس تبدیلی سے مبتدا پر خاص طور پر زور دینا مقصود ہے کہ خاص کر وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ جو لوگ قرآن کے نظائر پر نگاہ رکھتے ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اُس عہد و میثاق کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آیندہ آنے والے انبیا پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۷۱)

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ

(آج) اِس نبی امی رسول[527] کی پیروی کریں گے جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا دیکھتے ہیں[528]۔ وہ اُنھیں بھلائی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے، اُن کے لیے پاک

اِس کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہوں: سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۱۲ اور سورۂ آل عمران (۳) کی آیات ۸۱-۸۲ جن میں یہ عہد و میثاق تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

۵۲۶؎ حضرت موسیٰ کی دعا کا جواب پچھلے فقرے پر ختم ہو گیا ہے۔ یہاں سے آگے اب تضمین کے طریقے پر کلام کو مطابق حال کر دیا ہے کہ اِس وقت 'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ' کے مصداق کون لوگ ہوں گے۔

۵۲۷؎ یہ تینوں لفظ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعارف کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ آپ بنی اسمٰعیل میں پیدا ہوئے جنھیں اُن کے بھائی بنی اسرائیل امی کہتے تھے اور اُن کے بالمقابل بنی اسمٰعیل کے لیے یہ گویا ایک امتیازی لقب بن چکا تھا، اِس لیے کہ وہ اُس طریقے سے حاملین کتاب و شریعت نہیں تھے، جس طرح بنی اسرائیل تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی اور صرف نبوت ہی نہیں، اُس کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی سرفراز فرمایا تھا۔ چنانچہ خدا کی زمین پر آخری دینونت آپ ہی کے ذریعے سے برپا کی گئی جو اب پوری انسانیت کے لیے خدا کی سب سے بڑی حجت ہے۔

۵۲۸؎ تورات میں یہ ذکر اِس طرح آیا ہے:

''خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اُس کی سننا... اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا، وہی وہ اُن سے کہے گا اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں

گا۔'' (استثنا ۱۸: ۱۵-۱۹)

استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰ ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آنے والا نبی بنی اسمٰعیل، یعنی امیوں میں پیدا ہو گا، اِس لیے کہ اِس سیاق میں 'تیرے بھائیوں میں سے' یا 'اُنھی کے بھائیوں میں سے' کا مطلب اِس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہو گا۔ یہ حضرت موسیٰ کی زبان مبارک سے گویا اُسی بشارت کا اعادہ تھا جو سیدنا ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ایک رسول کی بعثت کی دی تھی۔''

(تدبر قرآن ۳/ ۳۷۴)

اِس کے بعد اُنھوں نے لکھا ہے:

''اِس سے یہ بھی واضح ہوا کہ وہ صرف نبی نہیں ہو گا، بلکہ رسول بھی ہو گا، اِس لیے کہ 'میری مانند' اور 'تیری مانند' سے مراد حضرت موسیٰ کے مانند ہے اور حضرت موسیٰ فرعون اور اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، جن کے ذریعے سے بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی اور فرعون اور اُس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اِسی طرح اپنی قوم قریش اور اہل عرب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۷۴)

تورات میں دوسری جگہ فرمایا ہے:

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کے لیے تھی۔''

(استثنا ۳۳: ۲)

استاذ امام لکھتے ہیں:

''آتشی شریعت سے میرے نزدیک اُسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو سیدنا مسیحؑ نے ظاہر فرمائی ہے کہ اُس کے ہاتھ میں اُس کا چھاج ہو گا، وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا، دانے کو بھس سے الگ کرے گا، پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھس کو جلا دے گا۔ یہ ٹھیک رسول کی وہ خصوصیت بیان ہوئی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ وہ اپنی قوم

کے لیے عدالت بن کر آتا ہے اور حق و باطل کے درمیان اُس کے ذریعے سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۴/۳۷۴)

انجیل میں یہ بشارت آپ کے اسم گرامی کی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ سیدنا مسیح فرماتے ہیں:

''اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے، یعنی سچائی کا روح۔'' (یوحنا ۱۴: ۱۶-۱۷)

''لیکن مددگار، یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے، وہ سب تمھیں یاد دلائے گا۔'' (یوحنا ۱۴: ۲۶)

''اِس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُس کا کچھ نہیں۔'' (یوحنا ۱۴: ۳۰)

''لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا۔'' (یوحنا ۱۵: ۲۶)

''لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا۔'' (یوحنا ۱۶: ۷)

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں، مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ، یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اِس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا، وہی کہے گا اور تمھیں آیندہ کی خبریں دے گا۔'' (یوحنا ۱۶: ۱۲-۱۳)

''...کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا؟ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اِس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اُس قوم کو جو اُس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ اور جو اُس پتھر پر گرے گا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، لیکن جس پر وہ گرے گا، اُسے پیس ڈالے گا۔'' (متی ۲۱: ۴۲-۴۴)

اِن ارشادات میں لفظ 'مددگار'، ظاہر ہے کہ آرامی یا سریانی کے کسی لفظ کا ترجمہ ہے۔ قرآن

وَ یُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَ عَزَّرُوۡهُ وَ نَصَرُوۡهُ وَ اتَّبَعُوا

چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام ٹھیراتا ہے[۵۲۹] اور اُن کے اوپر سے اُن کے وہ بوجھ اتارتا اور بندشیں دور کرتا ہے جو اب تک اُن پر رہی ہیں۔[۵۳۰] لہٰذا جو اُس پر ایمان لائے،

نے بتایا ہے کہ یہ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام احمد کے ہم معنی کوئی لفظ تھا جسے انجیل کے مترجمین نے کچھ سے کچھ بنا دیا ہے اور پیش وعقب میں ایسے بے جوڑ فقرے اور الفاظ داخل کر دیے ہیں کہ اِس کا مطلب خبط ہو کر رہ جائے۔

استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِن پیشین گوئیوں پر غور کیجیے۔ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں۔ اُن کے بعد کوئی نبی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر اِن پیشین گوئیوں کا مصداق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ آخر وہ پتھر کون ہو سکتا ہے جس کو معماروں نے تو رد کر دیا تھا، لیکن بالآخر وہی کونے کے سرے کا پتھر بن گیا؟ یہ کس کی شان ہے کہ جو اُس پر گرے گا، اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گرے گا، اُس کو پیس ڈالے گا؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے، جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا اور وہ باتیں بتائے گا جو حضرت مسیح بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ضد اور مکابرت کی بات اور ہے، لیکن جو شخص بھی اِن پیشین گوئیوں پر انصاف اور غیر جانب داری کے ساتھ غور کرے گا، وہ پکار اٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر راست آسکتی ہیں تو صرف نبی امی اور رسول خاتم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی راست آسکتی ہیں۔ نبی امی کے سوا اور کون اِن کا مصداق ہو سکتا ہے؟'' (تدبر قرآن ۳/۳۷۵)

۵۲۹؎ یعنی جو پاک چیزیں اُنھوں نے حرام کر رکھی ہیں، اُنھیں حلال قرار دیتا ہے اور جو ناپاک چیزیں یہ حلال کیے بیٹھے ہیں، اُنھیں حرام قرار دیتا ہے۔

۵۳۰؎ اشارہ ہے اُن خودساختہ پابندیوں کی طرف جو یہود کے فقیہوں نے اپنی فقہی موشگافیوں

النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ

جنھوں نے اُس کی عزت کی اور اُس کی نصرت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کر لی جو اُس کے ساتھ اتاری گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ ۱۵۶-۱۵۷

کہہ دو،[۵۳۱] (اے پیغمبر کہ) لوگو، میں تم سب کی طرف[۵۳۲] اُس خدا کا رسول ہو کر آیا ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ وہی زندگی دیتا اور وہی مارتا ہے[۵۳۳]۔ سو اللہ اور اُس کے نبی امی رسول پر ایمان لاؤ جو خود بھی اللہ اور

سے اور اُن کے صوفیا اور رہبان نے اپنے تورع کے مبالغوں سے اپنے اوپر لادر کھی تھیں، نیز اُن پابندیوں کی طرف جو اُن کی سرکشی کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اُن پر عائد کر دی گئی تھیں۔

۵۳۱ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر تک بات پہنچ گئی تو یہاں سے آگے آپ کی دعوت بھی آپ ہی کی زبان مبارک سے لوگوں، بالخصوص بنی اسرائیل کے سامنے پیش کر دی گئی ہے۔

۵۳۲ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل اِس بہانے سے گریز و فرار کے راستے تلاش نہ کریں کہ آپ اُن کے لیے نہیں، بلکہ صرف بنی اسمٰعیل کے لیے خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث ہوئے ہیں اور وہی آپ کو ماننے کے مکلّف ہیں۔ اِس سے واضح ہو گیا کہ آپ کی بعثت سب کی طرف ہے، خواہ وہ بنی اسمٰعیل ہوں یا بنی اسرائیل اور خواہ عربی ہوں یا عجمی، سب اِس کے پابند ہیں کہ آپ پر ایمان لائیں، اگر آپ کی دعوت اُن تک پہنچ جائے۔

تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

وَمِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤی اُمَّۃٌ یَّہۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَبِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾

وَقَطَّعۡنٰہُمُ اثۡنَتَیۡ عَشۡرَۃَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی

اُس کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہے[۵۳۴] اور اُس کی پیروی کرو تا کہ تم راہ یاب ہو جاؤ۔ ۱۵۸

(بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ اِسے ضرور مانیں گے)۔

موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہمیشہ رہا ہے جو حق کے مطابق رہنمائی کرتے اور اُسی کے مطابق انصاف کرتے ہیں[۵۳۵]۔ (تاہم زیادہ وہی ہیں جو نافرمان رہے)۔ ہم[۵۳۶] نے اُنھیں بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے الگ الگ گروہ بنا دیا تھا[۵۳۷]۔ جب

۵۳۳؎ مطلب یہ ہے کہ متنبہ ہو جاؤ، تمھارا معاملہ کسی عام انسان سے نہیں ہے، اُس خدا کے رسول سے ہے جو پوری کائنات کا بادشاہ، تنہا معبود اور تمھاری زندگی اور موت کا مالک ہے۔ اُس کی دعوت سے اعراض کرو گے تو اِس کے نتائج معمولی نہیں ہوں گے۔

۵۳۴؎ یعنی جس بات کی دعوت دے رہا ہے، سب سے پہلے خود اُس پر ایمان لایا ہے، لہٰذا سنجیدگی سے سنو۔ نہ اُس کے لیے ممکن ہے کہ اُس کی تبلیغ میں کوئی مداہنت کرے اور نہ تم اُس کی مخالفت کر کے خدا کے مواخذے سے بچ سکتے ہو۔ یہ وہی چیز ہے جس کا تعارف موسیٰ علیہ السلام نے تمھیں پہلے ہی کرا دیا تھا کہ جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا، وہی وہ لوگوں سے کہے گا۔

۵۳۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'اُمَّۃٌ یَّہۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَبِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ'۔ لفظ 'اُمَّۃٌ' کی تنکیر قلت کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور 'یَہۡدُوۡنَ' اور 'یَعۡدِلُوۡنَ' میں ایک فعل ناقص محذوف ہے، اِس لیے کہ قرینہ اُس پر دلالت کر رہا ہے۔ یہ اُن کے علما اور قضاۃ کی طرف اشارہ ہے جن میں صالحین کا ایک قلیل گروہ ہمیشہ رہا ہے۔ اِن آیات کے زمانۂ نزول میں بھی اِس طرح کے لوگ موجود تھے جنھوں نے کھلے ذہن کے ساتھ اسلام کو دیکھا اور اُس کی صداقت کا اعلان کر دیا۔

اِذِ اسۡتَسۡقٰىهُ قَوۡمُهٗۤ اَنِ اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ‌ۚ فَانۡۢبَجَسَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنًا‌ ؕ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ‌ ؕ وَظَلَّلۡنَا عَلَيۡهِمُ الۡغَمَامَ وَاَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهِمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰى‌ ؕ كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ

اُس کی قوم نے اُس سے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنی لاٹھی اِس پتھر پر مارو۔ اُس نے ماری تو اُس سے بارہ چشمے بہ نکلے، اِس طرح کہ ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی۔ (صرف یہی نہیں)، ہم نے اُن پر بدلیوں کا سایہ کیا اور اُن پر من وسلویٰ اتارے[۵۳۸] ـــــ کھاؤ یہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمھیں دی ہیں[۵۳۹]۔

۵۳۶؎ 'اَلَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ' کے الفاظ سے جو تضمین شروع ہوئی تھی، وہ پچھلی آیت پر ختم ہوگئی۔ یہاں سے آگے سلسلۂ کلام پھر اُسی سرگذشت سے جڑ گیا ہے جو بیان ہو رہی تھی۔

۵۳۷؎ اصل میں لفظ 'قَطَّعۡنٰهُمُ' آیا ہے۔ یہ یہاں اچھے معنی میں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یعنی ایک ہی باپ کی اولاد بارہ خاندانوں کی شکل میں پھلی پھولی، اور ہم نے ہر خاندان کو امتوں اور قوموں کی شکل میں بڑھایا اور پھیلایا اور اِسی اعتبار سے اُن کو اپنی نعمتوں اور رحمتوں سے بھی نوازا، لیکن اُنھوں نے ہر نعمت کی ناقدری کی۔"

(تدبر قرآن ۳/ ۳۷۷)

۵۳۸؎ من وسلویٰ کیا تھے؟ اِس کی وضاحت ہم سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۵۷ کے تحت کر چکے ہیں۔ پینے کے لیے پانی، کھانے کے لیے من وسلویٰ اور دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے بدلیوں کے سایے کا یہ اہتمام کتنا بڑا معجزہ اور کتنا عظیم احسان تھا، اِس کا اندازہ کوئی شخص اگر کرنا چاہے تو اُسے جزیرہ نماے سینا کے اُس بیابان کو جا کر دیکھنا چاہیے، جہاں لاکھوں کی تعداد میں بنی اسرائیل آ کر ٹھیرے تھے، خاص کر جب کہ مصر کی طرف سے اُن کی رسد کا سلسلہ بھی منقطع تھا اور جزیرہ نما کے شمال اور مشرق میں عمالقہ کے قبیلے بھی آمادۂ مزاحمت تھے۔

مَا رَزَقۡنٰكُمۡ ؕ وَمَا ظَلَمُوۡنَا وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿١٦٠﴾ وَاِذۡ قِيۡلَ لَهُمُ اسۡكُنُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ وَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ وَقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطِيۡٓــٰٔتِكُمۡ ؕ

(افسوس کہ جن پر یہ عنایت ہوئی، اُنھوں نے اِس کی ناقدری کی) اور (اِس طرح) ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ اپنے اوپر ہی ظلم کرتے رہے۔ ۱۵۹-۱۶۰

اور اُنھیں وہ واقعہ یاد دلاؤ، جب اُن سے کہا گیا کہ اِس بستی[۵۴۰] میں جا کر بس جاؤ اور اِس میں جہاں سے چاہو، کھاؤ اور دعا کرو کہ پروردگار، ہمارے گناہ بخش دے[۵۴۱] اور بستی کے دروازے[۵۴۲] میں (عجز کے ساتھ) سر جھکائے ہوئے داخل ہو،[۵۴۳] ہم تمھاری

الاعراف ۷

۵۳۹؎ مطلب یہ ہے کہ یہ نعمتیں گویا زبان حال سے دعوت دیتی تھیں کہ اپنے پروردگار کی اِس عنایت سے فائدہ اٹھاؤ اور اُس کے شکر گزار بن کر رہو۔

۵۴۰؎ اصل میں لفظ 'الْقَرْيَة' آیا ہے۔ اِس کے استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جس طرح چھوٹے دیہات کے لیے مستعمل ہے، اُسی طرح بڑے بڑے شہروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اِس سے مراد فلسطین ہی کا کوئی شہر ہے، اِس لیے کہ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۵۸ میں 'فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا' کے جو الفاظ اِس کے لیے آئے ہیں، وہ اِسی سرزمین کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔

۵۴۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'قُوْلُوْا حِطَّةٌ'۔ اِن میں 'حِطَّةٌ' ایک جملے کا قائم مقام ہے، یعنی 'مسئلتنا حطة'۔ 'حِطَّةٌ' 'حط یحط' سے ہے جس کے معنی جھاڑ دینے کے ہیں۔ یہاں اِس سے مراد گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ عربی اور عبرانی چونکہ قریب الماخذ زبانیں ہیں، اِس وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ عبرانی میں بھی یہ جھاڑ دینے اور بخش دینے کے مفہوم میں مستعمل رہا ہے۔

۵۴۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا'۔ 'الْقَرْيَة' کے بعد 'الْبَاب' کا لفظ

سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٦١﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿١٦٢﴾

خطائیں معاف کر دیں گے اور (تم میں سے) جو لوگ اچھا رویہ اختیار کریں گے، اُن پر آگے ہم اور بھی عنایت فرمائیں گے۔ پھر جو بات اُن سے کہی گئی تھی، اُن کے ظالموں نے اُسے ایک دوسری بات سے بدل دیا۔[۵۴۴] چنانچہ ہم نے اُن پر آسمان سے عذاب اتارا، اِس لیے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرتے رہے تھے۔[۵۴۵] ۱۶۱-۱۶۲

جس طرح یہاں آیا ہے، اِس سے عربیت کی رو سے بستی کا دروازہ ہی مراد ہو سکتا ہے، اِسے 'خیمۂ عبادت کا دروازہ' کے معنی میں لینے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔

۵۴۳۔ اِس مفہوم کے لیے اصل میں 'سُجَّدًا' کا لفظ آیا ہے۔ صاف واضح ہے کہ اِس سے مراد یہاں سر جھکانا ہے۔ قرآن کی یہ آیت دلیل ہے کہ 'سجد' عربی زبان میں جس طرح زمین پر پیشانی رکھ دینے کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح محض سر جھکا دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

۵۴۴۔ یعنی بنی اسرائیل کے کچھ بدبختوں نے 'حِطَّةٌ' کے لفظ کو جو استغفار اور توبہ کا کلمہ تھا، اِس سے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے کسی لفظ سے بدل دیا۔ 'بَدَّلَ' کا جو لفظ اصل میں استعمال ہوا ہے، یہ جب اپنے دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے تو اِس کے معنی ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو رکھ دینے کے ہوتے ہیں۔ لفظ کی یہ نوعیت پیش نظر رہے تو اِسے محض رویے کی تبدیلی کے معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ اِس کے صاف معنی یہی ہیں کہ اُنھوں نے اِس لفظ کو کسی دوسرے لفظ سے تبدیل کر دیا۔

۵۴۵۔ اِس عذاب کے لیے 'آسمان سے عذاب' کی یہ تعبیر اُسی طرح اختیار کی گئی ہے، جس طرح کسی ہول ناک آفت کو قہر آسمانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل پر یہ عذاب غالباً ارض فلسطین کے قریب ایک شہر شطیم میں آیا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ اِس شہر میں اُنھوں نے موآبی

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا

اور اُن سے اُس بستی کا حال بھی پوچھو[546] جو سمندر کے کنارے تھی[547]، جب وہ سبت[548] کے معاملے میں (خدا کے حدود سے) تجاوز کرتے تھے۔ جب اُن کی مچھلیاں اُن کے سبت

عورتوں سے بدکاریاں کیں، اُن کی دعوت پر مشرکانہ قربانیوں میں شریک ہوئے اور اِس طرح گویا بالواسطہ اُن کے دیوتا بعل فغور کی پرستش میں اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اِن جرائم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک سخت وبا بھیجی جس میں اُن کے چوبیس ہزار مرد و زن ہلاک ہوئے۔

۵۴۶؎ یہ اسلوب یہاں زجر و توبیخ کو ظاہر کر رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی اِن تمام کرتوتوں کے باوجود جو بیان ہوئیں، اپنی پاکی و برتری کے زعم سے باز نہیں آتے اور اپنے آپ کو خدا کا چہیتا اور لاڈلا بنائے بیٹھے ہیں تو ذرا اِن سے اُس قریے کا ماجرا پوچھو جس نے سبت کی بے حرمتی کی اور اُس کی سزا میں خدا نے اُس کو نمونۂ عبرت بنا دیا۔" (تدبر قرآن ۳/ ۳۷۸)

۵۴۷؎ یہ مقام غالباً ایلہ یا ایلات یا ایلوت تھا۔ اسرائیل کی یہودی ریاست نے یہاں اِسی نام کی ایک بندرگاہ بنائی ہے۔ اردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ اُس کے قریب ہی واقع ہے۔ حضرت سلیمان کے عہد میں بحر قلزم کے لیے اُن کے جنگی اور تجارتی بیڑے کا صدر مقام یہی بستی تھی۔ اِس کا محل وقوع بحر قلزم کی اُس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے، جو جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔

۵۴۸؎ سبت چھٹی کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ اصلاً جمعہ کا دن تھا جسے بنی اسرائیل نے اُس کے اگلے دن سے بدل ڈالا۔ اُن کے ہاں یہ دن پشت در پشت تک دائمی عہد کے نشان کے طور پر خدا کی عبادت کے لیے خاص تھا اور اِس میں اُن کے لیے کام کاج، سیر و شکار، حتیٰ کہ گھروں میں آگ جلانا اور لونڈی غلاموں سے کوئی خدمت لینا بھی ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

يَسۡبِتُوۡنَ ۙ لَا تَاۡتِيۡهِمۡ ۛۚ كَذٰلِكَ ۛۚ نَبۡلُوۡهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۳﴾
وَاِذۡ قَالَتۡ اُمَّةٌ مِّنۡهُمۡ لِمَ تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۙ اللّٰهُ مُهۡلِكُهُمۡ اَوۡ

کے دن منہ اٹھائے ہوئے اُن کے سامنے پانی کے اوپر آ جاتی تھیں اور جب سبت کا دن نہ ہوتا تو نہیں آتی تھیں۔ ہم اِس طرح اُنھیں آزماتے تھے، اِس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔[۵۴۹] اور اُنھیں یاد دلاؤ، جب اُن میں سے ایک گروہ نے (نصیحت کرنے

۵۴۹۔ آیت میں مچھلیوں کے منہ اٹھائے ہوئے پانی کے اوپر آ جانے کا ذکر جن الفاظ میں ہوا ہے، وہ یہ ہیں: 'اِذۡ تَاۡتِيۡهِمۡ حِيۡتَانُهُمۡ يَوۡمَ سَبۡتِهِمۡ شُرَّعًا'۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...'شُرَّع'، 'شارعة' کی جمع ہے۔ جب یہ لفظ نیزوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اِس سے مراد سیدھے اٹھائے ہوئے نیزے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ مچھلیوں کے لیے آیا ہے تو اِس سے منہ اٹھائے ہوئے مچھلیاں مراد ہیں۔ پلی ہوئی مچھلیوں کے تالاب کے کنارے اُن کے ابھرنے کے اوقات میں کھڑے ہو جایئے تو یہ دل کش منظر نظر آئے گا کہ مچھلیاں اپنے سر سطح پر اِس طرح ابھارے ہوئے نظر آئیں گی گویا وہ اپنے نیزے سیدھے کیے ہوئے ہیں۔ سمندروں کے کنارے جو شکارگاہیں ہوتی ہیں، اُن میں یہ منظر اور بھی دل فریب اور طمع انگیز ہوتا ہوگا۔ یہود کی شریعت میں سبت، یعنی ہفتے کے دن کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی، لیکن وہ صبر نہ کر سکے۔ اُنھوں نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار کے لیے مختلف قسم کے حیلے ایجاد کر لیے۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی نافرمانی میں اصرار کے حد تک بڑھ جاتی ہے اور اچھوں کے سمجھانے سے بھی باز نہیں آتی تو اُس معاملے میں اُس کی آزمایش سخت سے سخت تر ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی صورت حال بنی اسرائیل کے لیے پیدا کر دی۔ عام دنوں میں تو یہ مچھلیاں نظر نہ آتیں یا بہت ہی کم نظر آتیں، لیکن سبت کے دن معلوم ہوتا کہ اُن کے ہاں بارات اتری ہوئی ہے۔ یہ چیز اُن کی حرص کو اور بھڑکا دیتی۔ مشہور ہے کہ آدمی جس چیز سے روک دیا جائے، اُس کی خواہش اور زیادہ بڑھ جاتی ہے... بنی اسرائیل

مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٦٤﴾ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٥﴾ فَلَمَّا عَتَوْا

والوں سے) کہا:[۵۵۰] تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت سزا دینے والا ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا: تمھارے پروردگار کے حضور اپنا عذر پیش کرنے کے لیے اور اِس لیے کہ یہ (خدا کے غضب سے) بچ جائیں۔[۵۵۱] پھر جب اُنھوں نے وہ سب کچھ بھلا دیا جس سے اُنھیں یاددہانی کی گئی تھی تو ہم نے اُنھیں نجات دی جو برائی سے روک رہے تھے اور جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا، اُنھیں ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا، اِس لیے کہ وہ نافرمان ہو چکے تھے۔[۵۵۲] چنانچہ جس

اپنی شامت اعمال سے اِس دہرے فتنے میں مبتلا ہو گئے اور پھر اِس حد تک خراب ہوئے کہ نیکوں کی تلقین و موعظت تو درکنار، خدا کے عذاب سے بھی اُن کو تنبیہ نہیں ہوئی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اُن پر لعنت کر دی۔'' (تدبرقرآن ۳/۳۷۸)

۵۵۰۔ اِس سے مزید وضاحت ہو گئی کہ اُس بستی کے لوگوں نے خدا کے حکم سے سرکشی کی یہ راہ نصیحت کرنے والوں کی تلقین و نصیحت کے علی الرغم اختیار کیے رکھی۔

۵۵۱۔ دعوت و تبلیغ کا اصلی مقصد یہی ہے اور اِس کام کے لیے اٹھنے والوں کے لیے ذمہ داری کی آخری حد بھی یہی ہے کہ وہ زندگی کے آخری لمحے تک برابر اِس کام میں لگے رہیں اور اپنی دعوت کبھی منقطع نہ کریں۔ ختم نبوت کے بعد اب اُن کی دعوت میں کوئی ایسا مرحلہ کبھی نہیں آ سکتا، جب وہ فرض کر لیں کہ اُن کا کام پورا ہو گیا، اِس لیے نہ ماننے والوں کو عذاب الٰہی کے لیے چھوڑ کر اب وہ اُن سے الگ ہو سکتے ہیں۔

۵۵۲۔ یہ سزا اُس قانون کے مطابق دی گئی جو بنی اسرائیل کے منصب شہادت کے لیے

عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿١٦٦﴾

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٦٧﴾

چیز سے روکے گئے تھے، جب سرکشی کے ساتھ وہی کیے چلے گئے تو ہم نے اُن سے کہہ دیا کہ جاؤ ذلیل بندر بن جاؤ۔[553] ۱۶۳-۱۶۶

اور وہ بات بھی یاد دلاؤ، جب تمھارے پروردگار نے (اپنے اِس) فیصلے سے اُنھیں آگاہ کیا کہ روزِ قیامت تک وہ ضرور ایسے لوگوں کو اُن پر مسلط کرتا رہے گا جو اُنھیں نہایت برے عذاب دیں گے۔[554] حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار بہت جلد سزا

انتخاب کے بعد خاص اُن کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا۔ دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۵۵۳؎ یہ لعنت کا جملہ ہے۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۶۶ میں اِس کا جو نتیجہ بیان ہوا ہے، اُس سے واضح ہے کہ وہ بندروں سے جس طرح مشابہ ہوئے، اُس کی نوعیت ایسی محسوس تھی کہ گرد و پیش کی بستیوں کے لوگ اُسے دیکھ کر عبرت حاصل کر سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواہش نفس کی پیروی میں جب وہ بندروں کی طرح کسی حد کے پابند نہیں رہے تو پہلے اُن کی سیرت مسخ ہوئی اور اِس کے بعد ایک ظاہری فرق جو تھوڑا سا رہ گیا تھا، وہ بھی بالآخر مٹ گیا۔ یہاں تک کہ اِس لعنت نے اُن کے ظاہر و باطن، ہر چیز کا احاطہ کر لیا۔

۵۵۴؎ بنی اسرائیل کو اِس فیصلے سے ابتدا ہی میں آگاہ کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ بائیبل کے صحیفوں ــــــ احبار اور استثنا ــــــ میں کئی جگہ اِس کا ذکر ہوا ہے۔ انبیا علیہم السلام اِس کے بعد بھی اُنھیں اِس کی یاد دہانی کرتے رہے۔ یسعیاہ، یرمیا اور دوسرے تمام نبیوں کے صحائف اِسی تنبیہ پر مشتمل ہیں۔ آخر میں سیدنا مسیح علیہ السلام نے یروشلم کی گلیوں میں اِس کی منادی کی۔ یہ فیصلہ کس طریقے

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۱۶۸) فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَیَقُوْلُوْنَ سَیُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ یَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ یَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْهِمْ مِّیْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا یَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ

دینے والا بھی ہے اور یقیناً بخشنے والا اور نہایت مہربان بھی ہے۔[555] ہم نے زمین میں اُن کی جمعیت مختلف گروہوں کی صورت میں پراگندہ کر دی۔ اُن میں کچھ نیک بھی ہیں اور کچھ اِس سے مختلف بھی۔[556] ہم نے اُنھیں اچھے اور برے حالات سے آزمایا تاکہ وہ پلٹیں۔ پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ کتابِ الٰہی کے وارث ہوئے جو (اُس کی آیتوں کے عوض) اِس دنیاے دوں کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں سب معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی متاعِ حقیر پھر مل جائے تو اُسے بھی لے لیں گے۔ کیا اُن سے اِسی کتاب کے بارے میں عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ پر حق کے سوا کوئی بات

سے نافذ ہوا؟ دنیا کی تاریخ اِس کی گواہی دیتی ہے۔ اِس وقت بھی ارضِ مقدس میں یہ اِسی مقصد سے جمع کیے جا رہے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...یہ آشیاں بندی بھی ایک نئے طوفان کی دعوت ہے جس کے بعد اِن کی پوری مجتمعہ قوت ان شاء اللہ یک قلم ختم ہو جائے گی۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۸۱)

۵۵۵ یعنی اتمامِ حجت ہو جائے تو سزا دینے میں دیر نہیں کرتا اور لوگ رجوع کر لیں تو فوراً معاف بھی کر دیتا ہے، اِس لیے کہ صرف سریع العقاب ہی نہیں، اِس کے ساتھ غفور و رحیم بھی ہے۔

۵۵۶ مطلب یہ ہے کہ انفرادی حیثیت سے تو نیک و بد، ہر طرح کے لوگ اِن کے اندر موجود

وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ

الاعراف ۷

نہ لگائیں؟ اور جو کچھ اِس کتاب میں (لکھا) ہے، اُنھوں نے اُسے اچھی طرح پڑھا بھی ہے۔[557] حقیقت یہ ہے کہ خدا سے ڈرنے والوں کے لیے آخرت کا گھر ہی بہتر ہے، پھر کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ ہاں، جو کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز کا اہتمام رکھتے ہیں، وہی اصلاح کرنے والے ہیں[558] اور اصلاح کرنے والوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔ (اُنھیں یاد بھی ہے)، جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر اُن کے اوپر معلق کر دیا تھا گویا وہ سائبان ہے اور وہ گمان کر رہے تھے کہ وہ اُن پر گرا ہی چاہتا ہے۔[559] (فرمایا): یہ جو کچھ ہم

ہیں، مگر اجتماعی حیثیت سے یہ اُن تمام اوصاف سے محروم ہو چکے ہیں جو اِنھیں دنیا کی قوموں میں سربلند رکھ سکتے تھے۔

۵۵۷ اصل میں لفظ 'دَرَسُوْا' آیا ہے۔ یہ اصلاً گھسنے کے معنی میں آتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہاں یہ لفظ یہود کے لیے بطور تعریض استعمال ہوا ہے کہ کتاب کو تو پڑھتے پڑھتے اُنھوں نے گھس ڈالا، لیکن حال وہی رہا کہ ساری زلیخا پڑھ جانے کے بعد بھی یہ پتا نہ چل سکا کہ زلیخا زن بود کہ مرد!" (تدبر قرآن ۳/۳۸۲)

۵۵۸ آیت میں یہ فقرہ ایجاز کے قاعدے سے محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے کھول دیا ہے۔

۵۵۹ یہ خدا کی قدرت اور اُس کے جلال کا ایک مظاہرہ تھا جو اِس لیے کیا گیا کہ بنی اسرائیل ہمیشہ اِس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ یہ عہد باندھ رہے ہیں، اُس کی قدرت کتنی بے پناہ

وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٧١﴾

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ

نے تمھیں دیا ہے، اِسے مضبوطی سے پکڑو[٥٦٠] اور جو کچھ اِس میں (لکھا) ہے، اُسے یاد رکھو[٥٦١] تاکہ (خدا کے غضب سے) بچے رہو۔[٥٦٢] ۱۶۷-۱۷۱

(اے[٥٦٣] پیغمبر)، اِنھیں وہ وقت بھی یاد دلاؤ، جب تمھارے پروردگار نے بنی آدم کی

ہے اور اُنھوں نے اگر اِس کی خلاف ورزی کی تو وہ اُن کے ساتھ کیا معاملہ کر سکتا ہے۔ بائیبل میں اِس کا ذکر اِن الفاظ میں ہوا ہے:

> ''اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور وہ پہاڑ سے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اُس پر اترا اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا۔''
>
> (خروج ۱۹: ۱۷-۱۸)

۵۶۰؎ یعنی اِسے پوری مضبوطی کے ساتھ لو اور زندگی کے تمام مراحل میں پورے استقلال اور عزیمت کے ساتھ اِس کی ہدایات کی پیروی کرو۔

۵۶۱؎ مطلب یہ ہے کہ اِس کا حرف حرف ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھو، خواہ وہ اِس کے احکام و ہدایات سے متعلق ہو یا اِس کی تنبیہات سے متعلق جو اِن احکام و ہدایات سے انحراف کے نتائج کے بارے میں تمھیں سنائی گئی ہیں۔

۵۶۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'۔ موقع کلام کا تقاضا ہے کہ یہاں اِنھیں خدا کے غضب سے بچنے کے مفہوم میں لیا جائے۔

۵۶۳؎ زمین پر خدا کی دینونت کے واقعات سے استدلال کے بعد اب یہ قریش کو اُس عہد فطرت کی یاد دہانی کرائی ہے جس کی بنیاد پر تمام بنی آدم قیامت کے دن مسئول ٹھیرائے جائیں

عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ

پشتوں سے[۵۶۴] اُن کی نسل کو نکالا اور اُنھیں خود اُن کے اوپر گواہ ٹھیرایا تھا۔ (اُس نے پوچھا تھا): کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہاں، (آپ ہی ہمارے رب ہیں)، ہم اِس کی گواہی دیتے ہیں[۵۶۵]۔ یہ ہم نے اِس لیے کیا کہ قیامت کے دن تم

گے اور خدا کی بارگاہ میں کوئی شخص یہ عذر پیش نہیں کر سکے گا کہ اُسے کسی پیغمبر کی دعوت نہیں پہنچی یا اُس نے شرک اور الحاد کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور خدا کے اقرار اور اُس کی توحید کے تصور تک پہنچنا اُس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ قرآن نے اِس عہد کو جس طریقے سے پیش کیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ یہ محض تمثیلی انداز بیان نہیں ہے، بلکہ اُسی طرح کے ایک واقعے کا بیان ہے جس طرح عالم خارج میں واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اِس سے یہ حقیقت بالکل مبرہن ہو جاتی ہے کہ خالق کا اقرار مخلوقات کی فطرت ہے۔ وہ اپنے وجود ہی سے تقاضا کرتی ہیں کہ خالق کی محتاج ہیں۔ اُن کے لیے خالق کا اثبات پیش نظر ہو تو کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی، صرف متنبہ کرنے اور توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ انسان بعض اوقات انکار کر دیتا ہے۔ لیکن یہ محض مکابرت ہے، لہٰذا جس وقت انکار کرتا ہے، عین اُسی وقت اپنے دائرۂ علم میں ہر انفعال کے لیے فاعل، ہر ارادے کے لیے مرید، ہر صفت کے لیے موصوف، ہر اثر کے لیے موثر اور ہر نظم کے لیے ایک علیم و حکیم ناظم کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے۔ اُس کا تمام علم اِسی سرگردانی کی سرگذشت ہے۔ یہ عمل کی تکذیب ہے جو اُس کے انکار کی حقیقت بالکل آخری درجے میں واضح کر دیتی ہے۔

۵۶۴ اصل الفاظ ہیں: 'مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ'۔ 'مِنْ ظُهُوْرِهِمْ'، 'مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ' سے بدل واقع ہوا ہے۔ اِس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ واقعہ کسی خاص دور ہی کے بنی آدم سے متعلق نہیں ہے، بلکہ قیامت کے دن تک جتنے بنی آدم بھی پیدا ہونے والے ہیں، اُن سب سے متعلق ہے اور ارواح کے اجسام کے ساتھ اتصال کی ابتدا سے پہلے ہوا ہے۔

اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

کہیں یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اِس بات سے بے خبر ہی رہے یا اپنا یہ عذر پیش کرو کہ شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے پہلے سے کر رکھی تھی اور ہم بعد کو اُن کی اولاد ہوئے ہیں، پھر کیا آپ اِن غلط کاروں کے عمل کی پاداش میں ہمیں ہلاک کریں گے؟[۵۶۶] ہم اِسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں، اِس لیے کہ لوگوں پر حجت قائم ہو[۵۶۷] اور اِس لیے کہ وہ رجوع کریں۔ ۱۷۲-۱۷۴

الاعراف ۷

۵۶۵ انسان کو اِس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اِس لیے یہ واقعہ تو اُس کی یادداشت سے محو کر دیا گیا ہے، لیکن اِس کی حقیقت اُس کے صفحۂ قلب پر نقش اور اُس کے نہاں خانۂ دماغ میں پیوست ہے۔ اِسے کوئی چیز بھی محو نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ماحول میں کوئی چیز مانع نہ ہو اور انسان کو اُسے یاد دلایا جائے تو وہ اِس کی طرف اِس طرح لپکتا ہے، جس طرح بچہ ماں کی طرف لپکتا ہے، دراں حالیکہ اُس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا، اور اِس یقین کے ساتھ لپکتا ہے، جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اُس کو جانتا تھا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کا یہ اقرار اُس کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب تھا جو اُس کے اندر ہی موجود تھا۔ اُس نے اِسے پا لیا ہے تو اُس کی نفسیات کے تمام تقاضوں نے بھی اِس کے ساتھ ہی اپنی جگہ پا لی ہے۔

۵۶۶ یعنی جہاں تک توحید اور بدیہیات فطرت کا تعلق ہے، اُن کے بارے میں مجرد اِس اقرار کی بنا پر بنی آدم کا مواخذہ کیا جائے گا۔ اُن سے انحراف کے لیے کسی کا یہ عذر خدا کے ہاں مسموع نہیں ہو گا کہ اُسے کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی یا اُس نے یہ انحراف خارجی اثرات کے نتیجے میں اختیار کیا تھا اور اِس کے ذمہ دار اُس کے باپ دادا اور اُس کا ماحول ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان کے باطن کی یہ شہادت ایسی قطعی ہے کہ ہر شخص مجرد اِس شہادت کی بنا پر اللہ کے حضور

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ الَّذِيۡۤ اٰتَيۡنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانۡسَلَخَ مِنۡهَا فَاَتۡبَعَهُ الشَّيۡطٰنُ فَكَانَ مِنَ الۡغٰوِيۡنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ

اور اُس کی سرگذشت بھی اِنھیں سناؤ[568] جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا فرمائی تھیں، مگر وہ اُن سے نکل بھاگا[569]۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان اُس کے پیچھے لگ گیا[570]، یہاں تک کہ وہ

الاعراف ۷

میں جواب دہ ہے۔

۵۶۷؎ یعنی مزید حجت جس کے نتیجے میں دنیا میں بھی اُن کا مواخذہ ہوگا اور آخرت کے لحاظ سے بھی اُن کی مسئولیت دوچند ہو جائے گی، ورنہ اصلاً تو یہ حجت، جیسا کہ بیان ہوا، اُس علم سے قائم ہو جاتی ہے جو انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ آیات الٰہی کی تفصیل سے اِسی علم کی یاددہانی ہوتی ہے۔ قرآن مجید اِسی بنا پر اپنے لیے 'ذِکۡر' اور 'ذِکۡرٰی' اور رسولوں کے لیے 'مُذَکِّر' کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

۵۶۸؎ یہ من حیث القوم یہود کی تمثیل ہے۔ آگے یہ بات قرآن نے خود واضح کر دی ہے۔ لیکن آیت میں چونکہ لفظ 'الَّذِیۡ' آیا ہے، اِس لیے مختلف اشخاص کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''الَّذِیۡ' اگرچہ اصلاً معرفہ کے لیے آتا ہے، لیکن تمثیلات میں یہ لازم نہیں ہے کہ اِس سے کوئی معین شخص ہی مراد ہو جو خارج میں بھی موجود ہو، بلکہ متکلم جس کی تمثیل پیش کرنا چاہتا ہے، اُس کو نگاہ میں رکھ کر اُس کا ایک ایسا سراپا آراستہ کر دیتا ہے جو اُس پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ چونکہ پیش نظر صرف واقعے کی تصویر کشی ہوتی ہے، اِس وجہ سے تقاضاے بلاغت یہ ہوتا ہے کہ اُس کو نکرہ کے بجاے معرفہ کے لفظوں میں ذکر کیا جائے تاکہ تمثیل ایک خاص شخص کی صورت میں متمثل ہو کر اِس طرح سامع کے سامنے آ جائے کہ گویا اُس نے اُس کی سرگذشت صرف سنی ہی نہیں، بلکہ خود اُس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۹۵)

۵۶۹؎ یعنی کتاب الٰہی کی جو تشریف وخلعت اُنھیں عطا فرمائی گئی تھی، وہ اُنھوں نے اتار پھینکی

اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلًا ِۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا

گم راہوں میں شامل ہوکر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اِن آیتوں کے ذریعے سے اُسے بلندی عطا کرتے،[۵۷۱] لیکن وہ زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔ چنانچہ اُس کی مثال کتے کی سی ہوگئی کہ تم اُس پر پتھر اٹھاؤ، جب بھی زبان نکالے رہتا ہے اور چھوڑ دو، جب بھی زبان نکالے رہتا ہے۔[۵۷۲] یہ اُس قوم کی تمثیل ہے جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا۔ سو یہ سرگذشت اِنھیں سناؤ تاکہ یہ سوچیں۔ کیا ہی بری تمثیل ہے

الاعراف ۷

اور استاذ امام کے الفاظ میں بالکل ننگے الف بن کر رہ گئے۔

۵۷۰؎ یہ اُس سنت الٰہی کے مطابق ہوا جو سورۂ زخرف (۴۳) کی آیت ۳۶ میں بیان ہوئی ہے کہ جو خداے رحمٰن کی یاددہانی سے منہ پھیرتے ہیں، اُن پر ایک شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے، پھر وہ اُسی کے ساتھی بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

۵۷۱؎ یعنی اُس قانون کے مطابق چاہتے جو ہم نے اُن لوگوں کے لیے مقرر کر رکھا ہے جنھیں ہم اپنی آیتوں سے نوازتے ہیں۔ وہ قانون یہ ہے کہ اگر اِن آیتوں کی قدر کریں گے تو اِن کے ذریعے سے اُنھیں دین و دنیا کی سرفرازی حاصل ہوگی اور اِن سے گریز کر کے اپنی خواہشوں کے غلام ہو کر رہ جائیں گے تو اُنھی کے حوالے کر دیے جائیں گے۔

۵۷۲؎ یعنی زبان نکالے ہوئے حرص و دناءت کی تصویر بنا رہتا ہے۔ اُسے پیار کیجیے یا دھتکاریے، اُس کی یہ حالت کسی حال میں اُس سے جدا نہیں ہوتی۔ ہم اپنی زبان میں بھی اُس شخص کو جو دنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو، اِسی رعایت سے دنیا کا کتا کہتے ہیں۔

يَظْلِمُوْنَ ﴿١٧٧﴾ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٧٨﴾

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ

اُس قوم کی جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتی رہی۔[573]

(حقیقت یہ ہے کہ) جن کو اللہ ہدایت بخشے، وہی ہدایت پانے والے ہیں اور جن کو وہ (اپنے قانون کے مطابق) گم راہ کردے، وہی نامراد ہوتے ہیں۔[574] ۱۷۵-۱۷۸

(یہ متنبہ ہو جائیں)، جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔[575] اُن کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں ہیں۔ اُن کی آنکھیں ہیں جن سے

۵۷۳ اِس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ تمثیل کسی خاص شخص کی تمثیل نہیں ہے، بلکہ اُس قوم کی تمثیل ہے جس نے اللہ کی آیتوں سے بہرہ یاب ہونے کے بعد اُنھیں جھٹلا دیا۔ قرآن کے طالب علم جانتے ہیں کہ اِس سے مراد یہود ہی ہو سکتے ہیں۔

۵۷۴ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور قریش کے لیے تہدید و وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں خدا کا ایک قانون ہے۔ اِس کے تحت ہدایت اُنھی کو ملتی ہے جو اُس کے سچے طالب ہوتے ہیں اور جو خواہشوں کی غلامی اختیار کر لیتے ہیں، وہ گم راہی کے لیے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اُنھیں کبھی راہ ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ اِس لیے ہر شخص پر واضح ہونا چاہیے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اِسی قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔

۵۷۵ یہ سخت غصے اور تہدید کا جملہ ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ جنوں اور انسانوں کی بڑی تعداد نے سرکشی کا جو رویہ اختیار کیا ہے، اُس کے بعد تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے اُنھیں پیدا ہی جہنم کے لیے کیا تھا۔ چنانچہ آگے وضاحت کر دی ہے کہ وہ کیوں جہنم کا ایندھن بننے والے

لَا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا

وہ دیکھتے نہیں ہیں۔ اُن کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں ہیں[576]۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ وہی ہیں جو بالکل غافل ہیں[577]۔ (ایمان والو، تم یاد رکھو کہ) اللہ کے لیے صرف اچھے نام ہیں، سو اُس کو اُنھی سے پکارو[578] اور اُن

ہیں۔ فرمایا ہے کہ حقائق کو سمجھنے اور اُن کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے جو صلاحیتیں ہم نے اُنھیں دی تھیں، اُن سے اُنھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ پیدا ہوں، زندگی گزاریں اور جہنم رسید ہو جائیں۔

۵۷۶۔ یہ سمجھنا، دیکھنا اور سننا اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے ہے، ورنہ مطلوبات بطن وفرج کے لیے تو وہ ہر چیز کو خوب سمجھتے، دیکھتے اور سنتے ہیں۔

۵۷۷۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... چوپایوں کے مانند اِس وجہ سے ہیں کہ جس طرح چوپایوں کی طلب و جستجو بس اپنے پیٹ اور تن کی مطلوبات ہی تک محدود ہوتی ہے، اُسی طرح اُن کی تگ و دو بھی اپنی مادی ضروریات و خواہشات ہی تک محدود ہے۔ اور چوپایوں سے زیادہ بے عقل اِس وجہ سے ہیں کہ چوپایے بہرحال اپنی جبلت کی تمام صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اِس میں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، لیکن انسان کی فطرت کے اندر قدرت نے جو اعلیٰ صلاحیتیں رکھی ہیں، اُن سے نہ صرف یہ کہ وہ حقیقی فائدہ نہیں اٹھاتا، بلکہ بسا اوقات اُس سے ایسی حرکتیں صادر ہوتی ہیں جو ایک بیل یا گدھے سے کبھی صادر نہیں ہوتیں۔ مثلاً انسان انسان ہو کر اتنا بے عقل اور کج فہم بن جاتا ہے کہ درختوں، پتھروں اور جانوروں کی پرستش شروع کر دیتا ہے، لیکن ایک گدھا یا بیل ایسی بے عقلی کبھی نہیں کر سکتا۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو اصلی اور حقیقی بے خبر ہیں، اِس لیے کہ یہ بے خبری چوپایوں میں بھی نہیں ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۳۹۸)

الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾

لوگوں کو چھوڑ دو جو اُس کے ناموں میں کج روی اختیار کر رہے ہیں۔[579] جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اُس کا بدلہ عنقریب پالیں گے۔ (یاد رکھو کہ سب یکساں نہیں ہیں)، ہمارے پیدا کیے ہوئے لوگوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور اُسی کے مطابق فیصلے کرتا رہا ہے۔ اِس کے برخلاف جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا ہے، اُن کو ہم وہاں سے داؤں پر لے جا رہے ہیں، جہاں سے اُن کو خبر بھی نہ ہو گی۔ (اِس وقت) میں اُن کو ڈھیل دے رہا ہوں، اِس لیے کہ میری تدبیر بڑی محکم ہے۔[580] ۱۷۹-۱۸۳

---

۵۷۸ یعنی ایسے ناموں سے پکارو جو اُس کی شان یکتائی، اُس کی قدرت، اُس کی بے نیازی اور اُس کے علم و حکمت کے مطابق ہیں۔ یہ اُسی توحید کی وضاحت مزید ہے جس کا ذکر اوپر عہد فطرت کے حوالے سے ہوا ہے۔

۵۷۹ اصل میں لفظ 'یُلْحِدُوْنَ' آیا ہے۔ یہ یہاں صفات الٰہی کی بے حرمتی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے نام اور ایسی صفات اللہ تعالیٰ سے منسوب کرتے ہیں جو کسی طرح اُس کے شایان شان نہیں ہے، جن سے اُس کی ذات و صفات کی اہانت ہوتی ہے اور جن سے وہ پاک، برتر اور منزہ ہے۔

۵۸۰ یہ معاملہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو خدا کے مقابلے میں سرکشی اور بغاوت پر اتر

اَوَلَمۡ يَتَفَكَّرُوۡا سکتۃ مَا بِصَاحِبِهِمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمۡ يَنۡظُرُوۡا فِىۡ مَلَكُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ ۙ وَّاَنۡ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ

کیا اِنھوں نے غور نہیں کیا کہ اِن کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے؟[581] وہ تو ایک کھلا خبردار کرنے والا ہے۔ کیا اِنھوں نے زمین اور آسمانوں کی سلطنت پر اور اُن سب چیزوں

آتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...جب شکاری کو اپنی ڈور پر پورا اعتماد ہوتا ہے تو وہ مچھلی کو آخری حد تک ڈھیل دیتا ہے۔ مچھلی سمجھتی ہے کہ اب اُس نے بازی مار لی، حالاں کہ شکاری اِس لیے اُس کو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ کتنا ہی زور لگائے، لیکن وہ اُس کے قابو سے باہر نہیں جا سکتی۔ اُس کی بھاگ دوڑ اُس کے لیے نجات کی راہ نہیں کھولے گی، بلکہ اُس کو تھکا کر اتنا چور کر دے گی کہ بالآخر وہ بے جان ہو کر خود بخود گھسٹتی ہوئی کنارے پر آ لگے گی۔ یہی حال خدا کی تدبیر کا ہے۔ اُس کی تدبیر نہایت محکم اور اُس کی گرفت نہایت شدید ہوتی ہے۔ کوئی اُس کے احاطے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اِس وجہ سے وہ لوگوں کو اُن کی سرکشی کے باوجود ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے۔ اِس ڈھیل کو سرکش اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، حالاں کہ وہ جتنی ہی زور آزمائی کرتے ہیں، اتنے ہی اپنی ہلاکت کے گڑھے سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ جلد بازی وہ کرتا ہے جس کو اپنی تدبیر کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ جس کا تیر بے خطا اور جس کا وار بے پناہ ہو، اُس کو جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟" (تدبر قرآن ۳/ ۴۰۰)

۵۸۱ ساتھی سے مراد یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کو جو دن رات اِس بات کی لگن تھی کہ آپ اپنی قوم کو اُس عذاب سے خبردار کر دیں جو سنت الٰہی کے مطابق رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر لازماً آتا ہے، اُسے دیکھ کر قریش کے لیڈر اپنے لوگوں کو آپ کے اثر سے بچانے اور اپنی سیادت کی دھاک قائم رکھنے کے لیے اُن سے کہتے تھے کہ اگرچہ یہ شخص بھلا چنگا ہے، لیکن معلوم

اَجَلُهُمْ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا

پر جو خدا نے پیدا کی ہیں، کبھی نگاہ نہیں کی (کہ اِن پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ خدا نے یہ کارخانہ عبث نہیں بنایا) اور نہیں سوچا کہ کیا عجب اِن کی مدت قریب آ لگی ہو؟[۵۸۲] سو (یہ مدت پوری ہو گئی تو) اِس کے بعد یہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ (حقیقت یہ ہے کہ)

ہوتا ہے کہ اِسے عذاب اور قیامت کا سودا لاحق ہو گیا ہے۔ یہ قریش کی اِسی طفل تسلی کی تردید فرمائی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ساتھی کا لفظ بھی اِسی بنا پر استعمال کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس لفظ کے استعمال سے قریش کو اِس امر واقعہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یہ پیغمبر اُن کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں، بلکہ اُن کے دن رات کے ساتھی ہیں۔ اِن کا بچپن، اِن کی جوانی، سب اُنھی کے اندر اور اُنھی کے ساتھ گزری ہے۔ ہر دور اور ہر مرحلہ میں اُنھوں نے اِن کو دیکھا اور آزمایا اور ہر طرح کے حالات میں اِن کو جانچا اور پرکھا ہے۔ پھر آخر یہ اِس امر پر کیوں نہیں غور کرتے کہ جو شخص ہمیشہ اپنی سلامت روی، اپنی صداقت شعاری، اپنی بے غرضی، اپنی پاک بازی، اپنی فکر و رائے کی اصابت اور اپنی دانش و بینش کی پختگی کے اعتبار سے ساری قوم میں گل سرسبد رہا، دفعتاً وہ اب خبطی اور دیوانہ کیسے بن گیا؟'' (تدبر قرآن ۳/ ۴۰۰)

۵۸۲ مطلب یہ ہے کہ خدا کی کائنات پر غور کرتے تو لازماً اِس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ نہ یہ کارخانہ عبث بنا ہے کہ جزا و سزا کے بغیر یوں ہی چلتا رہے اور کسی ظالم، معاند، حق و انصاف کے دشمن اور سرکش کے لیے کوئی یوم حساب نہ آئے اور نہ اِس کا علیم و حکیم خداوند جس نے انسان کو خیر و شر میں امتیاز کا شعور دیا ہے، خود اِس شعور سے بے نیاز ہو کر دنیا کو یوں ہی چھوڑے رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ حسرت و افسوس کے ساتھ فرمایا ہے کہ وہ اِس بات پر غور کرتے تو یہ بات بھی اُن پر کھل جاتی کہ کیا عجب کہ اُن کی وہ اجل بھی قریب آ لگی ہو جس سے پیغمبر اُن کو خبردار کر رہے ہیں اور خدا کا وہ فیصلہ اُن کے لیے بھی صادر ہونے والا ہے جو اُن سے پہلے پیغمبروں کی تکذیب کرنے والوں کے

هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾ يَسۡـَٔـلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرۡسٰٮهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ ۚ لَا يُجَلِّيۡهَا لِوَقۡتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؔ ؕ ثَقُلَتۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ لَا تَاۡتِيۡكُمۡ

جنھیں خدا (اپنے قانون کے مطابق) گم راہی میں ڈال دے، اُن کے لیے پھر کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہو سکتا۔ اُن کو وہ اُن کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں، (تمھارا ٹھٹا اڑانے کے لیے) کہ آخر وہ گھڑی کب نازل ہو گی؟[۵۸۳] کہہ دو کہ اُس کا علم تو میرے پروردگار ہی کے پاس ہے۔ وہی اپنے وقت پر اُس کو ظاہر کرے گا۔[۵۸۴] زمین و آسمان اُس سے بوجھل ہو رہے ہیں[۵۸۵]۔ وہ تم پر

لیے صادر ہو چکا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ گویا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں آفاقی شہادت کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہہ رہے ہیں، اُس کو خبط پر محمول نہ کرو، بلکہ اپنی بلادت اور سرگشتگی پر ماتم کرو۔''

(تدبر قرآن ۳/ ۴۰۳)

۵۸۳؎ اصل میں 'اَيَّانَ مُرۡسٰهَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'اَيَّانَ' بھی 'متی' کے معنی میں ہے، لیکن یہ اُس موقع پر استعمال ہوتا ہے، جب استغراب و استنکار کے لہجے میں کسی چیز کے متعلق پوچھنا مقصود ہو۔ اِسی طرح 'مُرۡسٰی' جہاز وغیرہ کے لنگر انداز ہونے کو کہتے ہیں۔ اِس سے سوال کے اندر چھپے ہوئے طنز و استہزا کو سمجھا جا سکتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں گویا مدعا یہ ہے کہ جس گھڑی کے ڈراوے سنا رہے ہو، وہ کب نمودار ہو گی؟ آخر یہ جہاز چلا تو کہاں اٹک کر رہ گیا، یہ ساحل پر کب لنگر انداز ہو گا؟

۵۸۴؎ مطلب یہ ہے کہ اُس کا علم بھی خدا ہی کے پاس ہے اور اُس کو برپا کر دینے کی قدرت بھی وہی رکھتا ہے۔ مجھے نہ اُس کے وقت کا پتا ہے اور نہ میں یہ طاقت رکھتا ہوں کہ جب چاہوں،

اِلَّا بَغۡتَةً ؕ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ كَاَنَّكَ حَفِىٌّ عَنۡهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ اللّٰهِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۷﴾ قُلْ لَّاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِىۡ نَفۡعًا

آئے گی تو اچانک آپڑے گی۔ وہ (اُس کے بارے میں) تم سے اِس طرح پوچھتے ہیں گویا تم اُس کی تحقیق میں لگے ہوئے ہو۔[۵۸۶] کہہ دو: اُس کا علم تو صرف اللہ کو ہے، مگر لوگوں کی اکثریت اِس بات کو نہیں جانتی۔ کہہ دو: (تم مجھ سے اُن چیزوں کا مطالبہ نہ کرو جو

اُسے برپا کردوں۔

۵۸۵۔ اِس سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...جس طرح ایک حاملہ عورت ولادت کے قریب بارِ حمل سے گراں بار ہوتی ہے، اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ولادت کا صحیح وقت کیا ہے، لیکن ہر آنکھیں رکھنے والا دیکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ عورت جنے گی اور بہت جلد جنے گی، وہی حال قیامت اور عذاب کے معاملے میں آسمان وزمین میں غور کرنے والے اربابِ بصیرت کا ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین کو اِس بوجھ سے گراں بار دیکھتے ہیں، اور اگرچہ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اِس بوجھ سے کب سبک دوش ہوں گے، لیکن جس طرح ایک حاملہ اپنے آخری مرحلہ میں اپنے بوجھ سے سبک دوش ہونے کے لیے منتظر اور بے قرار ہوتی ہے، وہی بے قراری آسمان وزمین کے اندر نمایاں ہے۔ اِس میں اِس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو آسمان وزمین کے اندر قیامت اور عذاب کی نشانیاں نظر نہیں آرہی ہیں، اُن کو گویا آخری مرحلے میں پہنچی ہوئی حاملہ کا حمل نظر نہیں آرہا ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۴۰۴)

۵۸۶۔ حالاں کہ کوئی شخص بھی جسے خدا نے علم وعقل سے بہرہ یاب کیا ہو، کسی ایسی چیز کے درپے نہیں ہو سکتا جو اُس کے حدودِ علم وتحقیق سے ماورا ہو۔ اور اُسے ہونا بھی نہیں چاہیے، اِس لیے کہ اِس سے بڑھ کر بے عقلی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی جاننے کی چیزوں پر توجہ کرنے کے بجائے اُن چیزوں کی کھوج کرید میں لگا رہے جن کو نہ وہ جان سکتا ہے اور نہ وہ اُس کے جاننے کی

وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

اللہ کے علم و اختیار میں ہیں)، میں اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے۔ مجھے سارے غیب کا علم ہوتا تو میں خیر کثیر جمع کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔[۵۸۷] حقیقت یہ ہے کہ میں صرف ایک خبردار کرنے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔۱۸۴-۱۸۸

ہیں۔

۵۸۷؎ یعنی علم و عمل کا سارا خزانہ سمیٹ لیتا، لیکن تم جانتے ہو کہ مجھے نقصان بھی پہنچ جاتا ہے اور اپنے لیے خیر و صلاح کے راستوں پر بھی میں اُسی حد تک آگے بڑھ سکتا ہوں جس حد کا مجھے علم دیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...'لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ' کے ٹکڑے میں جس خیر کی زیادہ سے زیادہ مقدار جمع کر لینے کی تمنا کا اظہار ہے، وہ پیغمبر کے ظرف اور اُس کی طلب کے اعتبار سے ہے۔ پیغمبر اپنے حوصلہ اور اپنے ارمان کے اعتبار سے اِس مقام بلند پر ہوتا ہے کہ وہ خیر کی کسی وادی کو ناطے کردہ نہیں چھوڑنا چاہتا، لیکن وہ خیر سے واقف اُسی حد تک ہوتا ہے، جس حد تک اُس کو وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اگر اُس کو پورا غیب معلوم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اُس کے اپنے امکان کے حد تک تو اُس کی کوشش یہی ہوگی کہ خیر کی راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے۔ لیکن دائرۂ وحی سے باہر اُسے بھی دوسروں کی طرح اپنی صواب دید ہی پر کام کرنا اور اپنی عقل ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جس میں کامیابی اور ناکامی، دونوں کے امکانات مضمر ہوتے ہیں۔''

(تدبر قرآن ۳/۴۰۵)

هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِیَسۡکُنَ اِلَیۡهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتۡ حَمۡلًا خَفِیۡفًا فَمَرَّتۡ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثۡقَلَتۡ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنۡ اٰتَیۡتَنَا صَالِحًا لَّنَکُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَکَآءَ فِیۡمَاۤ اٰتٰهُمَا ۚ فَتَعٰلَی اللّٰهُ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۹۰﴾ اَیُشۡرِکُوۡنَ مَا لَا یَخۡلُقُ

وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنایا تاکہ اُس سے تسکین پائے۔[588] پھر (بارہا ایسا ہوا کہ) جب مرد نے عورت کو چھا لیا تو اُسے ایک ہلکا سا حمل رہ گیا۔ سو اُس کو لیے پھرتی رہی۔ پھر جب زیادہ بوجھل ہو گئی تو مرد و عورت، دونوں نے مل کر اللہ، اپنے پروردگار سے دعا کی کہ (پروردگار)، اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد عطا فرمائی تو ہم ضرور تیرے شکر گزاروں میں رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اُن کو صحیح و سالم اولاد عطا فرما دی تو اُس کی بخشی ہوئی چیز میں وہ دوسروں کو اُس کے شریک ٹھیرانے لگے۔[589] سو (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ برتر ہے اُن چیزوں سے

۵۸۸؎ مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا یہ نہیں کر سکتا تھا کہ دو الگ الگ اور مستقل وجود پیدا کرے اور دونوں میں ایسی مطابقت، ہم آہنگی اور سازگاری پیدا کر دے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے راحت دل و جان اور سرمایۂ تسکین و نشاط بن جائیں۔ یہ اِس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایک ہی علیم و حکیم ہستی کا ارادہ ہے جس نے اپنے پیشگی منصوبے کے تحت، دونوں کو خاص ڈھنگ سے وجود بخشا اور اِس طرح پروان چڑھایا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بمنزلۂ جان و تن ہو گئے ہیں۔ آیت میں ایک جان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ سورۂ نساء (۴) کی آیت ۱ میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔

شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿١٩١﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٢﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿١٩٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ

جنھیں یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔[۵۹۰] کیا وہ اُن کو شریک ٹھیراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے، بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں! وہ نہ اُن کی کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم اُن کو رہنمائی کے لیے پکارو تو وہ تمھارے پیچھے نہ آئیں گے۔[۵۹۱] تم اُنھیں پکارو یا خاموش رہو، تمھارے لیے برابر ہے۔ تم اللہ کے سوا جنھیں پکارتے ہو، وہ بندے ہیں، جس طرح تم بندے ہو۔[۵۹۲] سو اُنھیں پکار دیکھو، اُنھیں چاہیے کہ تمھیں جواب

الاعراف ۷

۵۸۹؎ یہ مشرکین کا عام رویہ ہے۔ اپنی اصل ضرورت اور اصل احتیاج کے وقت تو وہ اللہ، پروردگار عالم ہی کی طرف متوجہ ہوتے اور اُسی کو پکارتے ہیں، لیکن جب وہ احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو اُسے دوسروں کی کرامت اور اُن کے علم و عمل کا کرشمہ قرار دینے لگتے ہیں۔

۵۹۰؎ شرک جس نوعیت کا بھی ہو، اُس سے اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمال کی نفی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ وہ ایسی تمام نسبتوں اور شراکتوں سے منزہ و ارفع ہے، اِس نوعیت کی کوئی چیز بھی اُس سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔

۵۹۱؎ اصل میں لفظ 'لَا يَتَّبِعُوْكُمْ' آیا ہے۔ لفظ 'اِتِّبَاع' یہاں اپنے ابتدائی لغوی مفہوم میں ہے، یعنی 'مشی خلفہ'۔ ہم نے ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ ہم بھی اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ اُس نے مصیبت میں بلایا، لیکن کوئی اُس کے پیچھے نہیں آیا۔

۵۹۲؎ یہ اُن ذوات پر تبصرہ ہے جنھیں مشرکین اپنے زعم کے مطابق خدائی میں شریک مانتے

كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمۡ اَرۡجُلٌ يَّمۡشُوۡنَ بِهَآ ۡ اَمۡ لَهُمۡ اَيۡدٍ يَّبۡطِشُوۡنَ بِهَآ ۡ اَمۡ لَهُمۡ اَعۡيُنٌ يُّبۡصِرُوۡنَ بِهَآ ۡ اَمۡ لَهُمۡ اٰذَانٌ يَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا ؕ قُلِ ادۡعُوۡا شُرَكَآءَكُمۡ ثُمَّ كِيۡدُوۡنِ فَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۱۹۵﴾

دیں، اگر تم سچے ہو۔[۵۹۳] (تم نے کبھی غور نہیں کیا)، کیا اُن کے پاؤں ہیں کہ جن سے وہ چلتے ہیں؟ کیا اُن کے ہاتھ ہیں کہ جن سے وہ پکڑتے ہیں؟ کیا اُن کی آنکھیں ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے ہیں؟ کیا اُن کے کان ہیں کہ جن سے وہ سنتے ہیں؟[۵۹۴] کہہ دو، (اے پیغمبر)، تم

اور معبود قرار دے کر پوجتے تھے، یعنی فرشتے اور جنات وغیرہ۔

۵۹۳۔ یہ اُسی طرح کا چیلنج ہے، جس طرح کا چیلنج سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۳ میں دیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... مطلب یہ ہوا کہ اب تک تو تم نے اپنے اِن خیالی معبودوں کو جو چاہا مانا اور جو چاہا منوایا، لیکن اب پیغمبر اور قرآن نے اِن سب کی خدائی کو چیلنج کر دیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ تمھاری مدد اور رہنمائی کے لیے پہنچیں اور تم کو بھی اور خود اپنے آپ کو بھی سنبھالیں۔ اگر اُنھوں نے اپنی خدائی بچالی تو بے شک، معلوم ہوگا کہ تم سچے ہو۔“ (تدبر قرآن ۳/۴۰۹)

۵۹۴۔ اوپر ذوات پر تبصرہ کیا تھا۔ اب یہ اُن مظاہر پر تنقید ہے جنھیں مشرکین اِن ذوات کے پیکر اور قالب کی حیثیت سے سونے، چاندی یا لوہے اور پتھر کی مورتوں کی صورت میں ڈھالتے اور یہ گمان رکھتے تھے کہ اُن کے یہ معبود اِن مورتوں کے اندر حلول کر آئے ہیں۔ زبور میں یہی حقیقت بدیں الفاظ بیان ہوئی ہے:

اُن کے بت چاندی اور سونا ہیں
یعنی آدمی کی دست کاری۔
اُن کے منہ ہیں، پر وہ بولتے نہیں۔
آنکھیں ہیں، پر وہ دیکھتے نہیں۔

إِنَّ وَلِـۧيَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٩٦﴾ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٧﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ

اپنے سب شریکوں کو بلا لو، پھر میرے خلاف تدبیریں کر دیکھو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔[۵۹۵] میرا کارساز اللہ ہے جس نے نہایت اہتمام کے ساتھ یہ کتاب اتاری ہے اور وہ اپنے نیک بندوں کی کارسازی فرماتا ہے۔[۵۹۶] اِس کے برخلاف جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ نہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ تم اُنھیں

اُن کے کان ہیں، پر وہ سنتے نہیں۔
ناک ہیں، پر وہ سونگھتے نہیں۔
اُن کے ہاتھ ہیں، پر وہ چھوتے نہیں۔
پاؤں ہیں، پر وہ چلتے نہیں۔
اور اُن کے گلے سے آواز نہیں نکلتی۔
اُن کے بنانے والے اُنھی کے مانند ہو جائیں گے۔
بلکہ وہ سب جو اُن پر بھروسا رکھتے ہیں۔

(۸-۴:۱۱۵)

۵۹۵ یہ اُن دھمکیوں کا جواب ہے جو مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے کہ ہمارے معبودوں کو برا کہتے ہو اور اُن کی طرف سے لوگوں کے عقیدے خراب کر رہے ہو تو یاد رکھو، ایک دن اُن کا قہر تم پر ٹوٹ پڑے گا اور تم کہیں پناہ حاصل نہ کر سکو گے۔

۵۹۶ مطلب یہ ہے کہ تمھارے معبود تو اپنے چہرے سے مکھی بھی نہیں ہٹا سکتے، لیکن میرا حامی و ناصر وہ پروردگار ہے جس نے انسان کی حیثیت سے میری سب سے بڑی احتیاج پوری کی اور مجھے کتاب ہدایت سے نوازا ہے۔ اُس کی شان یہی ہے کہ وہ اپنے صالح بندوں کی کارسازی فرماتا

يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٩٨﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿١٩٩﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٠٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿٢٠١﴾ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ

رہنمائی کے لیے پکارو تو تمھاری بات نہ سنیں گے۔ تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔[597] (اِن کے ماننے والوں کو اب اور کیا سمجھایا جائے؟ اِس لیے) درگذر کرو، (اے پیغمبر)، نیکی کی تلقین کرتے رہو[598] اور اِن جاہلوں سے اعراض کرو۔ اِس کے باوجود اگر تمھیں کوئی اکساہٹ شیطان کی طرف سے آ جائے تو اللہ کی پناہ چاہو، اِس لیے کہ وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (یاد رکھو)، جو خدا ترس ہیں، اُنھیں جب شیطان کی کوئی چھوت لاحق ہوتی

ہے۔

۵۹۷ اصل الفاظ ہیں: 'وَتَرٰھُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ، وَھُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ'۔ اِن میں 'تَرٰھُمْ' اگرچہ واحد ہے، لیکن یہ 'خطاب لغیر معین' کے اسلوب پر آیا ہے، لہٰذا جمع کے مفہوم میں ہے اور اِس کے مخاطب مشرکین ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں 'رویت'، 'نظر' اور 'اِبصار' کے الفاظ اِس ٹکڑے میں اِس خوبی سے استعمال ہوئے ہیں کہ بس قرآن کا اعجاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے بصرو، تم تو یہ خیال کر رہے ہو کہ یہ تمھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں، لیکن اِنھیں سوجھتا سجھاتا کچھ بھی نہیں۔

۵۹۸ اصل میں لفظ 'عُرف' آیا ہے۔ اِس سے مراد وہ باتیں ہیں جو تمام سلیم الطبع لوگوں کے نزدیک نیکی اور خیر کی باتیں سمجھی جاتی ہیں اور اِس لحاظ سے گویا جانی پہچانی ہوتی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ جو دعوت دے رہے ہو، اُس پر جمے رہو۔ خدا کا فیصلہ جب تک صادر نہیں ہو جاتا، تمھارے لیے

فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾
وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ

ہے تو فوراً اپنے پروردگار کا دھیان کرتے ہیں اور دفعتاً اُن کے دل روشن ہو جاتے ہیں۔ اِس کے برخلاف اِن (جاہلوں) کے بھائی، (شیاطین) اِنھیں گم راہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں، پھر اُس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ۱۸۹-۲۰۲

(اِن کے مطالبے پر) تم اِن لوگوں کے سامنے جب کوئی نشانی پیش نہیں کرتے تو کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لیے کوئی نشانی کیوں نہیں گھڑ لی؟[۵۹۹] کہہ دو، میں تو صرف اُس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ

یہی حکم ہے۔ اِن کی بوالفضولیوں کے پیشِ نظر تم خیر و صلاح کی یہ دعوت منقطع نہیں کر سکتے۔

۵۹۹؎ یہ صریح طعن کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن گھڑ کر لا سکتے ہو تو اپنے دعویٰ نبوت کی تائید کے لیے کوئی معجزہ بھی گھڑ کر لے آؤ۔ اِس مفہوم کے لیے اصل میں لفظ 'اِجْتِبَاء' آیا ہے۔ اِس کے لغوی معنی تو کسی چیز کا انتخاب کر لینے کے ہیں، مگر طنزیہ اسلوب نے یہاں اِس میں گھڑنے اور بنا لینے کے معنی پیدا کر دیے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس قول سے ظالموں کا مطلب یہ ہوتا کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اُس کا معاملہ تو بہت آسان ہے۔ اِدھر اُدھر سے جو باتیں اگلوں کے واقعات اور کاہنوں اور اہل کتاب کی روایات پر مشتمل کانوں میں پڑیں، اُن میں سے جو باتیں دل کو بھا گئیں، اُن کو جوڑ جاڑ کر کچھ کلام بنایا اور اُس کو لا کر ہمیں اِس دعوے کے ساتھ سنا دیا کہ یہ اللہ نے اپنے خاص فرشتے کے ذریعے سے وحی بھیجی ہے۔ لیکن اب ہم نے مطالبہ جو معجزے کا رکھ دیا ہے تو تمھاری کچھ پیش نہیں جاتی، اِس لیے کہ اِدھر اُدھر سے باتیں چھانٹ لینا اور چیز ہے، معجزہ دکھانا اور چیز ہے۔ یہ

لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿٢٠٣﴾ وَاِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ وَاَنۡصِتُوۡا لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿٢٠٤﴾

وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ فِىۡ نَفۡسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيۡفَةً وَّدُوۡنَ الۡجَهۡرِ مِنَ الۡقَوۡلِ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ وَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡغٰفِلِيۡنَ ﴿٢٠٥﴾ اِنَّ

اُن لوگوں کے لیے تمھارے پروردگار کی طرف سے آنکھیں کھول دینے والی آیتیں ہیں اور ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لانا چاہیں۔[600] (اِس لیے) جب یہ قرآن سنایا جائے تو اِس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۲۰۳-۲۰۴

اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو، (اے پیغمبر)، دل ہی دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور بولنے میں ہلکی آواز سے اور اُن لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے

چھانٹ لینے کی چیز نہیں تھی کہ کہیں سے چھانٹ کر لاتے اور ہمیں دکھا دیتے کہ یہ لو، تمھارا مطالبہ پورا کر دیا۔ گویا اِس طعنے میں صرف معجزہ نہ دکھا سکنے ہی کا طعنہ نہیں، بلکہ اِس سے زیادہ زہر آلود طعنہ اِس کے اندر یہ مضمر ہے کہ نعوذ باللہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جو اِدھر اُدھر سے اپنے ذوق کے مطابق چھانٹی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۴۱۲)

[600] یعنی آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے رحمت۔ یہ اُس طنز کا جواب ہے جو اوپر نقل ہوئی ہے اور دیکھیے کہ کس قدر باعظمت اسلوب میں اور کیسا باوقار جواب ہے۔ فرمایا تھا کہ نیکی کی تلقین کرتے رہو اور اِن جاہلوں سے اعراض کرو۔ یہ بہترین مثال ہے کہ اِس ہدایت کی تعمیل کس طرح ہونی چاہیے۔ اُن کی بات چونکہ آخری درجے میں جاہلانہ تھی، اِس لیے اُس کا نوٹس ہی نہیں لیا اور اصل حقیقت نہایت سادہ لفظوں میں سامنے رکھ دی ہے کہ میں معجزے اور کرامتیں نہیں، بلکہ یہ بصائر اور ہدایت و رحمت لے کر آیا ہوں، اِس لیے قبول کرنا ہے تو اِسے قبول کرو۔ دنیا اور آخرت کی تمام سعادتیں اِسی میں مضمر ہیں۔ لیکن اِس کے لیے ضروری ہے کہ دلوں

اَلَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَ یُسَبِّحُوۡنَہٗ وَ لَہٗ یَسۡجُدُوۡنَ ﴿۲۰۶﴾ السجدۃ

ہیں[۶۰۱]۔ حقیقت یہ ہے کہ جو (فرشتے) تیرے پروردگار کے حضور میں ہیں، وہ اُس کی عبادت سے کبھی تکبر نہیں کرتے۔ وہ اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور اُسی کے آگے سجدہ ریز رہتے ہیں[۶۰۲]۔ ۲۰۵-۲۰۶

کی خرابی دور کی جائے اور جانتے ہو، وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ تم حقیقت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

۶۰۱۔ یہ آخر میں خدا کو دائماً یاد رکھنے کی تلقین فرمائی اور اُس کا طریقہ بھی بتا دیا ہے کہ خدا کا یہ ذکر ناز و تدلل کے ساتھ نہیں، بلکہ لجاجت، خوف، فروتنی اور مسکنت کے ساتھ اور پست آواز سے ہونا چاہیے تاکہ دل کی توجہ اِس میں شامل رہے۔ روح کی زندگی کے لیے یہ اُسی طرح ضروری ہے، جس طرح جسم کی زندگی کے لیے سانس کی آمد و شد ضروری ہے۔ شیطان کے حملوں سے یہی ذکر آدمی کو بچاتا اور دعوت حق کے راستے پر پابرجا رکھتا ہے۔ قرآن کی اکثر سورتیں اِسی تلقین پر ختم ہوتی ہیں، اِس لیے کہ دعوت کی راہ میں یہی بدرقہ ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو بیدار کرنے والے کہیں خود غفلت کی نیند نہ سو جائیں اور جس بھول سے وہ دوسروں کو نکالنا چاہتے ہیں، وہی بھول کہیں اُنھیں بھی لاحق نہ ہو جائے۔

۶۰۲۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کو یاد کرنے والوں کا زمرہ یہ ہے۔ وہ زمین پر رہتے بستے ہیں، مگر اُن کا تعلق فرشتوں کی بزم قدس سے ہوتا ہے جو اپنے پروردگار کی بندگی سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے مانتے ہیں کہ اُن کا خالق بے عیب، بے نقص اور بے خطا ہے، ہر قسم کی کمزوریوں سے منزہ ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، وہ بے ہمتا اور بے مثل ہے۔ وہ زبان سے بھی دائماً اِسی حقیقت کا اعتراف و اعلان کرتے اور اُسی کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔ اِس میں مشرکین پر بھی تعریض ہے کہ جن کو خدا کے شریک ٹھیراتے ہو، اُن کا اپنا حال یہ ہے کہ ہر وقت

خدا کے آگے سر گرم سجود اور زمزمہ سنج تسبیح و تہلیل ہیں۔

کوالالمپور

۲۸/ مارچ ۲۰۱۱ء

الانفال - التوبه

۸ ــــــ ۹

الانفال - التوبۃ

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں جس آخری دینونت کے لیے تیاری اور مسلمانوں کے تزکیہ و تطہیر کی ہدایات دی گئی ہیں، دوسری اُسی کے ظہور کا بیان ہے۔ دونوں کے مخاطب اہل ایمان ہیں اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ مدینۂ طیبہ میں یہ دونوں سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ جزا و سزا میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ـــــ الانفال ـــــ کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کے خلاف آخری اقدام کی تیاری اور اِس کے لیے مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر ہے۔

دوسری سورہ ـــــ التوبہ ـــــ کا موضوع اِنھی منکرین کے لیے، خواہ وہ کھلے منکر ہوں یا منافقین، خدا کی آخری دینونت کا ظہور ہے۔

سورۃ الانفال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ ۪ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ

الانفال ۸

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

وہ تم سے غنائم[۱] کے بارے میں پوچھتے ہیں[۲]۔ اِنھیں بتادو کہ یہ سب غنائم اللہ اور اُس کے رسول کے ہیں[۳]۔ اِس لیے اللہ سے ڈرو، (اِس معاملے میں کوئی نزاع پیدا نہ کرو) اور اپنے آپس کے معاملات کی اصلاح کرلو[۴] اور اللہ اور اُس کے رسول کا حکم مانو، اگر تم

۱۔ آیت میں لفظ 'اَلْاَنْفَال' آیا ہے۔ 'نفل' اُس چیز کو کہتے ہیں جو حق سے زیادہ حصۂ مزید کے طور پر دی جائے۔ اِس تعبیر میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کا اجر تو اُس کے ہاں بالکل الگ اور دائمی طور پر محفوظ ہو جاتا ہے، اِس کے ساتھ جو مال غنیمت دشمن سے حاصل ہوتا ہے، وہ ایک حصۂ مزید ہے۔ قیامت سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ اِسی دنیا میں مجاہدین کو عطا کر دیتے ہیں۔

۲۔ یہ سوال اعتراض کی نوعیت کا ہے اور غزوۂ بدر میں حاصل ہونے والے مال غنیمت سے متعلق پیدا ہوا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ جو جتنا مال جنگ میں لوٹے، وہ اُسی کا حق ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے بعد جب لوٹنے والوں سے دوسروں نے جنگی خدمات کی بنا پر اپنے حق کا مطالبہ کیا تو اُس سے ایک نزاع پیدا ہو گئی جس نے کسی حد تک تلخی کی صورت اختیار کر لی۔ یہ سوال اِسی پس منظر میں اور مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے کیا گیا ہے۔*

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۵۷۰۔

مُّؤْمِنِيْنَ ① اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ

مومن ہو۔ (یاد رکھو[5]) ، اہل ایمان تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل دہل جاتے ہیں[6] اور جب اُس کی آیتیں اُنھیں سنائی جاتی ہیں تو اُن کا ایمان بڑھا دیتی

۳۔ یعنی اِس وقت جو غنائم حاصل ہوئے ہیں، اُن کے متعلق خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ اُن پر کسی شخص کا بھی کوئی حق قائم نہیں ہوتا۔ یہ سب اللہ اور رسول کا ہے اور وہ اِس کے ساتھ جو معاملہ چاہیں گے، اپنی صواب دید کے مطابق کریں گے۔ یہ فیصلہ اِس لیے کیا گیا کہ زمانۂ رسالت کی جنگیں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت کے تحت لڑی گئی تھیں اور اِن میں لڑنے والوں کی حیثیت اصلاً آلات و جوارح کی تھی۔ وہ اللہ کے حکم پر میدان میں اترے اور براہ راست اُس کے فرشتوں کی مدد سے فتح یاب ہوئے تھے۔ لہٰذا اِن جنگوں کے مال غنیمت پر اُن کا کوئی حق اللہ تعالیٰ نے تسلیم نہیں کیا، تاہم آگے جا کر بتا دیا ہے کہ اِس کے باوجود یہ سارا مال نہیں، بلکہ اِس کا پانچواں حصہ ہی اجتماعی مقاصد کے لیے خاص رہے گا اور باقی از راہ عنایت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

۴۔ مطلب یہ ہے کہ بحث و اختلاف کی گرما گرمی میں اگر کوئی بدگمانی یا رنجش پیدا ہو گئی ہے یا اپنے بھائیوں کے بارے میں رشک و حسد کے جذبات کسی کے دل میں ابھرے ہیں کہ فلاں اور فلاں کو اِس مال میں کیوں شریک بنایا گیا ہے، تو اپنی اصلاح کر لو۔ تم سب بھائی بھائی ہو۔ تمھارے تعلقات اخوت، رحم اور محبت کی بنیاد پر قائم ہونے چاہییں۔ یہ ایمان و تقویٰ کے منافی ہے کہ تمھارا دامن دل حسد، رقابت اور خود غرضی کے غبار سے آلودہ ہو، اِسے پاک صاف کر لو۔

۵۔ یہاں سے آگے سچے اہل ایمان کی تصویر ہے جو اُن لوگوں کے سامنے رکھی گئی ہے جنھیں 'اگر تم مومن ہو' کے الفاظ میں خطاب فرمایا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو تو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرو۔ اِن کے بغیر یہ دعویٰ کسی کو زیب نہیں دیتا۔

يَتَوَكَّلُوْنَ ② الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③

ہیں[7] اور وہ (ہر معاملے میں) اپنے پروردگار ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔[8] وہ جو نماز کا اہتمام

الانفال ۸

۶۔ یہ سچے اہل ایمان کی پہلی علامت بتائی ہے کہ وہ خدا کی عظمت و جلالت اور کبریائی کا شعور رکھتے ہیں، لہٰذا خدا کی کوئی بات بھی اُن کے سامنے پیش کی جائے، وہ اِس گہرے احساس کے ساتھ اُس کو سنتے ہیں کہ یہ اُس ہستی کا ذکر ہو رہا ہے یا اُس کے نام پر کوئی بات کہی جا رہی ہے، جس کی ناراضی کا خوف ہر انسان کے نہاں خانۂ وجود میں جاگزیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اُن کا دل اِس گہرے احساس سے لرز جاتا ہے۔

۷۔ یہ دوسری علامت ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ آیات سے یہاں کتاب الٰہی کی وہ آیات مراد ہیں جن میں خدا کے احکام اور قوانین بیان ہوتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اہل ایمان جب اِن احکام و قوانین کو سنتے ہیں تو اِنھیں ایمان ہی کا مظہر اور اُس کے مضمرات کی تفصیل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایمان کے شجرۂ طیبہ پر یہ برگ و بار دیکھ کر اُن کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اِسی طرح ایمان کے اِن مطالبات کو جب وہ پورا کرتے ہیں تو امتحان و آزمایش کے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، اُن میں خدا کی تائید و نصرت کا ظہور اور کامیابی سے گزرنے کے بعد فتح مندی کا احساس بھی اُن کے ایمان کو قوی سے قوی تر بنا دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''' زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ' کے اسلوب بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اندر ایمان موجود ہوتا ہے، جب اُن کے سامنے ایمان کے مقتضیات و مطالبات آتے ہیں تو وہ پوری بشاشت سے اُن کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ اِن مقتضیات و مطالبات کو اپنے ہی لگائے ہوئے درخت کا پھل اور اپنی ہی بوئی ہوئی کھیتی کا حاصل سمجھتے ہیں اور جس طرح ہر کسان اپنی کھیتی کے حاصل اور اپنے درخت کے پھلوں میں افزونی دیکھ کر باغ باغ ہوتا ہے، اُسی طرح یہ اہل ایمان بھی اپنے ایمان کی یہ افزایش دیکھ کر شادمان ہوتے ہیں۔ یہ گویا اُن مدعیان ایمان پر ایک لطیف تعریض ہوئی جو ایمان کا دعویٰ کرنے کو تو کر بیٹھے، لیکن جب اُس کے مطالبے سامنے آئے تو اُن

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۚ ﴿۴﴾

کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُنھیں دیا ہے، اُس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں[9]۔ یہی سچے مومن ہیں۔ اِن کے پروردگار کے پاس اِن کے لیے درجے ہیں، مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے[10]۔ ۱-۴

سے خوش ہونے کے بجائے اُن کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے کہ یہ کیا بلا نازل ہو گئی!''

(تدبر قرآن ۳/۴۳۲)

۸۔ یہ تیسری علامت ہے۔ یعنی امتحان و آزمایش کے مراحل میں وہ اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔ اُنھیں یقین کامل ہوتا ہے کہ اُن کے پروردگار نے جو حکم بھی دیا ہے اور جس امتحان سے بھی گزارا ہے، اُس میں سرتاسر اُنھی کی فلاح ہے۔ چنانچہ تمام احکام اور تمام امتحانات کو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اُن میں یقیناً کوئی حکمت و مصلحت پوشیدہ ہو گی اور جلد یا بدیر وہ اُن کے لیے رحمت و برکت کی صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔

۹۔ یہ چوتھی علامت ہے اور اِس میں جو چیزیں بیان ہوئی ہیں، وہ سب کی جامع اور محافظ ہیں۔ ایمان جو اوصاف اہل ایمان کے اندر پیدا کرتا ہے، اُن کی شیرازہ بندی اِنھی دو چیزوں —— نماز اور انفاق —— سے ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ اِسی حیثیت سے بیان ہوئی ہیں۔

۱۰۔ یعنی اُن کے ایمان و یقین کی کیفیات اور اُن کے ظہور کے لحاظ سے درجے ہیں، اُن کی غلطیوں اور کوتاہیوں کے لیے خدا کا دامن مغفرت ہے اور اِس کے نتیجے میں ایسی روزی ہے جو اِس عزت کے ساتھ دی جائے گی کہ یہ درحقیقت اُنھی کا حق ہے جو اُنھیں دیا جا رہا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ اِن آیتوں میں جس ایمان کا ذکر ہوا ہے، وہ قانونی اور فقہی ایمان نہیں ہے جس سے لوگوں کے حقوق و فرائض کا تعین کیا جاتا ہے، بلکہ حقیقی ایمان ہے اور یہ ہرگز کوئی جامد چیز

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ

اِسی طرح کی صورت اُس وقت پیش آئی تھی[11]، جب تمھارا پروردگار تمھیں ایک مقصد حق کے ساتھ[12] تمھارے گھر سے نکال لایا اور مسلمانوں کے ایک گروہ کو یہ سخت

نہیں ہے۔ اللہ کے ذکر اور اُس کی آیتوں کی تلاوت اور انفس و آفاق میں اُن کے ظہور سے اِس میں افزونی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے دوسری جگہ اِسے ایک ایسے درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑیں زمین کے اعماق میں اتری ہوئی اور شاخیں آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔ چنانچہ انسان اگر اپنے ایمان کو علم نافع اور عمل صالح سے برابر بڑھاتے رہنے کے بجائے اُس کے تقاضوں کے خلاف عمل کرنا شروع کر دے تو یہ کم بھی ہوتا ہے، بلکہ بعض حالات میں بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

[11] اصل میں لفظ 'کَمَا' ہے۔ یہ واقعہ سے واقعہ کی مماثلت کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ اِس صورت میں اِس کا مشبہ اور مشبہ بہ متعین الفاظ کے اندر نہیں ہوتا، بلکہ بحیثیت مجموعی واقعہ کے اندر ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ اوپر مال غنیمت سے متعلق نزاع کا ذکر ہوا ہے۔ اِسی طرح کا ایک معاملہ جنگ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے پیش آیا تھا۔ تزکیہ و تطہیر کی ضرورت سے قرآن نے اُسے بھی ساتھ ہی موضوع بنالیا ہے۔

[12] اِس کی وضاحت آگے فرما دی ہے کہ وہ مقصد حق یہ تھا کہ حق کا بول بالا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکروں کی جڑ کاٹ دی جائے۔ اِس سے قرآن نے اُن روایتوں کی تردید کر دی ہے جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اُس تجارتی قافلے کو لوٹنے کے لیے گھر سے روانہ ہوئے تھے جو ابوسفیان کی سربراہی میں شام سے واپس آ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ ابتدا ہی سے قریش کی ہزیمت پیش نظر تھی اور نکلنے کی ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی تھی تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے۔ یہ چیز، ظاہر

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝٦ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ

ناگوار تھا۔[۱۳] وہ اِس مقصدِ حق کے معاملے میں تم سے جھگڑ رہے تھے، اِس کے باوجود کہ اُن پر وہ اچھی طرح واضح تھا۔ اُن کا حال یہ تھا کہ گویا آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔[۱۴] اُس وقت کو یاد کرو، جب اللہ تم لوگوں سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمھیں مل جائے گا۔[۱۵] تم چاہتے تھے کہ تمھیں وہ ملے جو

الانفال ۸

ہے کہ کسی تجارتی قافلے کو لوٹ لینے سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

۱۳؎ آیت میں 'فَرِيْقًا' کا لفظ بتاتا ہے کہ اُن لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی جن پر یہ دیکھ کر دہشت طاری ہو رہی تھی کہ پیشِ نظر تجارتی قافلہ نہیں، بلکہ قریش کا لشکر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِسی لشکر کی سرکوبی کے لیے مدینہ سے نکل رہے ہیں۔ تاہم یہ گروہ اتنا قابلِ لحاظ ضرور تھا کہ مسلمانوں کی جماعت کے تزکیہ و تطہیر کے لیے اِس کا رویہ زیرِ بحث آیا ہے۔

۱۴؎ اصل میں لفظ 'يُجَادِلُوْنَكَ' آیا ہے۔ اِس کے معنی یہاں بلطائف الحیل مخاطب سے اپنی بات منوانے کے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اِس کے باوجود کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشا اُن پر واضح تھا کہ آپ لشکر ہی کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، وہ موت کے خوف سے آخر وقت تک سخن سازی کرتے اور زور لگاتے رہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے آپ کو قائل کر لیں کہ لشکر کے مقابلے میں جانے کے بجائے قافلے کو لوٹنا زیادہ قرینِ مصلحت ہے، اِس سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو سنبھالنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

۱۵؎ اِس وعدے میں ابہام کا اسلوب ہے۔ یعنی دوٹوک انداز میں یہ نہیں کہا گیا کہ تجارتی قافلے کی حفاظت کا بہانہ بنا کر قریش نے حملے کے لیے فوج بھیج دی ہے، اُس کے مقابلے کے لیے

الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸ج

مسلح نہیں ہے[16] اور اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے[17] حق کا بول بالا کرے اور منکروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے، خواہ اِن مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو[18]۔ ۵-۸

نکلو، اللہ اُس کو تمھارے قابو میں کر دے گا، بلکہ ابہام کا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے کہ قریش کی دو جماعتیں آ رہی ہیں جن میں سے ایک تمھیں مل جائے گی، اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس سے مخلصین اور منافقین کو الگ الگ کرنا مقصود تھا تاکہ ایک بڑی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے یہ اندازہ ہو جائے کہ کون کہاں کھڑا ہے۔ چنانچہ اِس موقع پر مہاجرین وانصار کے اکابر کی جو تقریریں روایتوں میں نقل ہوئی ہیں، اُن سے صاف واضح ہے کہ وہ حضور کا یہ منشا پوری طرح سمجھ گئے تھے۔* استاذ امام کے الفاظ میں، اُنھوں نے آپ کے استفسار کے جواب میں ایسی تقریریں کیں جن کی گونج اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ باقی رہے گی، جن کا ایک ایک لفظ میدان جہاد کا رجز ہے اور جن کی حرارت ایمانی چودہ سو سال گزرنے پر بھی ٹھنڈی نہیں پڑی ہے۔ یہ تقریریں، ظاہر ہے کہ کسی تجارتی قافلے پر حملے کے لیے نہیں کی گئی تھیں۔

۱۶۔ یہ ضعیف الایمانوں کے اُسی گروہ قلیل کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اُن پر بھی، جیسا کہ فرمایا ہے، حقیقت بالکل واضح تھی، مگر اپنی بزدلی کے باعث وہ چاہتے تھے کہ قافلے کا قصد کیا جائے جو غیر مسلح ہے تاکہ کوئی خطرہ پیش نہ آئے اور مال غنیمت بھی حاصل ہو جائے۔

۱۷۔ اِس سے وہ کلمات مراد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کے لیے گھر سے نکالنے اور بعد میں آپ کی تائید ونصرت کے لیے صادر ہوئے۔

۱۸۔ اِن آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، اُس کی روشنی میں غزوۂ بدر کی جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ اُس سے بالکل مختلف ہے جو سیرت ومغازی کی کتابوں میں پیش کی گئی ہے۔ استاذ امام

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۳۳۔

امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمانوں کے ذہن میں قریش کے قافلۂ تجارت سے تعرض کرنے کا کوئی خیال موجود نہیں تھا۔ مدینہ پر حملے کی ساری اسکیم قریش نے بنائی اور اُس کے لیے قافلۂ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراشا۔ قریش مدینہ میں مسلمانوں کے جڑ پکڑنے سے بہت خائف تھے۔ مذہبی عناد کے علاوہ اُنھیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ اب مکہ اور شام کی تجارتی شاہ راہ اُن کے لیے محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ اِس وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہی وہ اِس فکر میں تھے کہ کوئی عذر تلاش کر کے مسلمانوں کو ایک قوت بننے سے پہلے ہی ختم کر دیں۔ اب یا تو قافلۂ تجارت کے سالار ابوسفیان نے واپسی کے موقع پر کوئی وہمی خطرہ مسلمانوں کے حملے کا محسوس کیا ہو کہ آدمی بھیج کر قریش کو حملے کی خبر بھیج دی یا اِس کے لیے بھی پہلے سے قریش کے لیڈروں میں کوئی سازش رہی ہو، بہر حال ابوسفیان کی اطلاع پر مکہ سے ایک بھاری بھرکم لشکر مدینہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ مرحلہ ہے جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رویا کے ذریعے سے یہ اطلاع ہوتی ہے کہ قریش کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک سے مسلمانوں کا مقابلہ ہونا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے بعد مدینہ سے بدر کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا اور مسلمانوں کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے صورت حال مبہم انداز میں اُن کے سامنے رکھی کہ کفار کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک سے ہمارا مقابلہ ہو گا اور وہ ہم سے شکست کھائے گی۔ مسئلہ کے سامنے آتے ہی مہاجرین و انصار سب سمجھ گئے کہ قریش کی فوج آرہی ہے اور اُس سے معاملہ درپیش ہے۔ چنانچہ اُن کے لیڈروں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفاداری اور اسلام کے لیے اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا۔ البتہ، ایک مختصر سی ٹولی اُن میں ایسی بھی تھی جس نے اپنا زور اِس بات کے لیے لگایا کہ قریش کی فوج کے بجائے قافلۂ تجارت کا رخ کیا جائے تاکہ بغیر ایک قطرۂ خون بہائے بھاری غنیمت ہاتھ آئے۔ اِسی گروہ کو بے نقاب کرنے کے لیے حضور نے اپنی بات مبہم انداز میں پیش کی تھی تاکہ جن لوگوں کے اندر کوئی کمزوری چھپی ہوئی ہے، وہ اپنی کمزوری ظاہر کر دیں اور مخلص و منافق میں

الانفال
۸

اِذۡ تَسۡتَغِيۡثُوۡنَ رَبَّكُمۡ فَاسۡتَجَابَ لَكُمۡ اَنِّىۡ مُمِدُّكُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ مُرۡدِفِيۡنَ ﴿٩﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰى وَلِتَطۡمَئِنَّ بِهٖ قُلُوۡبُكُمۡ‌ ۚ وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿١٠﴾ اِذۡ يُغَشِّيۡكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنۡهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ

یاد کرو، جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے[19] تو اُس نے تمھاری فریاد سن لی اور فرمایا کہ میں ایک ہزار فرشتے تمھاری مدد کے لیے بھیج رہا ہوں جو لگاتار پہنچتے رہیں گے۔[20] یہ اللہ نے صرف اِس لیے کیا کہ تمھارے لیے خوش خبری ہو اور اِس لیے کہ تمھارے دل اِس سے مطمئن ہوں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مدد تو اللہ ہی کے پاس سے آتی ہے۔[21] یقیناً اللہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ یاد کرو، جب اللہ اپنی

الانفال ۸

مرحلۂ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی امتیاز ہو جائے۔'' (تدبر قرآن ۳/۴۳۹)

۱۹ مسلمانوں کی تعداد چونکہ اِس جنگ میں بہت تھوڑی تھی اور وہ بے سروسامان بھی تھے، اِس لیے استاذ امام کے الفاظ میں، ہر شخص سراپا عجز و نیاز اور یک سر دعا و فریاد بنا ہوا تھا۔ اِن دعاؤں میں لوگوں نے کس طرح اپنے دل نکال کر اپنے رب کے سامنے رکھ دیے تھے، اُس کا اندازہ کسی حد تک اُس دعا سے کیا جا سکتا ہے جو اُس موقع پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ آپ نے عرض کیا تھا: ''خدایا، یہ ہیں قریش، اپنے سامان غرور کے ساتھ آئے ہیں تاکہ تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کر دیں۔ خدایا، اب تیری وہ مدد آ جائے جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ خدایا، اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہو گئی تو روے زمین پر پھر کوئی تیری عبادت نہ کرے گا*۔''

۲۰ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ میدان جنگ میں حوصلے کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ دخل اِسی چیز کو ہوتا ہے کہ لڑنے والوں کو اِس بات کا اطمینان رہے کہ جب ذرا کمزور ہوں گے تو

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/۲۳۹۔ تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/۳۸۳۔

مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ

طرف سے تمھاری تسکین کے لیے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا[22] اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا[23] کہ اُس کے ذریعے سے تمھیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی نجاست دور

پیچھے سے کمک لازماً پہنچ جائے گی۔

۲۱۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کیا جائے تو جو کچھ بھی مدد حاصل ہوتی ہے، خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے اور تمھیں بھی لازماً حاصل ہوتی، مگر پہلے اِس لیے بتا دیا گیا کہ یہ چیز تمھارے لیے خوش خبری ہو اور تمھارے حوصلے کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بن جائے۔

۲۲۔ آیت میں مضارع کا صیغہ ہے۔ اِس کے ساتھ حرف 'إذ' ہو تو فعل ناقص کی ضرورت نہیں ہوتی، اُس کا مفہوم آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی صورت اِس سے پیچھے 'يَعِدُكُمْ' اور 'تَسْتَغِيْثُوْنَ' میں بھی ہے۔ آیت میں نیند کے بجائے اونگھ کا ذکر ہوا ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرح کی صورت حال میں اونگھ آ جائے تو آدمی کچھ سو ہی لیتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ نہایت برمحل استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے یہ چیز مسلمانوں پر اڑھا دی، جیسا کہ 'يُغَشِّيْكُمْ' کے لفظ سے واضح ہے اور وہ جنگ سے پہلے رات میں سو لیے۔ اِس سے اُن کے اعصاب اور دل و دماغ کو اتنا سکون حاصل ہو گیا کہ وہ تازہ دم ہو کر میدان میں اتر سکیں۔ یہ فی الواقع خدا کی تائید کا ظہور تھا، اِس لیے کہ جہاں صبح ایک دل بادل فوج کا سامنا کرنا ہو، وہاں رات میں سو لینا آسان نہیں ہوتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...میدان جنگ میں فوج کے لیے سو لینے کا موقع مل جانا ہی اول تو بڑی نعمت ہے، لیکن اِس سے بڑی نعمت اِس موقع سے صحیح فائدہ اٹھا سکنا ہے۔ اِس لیے کہ نیند کے لیے موقع مل جانا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اِس کا اصلی انحصار دل و دماغ کی حالت پر ہے اور یہ چیز ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، اُنھی کو حاصل ہوتی ہے جن پر خدائے مقلب القلوب اپنے فضل خاص سے یہ سکینت طاری کر دے۔" (تدبر قرآن ۳/۴۴۵)

عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ وَيُثَبِّتَ بِهِ الۡاَقۡدَامَ ؕ‏ ﴿۱۱﴾ اِذۡ يُوۡحِىۡ رَبُّكَ اِلَى الۡمَلٰۤـئِكَةِ اَنِّىۡ مَعَكُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ‌ؕ سَاُلۡقِىۡ فِىۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ

کرے[۲۴] اور (تمھیں کچھ دیر کے لیے سلا کر) تمھارے دلوں کو اِس سے مضبوط کرے اور تمھارے قدم جما دے[۲۵]۔ یاد کرو، جب تمھارا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا[۲۶] کہ میں تمھارے ساتھ ہوں تو ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو[۲۷]۔ میں اِن منکروں کے دلوں

۲۳؎ یعنی زمین کا پانی اگر میسر نہیں تھا تو اپنی عنایت خاص سے اُس نے آسمان کو حکم دیا کہ وہ اپنا پانی برسا دے۔ رات کی نیند اور اِس سے پہلے فرشتوں کے اترنے کی بشارت کے بعد یہ تیسری تائیدالٰہی ہے جو بدر کے موقع پر ظاہر ہوئی۔

۲۴؎ یہ اُن وساوس کی طرف اشارہ ہے جو ناپاکی کی حالت میں ہجوم کر سکتے اور عین میدان جنگ میں لوگوں کو خدا کی یاد اور اُس کی تائید و نصرت پر اعتماد سے محروم کر سکتے تھے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ پانی کے حیوانی فوائد چونکہ ہر شخص کے علم میں ہیں، اِس لیے اللہ نے اُن سے صرف نظر فرمایا اور اُن کے بجاے پانی کی روحانی برکات کا ذکر کیا ہے۔ بندۂ مومن کے لیے زیادہ اہمیت اِنھی کی ہوتی ہے۔ اِس موقع پر بھی صحابۂ کرام کو زیادہ پریشانی یہی ہو سکتی تھی کہ نماز کے لیے وضو کیسے ہو گا، طہارت کے لیے کیا کریں گے اور غسل کی ضرورت پیش آ گئی تو اُس کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے گی؟

۲۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَلِيَرۡبِطَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ وَيُثَبِّتَ بِهِ الۡاَقۡدَامَ'۔ یہ دونوں باتیں پانی سے نہیں، بلکہ نیند سے متعلق ہیں۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ نیند ہی سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ قرآن نے یہاں ترتیب صعودی کا طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی پہلے پانی اور اُس کے بعد نیند کے فوائد بیان کیے ہیں۔ یہی اسلوب سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱۸۵ میں بھی ہے۔ 'وَلِيَرۡبِطَ' میں حرف 'ل' کا اعادہ اِسی لیے کیا گیا ہے۔

۲۶؎ اِس سے معلوم ہوا کہ فرشتے بھی اپنے علو مرتبت کے باوجود خدا تک براہ راست رسائی

كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿١٢﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١٣﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ

میں رعب ڈالے دیتا ہوں[۲۸]، سو تم اِن کی گردنوں پر مارو اور اِن کے پور پور پر چوٹ لگاؤ[۲۹]۔ یہ اِس لیے کہ یہ اللہ اور اُس کے رسول کے مقابلے کو اُٹھے ہیں اور جو اللہ اور اُس کے رسول کے مقابلے کو اٹھتے ہیں، اُن کو ایسی ہی سزا ملتی ہے، اِس لیے کہ اللہ سخت سزا

نہیں رکھتے۔ اُس کے احکام اُنھیں بھی وحی کے ذریعے سے ہی ملتے ہیں۔

۲۷؎ اِس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ فرشتے بھی خدا کی معیت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسری یہ کہ بدر کی جنگ میں بھی اصلی چیز مسلمانوں کی اپنی شجاعت اور ثابت قدمی تھی۔ فرشتوں کا کام اُنھیں ایک طرف بٹھا کر خود لڑنا نہیں تھا، بلکہ منکروں کو ٹھیک اُن کے سامنے کر دینا اور اُنھیں ثابت قدم رکھنا تھا۔

۲۸؎ لڑنے والوں کی اصلی طاقت اُن کے حوصلے میں ہوتی ہے، اِس لیے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ منکرین جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ بھی نہیں کر سکیں گے۔

۲۹؎ یعنی مسلمانوں کی تلواروں سے۔ یہ اُس بے بسی کی تصویر ہے جو مرعوبیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...حریف میں جب تک دم خم ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اِس بات کا موقع وہ مشکل ہی سے دیتا ہے کہ آپ جہاں چاہیں، اُس کے مار دیں، لیکن جب اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تو پکڑ کر اُس کی چندیا پر جوتے لگا دیجیے، وہ چوں بھی نہ کر سکے گا۔ تعیین محل کے ساتھ جب کسی کو مارنے کے لیے کہا جائے تو اِس میں اُس کی تحقیر و تذلیل بھی مدنظر ہوتی ہے اور اِس سے اُس کی بے بسی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۴۴۹/۳)

وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ
الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا
اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ
الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ

دینے والا ہے —— یہ ہے تمھاری سزا۔ سو اِسے ابھی چکھو اور جان لو کہ (آگے) منکروں کے لیے آگ کا عذاب ہے[30]۔ ۹-۱۴

ایمان والو، جب اِن منکروں سے تمھارا مقابلہ باقاعدہ فوج کشی کی صورت میں ہو[31] تو اِنھیں پیٹھ نہ دکھاؤ اور (خوب سمجھ لو کہ) جو اُس وقت اِن کو پیٹھ دکھائے گا، اِلّا یہ کہ جنگ کے لیے پینترا بدلنا چاہتا ہو یا اپنی فوج کے کسی دوسرے حصے سے ملنا چاہتا ہو تو وہ خدا کا غضب لے کر لوٹا۔ اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے[32]۔ (ایمان

۳۰؎ قرآن کے عام اسلوب کے مطابق اثنائے کلام میں خطاب کا رخ پھر گیا ہے اور یہ بات قریش کو مخاطب کر کے فرمادی ہے۔

۳۱؎ یعنی گوریلا وار فیر یا کروفر کی جنگ کی صورت میں نہیں، جس میں حملہ کرو، لوٹو اور بھاگ جاؤ کے اصول پر جنگ کی جاتی ہے، بلکہ جب منظّم فوج کشی کے طریقے پر مقابلہ ہو۔

۳۲؎ اِس سے معلوم ہوا کہ خدا کے حکم پر اور قتال فی سبیل اللہ کے لیے میدان میں اترنے کے بعد بزدلی اور فرار کی نوعیت کا پیٹھ دکھانا حرام ہے۔ کسی صاحب ایمان کو ہرگز اِس کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بے اعتمادی، دنیا کی آخرت پر ترجیح اور موت وحیات کو اپنی تدبیر پر منحصر قرار دینے کا جرم ہے جس کی ایمان کے ساتھ کوئی گنجایش نہیں مانی جاسکتی۔

رَمَيۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبۡلِىَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مِنۡهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوۡهِنُ كَيۡدِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۸﴾

والو، تم کیوں جان چراؤ، جب کہ تمھاری طرف سے خدا لڑتا ہے)؟ سو حقیقت یہ ہے کہ (اِس جنگ میں) تم نے اِن کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے اِن کو قتل کیا ہے اور، (اے پیغمبر)، جب تو نے اِن پر (خاک) پھینکی تو تو نے نہیں پھینکی، بلکہ اللہ نے پھینکی ہے[۳۳]، اِس لیے کہ منکروں کو اپنی شانیں دکھائے اور اِس لیے کہ مسلمانوں کو اللہ اپنی طرف سے اچھا انعام عنایت فرمائے[۳۴]۔ بے شک، اللہ سمیع و علیم ہے۔ یہ جو کچھ ہوا، تمھارے سامنے ہے[۳۵]

۳۳؎ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ جب مسلمانوں اور کفار کے لشکر آمنے سامنے ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر خاک زمین سے اٹھائی اور 'شاھت الوجوہ' کہہ کر کفار کی طرف پھینک دی*۔ یہ لعنت کا جملہ اور قدیم ترین زمانے سے لعنت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ مسلمان اِس کے ساتھ ہی یک بارگی حملہ آور ہو گئے۔ قرآن میں یہ اِسی واقعے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''یہاں زبان کا یہ اسلوب بھی نگاہ میں رہے کہ بعض مرتبہ فعل کی نفی سے مقصود نفس فعل کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ اِس فعل کے ساتھ اُن شان دار نتائج کی نسبت کی نفی ہوتی ہے جو اِس فعل کے پردے میں ظاہر ہوئے۔ مٹھی بھر نہتے مسلمانوں کا قریش کی دل بادل غرق آہن فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال دینا یا آں حضرت کے دست مبارک سے پھینکی ہوئی چٹکی بھر خاک کا ایک ایسا طوفان بن جانا کہ تمام کفار کو اپنی اپنی آنکھوں کی پڑ جائے، یہ مسلمانوں کی چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلواروں یا پیغمبر کی 'رمی' کے کارنامے نہیں تھے، بلکہ اُس دست غیب کے کارنامے تھے جو مسلمانوں کی میانوں اور پیغمبر عالم کی آستینوں میں چھپا ہوا تھا۔'' (تدبر قرآن ۳/۴۵۱)

۳۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَلِيُبۡلِىَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مِنۡهُ بَلَآءً حَسَنًا'۔ اِس کا معطوف علیہ یہاں

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/۲۴۵۔

الانفال ۸

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ج وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ج وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ج وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ لا

اور اِس کے ساتھ یہ (بشارت) بھی کہ اللہ اِن منکروں کی تمام تدبیریں[36] بے کار کر کے رہے گا۔ اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو (قریش کے لوگو)، یہ فیصلہ آ گیا ہے[37]۔ اگر (اب بھی) باز آ جاؤ تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر پھر یہی کرو گے تو ہم بھی یہی کریں گے اور تمھاری جمعیت، خواہ کتنی ہی زیادہ ہو، تمھارے کچھ کام نہ آئے گی۔

عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق حذف کر دیا ہے، اِس لیے کہ اوپر کے الفاظ سے وہ خود بخود واضح ہو رہا ہے۔

۳۵؎ اصل میں 'ذٰلِکُم' کا لفظ آیا ہے۔ یہ جب اِس طرح آتا ہے تو پورے جملے کا قائم مقام ہوتا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ آگے حرف ربط 'و' کا تعلق اِسی جملے کے مفہوم سے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہ جملہ ٹھیک اوپر کے جملہ 'ذٰلِکُم فَذُوْقُوْہُ، وَاَنَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابَ النَّارِ' کا مدمقابل جملہ ہے، یعنی کفار کے لیے یہ چیت نقد ہے جو اُن کو بدر میں لگی اور تمھارے لیے یہ فتح عظیم نقد ہے جو تمھیں حاصل ہوئی۔ اب آگے اُن کے لیے دوزخ ہے اور تمھارے لیے یہ بشارت کہ کفار کی سازشوں کے تمام تار و پود بکھر جائیں گے اور دین حق کا بول بالا ہوگا۔"

(تدبر قرآن ۳/ ۴۵۲)

۳۶؎ اصل میں لفظ 'کَیْد' آیا ہے۔ اِس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ بدر کی جنگ مسلمانوں کے کسی اقدام کے نتیجے میں نہیں ہوئی، بلکہ قریش کے لیڈروں کی سازش کے نتیجے میں ہوئی۔ اُنھوں نے قافلۂ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراشا اور ایک لشکر جرار لے کر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی بنا پر اِس کو اور اِس کے بعد بھی جو کچھ وہ کریں گے، اُسے 'کَیْد' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی چال اور سازش کے ہیں۔

وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٩﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ

اور خوب سمجھ لو کہ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے[۳۸]۔ ۱۵-۱۹

ایمان والو[۳۹]، اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو، (جس طرح کہ اطاعت کا حق

۳۷۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کو اِس جنگ میں اپنی فتح کا کامل یقین تھا۔ بدر کے لیے روانگی سے پہلے اُنھوں نے کعبے کے پردے پکڑ کر دعا مانگی تھی کہ خدایا، اُس کی مدد کر جو دونوں لشکروں میں سب سے اعلیٰ ہو، جو دونوں گروہوں میں سب سے اشرف ہو، جو دونوں قبیلوں میں سب سے بہتر ہو*۔ اِس طرح خود اُنھوں نے اِس جنگ کو حق و باطل میں فیصلے کی میزان ٹھیرا لیا تھا، چنانچہ یہ فیصلہ آ گیا۔ آگے آیت ۴۱ میں غزوۂ بدر کو قرآن نے 'یَوْمَ الْفُرْقَان' کہا ہے۔ اُس کی وجہ یہی ہے۔

۳۸۔ یہ پوری آیت نصیحت بھی ہے اور فضیحت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتے ہو کہ آیندہ مزید تیاری اور قوت و شوکت کے ساتھ حملہ آور ہو گے۔ سو جان لو کہ یہ چیز بھی تمھارے کچھ کام نہ آئے گی، اِس لیے کہ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...یہ (آخری) ٹکڑا ساری آیت کی جان ہے اور اِس کے دو لفظوں میں کفار کے لیے دھمکیوں کا اور اہل ایمان کے لیے بشارتوں کا ایک جہان ہے۔ فرمایا کہ اب آئے جس کو آنا ہو اور لڑے جس کو لڑنا ہو اور جمع کرے وہ جتنی جمعیت جمع کر سکتا ہو، اہل ایمان کے ساتھ ہم ہیں ہم! سبحان اللہ۔" (تدبر قرآن ۳/ ۴۵۳)

۳۹۔ یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن اُنھی لوگوں کی طرف ہے جن کی کمزوری اور منافقت ابتدا سے زیر بحث ہے۔

* تفسیر القرآن العظیم ۲/ ۳۹۲۔

تَسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۰﴾ وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۱﴾
اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الۡبُكۡمُ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۲﴾
وَلَوۡ عَلِمَ اللّٰهُ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا لَّاَسۡمَعَهُمۡ ؕ وَلَوۡ اَسۡمَعَهُمۡ لَتَوَلَّوۡا

ہے[۴۰]) اور رسول (کی دعوت) سے روگردانی نہ کرو[۴۱]، جب کہ تم (اُس کو) سن رہے ہو[۴۲]۔
تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے سنا، لیکن سنتے سناتے کچھ
نہیں تھے[۴۳]۔ یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور یہی بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل
سے کام نہیں لیتے[۴۴]۔ اگر اللہ اِن میں کوئی بھلائی دیکھتا تو ضرور اِن کو سننے کی توفیق دیتا[۴۵]

۴۰؎ آیت میں لفظ 'اَطِيۡعُوۡا' آیا ہے۔ یہ اپنے کامل معنی میں ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۴۱؎ پیچھے اللہ و رسول، دونوں کا ذکر ہے، لیکن یہاں ضمیر واحد آ گئی ہے۔ اِس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول کی دعوت سے روگردانی اللہ سے روگردانی کے ہم معنی ہے، اِس لیے کہ خدا سے تعلق اور اُس کی اطاعت کا واحد ذریعہ اُس کا رسول ہی ہے۔

۴۲؎ یہ الفاظ اُن کے رویے کی شناعت کو ظاہر کرنے کے لیے آئے ہیں کہ جب رسول کی موجودگی میں اور اُس کی زبان سے براہ راست سن کر تمھارا یہ حال ہے تو آگے کیا کرو گے؟

۴۳؎ قرآن کے ذوق آشنا سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اشارہ یہود کی طرف ہے۔

۴۴؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ انسان کا اصلی امتیازی وصف اُس کا سننا سمجھنا اور عقل و بصیرت سے کام لینا ہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اِس وصف سے محروم کر لے تو پھر وہ دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور ہی ہے، بلکہ بدترین جانور۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... بدترین اِس لیے کہ جانور خواہ کتنا ہی برا ہو، وہ اپنی جبلت پر قائم رہتا ہے اور اپنے محل میں اُس کی ایک قیمت اور اُس کی ایک افادیت ہے، لیکن انسان اپنی خصوصیت نوعی سے محروم

الانفال
۸

وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۳﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِيۡبُوۡا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاكُمۡ لِمَا يُحۡيِيۡكُمۡ ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوۡلُ بَيۡنَ الۡمَرۡءِ وَقَلۡبِهٖ وَاَنَّهٗۤ

اور اگر اِس کے بغیر سنوا دیتا تو یہ بے رخی کے ساتھ منہ پھیر جاتے۔[۴۶] ۲۰-۲۳

ایمان والو، اللہ اور اُس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہو، جب کہ رسول تمھیں اُس چیز کی طرف بلا رہا ہے جو تم کو زندگی بخشنے والی ہے[۴۷] اور جان رکھو کہ (ایک عرصے تک

الانفال ۸

ہو جائے تو اُس کے آگے شیطان بھی اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ یہ عقل و بصیرت سے کام لے تو جس طرح اِس کے عروج کی کوئی حد نہیں، اُسی طرح عقل و بصیرت سے محروم ہو جانے کی صورت میں اِس کی پستی کی بھی کوئی انتہا نہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/۴۵۷)

۴۵؎ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہی خدا کی سنت ہے۔ انسان کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی جو صلاحیت رکھی گئی ہے، اُسے زندہ رکھا جائے اور اُس سے کام لیا جائے تو خدا کی توفیق شامل حال ہو جاتی ہے اور انسان علم و عمل کے اعلیٰ درجات تک پہنچنے کے لیے ترقی کرتا رہتا ہے۔

۴۶؎ اِس لیے کہ وہ اُن کے اندر جڑ نہ پکڑ سکتی اور وہ اُس کو لازماً اگل دیتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...غذا کتنی ہی صالح ہو، لیکن معدہ فاسد ہو چکا ہو تو وہ اُس کو قبول نہیں کرتا۔ آدمی لقمہ حلق سے اتار تو لیتا ہے، لیکن بڑی جلدی قے کر دیتا ہے۔ ایک پودے کی صحیح نشو و نما کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذات سے تندرست ہو، بلکہ اِس کے لیے زمین کی زرخیزی بھی مطلوب ہوتی ہے۔ ایک مالی اگر ایک بنجر زمین میں عمدہ سے عمدہ پودا لگا دے تو لگانے کو تو وہ لگا دے گا اور چند روز وہ پودا اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل پر زندہ بھی رہے گا، لیکن جب زمین کے اندر سے اُس کے مزاج کے مطابق اُس کو مطلوب غذا نہیں ملے گی تو بالآخر وہ سوکھ جائے گا۔ ٹھیک یہی حال نیکی اور ہدایت کے بیج کا بھی ہے۔ یہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق نشو و نما صالح

اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ وَاتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۵﴾

مہلت دینے کے بعد) اللہ آدمی اور اُس کے دل کے درمیان حائل ہو جایا کرتا ہے[۴۸] اور یاد رکھو کہ (ایک دن) اُسی کی طرف سمیٹے جاؤ گے۔ اُس فتنے سے بچو جو خاص اُنھی لوگوں کو لاحق نہیں ہو گا جو تم میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں[۴۹] اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ۲۴-۲۵

فطرت کی زمین کے اندر پاتا ہے۔ اگر کسی شخص کی فطرت کی زمین شور ہو چکی ہو تو یہ بیج ڈالنے کو تو قدرت اُس کے اندر بھی ڈال سکتی ہے، لیکن قدرت ہی کا قانون یہ ہے کہ وہ اُس کے اندر نشو و نما نہ پا سکے۔" (تدبر قرآن ۳/۴۵۸)

۴۷؎ یعنی حقیقی اور جاوداں زندگی بخشنے والی ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اِسی کو قبول کرنے سے بصارت کو بصیرت نصیب ہوتی ہے۔ اِس سے عقل کو وہ نور حاصل ہوتا ہے جو آفاق و انفس کے اسرار و حقائق سے اُس کے لیے پردہ اٹھاتا ہے۔ اِسی سے دل کو وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جو اُس کو ایک مضغۂ گوشت سے تجلیات و انوار الٰہی کا ایک آئینہ بنا دیتی ہے۔

۴۸؎ خدا کے حائل ہو جانے سے مراد یہاں خدا کے قانون کا حائل ہو جانا ہے۔ یہ، اگر غور کیجیے تو بڑی سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جانتے بوجھتے رسول کی دعوت سے منہ موڑو گے تو ایک وقت ایسا آئے گا، جب لوٹنا بھی چاہو گے تو نہیں لوٹ سکو گے۔ اُس کے بعد خدا کا وہ قانون تمھارے اور اِس دعوت کے درمیان حائل ہو جائے گا جو ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ بار بار کی تنبیہ کے باوجود تم نے اپنے رویے کی اصلاح نہ کی تو اِس جرم کی پاداش میں تمھارے دلوں پر مہر کر دی جائے گی اور خدا ہمیشہ کے لیے تمھیں راہ ہدایت سے محروم کر دے گا۔

۴۹؎ دنیا میں خدا کا قانون یہی ہے کہ بعض اوقات ایک گروہ کے جرائم کی سزا پوری قوم کو بھگتنا

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٢٦﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٧﴾ وَاعْلَمُوْٓا

اُس وقت کو یاد کرو، جب تم تھوڑے تھے، زمین میں تمھیں بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے رہتے تھے کہ لوگ تمھیں اچک نہ لیں۔ پھر اللہ نے تمھیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے تمھاری تائید کی اور تمھاری روزی کے لیے تمھیں پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں تاکہ تم شکر گزار رہو[50]۔ ایمان والو، اللہ و رسول سے بے وفائی نہ کرو، (یہ امانت میں خیانت ہے) اور جانتے بوجھتے اپنی امانتوں میں خیانت کا ارتکاب نہ کرو[51] اور جان رکھو کہ

پڑتی ہے۔ یہ اُس سے متنبہ فرمایا ہے کہ اپنے رویے کی اصلاح کرلو، ورنہ اندیشہ ہے کہ اُس طرح کے کسی فتنے میں مبتلا ہو جاؤ گے جو پوری جماعت، بلکہ آیندہ نسلوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ اللہ کے دین میں اِسی بنا پر لوگوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی بھلائی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں۔ قرآن اِسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی کے تحت ہدایت فرمائی ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے دائرۂ اختیار میں لوگوں کو کسی برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھے تو اُسے چاہیے کہ ہاتھ سے اُس کا ازالہ کرے۔ پھر اگر اِس کی ہمت نہ ہو تو زبان سے، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے اُسے ناگوار سمجھے اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے*۔

۵۰؎ خدا اور رسول کی اطاعت کے اُسی مطالبے کو موکد کرنے کے لیے جس کا ذکر پیچھے ہوا ہے، یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات گنائے ہیں۔

* مسلم، رقم ۱۷۷۔

الانفال ۸

اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ

تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک آزمایش ہیں اور یہ بھی کہ اجر عظیم اللہ ہی کے پاس ہے۔[۵۲] ۲۶-۲۸

ایمان والو، اگر تم خدا سے ڈرتے رہے[۵۳] تو وہ تمھارے لیے فرقان نمایاں کرے

۵۱۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'۔ یہ پچھلے جملے پر عطف ہے، لیکن اِس میں حرف 'لا' کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ و رسول کی خیانت ہی ہے جو لوگوں کے لیے اپنی امانتوں اور ذمہ داریوں میں خیانت کی راہ کھولتی ہے۔ یہ آیت ٹھیک اُس حکم کے مقابل میں ہے جو آیت ۲۴ میں بیان ہوا ہے۔ وہاں جو بات مثبت اسلوب میں کہی گئی ہے، یہاں اُس کے ضد سے روکا گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اللہ و رسول سے اطاعت کا جو عہد باندھ چکے ہو، وہ ایک امانت ہے۔ اُس کی خلاف ورزی، خفیہ ہو یا علانیہ، ہر حال میں خیانت ہے۔ اِس خیانت سے بچو اور 'سمعنا و أطعنا' کا اقرار کر کے اللہ و رسول سے بے وفائی اور غداری نہ کرو۔ اللہ کا حکم یہی ہے کہ کسی امانت میں کبھی خیانت نہ کی جائے۔ 'جانتے بوجھتے' کی قید یہاں اُن لوگوں کی مذمت کے لیے ہے جن کی طرف اشارہ ہے۔ تاہم یہ اپنی جگہ ایک حقیقت بھی ہے کہ کوئی فعل خدا کے ہاں جرم اُسی وقت بنتا ہے، جب اُس کا ارتکاب یہ جانتے ہوئے کیا جائے کہ وہ غلط ہے۔

۵۲۔ یہ آخر میں اصل بیماری کا پتا دیا ہے کہ اِس رویے کا باعث درحقیقت مال و اولاد کی محبت ہے۔ یہ اگرچہ انسان کی فطرت ہے، لیکن جب اِس درجہ غالب آ جائے کہ اللہ و رسول سے بے وفائی یا دوسروں کے حقوق میں خیانت کا باعث بننے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ فتنہ بن گئی ہے۔ اِس موقع پر یاد کر لینا چاہیے کہ خدا کے ہاں اُنھی کے لیے اجر عظیم ہے جو مال و اولاد کی محبت میں خدا اور رسول سے بے وفائی نہیں کرتے۔

۵۳۔ یعنی اللہ و رسول سے بدعہدی کے مرتکب نہ ہوئے اور پیچھے جو ہدایات دی گئی ہیں، اُن

الانفال ۸

عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۲۹﴾ وَاِذۡ يَمۡكُرُ بِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِيُثۡبِتُوۡكَ اَوۡ يَقۡتُلُوۡكَ اَوۡ يُخۡرِجُوۡكَ‌ؕ وَيَمۡكُرُوۡنَ وَيَمۡكُرُ اللّٰهُ‌ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ ﴿۳۰﴾

گا[۵۴] اور تمھارے گناہ تم سے جھاڑ دے گا اور تمھاری مغفرت فرمائے گا۔[۵۵] حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑے فضل والا ہے۔ اُس وقت کو یاد رکھو، (اے پیغمبر)، جب منکرین تمھارے معاملے میں سازش کر رہے تھے کہ تمھیں قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا (ملک سے) نکال دیں۔[۵۶] وہ یہ سازش کر رہے تھے اور اللہ بھی اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر فرمانے والا ہے۔[۵۷] ۲۹-۳۰

پر خدا سے ڈرتے ہوئے عمل کرتے رہے۔

۵۴؎ فرقان اُس چیز کو کہتے ہیں جو حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دے۔ آگے آیت ۴۱ میں غزوۂ بدر کو اِسی بنا پر فرقان سے تعبیر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ عنقریب ایسے حالات پیدا کر دے گا جنھیں دیکھ کر اندھے بھی یقین کر لیں گے کہ آفتاب حق اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ طلوع ہو چکا ہے اور کسی تذبذب کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہی۔

۵۵؎ یعنی آگے تقویٰ پر مضبوطی سے جمے رہو گے تو اِس وقت اگر کوتاہیاں ہوئی بھی ہیں تو اللہ معاف کر دے گا اور تمھاری مغفرت فرمائے گا۔

۵۶؎ یہ دارالندوہ کی اُس مشاورت کی طرف اشارہ ہے جس میں قریش کے لیڈروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں آخری فیصلہ کرنے کے لیے مختلف تجویزیں پیش کی تھیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر قتل کی تجویز پر اتفاق ہو گیا تھا اور اِس کی تدبیر یہ سوچی گئی تھی کہ قریش کے تمام خاندان اِس میں شریک ہوں گے۔ یہاں یہ واقعہ اُس وعدۂ فرقان کو موکد کرنے کے لیے یاد دلایا گیا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اِس کی تفصیلات حدیث و سیرت کی کتابوں میں

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا

(یہ وہی لوگ ہیں کہ) جب اِن کو ہماری آیتیں سنائی جاتی تھیں تو کہتے تھے کہ ہم نے سن لیا ہے، اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا ہی کلام پیش کر دیں، یہ تو وہی اگلوں کی کہانیاں ہیں۔اور یاد کرو، جب اِنھوں نے کہا تھا کہ خدایا، اگر تیرے پاس سے یہی حق (نازل

الانفال
۸

دیکھ لی جاسکتی ہیں۔اِس میں سازش کا پہلو یہ تھا کہ جب سب خاندانوں کے لوگ مل کر قتل کا اقدام کریں گے تو آپ کا خون تمام قبیلوں پر تقسیم ہو جائے گا اور بنوعبد مناف کے لیے اِس کے نتیجے میں ممکن نہیں رہے گا کہ سب سے لڑسکیں، اِس لیے مجبوراً خون بہا قبول کر لینے کے لیے راضی ہو جائیں گے۔*

۵۷؎ مدعا یہ ہے کہ اُس پروردگار پر بھروسا رکھو جس نے قریش کے لیڈروں کی طرف سے اِس فیصلے کے بعد ایسی تدبیر فرمائی کہ پیغمبر اپنے خونی دشمنوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر صاف نکل گئے، راستے میں تعاقب کرنے والوں کو بھی منہ کی کھانی پڑی اور مسلمانوں کو وہ دارالہجرت بھی میسر ہو گیا جس نے جزیرہ نماے عرب میں اسلام کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا۔استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اسلام کے پودے کی نشوونما کے لیے سب سے زیادہ زرخیز اور مہرپرور سرزمین یثرب ہی کی سرزمین تھی جس کی طرف کفار نے خود اسلام کو دھکیل کر بھیجا۔خدا اپنی اسکیمیں اِسی طرح بروے کار لاتا ہے۔ دشمن سمجھتا ہے کہ بازی اُس نے جیتی، لیکن حقیقت میں داؤں خدا کا کامیاب ہوتا ہے۔ وہ حق کے دشمنوں ہی کے ہاتھوں جب چاہتا ہے، وہ کام کرا دیتا ہے جس میں حق کی فتح مندی اور خود دشمن کی موت مضمر ہوتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۴۶۷)

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/۱۰۷۔

بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۳۲﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ وَاَنۡتَ فِيۡهِمۡ‌ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمۡ وَهُمۡ يَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَمَا لَهُمۡ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمۡ يَصُدُّوۡنَ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ وَمَا كَانُوۡۤا اَوۡلِيَآءَهٗ‌ ؕ اِنۡ اَوۡلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الۡمُتَّقُوۡنَ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ

ہوا) ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ۔ اللہ (اُس وقت تو) اِن کو عذاب دینے والا نہیں تھا، جب کہ تم اِن کے درمیان موجود تھے اور نہ (اُس وقت) عذاب دینے والا ہو سکتا ہے، جب کہ یہ مغفرت چاہ رہے ہوں[۵۸]۔ لیکن اب اِن میں کیا ہے کہ اللہ انھیں عذاب نہ دے، جب کہ یہ مسجد حرام سے روک رہے ہیں[۵۹]، دراں حالیکہ یہ اُس کے جائز متولی بھی نہیں ہیں۔ اُس کے جائز متولی تو صرف خدا سے ڈرنے والے ہو سکتے ہیں[۶۰]۔ ہاں، مگر اِن میں سے اکثر اِس بات کو نہیں جانتے[۶۱]۔

۵۸؎ قریش کے لیڈروں کی طرف سے پیہم مطالبۂ عذاب کے باوجود اللہ نے اُنھیں ڈھیل کیوں دی؟ یہ اِس سوال کا جواب دیا ہے۔ فرمایا کہ عذاب کے معاملے میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب تک اصلاح کی دعوت قبول کر کے خدا سے مغفرت چاہنے والے قوم کے اندر سے نکلتے رہتے ہیں اور جب تک پیغمبر اُن کے درمیان موجود ہوتا ہے، اُنھیں چھوڑ کر نکل نہیں جاتا، اللہ اتمام حجت کے باوجود اُن پر وہ فیصلہ کن عذاب نازل نہیں کرتا جو رسولوں کی قوموں پر نازل کیا جاتا ہے اور جس کا مطالبہ قریش کر رہے تھے۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو یہ دعوت بھی ہے کہ یہ لوگ اگر اب بھی اپنی روش بدلنے کے لیے تیار ہو جائیں اور خدا سے معافی مانگ لیں تو اِس عذاب سے بچ سکتے ہیں۔

۵۹؎ مطلب یہ ہے کہ عذاب میں تاخیر سے یہ اِس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ یہ عذاب کے مستحق نہیں ہیں۔ اِن کے جرائم پہلے بھی کم نہیں تھے، لیکن اب تو یہ اِس سرکشی پر اتر آئے ہیں کہ اُن لوگوں کو جو خالص خدا کی عبادت کرنے والے اور اصل دین ابراہیمی کے علم بردار ہیں، اُس عبادت گاہ

میں آنے سے روک رہے ہیں جو خالص خدا ہی کی عبادت کے لیے اور ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے تعمیر کی گئی تھی۔

۶۰؎ بیت اللہ توحید کے مرکز کی حیثیت سے بنایا گیا تھا۔ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام اِس کے پہلے متولی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی منصب کی رعایت سے سیدنا ابراہیم کو لوگوں کا امام قرار دیا تھا۔ سورۂ بقرہ میں بیان ہوا ہے کہ یہ امامت اُنھیں عطا کی گئی تو اُنھوں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ کیا یہ منصب میری ذریت کو بھی حاصل رہے گا؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ 'لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ'، میرا یہ عہد تمھاری ذریت کے صالحین کے لیے ہے، اِس کا ظالموں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔* یہ اُسی کے حوالے سے فرمایا ہے کہ اِس گھر کی تولیت کا دعویٰ اِن مشرکوں کو زیب نہیں دیتا۔ اِس کے متولی تو وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ کی توحید پر قائم رہنے والے اور اُس کے عہد و میثاق کی پابندی کرنے والے ہوں۔ ملت ابراہیم سے انحراف اور بیت اللہ الحرام کو بتوں کی نجاست سے آلودہ کر دینے کے بعد اب یہ کسی لحاظ سے بھی اُس کے جائز متولی نہیں رہے۔

۶۱؎ یہ اُس عام جہالت اور بے خبری کی طرف اشارہ ہے جس میں بنی اسمٰعیل کی اکثریت اُس زمانے میں مبتلا تھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...ایک طویل مدت تک جاہلیت کی تاریکی میں زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ اپنی اصل تاریخ بالکل بھلا بیٹھے تھے۔ اُنھیں قومی تفاخر کے طور پر اتنی بات تو یاد رہی کہ وہ حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل کی اولاد ہیں، لیکن اِس سے آگے اُنھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ حضرت ابراہیم اِس سرزمین پر کیوں تشریف لائے، اُن کی دعوت کیا تھی، وہ جس ملت کے داعی ہوئے، اُس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں، حضرت اسمٰعیل کو اُنھوں نے یہاں کیوں بسایا، خانہ کعبہ کی تعمیر کس مقصد کے لیے ہوئی اور اِس گھر کے تعلق سے ذریت اسمٰعیل کو اللہ کے دین کی کیا کیا امانتیں اور کیا ذمہ داریاں سپرد ہوئیں؟ چند معاشرتی رسوم اور حج کے کچھ مناسک جو حضرت ابراہیم کے وقت سے چلے آرہے تھے، اُن میں بھی اتنی تبدیلیاں ہو گئی تھیں کہ اصلی اور ملاوٹ میں امتیاز

---

* ۲:۱۲۴۔

صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

(یہ اپنی نمازوں کے زعم میں نہ رہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ بیت اللہ کے سامنے اِن کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔[62] لو اب چکھو میرے عذاب کا مزہ، اُس کفر کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو۔[63] ۳۱-۳۵

مشکل ہو گیا تھا۔ خانہ کعبہ کو اُنھوں نے اپنا قومی معبد بنا لیا تھا جس کی کلید برداری اور اُس کے مختلف شعبوں کی سربراہی وراثت کے طور پر مختلف خاندانوں میں منتقل ہوتی رہتی۔ جن پر آبائی جاگیر کی طرح اُن کو فخر بھی ہوتا اور اِسی حیثیت سے وہ اُن پر متصرف بھی ہوتے۔ قرآن نے اُن کی اِسی جہالت کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے کہ یہ خانہ کعبہ کی تولیت کے مدعی تو ہیں، لیکن اِنھیں کچھ خبر نہیں کہ یہ خانہ کعبہ ہے کیا چیز اور اِس کی تولیت کے شرائط کیا ہیں؟'' (تدبر قرآن ۳/۴۷۱)

۶۲؎ نماز میں یہ خرافات غالباً اُن بتوں کی پرستش کرنے والوں سے آئے ہوں گے جو قریش نے سارے عرب پر اپنی مذہبی سیادت قائم کرنے کے لیے کعبے میں لا کر رکھ دیے تھے۔ قرآن نے نہایت بلاغت کے ساتھ اُن کی عبادت کی ظاہری ہیئت ہی سے نمایاں کر دیا ہے کہ اِس چیز کو انبیا علیہم السلام کے سکھائے ہوئے طریقۂ عبادت سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...دین کی ہر بات میں وقار، متانت، فروتنی، خشیت اور پاکیزگی کی جھلک اور معرفت، حکمت، دانش اور روحانیت کی مہک ہوتی ہے۔ جس کی آنکھوں میں کچھ بصیرت اور جس کی روحانی قوت شامہ میں ذرا بھی زندگی ہو تو وہ صرف دیکھ اور سونگھ ہی کر جان جاتا ہے کہ فلاں چیز دین کی نہیں ہے۔ علمی تحقیق و کاوش کا مرحلہ اِس کے بعد آتا ہے اور اِس کے وسائل و ذرائع الگ ہیں۔ یہاں قرآن نے یہی دکھایا ہے کہ یہ ان مدعیان تولیت کعبہ کی نماز ہے جس کی صورت ہی گواہی دیتی ہے کہ یہ شیطان کی ایجاد ہے۔ اِس میں اُس نماز کی ادنیٰ جھلک بھی نہیں ہے جس کے اہتمام و قیام کے لیے یہ یہاں بسائے گئے تھے اور جس کی خاطر خدا کا یہ گھر اِن کی تحویل میں

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ

الانفال
۸

جن لوگوں نے کفر کا یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے، وہ اپنے مال خدا کی راہ سے روکنے کے لیے خرچ کر رہے ہیں[۶۴]۔ سو وہ آگے بھی خرچ کرتے رہیں گے، پھر یہ اُن کے لیے حسرت بن جائے گا، پھر مغلوب ہوں گے اور جو اِسی طرح منکر رہیں گے، اُن سب کو جمع کر کے جہنم کی طرف ہانک دیا جائے گا[۶۵]۔ اِس لیے کہ (اپنی جنت کے لیے) اللہ پاک سے

دیا گیا تھا۔'' (تدبر قرآن ۴۷۲/۳)

[۶۳] یہ آخر میں قریش کو براہ راست خطاب کر کے واضح کر دیا ہے کہ جس عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے، اُس کی ابتدا ہو گئی ہے۔ پہلی قسط بدر میں وصول کر چکے ہو۔ استاذ امام کے الفاظ میں اب یکے بعد دیگرے چکھتے جاؤ اور گنتے جاؤ۔

[۶۴] اشارہ ہے قریش کے لیڈروں کی اُس فیاضی کی طرف جس کے ساتھ وہ اسلام کو مٹانے کے لیے اپنا مال خرچ کر رہے تھے۔ بدر کے موقع پر اُنھوں نے فی الواقع بڑی دریا دلی کے ساتھ فوج کی رسد اور سامان جنگ فراہم کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی تھی*۔ فرمایا کہ اُن کی یہ دریا دلی بھی خدا کے اُس فیصلے کو صادر ہونے سے نہیں روک سکے گی جو اُن کے جرائم کی وجہ سے اُن کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

[۶۵] یعنی دنیا میں مغلوب ہوں گے اور آخرت میں ہانک کر جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے۔ آیت میں 'یُحْشَرُوْنَ' کے ساتھ 'اِلٰی' کا صلہ ہے۔ ہانک کر لے جائے جانے کا مفہوم اُسی

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۱۸۹/۲۔

فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾
قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ
وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ

ناپاک کو الگ کرے اور ناپاک کو ایک دوسرے پر رکھ کر سب کا ڈھیر بنائے، پھر اِس ڈھیر کو جہنم میں جھونک دے[۶۶]۔ (حقیقت یہ ہے کہ) یہی لوگ نامراد ہونے والے ہیں۔ ۳۶-۳۷

اِن منکروں سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ اگر یہ باز آجائیں[۶۷] تو جو کچھ ہو چکا ہے، وہ اِنھیں معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر یہ پھر وہی کریں گے تو جان لیں کہ خدا کی سنت اگلوں

نے پیدا کر دیا ہے۔

۶۶؎ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ اُس فرقان کا بیان ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔ وہاں اللہ تعالیٰ سارے خبیث کو طیب سے بالکل الگ کر دے گا، پھر خبیث کو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ڈھیر کر دے گا، پھر اِس پورے ڈھیر کو جہنم میں جھونک دے گا۔ ’رَکْم‘ کے معنی کسی شے کو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ڈھیر کرنے کے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کو جلانا ہو تو اُس کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ سب کو جمع کر کے تہ بہ تہ ڈھیر کیا جاتا ہے، پھر اُس کو آگ دکھا دی جاتی ہے۔ تہ بہ تہ جمع کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آگ زیادہ مقدار میں ایندھن پا کر پورے زور سے بھڑکتی ہے اور جمع شدہ انبار کا ہر حصہ دوسرے حصے کو جلانے میں مددگار بن جاتا ہے۔ اِس میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل کفر جس طرح اِس دنیا میں تائید کفر میں ایک دوسرے کے پشت پناہ ہیں، اُسی طرح جہنم میں ایک دوسرے کو جلانے کے لیے باہم دگر ایندھن کا کام دیں گے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۴۷۴)

۶۷؎ یعنی کفر و شرک سے باز آجائیں اور رسول جو دعوت دے رہا ہے، اُس پر لبیک کہیں۔

حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٣٩﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا

کے معاملے میں گزر رہی چکی ہے[۶۸]۔ (ایمان والو) تم اِن سے برابر جنگ کیے جاؤ، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے[۶۹] اور دین (اِس سرزمین میں) سب اللہ کے لیے ہو جائے[۷۰]۔ سو

۶۸۔ یہ اُس سنت کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت رسولوں کے مخاطبین اگر اُن کی تکذیب پر جمے رہیں تو لازماً ہلاک کر دیے جاتے ہیں، خواہ وہ قہر الٰہی سے ہلاک ہوں یا اہل ایمان کی تلواروں سے۔

۶۹۔ یہ لفظ یہاں کسی کو ظلم و جبر کے ساتھ اُس کے مذہب سے برگشتہ کرنے یا مذہب پر عمل سے روکنے کی کوشش کے لیے آیا ہے۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں 'persecution' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۷۰۔ یہ اُس جنگ کی غایت ہے جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو دیا گیا تھا۔ آپ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد خدا کا فیصلہ یہی تھا کہ سرزمین حرم میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں پر قریش کے ظلم و جبر کا خاتمہ کر دیا جائے، بلکہ اِس سے آگے بڑھ کر اِس سرزمین کو منکرین سے اِس طرح پاک کر دیا جائے کہ یہاں اللہ کے دین، یعنی اسلام کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہ جائے۔* ظلم و جبر کے خلاف قتال کا حکم تو اب بھی موجود ہے، لیکن کسی سرزمین کو منکرین حق سے پاک کرنے یا اُنھیں زیردست بنا کر رکھنے کے لیے قتال اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔

* مسلمان اِس کے پابند ہیں کہ سرزمین حرم کی یہ حیثیت قیامت تک اِسی طرح برقرار رکھیں تا کہ توحید کا یہ مرکز باطل کی ہر آلودگی سے پاک رہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے سے یہ سرزمین اِسی مقصد کے لیے خاص کی گئی ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اِس میں نہ غیر اللہ کی عبادت کے لیے کوئی معبد تعمیر کیا جائے اور نہ کسی کافر و مشرک کو مستقل طور پر رہنے کی اجازت دی جائے۔

اَنَّ اللّٰہَ مَوۡلٰىکُمۡ ؕ نِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَ نِعۡمَ النَّصِیۡرُ ﴿۴۰﴾
وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوۡلِ

اگر یہ باز آ جائیں تو جو کچھ کریں گے، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔[1] اور اگر منہ موڑیں تو جان رکھو کہ اللہ تمھارا مولیٰ ہے۔ کیا ہی اچھا مولیٰ ہے اور کیا ہی اچھا مددگار! ۳۸-۴۰

(تم نے پوچھا تھا تو) جان لو[2] کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا تھا، اُس کا

اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے جو اِس دنیا میں ہمیشہ اُس کے براہ راست حکم اور اُنھی ہستیوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنھیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ اِس قانون کی رو سے اللہ کی حجت جب اِن رسولوں کے ذریعے سے کسی قوم پر پوری ہو جاتی ہے تو اِن کے منکرین پر اِسی دنیا میں عذاب آ جاتا ہے۔ یہ عذاب آسمان سے بھی آتا ہے اور بعض حالات میں اہل حق کی تلواروں کے ذریعے سے بھی۔ پھر اِس کے نتیجے میں منکرین لازماً مغلوب ہو جاتے ہیں اور اُن کی سرزمین پر حق کا غلبہ پوری قوت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہی دوسری صورت پیش آئی۔ چنانچہ آپ اور آپ کے صحابہ کو جس طرح فتنے کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا، اُسی طرح اِس مقصد کے لیے بھی تلوار اٹھانے کی ہدایت ہوئی۔ یہ خدا کا کام تھا جو انسانوں کے ہاتھ سے انجام پایا۔ اِسے ایک سنت الٰہی کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انسانی اخلاقیات سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۱۴ کے الفاظ 'یُعَذِّبۡھُمُ اللّٰہُ بِاَیۡدِیۡکُمۡ' (اللہ تمھارے ہاتھوں سے اُن کو سزا دے گا) میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔

[1] لہٰذا اُس کے لحاظ سے اِن کا اجر بھی اِنھیں عطا فرمائے گا۔

[2] اموال غنیمت سے متعلق چونکہ ناروا قسم کے سوالات اٹھا دیے گئے تھے، اِس لیے لوگوں کی کمزوریوں پر تبصرے کے بعد اب فیصلہ سنایا ہے تو آغاز اِس تنبیہی کلمے سے کیا ہے۔

وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی

پانچواں حصہ اللہ کے لیے، اُس کے پیغمبر کے لیے، (پیغمبر کے) اقربا اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا۔[73] (یہ اللہ کا حکم ہے، اِس کی بے چون و چرا تعمیل

۷۳۔ پیچھے بیان ہو چکا ہے کہ زمانۂ رسالت کی جنگوں پر اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ یہ سب اللہ ورسول کا ہے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ اِس کے باوجود یہ سارا مال نہیں، بلکہ اِس کا پانچواں حصہ ہی اجتماعی مقاصد کے لیے خاص رہے گا اور باقی ازراہ عنایت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہ تقسیم بھی صاف واضح ہے کہ صرف اِس وجہ سے کی گئی ہے کہ لوگوں نے جنگ بہر حال لڑی تھی۔ اُس کے لیے زادراہ کا بندوبست بھی کیا تھا اور اُس کی ضرورتوں کے لیے اسلحہ، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ بھی خود ہی مہیا کیے تھے۔ لہٰذا جب اِس طرح کے اموال مسلمانوں کو حاصل ہوئے جن کے لیے اُنھیں یہ اہتمام نہیں کرنا پڑا تو سورۂ حشر (۵۹) کی آیات ۶-۸ میں قرآن نے واضح کر دیا کہ یہ سب دین وملت کی ضرورتوں اور قوم کے غربا و مساکین کے لیے خاص کر دیا گیا ہے، اِس کا کوئی حصہ بھی مجاہدین میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ آیۂ زیر بحث میں اللہ تعالیٰ نے اِن اجتماعی مقاصد کی تفصیل کر دی ہے۔

سب سے پہلے اللہ کا حق بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ، ظاہر ہے کہ ہر چیز سے غنی اور بے نیاز ہے۔ اُس کے نام کا حصہ اُس کے دین ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ لہٰذا اِس کا اصلی مصرف وہ کام ہوں گے جو دین کی نصرت اور حفاظت و مدافعت کے لیے مسلمانوں کا نظم اجتماعی اپنی دینی ذمہ داری کی حیثیت سے انجام دیتا ہے۔

دوسرا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا گیا ہے۔ آپ کی شخصیت میں اُس وقت نبوت و رسالت کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کے سربراہ کی ذمہ داری بھی جمع ہو گئی تھی اور آپ کے

الانفال
۸

الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾

کرو)، اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اُس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتاری تھی،[۶۴] جس دن دونوں گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی تھی، اور (جان رکھو کہ) اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۶۵] ۴۱

اوقات کا لمحہ لمحہ اپنے یہ منصبی فرائض انجام دینے میں صرف ہو رہا تھا۔ اِس ذمہ داری کے ساتھ اپنی معاش کے لیے کوئی کام کرنا آپ کے لیے ممکن نہ تھا۔ اِس صورت حال میں ضروری تھا کہ اِس مال میں آپ کا حق بھی رکھا جائے۔ اِس کی نوعیت کسی ذاتی ملکیت کی نہیں تھی کہ اِسے آپ کے وارثوں میں تقسیم کیا جاتا۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہ آپ سے آپ اُن کاموں کی طرف منتقل ہو گیا جو آپ کی نیابت میں مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے لیے انجام دینا ضروری تھے۔

تیسرا حق 'ذی القربیٰ' کا بیان کیا گیا ہے۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ آپ کے وہ قرابت دار مراد ہیں جن کی کفالت آپ کے ذمے تھی اور جن کی ضرورتیں پوری کرنا اخلاقی لحاظ سے آپ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ آپ کی حیثیت تمام مسلمانوں کے باپ کی تھی۔ چنانچہ آپ کے بعد یہ ذمہ داری عرفاً و شرعاً مسلمانوں کے نظم اجتماعی کو منتقل ہوئی اور ذی القربیٰ کا حق بھی، جب تک وہ دنیا میں رہے، اِسی طرح قائم رہا۔

چوتھا حق یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے۔ اُن کا حق بیان کرتے ہوئے 'اُس لِ' کا اعادہ نہیں فرمایا جو اوپر اللہ، رسول اور ذی القربیٰ، تینوں کے ساتھ آیا ہے، بلکہ اُن کا ذکر ذی القربیٰ کے ذیل ہی میں کر دیا ہے۔ اِس سے مقصود اِس طبقے کی عزت افزائی ہے کہ گویا یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا ہی کے تحت ہیں۔ یہ حق کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ ہر وہ معاشرہ جو اِن طبقات کی ضرورتوں کے لیے حساس نہیں ہے، جس میں یتیم دھکے کھاتے، مسکین بھوکے سوتے اور مسافر اپنے لیے کوئی پرسان حال نہیں پاتے، اُسے اسلامی معاشرے کا پاکیزہ نام نہیں دیا جا سکتا۔

إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن

یاد کرو، جب تم وادی کے قریبی کنارے[6] پر تھے اور وہ دور کے کنارے پر، اور قافلہ تم سے نیچے تھا۔ اگر تم باہم وقت ٹھیرا کر نکلتے تو جو وقت ٹھیراتے، اُس میں لازماً آگے پیچھے ہو جاتے۔[7] لیکن اللہ نے کوئی فرق نہیں ہونے دیا، اِس لیے کہ اللہ اُس معاملے کا

۴؎ یعنی وہ تائید و نصرت جو بدر کے مواقع پر نازل کی گئی۔ فیصلے کے دن سے مراد غزوۂ بدر کا دن ہے۔ اُس کو فیصلے کے دن سے تعبیر کرنے کی وجہ پیچھے بیان ہو چکی ہے۔

۵؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ روے سخن اُنھی نکتہ چینوں کی طرف ہے جنھوں نے اموال غنیمت سے متعلق سوالات اٹھائے تھے۔ اِس جملے میں ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... یوں نہیں فرمایا کہ اگر تم اُس نصرت الٰہی پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے تم پر اتاری، بلکہ یوں فرمایا کہ 'اپنے بندے پر اتاری'، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ کسی گروہ کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ کامیابی جو حاصل ہوئی ہے، یہ اُس کا کارنامہ ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے، اللہ کی کارسازی اور اُس رسول کی برکت سے ہوا ہے جس کی مدد کے لیے اللہ نے اپنی غیبی فوج بھیجی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ نہ اللہ کسی کا محتاج ہے اور نہ اُس کا رسول کسی کا دست نگر ہے۔ اللہ جب چاہے گا، اپنے رسول کی مدد کے لیے اپنی افواج قاہرہ بھیج دے گا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۴۸۳)

۶؎ یعنی اُس کنارے پر جو مدینے سے قریب تھا۔

۷؎ مطلب یہ ہے کہ اگر تم دونوں فریق اپنے طور پر یہ طے کر کے نکلتے کہ ایک کو قافلے کی حفاظت کا بہانہ بنا کر حملہ کرنا ہے اور دوسرے کو اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر حملہ آور کو سبق سکھانا اور اُس پر اپنی دھاک بٹھا دینی ہے تو کبھی اِس طرح نہ پہنچ سکتے کہ قافلہ ابھی مسلمانوں کی زد میں ہوتا اور دونوں لشکر آمنے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ قریش کے دل بادل لشکر کے

لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۵ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ

فیصلہ کردے جس کو ہو کر رہنا تھا تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہے، وہ حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے، وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے[۸]۔ اور اِس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ اللہ سمیع و علیم ہے[۹]۔ یاد کرو، (اے پیغمبر)، جب اللہ تمھارے خواب میں اُن کو

الانفال ۸

پہنچنے سے پہلے ہی قافلہ بہ حفاظت نکل چکا ہوتا اور اُن کے لیے حملے کا کوئی جواز باقی نہ رہتا۔ چنانچہ اُن کے اندر کے لوگ ہی اصرار کرتے کہ ہم جس اندیشے سے نکلے تھے، وہ غلط ثابت ہوا، اب حملہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور وہ مجبور ہو جاتے کہ سب تیاریوں کے باوجود جنگ کیے بغیر ہی مکہ لوٹ جائیں۔

۸ے آیت میں 'هَلَكَ' اور 'حَيَّ' کے ساتھ 'عَنْ' آیا ہے۔ یہ منبع و مصدر کے مفہوم پر دلالت کے لیے ہے۔ عربی زبان میں یہ اِس مفہوم کے لیے بھی آتا ہے۔ ہلاکت اور زندگی سے مراد روحانی و معنوی ہلاکت اور زندگی ہے اور حجت یا 'بَيِّنَة' سے اُس فرقان کی طرف اشارہ مقصود ہے جو غزوۂ بدر کے موقع پر ظاہر ہوا اور جس نے حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ہر سلیم الطبع انسان پر واضح کر دیا۔

۹ے صفات الٰہی کا یہ حوالہ اُس پوری اسکیم کے تعلق سے آیا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...مطلب یہ ہے کہ کہاں تم، کہاں قریش اور کہاں قافلہ، لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کے بھید معلوم کر لیے، سب کی سرگوشیاں سن لیں اور سب کے ارادے تاڑ لیے اور پھر سب کو اِس طرح جمع کر کے وہ بات پوری کر کے دکھا دی جو اُس نے طے کر لی تھی، اِس لیے کہ وہ سمیع و علیم

وَلَتَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ سَلَّمَ ؕ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۴۳﴾ وَاِذۡ یُرِیۡکُمُوۡہُمۡ اِذِ الۡتَقَیۡتُمۡ فِیۡۤ اَعۡیُنِکُمۡ قَلِیۡلًا وَّ یُقَلِّلُکُمۡ فِیۡۤ اَعۡیُنِہِمۡ لِیَقۡضِیَ اللّٰہُ اَمۡرًا کَانَ مَفۡعُوۡلًا ؕ وَاِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۴۴﴾

الانفال ۸

تھوڑا دکھا رہا تھا۔[80] اگر وہ کہیں تم کو اُنھیں زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور جو معاملہ درپیش تھا، اُس کے بارے میں جھگڑنے لگتے،[81] مگر اللہ نے بچا لیا۔[82] یقیناً، وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ اور یاد کرو، جب تمھاری مڈبھیڑ کے وقت وہ تم لوگوں کی نگاہوں میں اُنھیں کم کر کے دکھا رہا تھا اور تمھیں اُن کی نگاہوں میں کم کر کے دکھا رہا تھا تاکہ اللہ اُس معاملے کا فیصلہ کر دے جس کو ہو کر رہنا تھا۔[83] حقیقت یہ ہے کہ تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔ ۴۲-۴۴

ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۴۸۴)

۸۰؎ رویا میں چیزیں بعض اوقات اُن کی معنوی حقیقت کے اعتبار سے دکھائی جاتی ہیں۔ اِس موقع پر بھی یہی ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کا لشکر انتہائی کم تعداد میں نظر آیا۔ یہ اُن کی معنوی قلت تھی جو قلت تعداد کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

۸۱؎ یہ اُسی گروہ سے کہا ہے جس کا ذکر سورہ کی ابتدا سے چلا آ رہا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اگر قریش کے لوگ کثیر تعداد میں دکھا دیے جاتے، جتنے کہ وہ فی الواقع تھے تو حضور بھی اُن کا ذکر اُسی صورت میں کرتے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ جو کمزور مسلمان اتنی قلیل تعداد کا سن کر بھی آمادۂ جنگ نہیں ہو رہے تھے، وہ بالکل ہی ہمت ہار بیٹھتے اور ایسا اختلاف پیدا ہو جاتا کہ جنگ کے لیے نکلنا ہی ممکن نہ رہتا۔

۸۲؎ یعنی کمزوری کے اظہار سے بچا لیا اور کمزور مسلمان بھی کچھ بحث وتمحیص کے بعد مقابلے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِيۡتُمۡ فِئَةً فَاثۡبُتُوۡا وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۚ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ وَاصۡبِرُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ۚ ﴿۴۶﴾

ایمان والو، جب (آیندہ بھی) کسی گروہ سے تمھارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو[۸۴] تاکہ تم کامیاب ہو[۸۵]۔ اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو[۸۶] اور آپس میں جھگڑو نہیں کہ اِس کے نتیجے میں ہمت ہار جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ثابت قدم رہو، اِس لیے کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو ثابت قدم رہنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

الانفال ۸

۸۳۔ یعنی اِس لیے کم کرکے دکھا رہا تھا کہ ایک دوسرے کو اِس طرح دیکھ کر کوئی فریق بھی خوف نہ کھائے اور وہ فرقان ظاہر ہو جائے جس کا ظہور خدا کی اسکیم میں طے ہو چکا تھا۔

۸۴۔ اللہ کا ذکر ثابت قدمی کا ذریعہ ہے اور ثابت قدمی اِس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی نصرت اِس کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ یہاں بہت ذکر کرنے کے لیے کہا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ حالات زیادہ صبر آزما ہوں تو ذکر بھی زیادہ مقدار میں مطلوب ہوگا۔

۸۵۔ اصل الفاظ ہیں: 'لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ'۔ قرآن کی تعبیرات میں 'فَلَاح' ایک جامع لفظ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہ دنیا اور آخرت، دونوں کی کامیابی پر مشتمل ہے۔ مجرد غلبہ تو ہو سکتا ہے کہ بغیر ذکر الٰہی کے بھی حاصل ہو جائے، لیکن وہ فلاح کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ فلاح اُسی غلبے سے حاصل ہوگی جس کا دروازہ ذکر الٰہی کی مدد سے کھلے اور جس میں غلبہ حاصل کرنے والوں کو خدا کی معیت حاصل ہو۔" (تدبر قرآن ۳/ ۴۸۷)

۸۶۔ اللہ و رسول کی اطاعت کا یہ خاص مفہوم بھی یہاں پیش نظر ہے کہ دشمن کے مقابلے میں

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ

والے ہوں۔[۸۷] تم اُن لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے[۸۸] اور جن کا رویہ یہ ہے کہ خدا کی راہ سے روکتے ہیں، دراں حالیکہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ اُس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یاد کرو، جب شیطان نے اُن کے اعمال اُنھیں خوش نما بنا کر دکھائے اور کہا کہ آج لوگوں میں کوئی

پورے نظم اور ڈسپلن کے ساتھ اللہ و رسول کے احکام کی پیروی کی جائے، اِس لیے کہ ذکر الٰہی سے محرومی جس طرح دل و دماغ کو منتشر کر دیتی ہے، ڈسپلن کی کم زوری اُسی طرح جماعت کے نظم کو درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔

۸۷۔ یہی بات اوپر افراد کو پیش نظر رکھ کر ارشاد ہوئی تھی۔ یہاں یہ جماعت کو پیش نظر رکھ کر کہی گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ خدا کی مدد و نصرت اور اُس کی معیت کے طالب ہو تو اپنے جماعتی کردار سے اُس کا استحقاق پیدا کرو۔ خدا منتشر بھیڑ کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ اُن لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو اُس کی راہ میں جہاد کے لیے بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہوں۔“ (تدبر قرآن ۳/۴۸۸)

۸۸۔ یہ اُس طمطراق اور جذبۂ نمایش کا ذکر ہے جس کا مظاہرہ قریش کے لیڈروں نے جنگ بدر کے لیے نکلتے ہوئے کیا تھا۔ مسلمانوں کو اِس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ طنطنہ، طمطراق اور ریا کسی بندۂ مومن کے شایان شان نہیں ہے۔ رزم ہو یا بزم، خدا کے بندوں پر عبدیت کی تواضع اور فروتنی ہر حال میں نمایاں رہنی چاہیے، اِس لیے کہ اُن کی جنگ محض جنگ نہیں، بلکہ اللہ کی عبادت ہے اور ضروری ہے کہ اُس کی یہ شان ہر جگہ قائم رہے۔ اُنھیں جو کچھ کرنا ہے، ہمیشہ اللہ کے لیے کرنا ہے

مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْۤ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ

نہیں جو تم پر غلبہ پا سکے اور (مطمئن رہو)، میں تمھارے ساتھ ہوں۔ مگر جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ الٹے پاؤں چلتا بنا اور کہنے لگا کہ میں تم سے بری ہوں، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو، میں اللہ سے ڈرتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے[۸۹]۔ یاد کرو، جب منافقین اور وہ بھی جن

الانفال ۸

اور اُس کی داد بھی آخرت میں اُسی سے لینی ہے۔ یہ اخلاص اُن سے جس طرح عبادت میں مطلوب ہے، اُسی طرح جنگ میں بھی مطلوب ہے۔

۸۹؎ شیطان نے یہ باتیں، ظاہر ہے کہ خود سامنے آکر نہیں کہیں، بلکہ اپنے طریقے کے مطابق انسانوں میں سے اپنے پیرووں سے کہلائیں۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ اِس طرح کے موقعوں پر اُس کی یہ خدمت مدینہ کے یہود انجام دیتے رہے۔ قرین قیاس ہے کہ اِس موقع پر بھی شیطان کی انگیخت سے اُنھی نے پہلے قریش کو بڑھاوے دیے ہوں گے کہ شاباش، آگے بڑھو، آج کس میں دم ہے کہ تمھارا مقابلہ کر سکے، مگر وقت آنے پر پیچھے ہٹ گئے ہوں گے کہ مبادا وہ بھی خدا کے عذاب کی گرفت میں آجائیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہی پیغمبر ہیں جن کے آنے کی پیشین گوئی اُن کے صحیفوں میں کی گئی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ آپ کو اِس طرح پہچانتے تھے، جس طرح کوئی مہجور باپ اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی قوم سے باہر کسی نبوت و رسالت کو وہ کسی قیمت پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، لہٰذا چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا یہ خطرہ مول لے اور اُنھیں اُس آزمایش سے نجات دلا دے جس میں وہ آپ کی بعثت کے بعد مبتلا ہو گئے تھے۔ دونوں لشکروں کو

وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾
وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰۗىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾

الانفال
۸

کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے، (خود تمھارے متعلق) کہہ رہے تھے کہ اِن کے دین نے اِن لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے[۹۰]، دراں حالیکہ جو اللہ پر بھروسا رکھتے ہیں، اللہ ضرور اُن کی مدد کرتا ہے، اِس لیے کہ اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۴۵-۴۹

اگر تم دیکھ پاتے (تو دیکھتے کہ اُس وقت کیا گزر رہی تھی)، جب فرشتے اِن منکروں کی روحیں قبض کر رہے تھے، اِن کے چہروں اور اِن کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ اب چکھو جلنے کا عذاب۔ یہ اُس کا بدلہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیجا تھا اور اِس لیے ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے[۹۱]۔ ۵۰-۵۱

آمنے سامنے دیکھ کر شیطان نے جو کچھ کہا ہے، اُس کا ظہور بھی یہود کے رویے میں ہوا، جب کہ قریش کی پیٹھ ٹھونکنے کے باوجود وہ اُن کا ساتھ دینے کے لیے کھلم کھلا میدان میں نہیں اترے۔ قرآن نے یہاں اشارے کنایے میں اُن کو بھی متنبہ کر دیا ہے اور مسلمانوں کو بھی بتا دیا ہے کہ جو کچھ سامنے دیکھتے ہو، اُس کے پیچھے کون کون چھپا ہوا ہے۔

۹۰ یعنی ہوش و خرد سے عاری کر کے اِس خبط میں مبتلا کر دیا ہے کہ ممولے ہو کر بھی شہبازوں سے لڑ سکتے اور چیونٹی ہو کر بھی پہاڑوں سے ٹکرا سکتے ہو۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ

الانفال ۸

اِن کے ساتھ وہی معاملہ ہوا ہے جو آل فرعون اور اُن سے پہلے کے لوگوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اُنھوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کر دیا تو اللہ نے اُن کے گناہوں پر اُنھیں پکڑ لیا[۹۲]۔ بے شک، اللہ قوی ہے، وہ سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اللہ کسی نعمت کو جو اُس نے کسی قوم کو عطا کی ہو، اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنی حالت میں تبدیلی نہ کریں۔ نیز اِس وجہ سے کہ اللہ سمیع و علیم ہے[۹۳]۔ وہی ہوا

۹۱ چنانچہ ٹھیک وہی معاملہ کر رہا ہے جس کے تم اپنے کرتوتوں کے نتیجے میں مستحق ہو چکے ہو۔ آیت میں 'اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ' کے الفاظ ہیں۔ اِن میں مبالغہ پر جو نفی آئی ہے، وہ مبالغہ فی النفی کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقامات میں 'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ'* (بے شک، اللہ ذرے کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا) اور 'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا'** (بے شک، اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اِس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید اور کلام عرب، دونوں میں موجود ہیں۔

۹۲ اشارہ ہے اُن سزاؤں کی طرف جو پے در پے اُن پر نازل ہوئیں تاکہ وہ متنبہ ہوں اور پیغمبر کی بات سننے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ بدر کے موقع پر قریش کو جو کچھ پیش آیا، اُس کی نوعیت بھی یہی تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اِن کے ساتھ وہی معاملہ ہوا ہے جو فرعون والوں اور اُن سے پہلے

* النساء ۴: ۴۰۔

** یونس ۱۰: ۴۴۔

وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

ہے جو آلِ فرعون اور اُن سے پہلے کے لوگوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کو جھٹلایا تو بالآخر اُن کے گناہوں کی پاداش میں ہم نے اُنھیں ہلاک کیا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا۔[۹۴] یہ سب ظالم لوگ تھے۔ ۵۲-۵۴

کے لوگوں کو پیش آیا تھا۔

۹۳ مطلب یہ ہے کہ خدا کا عذاب اندھے کی لاٹھی نہیں ہے۔ وہ تمام تر خدا کے سمع و علم پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی قوم کو سرفرازی کے لیے منتخب کر لینے کے بعد وہ جب اُسے تباہی کے حوالے کرتا ہے تو اُس کے کرتوتوں کی بنیاد پر کرتا ہے۔ قوموں کے عزل و نصب سے متعلق یہ خدا کی غیر متبدل سنت ہے۔ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۵۸ میں فرمایا ہے کہ خدا یہ معاملہ دنیا کی ہر قوم کے ساتھ کر رہا ہے اور قیامت تک کرتا رہے گا۔ رسولوں کی بعثت کے بعد، البتہ یہ بالکل مشہود ہو جاتا ہے۔ اُن کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود جب کوئی قوم آیات الٰہی کو جھٹلا دیتی ہے تو یہ اِس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ آخری درجے میں بگڑ چکی ہے، لہٰذا اِسی درجے میں ہلاکت اور تباہی کے حوالے کر دی جاتی ہے۔

۹۴ یعنی تنبیہات سے آگے اب وہ نوبت بھی آ گئی ہے جو پہلی قوموں کے معاملے میں آتی رہی ہے کہ وہ خدا کی کھلی ہوئی نشانیوں کو بھی جھٹلا دیتی تھیں۔ بدر میں خدا کے فرقان کو دیکھ لینے کے بعد قریش نے یہی کیا ہے، اِس لیے اب اِس کا نتیجہ بھی بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ فرعون اور اُس کے لشکروں کے لیے اِس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ خدا نے اُنھیں غرق کر دیا تھا۔

اِس تشریح سے واضح ہے کہ 'كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ' کے الفاظ اِن آیتوں میں اگرچہ دو مرتبہ آئے ہیں، مگر یہ تکرار کے لیے نہیں آئے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ الَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ

يقيناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ لوگ ہیں جنھوں نے انکار کر دیا ہے، پھر کسی طرح ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔[۹۵] خاص کر وہ لوگ جن سے، (اے پیغمبر)، تم نے عہد لیا، پھر ہر مرتبہ وہ اپنا عہد توڑ دیتے ہیں اور ذرا نہیں ڈرتے (کہ اِس کا نتیجہ کیا ہوگا)۔[۹۶] سو اُنھیں لڑائی میں پاؤ تو اِن کو ایسی مار مارو کہ جو اِن کے پیچھے ہیں،[۹۷] اُن کو بھی تتر بتر کر دو تاکہ وہ

”... یہ تکرار نہیں ہے، بلکہ دونوں جگہ دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلے یہ بتایا کہ یہ اُسی نوع کی تنبیہ ہے جس نوع کی تنبیہ فرعون اور دوسری قوموں کو کی گئی۔ پھر یہ بتایا کہ اگر اِس تنبیہ سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو بالآخر اِن پر بھی اُسی طرح فیصلہ کن عذاب آجائے گا، جس طرح اُن قوموں پر آیا۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۴۹۷)

۹۵ اِس لیے کہ انسان اُسی وقت تک انسان ہے، جب تک وہ سوچنے سمجھنے اور علم و عقل کی روشنی میں فیصلے کرنے کی صلاحیت سے بہرہ یاب ہے۔ یہ صلاحیت ختم ہو جائے تو اُس میں اور جانوروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ آیت میں 'شَرَّ الدَّوَآبِّ' کے الفاظ آئے ہیں، اِن میں جو زور اور شدت ہے، اُس کی وضاحت پیچھے آیت ۲۲ کے تحت ہو چکی ہے۔

۹۶ یہ اشارہ یہود اور بعض دوسرے قبائل کی طرف ہے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمانے کے بعد حسن جوار اور باہمی تعاون اور مددگاری کے معاہدے کر لیے تھے۔ لیکن جس طرح کے حالات کے لیے یہ معاہدے کیے گئے تھے، وہ جب پیش آتے تو یہ کبھی اُن کی پاس داری نہیں کرتے تھے، بلکہ ہمیشہ اُنھیں توڑ دیتے تھے۔

اِلَیۡهِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡخَآئِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾
وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَبَقُوۡا ؕ اِنَّهُمۡ لَا یُعۡجِزُوۡنَ ﴿۵۹﴾
وَ اَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّ مِنۡ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ

سبق حاصل کریں۔ (تم لوگ، البتہ ہر حال میں عہد کی پابندی کرو) اور اگر کسی قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو اُن کا عہد اُسی طرح برابری کے ساتھ[98] اُن کے آگے پھینک دو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا[99]۔ ۵۵-۵۸

یہ منکرین اِس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ نکل بھاگے ہیں، یہ ہرگز ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکتے[100]۔ تم لوگوں سے جس قدر ہو سکے، اِن کے لیے فوج[101] اور بندھے ہوئے گھوڑے[102] تیار

۹۷؎ یعنی لڑائی کے لیے ابھی سامنے نہیں آئے، مگر پیچھے بیٹھے ہوئے پر تول رہے ہیں۔

۹۸؎ اصل میں 'عَلٰی سَوَآءٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...'عَلٰی سَوَآءٍ' کا مفہوم یہ ہے کہ اُنھی کے برابر اقدام تم بھی کرنے کے مجاز ہو۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دینا چاہیے، بلکہ جواب ہم وزن ہونا چاہیے۔ بعض لوگوں نے اِس سے یہ لازم قرار دیا ہے کہ ختم معاہدہ کی اطلاع فریق ثانی کو دے دینی چاہیے۔ اُن کی اِس بات کی کوئی دلیل اِن الفاظ میں مجھے نظر نہیں آتی۔ البتہ، یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ محض فرضی اندیشہ کسی معاہدے کو کالعدم قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ عملاً اُس کی خلاف ورزی کا اظہار ہوا ہو۔ اول تو یہاں 'تَخَافَنَّ' کا جو فعل استعمال ہوا ہے، اُس میں خود تاکید ہے۔ دوسرے 'عَلٰی سَوَآءٍ' کی قید بھی اِن کو نمایاں کر رہی ہے۔''

(تدبر قرآن ۳/۴۹۹)

۹۹؎ یعنی جب اللہ پسند نہیں کرتا تو اہل ایمان کو بھی پسند نہیں کرنا چاہیے۔

بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ

رکھو جس سے اللہ کے دشمنوں پر اور تمھارے اِن دشمنوں پر تمھاری ہیبت رہے اور اِن کے علاوہ دوسروں پر بھی جنھیں تم نہیں جانتے ہو، اللہ اُنھیں جانتا ہے[103]۔ (اِس مقصد کے لیے) جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے، وہ تمھیں پورا کر دیا جائے گا[104] اور

۱۰۰۔ اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ'۔ یہ اُسی مفہوم میں ہے جس میں 'أعجزه الصيد' کا جملہ بولا جاتا ہے، یعنی 'فاته ولم يقدر عليه'۔

۱۰۱۔ اصل میں لفظ قوت آیا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ عددی قوت کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمھارے پاس مجاہدین کی ایک منظّم فوج ہر وقت تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقت ضرورت اِن منکرین حق کے خلاف کارروائی کی جا سکے۔ یہ نہ ہو کہ جب کسی جنگی مہم کی صورت پیش آئے تو رضا کاروں کو اکٹھا کرنا شروع کر دو۔ اپنی استطاعت کے مطابق یہ فوجی قوت اب تمھیں تیار رکھنی چاہیے اور زیادہ سے زیادہ بڑھا لینی چاہیے۔

۱۰۲۔ یعنی وہ گھوڑے جنھیں تربیت دے کر خاص اِسی مقصد کے لیے تیار رکھا گیا ہو۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اُس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں کو وہی اہمیت حاصل تھی جو اِس زمانے میں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کو حاصل ہے۔

۱۰۳۔ یہ اُن قوتوں کی طرف اشارہ ہے جو ابھی سامنے نہیں آئی تھیں، لیکن اللہ کو معلوم تھا کہ جلد یا بدیر کسی نہ کسی صورت میں سامنے آ جائیں گی۔ مثلاً یہود اور منافقین، نیز وہ قبائل جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر جانب داری کے معاہدے کر رکھے تھے، پھر رومی، غسانی اور ایرانی۔ یہ بھی متنبہ ہو چکے تھے اور سرزمین عرب میں جو کچھ ہو رہا تھا، اُسے تشویش کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

۱۰۴۔ یعنی اُسی اصول کے مطابق پورا کر دیا جائے گا جو نیکیوں کے اجر کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھا ہے۔

وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ وَ اِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ وَ اَلَّفَ بَيْنَ

تمھارے لیے کوئی کمی نہ ہوگی۔ ۵۹-۶۰

یہ لوگ اگر صلح کی طرف جھکیں، (اے پیغمبر)، تو تم بھی اِس کے لیے جھک جاؤ[۱۰۵] اور اللہ پر بھروسا رکھو۔ بے شک، وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اگر وہ تم کو دھوکا بھی دینا چاہیں گے تو مطمئن رہو کہ اللہ تمھارے لیے کافی ہے[۱۰۶]۔ وہی ہے جس نے اپنی مدد سے اور ایمان والوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی اور ایمان والوں کے دل ایک

۱۰۵؎ سورۂ توبہ میں منکرین حق کے استیصال کا آخری حکم آنے سے پہلے یہی ہدایت تھی کہ قریش اگر جنگ کرنا چاہیں تو اُن کے ساتھ جنگ اُس وقت تک جاری رکھی جائے، جب تک سرزمین عرب میں دین سب اللہ کے لیے نہ ہو جائے، لیکن وہ صلح کے خواہاں ہوں تو اُن سے صلح کر لی جائے تاکہ یہی مقصد امن کے ماحول میں اور دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے حاصل کیا جا سکے۔ صلح حدیبیہ کا معاہدہ اِسی ہدایت کے تحت کیا گیا تھا۔ قریش جب اِس معاہدے پر قائم نہیں رہے تو اِس کے بعد، البتہ حکم دے دیا گیا کہ اب اِن سے ایمان کے سوا کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔ یہ ہدایات اگرچہ خاص اُن لوگوں کے لیے تھیں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اتمام حجت کیا گیا تھا، لیکن اِن سے یہ رہنمائی بعد کے زمانوں کے لیے بھی یقیناً حاصل ہوتی ہے کہ جنگ کا مقصد اگر صلح سے حاصل ہو سکتا ہو تو صلح کو ترجیح دینی چاہیے اور محض اِس اندیشے سے صلح کی پیش کش ٹھکرانی نہیں چاہیے کہ دشمن نیک نیتی سے صلح نہیں کرنا چاہتا، بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔

۱۰۶؎ اِس اجمال میں جو کچھ مضمر ہے، قلم اُس کی تعبیر سے قاصر ہے۔

قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیۡنَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۶۳﴾
یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسۡبُکَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۴﴾

دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے۔ اگر تم زمین میں جو کچھ ہے، سب خرچ کر ڈالتے، تب بھی اُن کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے، مگر اللہ نے اُنھیں جوڑ دیا[۱۰۷]۔ یقیناً اللہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ ۶۱-۶۳

اے پیغمبر، تمھارے لیے اللہ کافی ہے اور یہی مومنین کافی ہیں جنھوں نے تمھاری

۱۰۷؎ اوپر فرمایا ہے کہ اللہ نے مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی۔ یہ اُس کی وضاحت ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی، بلکہ خاص تائید الٰہی کا کرشمہ تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...کسی شیطانی مقصد کے لیے کسی بھیڑ کا اکٹھا کر لینا تو مشکل نہیں ہوتا، ہر نعرہ باز یہ کام کر سکتا ہے، لیکن خاص اللہ کے کام کے لیے جس میں خدا کی خوشنودی اور آخرت کی طلب کے سوا کسی بھی دوسری چیز کا کوئی ادنیٰ شائبہ نہ ہو، کلمۂ حق کے جاں نثاروں کی ایک جمعیت کا فراہم ہو جانا بغیر اِس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تائید کی اور اُس کی توفیق بخشی نے رہنمائی فرمائی۔ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمع ہوئے تھے، اپنی یہ نئی زندگی اختیار کرنے سے پہلے، دور جاہلیت کی تمام برائیوں میں آلودہ تھے، اُن کے قبیلے جدا جدا تھے اور اُن میں شدید قسم کے تعصّبات تھے، اُن کے دیوتا الگ الگ تھے اور یہ آنکھیں بند کر کے اُن کی پرستش کرتے تھے۔ اُن کے مفادات باہم متصادم تھے اور یہ اُن کے حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز اور عدل و ظلم کے تمام حدود و قیود سے آزاد تھے۔ اِس طرح کے لوگوں کو اُن کے تمام تعصّبات و مفادات اور تمام رسوم و عادات سے چھڑا کر بالکل ایک نئے سانچے میں ڈھال دینا اور اُس سانچے کو اُن کی نگاہوں میں اتنا محبوب بنا دینا کہ اُس کی خاطر وہ قوم، وطن، خاندان، جایداد اور بیوی بچے، سب کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں، یہ خدا ہی کے لیے ممکن ہے۔ کوئی انسان یہ کام نہیں انجام دے

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾

پیروی اختیار کر لی ہے۔[۱۰۸] اے پیغمبر، اِن مومنوں کو (اُس) جنگ پر ابھارو (جس کا حکم پیچھے دیا گیا ہے)۔ اگر تمھارے لوگوں میں بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمھارے سو ہوں گے تو ہزار منکروں پر بھاری رہیں گے، اِس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو بصیرت نہیں رکھتے۔[۱۰۹] ۶۴-۶۵

سکتا، اگرچہ وہ دنیا جہان کے سارے وسائل اُس پر صرف کر ڈالے۔'' (تدبر قرآن ۳/۵۰۵)

۱۰۸؎ یعنی مدد کے لیے اللہ اور رفاقت کے لیے یہی تھوڑے سے مسلمان کافی ہیں، لہٰذا منکرین حق کی کثرت اور اپنے ساتھیوں کی قلت کی فکر نہ کرو۔ یہ گویا وہی بات دوسرے اسلوب میں فرمائی ہے جو اوپر 'فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ، هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ' کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔

۱۰۹؎ یہ اُس جہاد کے لیے ذمہ داری کی حد بیان کی ہے جس کا حکم پیچھے 'حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ' کے الفاظ میں دیا گیا ہے۔ یہاں اُسی کے لیے ابھارنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ مسلمانوں کی جماعت چونکہ اُس وقت زیادہ تر مہاجرین و انصار کے سابقین اولین پر مشتمل تھی اور ایمان و اخلاق کے اعتبار سے اُس میں کسی نوعیت کا کوئی ضعف نہ تھا، اِس لیے وہ پابند کیے گئے کہ دس کے مقابلے میں ایک بھی ہوں تو اِس ذمہ داری کو پورا کریں۔ ایمان و اخلاق کی قوت کو یہاں 'فِقْه' سے تعبیر فرمایا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...'فقہ' سے مراد بصیرت ایمانی ہے۔ یہی بصیرت انسان کا اصل جوہر ہے۔ اِس بصیرت کے

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنۡكُمۡ وَعَلِمَ اَنَّ فِيۡكُمۡ ضَعۡفًا ؕ فَاِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغۡلِبُوۡا مِائَتَيۡنِ ۚ وَاِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ اَلۡفٌ يَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَيۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۶۶﴾

اِس وقت، البتہ اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے، اِس لیے کہ اُس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے۔ سو تمھارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمھارے ہزار ایسے ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری رہیں گے۔ اور اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو (اُس کی راہ میں) ثابت قدم رہیں[111]۔ ۶۶

ساتھ جب مومن میدان جنگ میں نکلتا ہے تو وہ اپنے تنہا وجود کے اندر ایک لشکر کی قوت محسوس کرتا ہے، اُس کو اپنے دہنے بائیں خدا کی نصرت نظر آتی ہے، موت اُس کو زندگی سے زیادہ عزیز و محبوب ہو جاتی ہے، اِس لیے کہ اُس کی بصیرت اُس کے سامنے اُس منزل کو روشن کر کے دکھا دیتی ہے جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہی بصیرت اُس کے اندر وہ صبر و ثبات پیدا کرتی ہے جو اُس کو تنہا اِس بصیرت سے محروم دس آدمیوں پر بھاری کر دیتی ہے۔‘‘
(تدبر قرآن ۳/۵۰۶)

۱۱۱۔ یعنی اصل حکم تو وہی ہے، لیکن اِس وقت بہت سے نئے لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ بہت بڑھ گئی ہے، مگر دین کی بصیرت کے لحاظ سے وہ سابقین اولین کے ہم پایہ نہیں رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے، اب اُن کے سو پابند ہوں گے کہ اللہ کے حکم پر دو سو کے مقابلے میں جنگ کریں۔

سورۂ انفال کی یہ آیتیں، اگر غور کیجیے تو جہاد و قتال کی ذمہ داری کے ساتھ اُس میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کا ضابطہ بھی بالکل متعین کر دیتی ہیں۔ اِن میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ جنگ میں نصرت الٰہی کا معاملہ الل ٹپ نہیں ہے کہ جس طرح لوگوں کی خواہش ہو، اللہ کی مدد بھی اُسی

طرح آجائے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر رکھا ہے اور وہ اِسی کے مطابق اپنے بندوں کی مدد فرماتا ہے۔ آیات پر تدبر کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ نصرت الٰہی کا یہ ضابطہ درج ذیل تین نکات پر مبنی ہے:

اول یہ کہ اللہ کی مدد کے لیے سب سے بنیادی چیز صبر و ثبات ہے۔ مسلمانوں کی کسی جماعت کو اِس کا استحقاق اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتا، جب تک وہ یہ صفت اپنے اندر پیدا نہ کر لے۔ اِس سے محروم کوئی جماعت اگر میدان جہاد میں اترتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے کسی مدد کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ 'صٰبِرُوْنَ' اور 'صَابِرَةٌ' کی صفات سے اِن آیتوں میں یہی بات واضح کی گئی ہے۔ 'وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ' کے الفاظ بھی آیات کے آخر میں اِسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔

دوم یہ کہ جنگ میں اترنے کے لیے مادی قوت کا حصول ناگزیر ہے۔ اِس میں تو شبہ نہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے، اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اور آدمی کا اصل بھروسا اللہ پروردگار عالم ہی پر ہونا چاہیے، لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا عالم اسباب کے طور پر بنائی ہے۔ دنیا کی یہ اسکیم تقاضا کرتی ہے کہ نیکی اور خیر کے لیے بھی کوئی اقدام اگر پیش نظر ہے تو اُس کے لیے ضروری وسائل ہر حال میں فراہم کیے جائیں۔ یہ اسباب و وسائل کیا ہونے چاہییں؟ دشمن کی قوت سے اِن کی ایک نسبت اللہ تعالیٰ نے انفال کی اِن آیتوں میں قائم کر دی ہے۔ یہ اگر حاصل نہ ہو تو مسلمانوں کو اِس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ جہاد کے شوق میں یا جذبات سے مغلوب ہو کر اِس سے پہلے اگر وہ کوئی اقدام کرتے ہیں تو اُس کی ذمہ داری اُنھی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس صورت میں اُن کے لیے کسی مدد کا ہرگز کوئی وعدہ نہیں ہے۔

سوم یہ کہ مادی قوت کی کمی کو جو چیز پورا کرتی ہے، وہ ایمان کی قوت ہے۔ 'عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا' اور 'بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ' میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔ 'ضَعْف' کا لفظ عربی زبان میں صرف جسمانی اور مادی کمزوری کے لیے نہیں آتا، بلکہ ایمان و حوصلہ اور بصیرت و معرفت کی

الانفال ۸

مَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗۤ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ ؕ تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا ۖۗ وَاللّٰہُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ

(اِنھیں اعتراض ہے کہ تم لوگوں نے یہ سب خون ریزی قیدی پکڑ کر اُن سے فدیہ لینے کے لیے کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ) کسی پیغمبر کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اُس کو قیدی ہاتھ آئیں، یہاں تک کہ (اِس کے لیے) وہ ملک میں خون ریزی برپا کر دے۔[111] (قریش کے لوگو)، یہ تم ہو جو دنیا کا سروسامان چاہتے ہو، اللہ تو آخرت چاہتا

کمزوری کے لیے بھی آتا ہے۔ اِسی طرح 'لَا یَفْقَھُوْنَ' کے معنی بھی یہاں اِس کے مقابلے میں ایمانی بصیرت سے محرومی ہی کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ منکرین حق چونکہ اِس بصیرت سے محروم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں اِس معرفت سے خوب خوب نوازا ہے، اِس لیے تم اگر ہزار کے مقابلے میں سو بھی ہو گے تو اللہ کی نصرت سے تمھیں اُن پر غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ تاہم اِس بصیرت میں کمی ہوئی تو یہ نسبت بھی اِس کے ساتھ ہی تبدیل ہو جائے گی۔

نصرت الٰہی کا یہ ضابطہ قدسیوں کی اُس جماعت کے لیے بیان ہوا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اور براہ راست اللہ کے حکم سے میدان جہاد میں اتری۔ بعد کے زمانوں میں، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی ایمانی حالت کے پیش نظر یہ نسبت کس حد تک کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔

111 آیت کی ابتدا 'مَا کَانَ' سے ہوئی ہے۔ یہ اسلوب بیان الزام اور رفع الزام، دونوں کے لیے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ رفع الزام اور پیغمبر کی تنزیہ شان کے لیے ہے۔ قریش اِس بہانے سے مدینہ پر حملہ آور ہوئے تھے کہ مسلمان اُن کے قافلۂ تجارت کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ جب بدر میں شکست ہو گئی تو اپنی قوم کو اُس کے اثرات سے بچانے کے لیے اُنھوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ دیکھ لو، ہمارا اندیشہ غلط نہیں تھا، اِنھیں جب قافلہ لوٹنے کا موقع نہیں ملا تو اب قیدی

حَكِيۡمٌ ﴿۶۷﴾ لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ فِيۡمَاۤ اَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۶۸﴾

ہے اور اللہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔[۱۱۲] اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا (کہ ابھی تمھیں کچھ اور مہلت دینی ہے) تو جو طریقہ تم نے اختیار کیا تھا، اُس کے باعث تم پر ایک عذاب عظیم نازل ہو جاتا۔[۱۱۳] ۶۷-۶۸

پکڑ کر اُن سے فدیہ وصول کر رہے ہیں۔ یہ وہی طریقے ہیں جو ہمیشہ سے دنیا داروں کے رہے ہیں۔ اِس طرح کے کام خدا کے پیغمبر نہیں کرتے۔ قرآن نے یہ اُن کے اِس پروپیگنڈے کا جواب دیا ہے کہ یقیناً خدا کے پیغمبر قیدی پکڑنے اور اُن سے مال حاصل کرنے کے لیے خون ریزی نہیں کرتے، مگر کسی مقصد حق کے لیے خون ریزی پر مجبور ہو جائیں تو قیدی بھی پکڑتے ہیں اور مال غنیمت بھی حاصل کرتے ہیں تاکہ اُن مجرموں کو سزا دیں جن کے خلاف وہ جنگ کرنے کے لیے مجبور ہوئے ہیں۔ چنانچہ اِس موقع پر بھی جو خون ریزی ہوئی ہے، وہ قیدی پکڑ کر اُن سے فدیہ لینے کے لیے نہیں ہوئی، بلکہ قریش کے لیڈروں کو اُن کی سرکشی کی سزا دینے کے لیے ہوئی ہے اور اُس وقت تک ہوتی رہے گی، جب تک فتنہ باقی ہے اور دین اِس سرزمین میں سب اللہ کے لیے نہیں ہو جاتا۔ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اب وہ اِسی کے مستحق ہیں۔

۱۱۲ یہ نہیں فرمایا کہ نبی اور اُس کے پیرو اہل ایمان آخرت کے طلب گار ہیں، بلکہ یہ فرمایا کہ اللہ آخرت چاہتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...اِس سے مقصود اِس حقیقت کا اظہار ہے کہ نبی اور اہل ایمان کے ہاتھوں جو کچھ یہ ہو رہا ہے، یہ اُن کی اپنی مرضی سے نہیں ہو رہا ہے، بلکہ اللہ کی مرضی اور اللہ کے حکم سے ہو رہا ہے۔ نبی اور اہل ایمان کی حیثیت اِس سارے کام میں محض آلہ اور واسطہ کی ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، یہی عین اللہ کا ارادہ اور اُس کی مرضی ہے۔ اللہ کی مرضی اپنے بندوں کے لیے یہ ہے کہ وہ ہر کام آخرت کو اپنا نصب العین بنا کر کریں تو نبی اور اُس کے ساتھیوں کا کوئی اقدام اللہ کی مرضی کے

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾

سو (مسلمانو، تم اِن کے اعتراضات کی پروانہ کرو اور فدیہ لے کر) جو مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے، اُس کو حلال وطیب سمجھ کر کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[۱۱۴]۔ ۶۹

خلاف کس طرح ہو سکتا ہے؟ گویا بدر اور اِس سلسلہ کے تمام اقدامات کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لے لی۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ عزیز وحکیم ہے۔ وہ جو ارادہ فرماتا ہے، اُس کو کوئی روک نہیں سکتا اور اُس کا ہر ارادہ عدل وحکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اب تم جو ژاژ خائی کرنا چاہتے ہو، کرتے رہو۔'' (تدبر قرآن ۳/۵۱۱)

۱۱۳؎ اشارہ ہے اُس طریقے کی طرف جو پیغمبر اور اُس کے ساتھیوں کو گھروں سے نکالنے، اُنھیں تعذیب کا نشانہ بنانے اور مدینہ میں اُن کا تعاقب کر کے اُنھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی صورت میں قریش نے اختیار کر رکھا تھا۔ اِس کے لیے اصل میں لفظ 'اَخذ' آیا ہے۔ یہ لینے، پکڑنے، اختیار کرنے، کسی ڈھب کو اپنانے وغیرہ، سب مفاہیم کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمھارے قیدی پکڑے گئے اور اُنھیں فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا، ورنہ حق تو یہ تھا کہ تمھارے جرائم کی پاداش میں تم پر وہ فیصلہ کن عذاب اِسی موقع پر نازل کر دیا جاتا جو پیغمبروں کے منکرین پر نازل کیا جاتا ہے اور تمھاری پوری قوم اِس طرح مٹا دی جاتی کہ اُس کا نام ونشان بھی زمین پر باقی نہ رہتا۔

۱۱۴؎ یعنی جو چیز حلال وطیب ہے، اُسے بغیر کسی تردد کے کھاؤ برتو، لیکن اِس بات سے ڈرتے رہو کہ کسی ایسی چیز میں آلودہ نہ ہو جاؤ جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ اِس کے باوجود چھوٹی موٹی کوئی غلطی یا کوتاہی ہو گئی تو مطمئن رہو، اللہ غفور ورحیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۰﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

اے پیغمبر، تمھارے قبضے میں جو قیدی ہیں، اُن سے کہہ دو کہ اللہ تمھارے دلوں میں کوئی خیر دیکھے گا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے، اُس سے بہتر تم کو عطا فرمائے گا[۱۱۵] اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اور اگر یہ تمھارے ساتھ بدعہدی کرنا چاہتے ہیں تو اِن سے بعید نہیں، اِس لیے کہ اِس سے پہلے اِنھوں نے خدا سے بدعہدی کی ہے[۱۱۶]۔ پھر اِسی کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے تم کو اِن پر قابو دے دیا اور اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے[۱۱۷]۔ ۷۰-۷۱

۱۱۵؎ یعنی حق و انصاف کی نگاہ سے اِس سارے معاملے پر غور کرنے کا رجحان اور قبول حق کے لیے آمادگی دیکھے گا تو اُس کی رحمت اور توفیق تمھاری طرف متوجہ ہوگی اور اِس فدیے سے کہیں بڑھ کر، جو تم سے لیا گیا ہے، وہ تمھیں اسلام کی نعمت عطا فرمائے گا جس کا صلہ خدا کی ابدی جنت ہے۔

۱۱۶؎ یہ اُس بدعہدی کی طرف اشارہ ہے جو قریش نے ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کیے ہوئے حرم اور اُن کی ملت کے معاملے میں کی۔ وہ اِس گھر کے متولی اور ملت ابراہیمی کے داعی اور علم بردار بنائے گئے تھے، مگر اُنھوں نے توحید کے بجائے شرک اختیار کیا اور اُس معبد کو جو دنیا والوں کے لیے توحید کے مرکز کی حیثیت سے بنایا گیا تھا، اپنے سیاسی مفادات کے لیے بت کدے میں تبدیل کر دیا۔

۱۱۷؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور بدر کے قیدیوں کو دھمکی ہے کہ بدعہدی کریں گے تو خدا پھر اِنھیں تمھارے قابو میں دے دے گا اور جو سزا اِس وقت اِنھیں دی گئی ہے، یہ اُس سے بڑی سزا

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ

(ایمان والو، اِس صورت حال میں اگر کوئی مسلمان حمایت ونصرت کا خواہاں ہو تو اُس سے کہو کہ مدینہ آ جائے۔ اِس لیے کہ) جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا ہے، اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) پناہ دی اور (اُن کی) مدد کی ہے، وہی ایک دوسرے کے حامی وناصر ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے، مگر ہجرت کر کے (مدینہ) نہیں آئے، تمھارا اُن سے حمایت ونصرت کا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا، جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں۔[118]

پائیں گے۔

118 اُس زمانے کے عرب میں ایک دوسرے کی حمایت ونصرت کے بغیر کسی شخص کے لیے جینا آسان نہیں تھا۔ اسلام سے پہلے یہ حمایت ونصرت ہر شخص کو اُس کے خاندان اور قبیلے کے تعلق سے حاصل تھی۔ کوئی شخص یا خاندان کسی خطرے یا مصیبت میں مبتلا ہوتا تو خاندان اور قبیلے کے لوگ اُس کی حمایت ومدافعت کے لیے سربہ کف ہو جاتے تھے۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد مسلمان ہر جگہ اِس سے محروم ہونا شروع ہو گئے۔ پھر حالت جنگ نے اِس صورت حال کو اور بھی سنگین بنا دیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ جو لوگ منکروں کے درمیان رہ رہے ہیں اور محض اپنے ایمان کی وجہ سے بے یار ومددگار ہو گئے ہیں، اُن کے لیے کیا کیا جائے؟ سورہ کے آخر میں یہ قرآن نے اِس سوال کا جواب دیا ہے کہ یہ حمایت ونصرت اُسی صورت میں ممکن ہے، جب کہ یہ لوگ ہمت کر کے ایک قدم اور آگے بڑھائیں اور ہجرت کر کے مدینہ آ جائیں۔ ایمان واسلام کی بنیاد پر حمایت ونصرت کا جو تعلق

النَّصۡرُ اِلَّا عَلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہُمۡ مِّیۡثَاقٌ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۷۲﴾ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ اِلَّا تَفۡعَلُوۡہُ تَکُنۡ فِتۡنَۃٌ فِی الۡاَرۡضِ وَ فَسَادٌ کَبِیۡرٌ ﴿ؕ۷۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ہَاجَرُوۡا

ہاں، اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو اُن کی مدد کرنا تم پر فرض ہے[۱۱۹]، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمھارا معاہدہ ہو۔ (یاد رکھو)، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے[۱۲۰]۔ جو لوگ منکر حق ہیں، وہ ایک دوسرے کے حامی و ناصر ہیں، (اِس لیے ایمان والو)، تم (اپنے اِن مظلوم بھائیوں کے لیے) یہ نہیں کرو گے تو ملک میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو جائے گا[۱۲۱]۔ (یہ بات اب تم میں سے ہر شخص کو سمجھ لینی

انصار و مہاجرین میں قائم ہو چکا ہے، وہ ہجرت کے بعد ہی ممکن ہے اور اِسی نے اُن کو خدا کی راہ میں جہاد و قتال کے لیے بنیان مرصوص بنا دیا ہے۔ نئے ایمان لانے والے بھی آگے بڑھیں اور ایمان کے اِس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اُن کے ساتھ شریک جہاد ہوں۔ جس حمایت و نصرت کے وہ خواہاں ہیں، اِس کے نتیجے میں وہ آپ سے آپ اُن کو حاصل ہو جائے گی۔

۱۱۹ یعنی جس چیز کی نفی کی گئی ہے، وہ علی الاطلاق حمایت و نصرت کی ذمہ داری ہے۔ رہی یہ بات کہ کسی شخص کو دین کے معاملے میں ستایا جائے اور وہ طالب مدد ہو تو اُس کی مدد کرنا تم پر فرض ہے۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ اُس وقت مسلمانوں کی ایک منظّم حکومت مدینہ میں قائم ہو چکی تھی اور اپنی طاقت کے لحاظ سے بھی وہ اِس کے اہل تھے کہ اِس ذمہ داری کو اٹھا سکیں۔

۱۲۰ یہ نہایت سخت تنبیہ ہے کہ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی اِن سے انحراف کی اجازت نہیں ہے۔ اِس ذیل میں سب سے اہم چیز عہد کی پابندی ہے۔ چنانچہ کوئی معاہد قوم اگر مسلمانوں پر ظلم بھی کر رہی ہو تو معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اُن کی مدد نہیں کی جا سکتی۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے معاہدے کو علانیہ ختم کر دیا

وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ ﴿٧٤﴾ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ

چاہیے کہ) جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو پناہ دی اور اُن کی مدد کی ہے، وہی سچے مومن ہیں۔ اُن کے لیے مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے[۱۲۲]۔ اور جو اِس کے بعد ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے، وہ بھی تمھی لوگوں میں سے

الانفال ۸

جائے۔

۱۲۱؎ یہ وجہ بیان ہوئی ہے کہ خاص دین کے معاملے میں یہ مدد کیوں ضروری ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...فرمایا کہ جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کی عداوت کا تعلق ہے، اِس معاملے میں تمام کفار ایک دوسرے کے دست و بازو بن گئے ہیں۔ جو اللہ کا بندہ اسلام قبول کر لیتا ہے، اُس کی تعذیب و ایذا رسانی سب کے نزدیک کار ثواب ہے۔ یہاں تک کہ ظالموں کے ظلم سے اُس کو بچانے کے لیے اُس کے اپنے بھائی بندوں کی حمیت بھی مردہ ہو چکی ہے۔ اُس کا مال اور اُس کی جان، سب مباح ہیں۔ ایسی حالت میں اگر تم بھی اِن مظلوموں کی مدد نہ کرو گے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ دین سے پھیرنے کے لیے سارے ملک میں ظلم و فساد عام ہو جائے گا۔''
>
> (تدبر قرآن ۳/ ۵۱۸)

۱۲۲؎ یہ اُس وقت کی صورت حال میں ہجرت اور جہاد کی ترغیب و تشویق ہے۔ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اِس وقت یہی دو چیزیں صداقت کی کسوٹی ہیں۔ جو شخص بھی ایمان کا دعویٰ رکھتا ہے، اُس کے لیے ضروری ہے کہ ہجرت کر کے مدینہ آئے اور انصار و مہاجرین کے دوش بدوش اہل کفر کے خلاف جہاد میں شریک ہو۔ سچا ایمان اِس وقت کسی کو مہاجر بننے کی سطح پر

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾

ہیں[۱۲۳] خون کے رشتہ دار، البتہ خدا کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔[۱۲۴] ۷۲-۷۵

ملے گا اور کسی کو انصار بننے کی سطح پر۔ اِن کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔ اِس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دین کی نصرت کے لیے ہجرت اور جہاد ایمان کے ایسے تقاضے ہیں کہ جب اِن کا موقع آ جائے تو کوئی چیز بھی اِن کا بدل نہیں ہو سکتی۔ ہر مسلمان سے اُس وقت ایمان کا پہلا اور آخری تقاضا یہی دو چیزیں ہوتی ہیں۔

۱۲۳؎ یعنی بعد میں آنے والوں کے لیے بھی تمھارے دل میں کوئی تنگی نہیں ہونی چاہیے۔ خدا نے آج تمھیں اپنی دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق دی ہے تو اِس پر خدا کا شکر ادا کرو۔ وہی کل دوسروں کو بھی اِس کی توفیق دے گا۔ اُن کا استقبال کسی احساسِ برتری کے ساتھ نہیں، بلکہ محبت و شفقت کے جذبات کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ نئے آنے والوں کے لیے ایمان و اسلام اور ہجرت و جہاد کے لیے ترغیب و تشویق بھی ہے۔

۱۲۴؎ یہ بر سر موقع یاد دہانی ہے کہ اوپر جس حمایت و نصرت کا ذکر ہوا ہے، اُس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رحمی رشتوں کی بنیاد پر جو حقوق و فرائض اللہ تعالیٰ نے قائم فرمائے ہیں، وہ تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ ہر گز نہیں، وہ سب حقوق و فرائض بدستور قائم رہیں گے۔ رحم و قرابت اور اُس کی بنیاد پر وراثت وغیرہ کے حقوق خدا کے ابدی قانون کا حصہ ہیں۔ یہ حمایت و نصرت اُن میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گی۔ وہ ہر حال میں مقدم ہوں گے اور ایمان و اسلام کی بنیاد پر حمایت و نصرت کے ہر تقاضے سے پہلے پورے کیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت اُس کے بے خطا علم پر مبنی ہے۔ اُس نے ہر چیز کا ایک محل اور مقام متعین کر دیا ہے۔ تمام حقوق و فرائض اُسی کے مطابق ادا کرنے چاہییں۔

سورة التوبة

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا

—— ۲ ——

اللہ[125] اور اُس کے رسول کی طرف سے اُن مشرکوں کے لیے اعلان براءت ہے جن سے تم لوگوں نے معاہدے کیے تھے[126]۔سو،[127] (اے مشرکین عرب)، اب ملک میں چار

۱۲۵؎ اِس سورہ کی ابتدا میں 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' نہیں لکھی جاتی۔ اِس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ سورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین پر اُس عذاب کا اعلان کیا گیا ہے جو پیغمبروں کی تکذیب کے نتیجے میں اُن کے منکرین پر لازماً آتا ہے۔ خدا کی زمین پر یہ اُس کی آخری دینونت کی سرگذشت ہے جس میں مشرکین کے قتل عام اور اہل کتاب کو محکوم بنا لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ کی ابتدا جن الفاظ سے ہوئی ہے، اُن کے ساتھ کسی طرح موزوں نہیں تھا کہ خدا کی رحمت و شفقت کا حوالہ دیا جائے۔ یہ خدا کے جلال اور قہر و غضب کے ظہور کا موقع ہے، اِس لیے 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' سے ابتدا نہیں کی گئی۔

۱۲۶؎ دنیا میں انسان کو رہنے بسنے کا جو موقع دیا گیا ہے، وہ کسی حق کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ محض امتحان کے لیے ہے۔ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہ امتحان پورا ہو جاتا ہے تو یہ ضرورت بھی اِس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے کہ اُنھیں باقی رکھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین اب اِسی مقام پر پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ آگے جس قتل عام کا حکم دیا گیا ہے، وہ خدا کی اِس سنت کا ظہور ہے کہ رسولوں کے مخاطبین اُن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اِسی دنیا میں عذاب سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اِس عذاب کا فیصلہ بھی خدا کرتا ہے اور جن پر یہ نازل کیا جاتا ہے، وہ بھی خدا کی طرف سے متعین کر کے بتا دیے جاتے ہیں۔ کوئی شخص، یہاں تک کہ خدا کا پیغمبر

اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝٢ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۵ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ

مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ بھی کہ اللہ (اپنے پیغمبر کا) انکار کرنے والوں کو رسوا کر کے رہے گا۔[128] (پھر حج کا موقع آئے تو اِس سرزمین کے) سب لوگوں تک پہنچانے کے لیے بڑے حج کے دن[129] اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے اعلان عام بھی کر دیا جائے کہ اللہ مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اُس کا

بھی اپنی طرف سے اِس کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سورۂ توبہ اِسی فیصلے کا اعلان ہے۔ تاہم اخلاقی لحاظ سے ضروری تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کے ساتھ تبلیغ و دعوت اور اتمام حجت کی مصلحت سے معاہدے کر رکھے ہیں، کسی اقدام سے پہلے اُنھیں ختم کر دیا جائے۔ یہ اُنھی معاہدات سے براءت کی گئی ہے۔ آیت میں لفظ 'بَرَآءَۃ' کے بعد 'اِلٰی' ہے۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ یہاں 'اِبلاغ' کا مفہوم بھی مضمر ہے۔ یعنی اِس دست برداری کی اطلاع اُن تک پہنچادی جائے۔

۱۲۷۔ یہاں سے خطاب میں تبدیلی ہوئی ہے اور اُس کا رخ براہ راست مشرکین کی طرف ہو گیا ہے۔ یہ تبدیلی بتا رہی ہے کہ اِس دھمکی کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ یہ ایک فیصلہ کن دھمکی ہے جس کے نتائج اب پوری قطعیت کے ساتھ سامنے آنے والے ہیں۔

۱۲۸۔ عذاب سے پہلے چار ماہ کی یہ مہلت کب دی گئی؟ اِس کی کوئی حتمی تاریخ تو متعین نہیں کی جاسکتی۔ تاہم آگے کی آیتوں سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اُس وقت دی گئی، جب قریش کی طرف سے معاہدۂ حدیبیہ کی کوئی خلاف ورزی ابھی نہیں ہوئی تھی۔

۱۲۹۔ اِس سے مراد حج ہی ہے۔ اہل عرب عمرے کو حج اصغر اور اِس کے مقابلے میں حج کو حج اکبر کہتے تھے۔

تَوَلَّيۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ‌ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍۙ ﴿۳﴾ اِلَّا الَّذِيۡنَ عٰهَدْتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ثُمَّ لَمۡ يَنۡقُصُوۡكُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَمۡ يُظَاهِرُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَحَدًا فَاَتِمُّوۡۤا اِلَيۡهِمۡ عَهۡدَهُمۡ

رسول بھی۔[130] اب اگر تم لوگ توبہ کرلو تو تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر منہ پھیرو گے تو جان رکھو کہ تم اللہ سے بھاگ نہیں سکتے۔ (اے پیغمبر)، اِن منکروں کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ وہ مشرکین، البتہ اِس اعلان براءت سے مستثنیٰ ہیں جن سے تم

۱۳۰؎ مطلب یہ ہے کہ چار ماہ کی جو مہلت اوپر دی گئی ہے، اُس کے گزر جانے کے بعد اُن لوگوں کے خلاف اقدامات کی ابتدا کر دی جائے جن تک اعلان براءت کی اطلاع پہنچانا ممکن ہو۔ اِس کے بعد حج کے دن کا انتظار کیا جائے۔ اِس میں ملک کے کونے کونے سے لوگ جمع ہوں گے جن کی وساطت سے یہ اطلاع سرزمین عرب کے باقی سب لوگوں تک بھی پہنچا دی جائے کہ اللہ و رسول نے مشرکین سے براءت کا اعلان کر دیا ہے۔ خدا کی طرف سے جو مہلت اُنھیں ملی ہوئی تھی، اُس کی مدت پوری ہوگئی ہے۔ وہ اب عذاب کی زد میں ہیں۔ چنانچہ تمام معاہدات ختم کر دیے گئے ہیں اور آیندہ بھی اُن کے ساتھ کسی معاہدے کا امکان باقی نہیں رہا۔ اِس میں ضمناً یہ بشارت بھی ہے کہ عنقریب وہ موقع آنے والا ہے، جب مسلمان حج بھی کریں گے اور منکرین پر ایسا غلبہ بھی حاصل کرلیں گے کہ حج کے موقع پر اِس طرح کا اعلان کر سکیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ۹ رہجری میں اِس حج سے سعادت اندوز ہوئے۔ یہ حج سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارت میں کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق علی رضی اللہ عنہ نے قرآن کی یہ آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سنائیں جس سے پورے عرب کے مشرکین تک اطلاع پہنچانے کا اہتمام کر دیا گیا۔*

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/ ۳۳۶۔

اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۴﴾ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ

نے معاہدہ کیا، پھر اُس کو پورا کرنے میں اُنھوں نے تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی ہے۔ سو اُن کا معاہدہ اُن سے اُن کی مدت تک پورا کرو، اِس لیے کہ اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدعہدی سے بچنے والے ہوں۔[131] (بڑے حج کے دن) اِس (اعلان) کے بعد جب حرام مہینے گزر جائیں[132] تو اِن مشرکوں کو جہاں پاؤ،

۱۳۱؎ یہ اُن معاہدوں کا بیان ہے جو مذکورہ اعلان سے مستثنیٰ تھے۔ مدعا یہ ہے کہ غیر موقت معاہدے تو مہلت کی مدت گزر جانے کے فوراً بعد ختم ہو جائیں گے۔ اِسی طرح وہ معاہدے بھی ختم ہو جائیں گے جو اگرچہ موقت تھے، مگر فریق ثانی کی طرف سے اُن کی خلاف ورزی ہو چکی ہے۔ لیکن ایسے موقت معاہدے جن کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوئی، اُنھیں ختم نہیں کیا جائے گا، بلکہ قرار دادہ مدت تک برقرار رکھا جائے گا۔ مدت گزر جانے کے بعد، البتہ وہ بھی کالعدم ہوں گے اور جن مشرکین سے کیے گئے تھے، اُن کی دارو گیر بھی اُسی طرح شروع ہو جائے گی، جس طرح حکم دیا گیا ہے۔

۱۳۲؎ اِس سے وہ چار مہینے مراد نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، بلکہ وہی مہینے مراد ہیں جنھیں اصطلاح میں اشہر حرم کہا جاتا ہے۔ یہ تعبیر اِن مہینوں کے لیے بطور اسم وعلم استعمال ہوتی ہے، اِس لیے عربیت کی رو سے کوئی اور مہینے مراد نہیں لیے جا سکتے۔ حج اکبر کے موقع پر جس اعلان کے لیے کہا گیا ہے، اُس کے بعد ۲۰ دن ذوالحجہ اور ۳۰ محرم کے باقی ہوں گے۔ یہ اُنھی کے بارے میں فرمایا ہے کہ اِن دنوں میں چونکہ جنگ وجدال ممنوع ہے، اِس لیے یہ جب گزر جائیں تو اِس اعلان کے نتیجے میں جن لوگوں کے خلاف کارروائی کی ضرورت ہو، اُن کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا جائے، اِس سے پہلے کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ ذوالحجہ اور محرم کے پچاس دنوں کے لیے یہ تعبیر بالکل اُسی

وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾

قتل کرو اور اِس مقصد کے لیے اِن کو پکڑو، اِن کو گھیرو اور ہر گھات کی جگہ اِن کی تاک میں بیٹھو۔[۱۳۳] پھر اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اِن کی راہ چھوڑ دو۔[۱۳۴] یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اور اگر (مہلت کی اِس مدت میں) اِن مشرکوں میں سے کوئی شخص تم سے امان چاہے (کہ وہ تمھاری دعوت سننا چاہتا ہے) تو اُس کو امان دے دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اُس کو اُس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اِس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کی باتوں کو زیادہ نہیں جانتے۔[۱۳۵] ۱-۶

طرح اختیار کی گئی ہے، جس طرح ہم اپنی زبان میں بعض اوقات نومبر یا دسمبر کے مہینے میں کہتے ہیں کہ یہ سال گزر جائے تو فلاں کام کیا جائے گا۔

۱۳۳؎ یہ قتل عام کا حکم ہے جو مشرکین عرب کے لیے اُسی طرح کا عذاب تھا جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں اُن کے مخاطبین پر ہمیشہ نازل کیا جاتا رہا ہے۔

۱۳۴؎ یعنی خدا کے اِس عذاب سے بچنے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ وہ کفر و شرک سے توبہ کر کے اسلام قبول کرلیں، اِس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے ایمان و اسلام کی شہادت کے طور پر وہ نماز کا اہتمام کریں اور حکومت کا نظم چلانے کے لیے اُس کے بیت المال کو زکوٰۃ ادا کریں۔ اِس کے بعد فرمایا ہے کہ 'فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ'، یعنی اُن کی راہ چھوڑ دو۔ اِس کے

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ

اللہ اور اُس کے رسول کے ہاں اِن مشرکوں سے کوئی عہد کس طرح باقی رہ سکتا ہے؟[136] ہاں جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام کے پاس (حدیبیہ میں) عہد کیا تھا،[137] سو جب

معنی یہ ہیں کہ ریاست اور قانون کی سطح پر ایمان و اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اِس سے زائد سے کوئی مطالبہ کسی مسلمان سے نہیں کیا جا سکتا۔ اِس لیے کہ جب خدا نے اپنے پیغمبر کو خود اپنی حکومت میں اِس کی اجازت نہیں دی تو دوسروں کو کس طرح دی جا سکتی ہے؟

۱۳۵؎ یعنی دین و شریعت اور نبوت و رسالت سے زیادہ واقف نہیں ہیں، اِس وجہ سے رعایت کے مستحق ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ لمبے عرصے تک تبلیغ و دعوت کے بعد بھی اتمام حجت میں کوئی کسر رہ گئی ہو، لہٰذا اِن میں سے کوئی شخص اگر بات سننے اور سمجھنے کے لیے امان چاہتا ہو تو امان دے دو اور اللہ کا کلام اچھی طرح سنا اور سمجھا کر اُس کے مامن تک پہنچا دو تاکہ وہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کر کے فیصلہ کر سکے کہ اُسے اسلام قبول کرنا ہے یا تلوار۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ جب مہلت کی یہ مدت ختم ہو جائے گی تو اُس کے لیے بھی وہی حکم ہوگا جو اوپر بیان ہوا ہے۔

۱۳۶؎ یہاں سے روے سخن اُن لوگوں کی طرف ہو گیا ہے جو اِن مشرکوں کے لیے مزید مہلت کے خواہاں تھے۔ اُنھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اِس اعلان کے نتیجے میں اب اُنھیں اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور زمانۂ جاہلیت کے دوست احباب کے خلاف تلوار سونتنی پڑے گی۔ یہ لوگ چونکہ ضعیف الایمان تھے، اِس لیے قدرتی طور پر سخت آزمایش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ آگے جو کچھ فرمایا ہے، اِنھی کمزور مسلمانوں کی ذہنی کیفیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے۔

۱۳۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'۔ زبان کے اسالیب سے واقف ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ الفاظ اگر کسی معاہدے کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں تو

فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى

تک وہ تمھارے ساتھ سیدھے رہیں، تم بھی اُن کے ساتھ سیدھے رہو۔[۱۳۸] اِس لیے کہ اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدعہدی سے بچنے والے ہوں۔[۱۳۹] —— کس طرح باقی رہ سکتا ہے، جب کہ حال یہ ہے کہ اگر وہ تم پر کہیں غلبہ پا لیں تو نہ تمھارے بارے میں کسی قرابت

صرف معاہدۂ حدیبیہ ہی کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی معاہدے مشرکین کے ساتھ کیے، اُن میں سے کوئی بھی مسجد حرام کے ساتھ اِس طرح کی نسبت سے تعارف کا سزاوار نہیں ہو سکتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس نسبت کے اظہار سے ایک طرف تو معاہدے کا تعارف ہو گیا۔ دوسری طرف اِس سے اُس کی غیر معمولی حرمت بھی واضح ہوئی کہ کوئی ایسا ویسا معاہدہ نہیں ہے، بلکہ اِس کی تکمیل جوارِ حرم میں ہوئی ہے جس سے زیادہ کوئی دوسری جگہ مقدس و محترم نہیں ہو سکتی۔“

(تدبر قرآن ۳/ ۵۴۳)

۱۳۸؎ یہ بات اگرچہ اوپر بیان ہو چکی ہے کہ ایسے موقت معاہدے جن کی خلاف ورزی نہیں ہوئی، وہ باقی رہیں گے، لیکن معاہدۂ حدیبیہ کی اہمیت چونکہ غیر معمولی تھی اور یہ دس سال کے لیے کیا گیا تھا، اِس لیے سلسلۂ کلام کو روک کر متنبہ کر دیا ہے کہ یہ معاہدہ بھی اُس وقت تک باقی رہے گا، جب تک قریش اِس پر قائم رہتے ہیں۔

۱۳۹؎ اصل میں لفظ ’تَقْوٰی‘ آیا ہے۔ اِس کے لغوی معنی بچنے کے ہیں۔ جس چیز سے بچنے کی طرف اشارہ مقصود ہے، وہ سیاق سے مفہوم ہو رہی ہے، اِس لیے لفظوں میں بیان نہیں ہوئی۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ لفظ اِس طریقے سے استعمال ہوا ہے۔ لفظ ’فِسْق‘ کے معاملے میں بھی آگے یہی اسلوب اختیار فرمایا ہے۔

قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸﴾ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹﴾ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ

کالحاظ کریں، نہ کسی عہد کا؟[140] اپنے منہ کی باتوں سے وہ تمھیں راضی کرنا چاہتے ہیں، مگر اُن کے دل انکار کر رہے ہیں اور اُن میں سے اکثر بدعہد ہیں۔ اللہ کی آیتوں کے عوض میں اُنھوں نے تھوڑی قیمت قبول کر لی،[141] پھر اُس کی راہ سے رک گئے ہیں۔ یقیناً بہت برا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ کسی مسلمان کے معاملے میں نہ اُنھیں کسی قرابت کا لحاظ ہے، نہ عہد کا اور وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔ سو اگر توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام

۱۴۰؎ اصل میں 'اِلًّا' اور 'ذِمَّةً' کے الفاظ آئے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تعلقات کی بنیاد دو ہی چیزوں پر ہوتی ہے۔ معاشرتی تعلقات کی بنیاد رشتۂ رحم و قرابت کے پاس و لحاظ پر اور سیاسی روابط کی بنیاد باہمی معاہدات کی عائد کردہ ذمہ داریوں کے احترام پر۔ پہلی کو 'اِلّ' سے تعبیر فرمایا ہے جو اُن حقوق کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایک اصل و نسل، ایک جوہر و معدن سے ہونے یا قرابت اور پڑوس کی بنا پر ایک دوسرے پر آپ سے آپ قائم ہو جاتے ہیں۔ دوسری کو 'ذِمَّة' سے تعبیر فرمایا ہے جو اُن ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کسی معاہدہ میں شریک ہونے والی پارٹیوں پر از روے معاہدہ عائد ہوتی ہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۴۲)

۱۴۱؎ یعنی دنیا کی متاع حقیر کو ترجیح دی اور خدا کی آیتوں کو چھوڑ کر اُسے اختیار کر لیا۔ آیت میں اِسے 'اِشْتِرَآء' سے تعبیر کیا ہے۔ زمانۂ قدیم میں خرید و فروخت مبادلۂ اشیا کے طریقے پر ہوتی تھی۔ لفظ 'اِشْتِرَاء' میں یہ مفہوم اِسی سے پیدا ہوا ہے۔

وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ

کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تمھارے دینی بھائی ہیں[۱۴۲]۔ ہم اُن لوگوں کے لیے اپنی آیتوں کی تفصیل کیے دے رہے ہیں جو جاننا چاہتے ہوں[۱۴۳]۔ اور اُس عہد کے بعد[۱۴۴] بھی جو اُنھوں نے کر رکھا ہے، اگر وہ اپنے قول و قرار توڑ ڈالیں اور تمھارے دین میں عیب

التوبه ۹

۱۴۲؎ پیچھے اِنھی شرائط کے بعد فرمایا ہے کہ 'فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ'۔ یہاں اُس کی جگہ 'فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ' کے الفاظ ہیں۔ یہ دونوں تعبیرات مل کر حکم کا منشا ہر لحاظ سے واضح کر دیتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اِن شرائط کے پورا ہو جانے کے بعد اُن سے مزید کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا، قانون اور ریاست کے نقطۂ نظر سے وہ مسلمان سمجھے جائیں گے اور وہ تمام حقوق اُنھیں حاصل ہو جائیں گے جو ایک مسلمان کی حیثیت سے مسلمانوں کے نظم اجتماعی میں اُن کو حاصل ہونے چاہییں۔ اُن میں اور پہلے ایمان لانے والوں کے حقوق و فرائض میں کوئی فرق نہیں ہوگا اور اخوت کا یہ رشتہ قائم ہو جانے کے بعد وہ تمام ذمہ داریاں بھی اُن میں سے ہر ایک پر عائد ہو جائیں گی جو عقل و فطرت کی رو سے ایک بھائی پر اُس کے بھائی کے بارے میں عائد ہونی چاہییں۔

۱۴۳؎ یہ مسلمانوں اور کفار، دونوں کے لیے تنبیہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جاننا اور سمجھنا چاہیں، اُن کے لیے اِس باب میں اللہ کے احکام کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے۔ کوئی ابہام باقی نہیں رہا ہے۔ اب اگر مسلمانوں میں سے کسی نے اِن مشرکین کے ساتھ اِس سے الگ ہو کر کوئی معاملہ کرنا چاہا تو اُس کی ذمہ داری خود اُسی پر ہے، اِسی طرح مشرکین میں سے اگر کسی نے اِس سے کچھ الگ امید باندھی تو اُس کی ذمہ داری بھی خود اُسی پر ہے۔" (تدبر قرآن ۳/ ۵۴۴)

۱۴۴؎ یعنی معاہدۂ حدیبیہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اُس کے لیے یہ الفاظ عہد کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے آئے ہیں، اِن سے کوئی نیا معاہدہ مراد نہیں ہے۔

اَیۡمَانَ لَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ یَنۡتَهُوۡنَ ﴿۱۲﴾
اَلَا تُقَاتِلُوۡنَ قَوۡمًا نَّکَثُوۡۤا اَیۡمَانَهُمۡ وَهَمُّوۡا بِاِخۡرَاجِ الرَّسُوۡلِ
وَهُمۡ بَدَءُوۡکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ؕ اَتَخۡشَوۡنَهُمۡ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشَوۡهُ

لگائیں تو کفر کے اِن سرخیلوں سے بھی لڑو[۱۴۵]۔ اِن کے قول و قرار کچھ نہیں، (یہ آج نہیں تو کل اپنا عہد توڑ دیں گے)، لہٰذا لڑو تا کہ یہ اِس کفر و شرک سے باز آ جائیں۔ ۷-۱۲

(ایمان[۱۴۶] والو)، کیا اب بھی اُن لوگوں سے نہیں لڑو گے جنھوں نے اپنے قول و قرار توڑ دیے ہیں اور (اِس سے پہلے) رسول کو (اُس کے وطن سے) نکالنے کی جسارت

۱۴۵؎ اصل میں 'اَئِمَّةَ الْکُفْرِ' کے الفاظ ہیں۔ اِن کا اطلاق قریش کے سوا کسی اور پر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہی پورے عرب کے سردار اور پیشوا تھے اور دین کے معاملے میں تمام اہل عرب اُنھی کے تابع تھے۔ مدعا یہ ہے کہ اگر قریش بھی اپنا معاہدہ توڑ دیں تو اُن سے بھی لڑو اور ایمان و اسلام کی دعوت قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو جہاں پاؤ، قتل کر دو۔ سرزمین عرب کے تمام مشرکین کے لیے یہی اللہ کا حکم ہے۔ اِس میں اب کسی کے لیے مزید رعایت کی گنجایش باقی نہیں رہی۔

۱۴۶؎ یہ سورہ چند شذرات کا مجموعہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین پر عذاب کے مراحل میں ہر مرحلے کی مناسبت سے نازل ہوئے اور اِنھی مراحل کی ترتیب کے ساتھ سورہ میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ اِن میں سے پہلا شذرہ آیت ۱۲ پر ختم ہو گیا ہے۔ یہاں سے دوسرا شروع ہوتا ہے جس کی پہلی آیت ہی واضح کر دیتی ہے کہ یہ کچھ فصل سے نازل ہوا ہے، اِس لیے کہ اوپر جس معاہدے کے بارے میں فرمایا تھا کہ اگر توڑ دیں، یہ آیت بتا رہی ہے کہ وہ معاہدہ قریش نے توڑ دیا ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾

بھی کر چکے ہیں[۱۴۷] اور وہی ہیں جنھوں نے تم سے جنگ چھیڑنے میں پہل کی ہے[۱۴۸]۔ کیا تم اُن سے ڈرتے ہو؟ سو اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تم اُس سے ڈرو، اگر تم فی الواقع مومن ہو۔ اُن سے لڑو، اللہ تمھارے ہاتھوں سے اُن کو سزا دے گا[۱۴۹] اور اُنھیں ذلیل و خوار کرے گا[۱۵۰] اور تمھیں اپنی مدد سے اُن پر غلبہ عطا فرمائے گا اور مومنوں کے ایک گروہ کے کلیجے (اِس

۱۴۷۔ مطلب یہ ہے کہ اِن کا یہ پہلا جرم نہیں ہے، اِس سے پہلے یہ خدا کے رسول کو اُس کے وطن سے نکالنے کی جسارت کر چکے ہیں۔ قرآن کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی تکذیب کے بعد جب کوئی قوم اُسے وطن سے نکالنے یا قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو اُس کی مہلت عمر بھی ختم ہو جاتی ہے۔ رسولوں کے باب میں یہی سنت الٰہی ہے۔ قرآن نے یہ اُسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اِس سے مزید وضاحت ہوگئی کہ یہ آیتیں قریش ہی سے متعلق ہیں، اِن کا کسی دوسرے قبیلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۴۸۔ یعنی جب ہجرت کے موقع پر قتل کر دینے میں کامیاب نہیں ہوئے تو قافلے کی حفاظت کا بہانہ کر کے حملہ آور ہو گئے اور اِس طرح خدا کے رسول اور اُس کے ساتھیوں کے خلاف صریح جارحیت کا ارتکاب کیا۔ یہ جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے جس سے اُس بات کی تائید ہوتی ہے جو پیچھے بیان ہو چکی ہے کہ اِس جنگ کے لیے پیش قدمی تمام تر قریش کی طرف سے ہوئی تھی۔

۱۴۹۔ یہ قرآن نے خود صراحت فرما دی ہے کہ پیچھے جس قتل عام کا حکم دیا ہے، وہ درحقیقت خدا کا عذاب ہے جو آخری پیغمبر کے منکرین پر اُس کے ساتھیوں کے ہاتھوں سے نازل کیا جا رہا ہے۔

۱۵۰۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ رسولوں کی تکذیب کا اصلی محرک استکبار ہوتا ہے اور استکبار کی سزا دنیا اور آخرت میں ذلت اور خواری ہی ہے۔

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑮

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑯ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ

سے) ٹھنڈے کرے گا[151] اور اُن کے دلوں کا غم وغصہ دور فرمائے گا اور (اِن منکروں میں سے) جن کو چاہے گا، اللہ اپنی عنایت سے توبہ کی توفیق بھی دے گا۔ اللہ علیم و حکیم ہے[152]۔ ۱۳-۱۵

کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیے جاؤ گے، دراں حالیکہ اللہ نے اُن لوگوں کو ابھی جانا ہی نہیں جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا اور اللہ اور اُس کے رسول اور اُن کے ماننے والوں کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا؟[153] (یاد رکھو)، جو کچھ تم کر رہے ہو،

---

۱۵۱ اُس گروہ کی طرف اشارہ ہے جسے اسلام لانے کے جرم میں برسوں ستایا گیا تھا۔ اُن کی دل داری کے لیے فرمایا ہے کہ جن سنگ دلوں کے ہاتھوں تم مظالم کا ہدف بنے رہے ہو، اب اُن کی سزا کا وقت آ گیا ہے۔ مطمئن رہو، یہ سزا ایسی عبرت ناک ہوگی کہ تمھارے سینے اِس سے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔

۱۵۲ مسلمانوں کا ایک گروہ آرزومند تھا کہ اُن کے اعزہ واقربا عذاب الٰہی سے دوچار ہونے کے بجائے ایمان لے آئیں۔ یہ اُن کو خوش خبری دی ہے کہ تمھاری یہ آرزو بھی کسی حد تک پوری ہو جائے گی اور اللہ اپنے علم و حکمت کے مطابق جس کو چاہے گا، توبہ اور اصلاح کی توفیق بھی عطا فرمائے گا۔

۱۵۳ مطلب یہ ہے کہ ابھی جماعت کی تطہیر نہیں ہوئی اور وہ لوگ پوری طرح الگ نہیں

شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ

اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔ (تم اِنھیں بیت اللہ کے متولی سمجھتے اور اِسی بنا پر اُن سے ہم دردی رکھتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ) اِن مشرکوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کی مسجدوں[۱۵۴] کا انتظام کریں، دراں حالیکہ وہ خود اپنے اوپر کفر کے گواہ ہیں[۱۵۵]۔ وہی ہیں کہ اُن کے سارے اعمال ضائع ہو گئے[۱۵۶] اور وہ ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کا انتظام کرنے والے تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخر کو مانتے ہوں، نماز کا

ہوئے جو سچے مجاہدین ہوں اور اللہ و رسول اور اُن کے ماننے والوں کے سوا کسی کی دوستی اور قرابت کی پروا نہ کریں۔ اِس وقت جو دینونت برپا ہے، اُس کے لیے اُنھیں الگ کرنا ضروری ہے۔ یہ امتحان اِسی مقصد سے برپا کیا جا رہا ہے، ورنہ خدا کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ آسمان سے عذاب نازل کرتا اور جن لوگوں سے تمھیں لڑنے کے لیے کہا جا رہا ہے، اُنھیں اُسی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا، جس طرح عاد و ثمود صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے تھے۔

۱۵۴؎ یہ قرآن کی بلاغت ہے۔ اِس سے مراد اگرچہ مسجد حرام ہی ہے، لیکن اللہ کی مسجدوں کے الفاظ سے حکم بھی عام ہو گیا ہے اور اُس کی علت بھی پوری طرح واضح ہو گئی ہے۔

۱۵۵؎ قریش اپنے شرک کا خود اعتراف کرتے تھے۔ اُسی کو یہاں کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا اُس کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔

۱۵۶؎ اللہ شرک کے ساتھ کسی نیکی کو بھی قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ جو اعمال وہ حرم کی خدمت کے لیے کر رہے ہیں، آخرت میں اُن کا کوئی اجر اُن کے لیے باقی نہ رہے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿١٨﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

اہتمام کرتے ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں[157]۔ سو توقع ہے کہ یہی لوگ راہ یاب ہوں گے[158]۔ کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کا انتظام کر دینے کو اُن لوگوں کے برابر کر دیا ہے جو اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہے؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

التوبه ۹

’’...خدا کے ہاں صرف وہی نیکی باقی رہتی ہے جو توحید کے ساتھ ہو۔ مذہبی صحیفوں میں مشرک کو زانیہ عورت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح ایک عورت کا اپنے شوہر کے ساتھ سارا چاؤ پیار بے کار ہے، اگر وہ بدکار ہے، اُسی طرح بندے کا سارا کیا دھرا برباد ہے، اگر وہ اپنے رب کا کسی کو شریک ٹھیراتا ہے۔‘‘ (تدبرقرآن ۳/۵۵۰)

۱۵۷؎ یعنی اُن کے اندر کسی غیر اللہ کا خوف نہ ہو۔ یہ شرک کے اصلی محرک سے اُس کی نفی کی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ حرم کی تولیت، بے شک اولاد ابراہیم کے سپرد کی گئی ہے، مگر اِس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُن صفات کے حامل بن کر رہیں جو اِس منصب کے لیے بنیادی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِن میں اہم ترین شرط یہ ہے کہ وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں۔

۱۵۸؎ اصل میں لفظ 'اِهْتِدَآء' استعمال ہوا ہے۔ یہ ہدایت منزل کے مفہوم میں ہے۔ یعنی کامیابی کے ساتھ اُس منزل تک پہنچیں گے جو آخرت میں اُن کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ آیت میں 'عَسٰى' کا لفظ بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...اِس بات کو 'عَسٰى' کے لفظ سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے۔ اِس میں قدم قدم پر مشکلات اور آزمایشیں ہیں۔ صرف وہی لوگ جادۂ مستقیم پر استوار رہ سکتے ہیں جن کے پاس توفیق الٰہی کا زادراہ ہو اور جن کو خدا سے استعانت کا سہارا

الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ﴿۲۱﴾ ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۲﴾

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ

التوبہ
۹

حقیقت یہ ہے کہ (مسجد حرام کے اِن مجاوروں نے اپنے اوپر ظلم ڈھایا ہے اور اب) اللہ اِن ظالم لوگوں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔[۱۵۹] اللہ کے ہاں اُن لوگوں کا درجہ بڑا ہے[۱۶۰] جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور وہی کامیاب ہوں گے۔ اُن کا پروردگار اُنھیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسے باغوں کی بشارت دیتا ہے جن میں اُن کے لیے دائمی راحت ہے۔ وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اجر عظیم اللہ ہی کے پاس ہے۔ ۱۶-۲۲

ایمان[۱۶۱] والو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان کے

حاصل ہو۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۵۰)

۱۵۹؎ یعنی اُس منزل تک نہیں پہنچائے گا جو آخرت میں اہل ایمان کی منزل ہے۔

۱۶۰؎ یہ تقابل کے لیے نہیں، بلکہ تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کا درجہ اللہ کے ہاں بہت اونچا ہے۔

۱۶۱؎ یہاں سے تیسرا شذرہ شروع ہوتا ہے۔ اِس کے مضامین سے واضح ہے کہ یہ ۹ ہجری میں

اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ

مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں۔ تم میں سے جو لوگ اُنھیں دوست بنائیں گے، وہی (اپنے اوپر) ظلم کرنے والے ہوں گے۔ اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارا خاندان اور تمھارا وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مندے سے تم ڈرتے ہو اور تمھارے وہ گھر جنھیں تم پسند کرتے ہو،[۱۶۲] یہ سب تمھیں اللہ سے، اُس کے رسول سے اور

کسی وقت اُس حج سے پہلے نازل ہوا ہے جس میں تمام اہل عرب سے اعلان براءت کیا گیا تھا۔

۱۶۲۔ یہ جن مرغوبات کی فہرست ہے، اُن میں، اگر غور کیجیے تو نہایت لطیف نفسیاتی ترتیب ملحوظ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...پہلے باپ، بیٹے، بھائی، بیوی اور خاندان کو لیا ہے جن کی محبت یا عصبیت آدمی کے لیے حق کی راہ میں حجاب اور آزمایش بنتی ہے۔ پھر اموال، کاروبار اور مکانات کا ذکر کیا ہے جو اصلاً مذکورہ متعلقین ہی کے تعلق سے مطلوب و مرغوب ہوتے ہیں اور آدمی صاحب توفیق نہ ہو تو اُس کے لیے یہ فتنہ بن جاتے ہیں۔ اموال کے ساتھ 'اِقْتَرَفْتُمُوْهَا' کی قید ہے۔ 'اِقْتِرَاف' کے معنی اکتساب کے ہیں۔ یہ قید اُس مال کے محبوب ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جس مال کو آدمی نے خود کمایا اور بڑھایا ہو، وہ اُس کو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اِسی طرح 'تجارت' کے ساتھ 'تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا' کی قید اِس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ وہ تجارت

اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۴﴾ لَقَدۡ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ فِیۡ مَوَاطِنَ کَثِیۡرَۃٍ ۙ وَّ یَوۡمَ حُنَیۡنٍ ۙ اِذۡ اَعۡجَبَتۡکُمۡ کَثۡرَتُکُمۡ فَلَمۡ تُغۡنِ

اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں[163] تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔[164] اور (جان لو کہ) اِس طرح کے بدعہد لوگوں کو اللہ راہ یاب نہیں کرے گا۔[165] حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمھاری مدد کی ہے۔ ابھی حنین کے دن بھی، جب

کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہے، اِس لیے کہ کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہی وہ چیز ہے جس کے متعلق تاجر کو ہر وقت یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ اُس پر کساد بازاری کا جھونکا نہ آ جائے اور اِس خطرے سے اُس کو بچائے رکھنے کے لیے وہ سارے جتن کرتا ہے، یہاں تک کہ وہی اُس کی معبود بن جاتی ہے۔ پھر نہ تو اُسے حلال و حرام کی تمیز باقی رہ جاتی ہے اور نہ ہجرت، جہاد اور اللہ کی راہ میں قطع علائق کی آزمایشیں اُسے گوارا ہوتیں۔ فرمایا کہ اِن میں سے ہر چیز ایک بت ہے اور جب تک بندہ اللہ کی خاطر اِن میں سے ہر بت کو توڑنے کے لیے تیار نہ ہو جائے، وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرسکتا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۵۳)

۱۶۳؎ یہ چیز اُس وقت واضح ہو جاتی ہے، جب ایک طرف اللہ و رسول کا مطالبہ ہو اور دوسری طرف اِن چیزوں کی محبت کا کوئی مطالبہ سامنے آ جائے۔ آدمی اگر اُس وقت اللہ و رسول کے مطالبے کو مقدم نہ رکھے تو اِس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ اُس کو اللہ و رسول سے زیادہ یہ چیزیں محبوب ہیں۔ ایمان و اسلام کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ یہ چیزیں محبوب نہ ہوں، بلکہ صرف یہ ہے کہ اللہ و رسول اور اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔

۱۶۴؎ یعنی اُسی انجام بد تک پہنچا دے جو اوپر مکذبین کے لیے بیان ہوا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اوپر جس ترجیح کا ذکر ہوا ہے، وہ ایمان کا ایسا تقاضا ہے کہ جسے پورا نہ کیا جائے تو مومن و کافر اپنے انجام کے لحاظ سے یکساں ہو سکتے ہیں۔

۱۶۵؎ اوپر مشرکین کے بارے میں ارشاد ہوا تھا کہ اللہ اُنھیں راہ یاب نہیں کرے گا۔ یہاں

عَنكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ

تم اپنی کثرت پر اترا رہے تھے۔ پھر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بالآخر اللہ نے اپنے رسول پر اور اُس کے ماننے والوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی[166] اور (اُن کی مدد کے لیے) ایسی فوجیں اتار دیں جنھیں تم نے نہیں دیکھا[167] اور اُن لوگوں کو سزا دی جو (پیغمبر کے) منکر ہیں، اور اِس طرح کے منکروں کی یہی سزا ہے۔[168] پھر اِس کے بعد اللہ، جس پر

وہی بات اُن لوگوں کے متعلق فرمائی ہے جو ایمان و اسلام کا عہد باندھ لینے کے بعد منافقت کا رویہ اختیار کریں اور اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے انکار کر دیں۔

۱۶۶؎ یعنی دلوں میں عزم، حوصلہ اور قرار پیدا کر دیا۔

۱۶۷؎ فرشتوں کی غیبی فوجوں کی طرف اشارہ ہے جو زمانۂ رسالت کی مہمات میں ہمیشہ مسلمانوں کے ہم رکاب رہتی تھیں۔

۱۶۸؎ جن مذبذبین کو اوپر قتال کے لیے ابھارا ہے، یہ اُن کی ہمت افزائی فرمائی ہے کہ جس کام کے لیے تمھیں کہا جا رہا ہے، وہ خدا کا کام ہے۔ تمھاری قلت و کثرت اُس میں کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ اِس سے پہلے بھی وہ خدا کی مدد سے ہوا ہے اور اب بھی اُسی کی مدد سے ہو گا۔ اُس پر بھروسا رکھو۔ تم نے تقویٰ اختیار کیا اور ثابت قدم رہے تو وہ کسی حال میں تمھیں اپنی مدد سے محروم نہیں کرے گا۔ اِس میں خاص طور پر غزوۂ حنین کا حوالہ دیا ہے۔ یہ غزوہ فتح مکہ کے بعد شوال ۸ھ ہجری میں مکے اور طائف کے درمیان وادی حنین میں پیش آیا تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے اِس میں

يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٧﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا
الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ

چاہے، عنایت فرماتا اور اُسے توبہ کی توفیق بھی دیتا ہے۔ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[169] ۲۳-۲۷

ایمان والو، یہ مشرکین بالکل ناپاک ہیں، لہٰذا اپنے اِس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے پاس نہ پھٹکنے پائیں[170] اور (اِس کے نتیجے میں) اگر تمھیں تنگ دستی کا اندیشہ ہے تو

۱۲ ہزار فوج تھی جسے اُس وقت کے حالات میں ایک لشکر جرار کہا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف منکرین اُن کے مقابلے میں بہت کم تھے۔ لیکن اِس کے باوجود قبیلۂ ہوازن کے تیر اندازوں نے اُن کا منہ پھیر دیا اور مسلمان شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اِس کی وجہ یہ ہوئی کہ اُس دن وہ اپنی کثرت تعداد کے غرے میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ بہتوں کے اندر نہ خدا کی یاد کی طرف توجہ باقی رہی، نہ نظم و اطاعت اور اخلاص و انابت کا وہ اہتمام رہا جس کی تاکید پیچھے سورۂ انفال میں کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چند مٹھی بھر صحابہ، البتہ پوری استقامت کے ساتھ جمے رہے۔ چنانچہ اُنھی کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے کچھ تذکیر و تنبیہ کے بعد مدد فرمائی اور بالآخر فتح حاصل ہو گئی۔*

۱۶۹؎ یہ وہی مضمون ہے جو اوپر آیت ۱۵ میں گزر چکا ہے۔

۱۷۰؎ جس اعلان براءت سے سورہ کی ابتدا ہوئی ہے، یہ اُسی کی تکمیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین عقیدے کی جس نجاست میں مبتلا ہیں، اُس کے ساتھ یہ حج و عمرہ کے لیے بھی حدود حرم میں داخل نہیں ہو سکتے۔ بیت اللہ توحید کا مرکز ہے، اِس میں اب اِن میں سے کسی مشرک کا داخل ہونا

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۶۹۔

يُغۡنِيۡكُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖۤ اِنۡ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۸﴾

(مطمئن رہو)، اللہ چاہے گا تو عنقریب اپنے فضل سے تمھیں غنی کر دے گا۔[۱۷۱] اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔[۱۷۲] ۲۸

گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کے پیغمبر کی تکذیب کے بعد اِن کے لیے اسلام ہے یا تلوار۔ تاہم معاہدات کی مدت پوری کرنے کے لیے کسی کو مہلت بھی دی گئی ہو تو اِس سال کے بعد اُسے حرم میں آنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ یہ حکم، ظاہر ہے کہ اُنھی مشرکین کے لیے تھا جن کے شرک کی نجاست اُن پر اتمام حجت کے درجے میں واضح کر دی گئی تھی۔ اِس کا اُن لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو اُن کے بعد اب توحید کے اِس مرکز کو دیکھنے اور اِس کی دعوت کو سمجھنے کے لیے وہاں جانا چاہتے ہوں۔

۱۷۱۔ حج کو اُس زمانے میں تجارت اور کاروبار کے پہلو سے بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ اُسی کے پیش نظر فرمایا ہے کہ اِس حکم سے کسی کو تشویش نہ ہو کہ مشرکین نہیں آئیں گے تو اِس سے کاروبار اور تجارت پر برا اثر پڑے گا جس سے مسلمانوں کی معاشی حالت جو پہلے ہی خراب ہے، خراب تر ہو جائے گی۔ لوگ مطمئن رہیں۔ خدا کی مدد اُن کے شامل حال ہے۔ وہ عنقریب اِس پہلو سے بھی اُن کو مستغنی کر دے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ وعدہ پورا ہوا اور اِس طرح پورا ہوا کہ ایک دن کے لیے بھی مکہ کی تجارت اِس بندش سے متاثر نہ ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تو یہ حال ہوا کہ مصر و شام اور روم و ایران کے خزانے بھی اونٹوں پر لد لد کر اسلام کے بیت المال میں پہنچنے لگے اور اللہ نے اپنے فضل سے مسلمانوں کو اِس طرح غنی کر دیا کہ لوگ اپنی زکوٰۃ کا مال مدینہ کی گلیوں میں لیے پھرتے تھے، لیکن اُس کا کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۵۵۶)

اِس میں مسلمانوں کے لیے یہ سبق ہے کہ وہ اگر ایمانی اقدار کی حفاظت کے لیے کسی وقت اپنے معاشی مصالح قربان کریں گے تو اُنھیں خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ وہ اُن کے نقصان کی تلافی

التوبہ
۹

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾

(اِن مشرکوں کے علاوہ) اُن اہل کتاب سے بھی لڑو جو نہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں، نہ اللہ اور اُس کے رسول کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حرام ٹھیراتے ہیں اور نہ دین حق کو اپنا دین بناتے ہیں[۷۳]، (اُن سے لڑو)، یہاں تک کہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور ماتحت بن کر رہیں[۷۴]۔ ۲۹

التوبہ
۹

کے لیے ایسی راہیں کھول سکتا ہے جن کا وہ گمان بھی نہ رکھتے ہوں۔

۷۲۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے لحاظ سے سوچتے ہو، لیکن اللہ علیم و حکیم ہے، اُس نے یہ حکم دیا ہے تو اِس کے نتائج و عواقب بھی اُس سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ اُس پر بھروسا رکھو، اُس کے تمام کام علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

۷۳۔ یہ لوگ اگرچہ ایمان کے مدعی تھے، لیکن درحقیقت اِن میں سے کسی چیز کو بھی نہیں مانتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...ایمان کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ کے شرائط کے تحت ہو، لیکن اُن کا ایمان اپنی خواہشوں اور بدعات کے تحت تھا۔ مشرکانہ عقائد ایجاد کر کے اُنھوں نے خدا کی نفی کر دی، اپنے آپ کو چہیتی اور مغفور امت قرار دے کر آخرت کا ابطال کر دیا اور اللہ اور رسول کی حرام ٹھیرائی ہوئی چیزوں کو جائز بنا کر شریعت کو کالعدم کر دیا۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کیا کہ اللہ نے اپنے آخری رسول کے ذریعے سے اپنے وعدے کے مطابق جو دین حق بھیجا تو اُس کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کیا، بلکہ اُس کی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیا اور اُس کے خلاف برابر سازشوں میں سرگرم رہے۔" (تدبر قرآن ۳/ ۵۵۹)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ن ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

(اُن کا دین اب یہی ہے کہ) یہودی کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں[۱۷۵] اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ اُن کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ وہ اُنھی

التوبہ
۹

۱۷۴ یعنی مغلوب ہوکر اور اپنی اِس مغلوبیت اور محکومی کو تسلیم کر کے اُس کی علامت کے طور پر جزیہ ادا کریں۔ اوپر مشرکین کی سزا بیان ہوئی ہے کہ ایمان نہ لائیں تو قتل کر دیے جائیں۔ یہ اُن اہل کتاب کی سزا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود آپ کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ یہ رعایت اِس لیے کی گئی ہے کہ اہل کتاب اصلاً توحید ہی سے وابستہ تھے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ بھی شرک کے مرتکب تھے، مگر بنی اسمٰعیل کی طرح اُنھوں نے شرک کو دین اور عقیدے کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا تھا۔ قرآن نے دوسری جگہ واضح کر دیا ہے کہ لوگ مشرک نہ ہوں تو قیامت میں بھی اِسی طرح رعایت کے مستحق ہوں گے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن کا یہ حکم بھی اُس کے قانون اتمام حجت کی ایک فرع اور اُنھی اقوام کے ساتھ خاص تھا جن پر خدا کے آخری پیغمبر کی طرف سے حجت پوری ہوگئی۔ اُن کے لیے یہ اُسی طرح کا عذاب تھا جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں اُن کے مخاطبین پر ہمیشہ نازل کیا جاتا رہا ہے۔ اُن کے بعد اب دنیا کے کسی غیر مسلم سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۷۵ یہ وہی عزرا (Ezra) ہیں جنھیں یہودی اپنے دین کا مجدد کہتے ہیں۔ اِن کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ یہودی اپنے دور ابتلا میں تورات کو گم کر بیٹھے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اِنھی عزرا نے اُسے اپنی یادداشت سے از سر نو مرتب کیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل اِن کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیرہ نماے عرب میں جو یہودی قبائل آباد تھے، اُن کے اندر یہ تعظیم اِس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اُنھوں نے اِن کو خدا کا بیٹا بنا

مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

منکروں کی سی بات کہہ رہے ہیں جو اُن سے پہلے ہو گزرے ہیں[۱۷۶]۔ اُن پر خدا کی مار، وہ کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔ اللہ کے سوا اُنھوں نے اپنے فقیہوں اور راہبوں کو رب بنا ڈالا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی[۱۷۷]۔ دراں حالیکہ اُنھیں ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا، اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ پاک ہے[۱۷۸] اُن چیزوں سے جنھیں وہ شریک

ڈالا تھا۔

۱۷۶؎ یہ اُن مشرک اقوام کی طرف اشارہ ہے جو اپنی دیومالاؤں میں آفتاب کو خدا بنا کر اُس کے لیے بیٹا فرض کیے ہوئے تھیں۔ یہود و نصاریٰ اُنھی سے متاثر ہوئے اور اپنی کتابوں کے بعض الفاظ کو موقع و محل سے ہٹا کر اُن کے وہ معنی بیان کرنے لگے جو اِن نئے مشرکانہ عقائد کے لیے بطور سند پیش کیے جا سکیں۔

۱۷۷؎ یعنی وہی حیثیت دے دی ہے جو رب العٰلمین کے لیے ماننی چاہیے۔ چنانچہ اُن کے لیے تحلیل و تحریم کے خدائی اختیارات مان کر اُن کے ہر حکم اور ہر فیصلے کو اُسی طرح واجب الاطاعت سمجھتے ہیں، جس طرح خدا کے احکام اور فیصلوں کو واجب الاطاعت سمجھا جاتا ہے۔ اُن کے مقابلے میں کتاب الٰہی کی کوئی صریح آیت اور پیغمبر کا کوئی واضح ارشاد بھی پیش کر دیا جائے تو اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

۱۷۸؎ اصل میں 'سُبْحٰنَهٗ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ تنزیہ کا کلمہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس کے اندر توحید کی نہایت واضح منطقی دلیل بھی ہے۔ وہ یوں کہ کسی چیز کی مسلم اور بنیادی صفات سے بالکل متناقض صفات کا اُس کے ساتھ جوڑ ملانا بالبداہت خلاف عقل ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

ٹھیراتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ خدا کے اِس نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا، خواہ اِن منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔[۱۷۹] وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ (اِس سرزمین کے) تمام ادیان پر اُس کو غالب کر دے، خواہ مشرکین بھی اِسے کتنا ہی ناپسند کریں۔[۱۸۰] ۳۰-۳۳

اِس اصول کے مطابق خدا کا کسی کو شریک ٹھیرانا اُس کی شان الوہیت کے منافی ہے، کیونکہ اِس سے اُس کی مسلمہ صفات کی نفی لازم آتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۶۳)

۱۷۹؎ یہ اکمال دین کی تمثیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جو کچھ چاہتے ہیں، اُس کے علی الرغم جو دین ہم نے اپنے پیغمبر کو پہلی وحی سے دینا شروع کیا تھا، اُسے پورا کریں گے اور اُس کی دعوت وہاں تک پہنچا دیں گے، جہاں تک پہنچنا اُس کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

۱۸۰؎ یہ غلبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اور اُن مشرکین کی خواہشوں کے علی الرغم قائم ہونا تھا جو آپ کے مخاطبین اولین تھے اور جن کا ذکر 'لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ' کے الفاظ میں ہوا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں لفظ 'كُلّ' کو اُسی تخصیص کے ساتھ لیا جائے جو ہم نے ترجمے میں واضح کر دی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قرآن کی یہ بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں دین حق کا غلبہ پورے جزیرہ نماے عرب پر قائم ہو گیا۔ یہ ایک سنت الٰہی کا ظہور تھا جو رسولوں کے باب میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ اُن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ اُنھیں غلبہ عطا فرماتے اور اُن کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ

ایمان[181] والو، اِن فقیہوں اور راہبوں میں بہتیرے ایسے ہیں جو لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں[182]۔ سو اُن لوگوں کو دردناک عذاب کی خوش خبری دو جو (اِن میں سے) سونا اور چاندی ڈھیر کر رہے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ

التوبه
۹

اِس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ آخرت کی جزا و سزا کا تصور بھی اُسی معیار پر ثابت کر دیا جائے جس معیار پر سائنسی حقائق معمل (laboratory) کے تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں۔ اِس کا انقلاب کی کسی جدوجہد سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس طرح کہ دور حاضر کے بعض مفکرین نے سمجھا ہے۔ یہاں اِس کا ذکر مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے ہوا ہے کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور مشرکین اور اہل کتاب، دونوں کے خلاف جس آخری اقدام کا حکم اُنھیں دیا گیا ہے، وہ اِسی فیصلے کے نفاذ کے لیے دیا گیا ہے۔

۱۸۱۔ اوپر وہ جرائم بیان ہوئے ہیں جن کے مرتکب یہ لوگ اپنے خالق کے حقوق کے معاملے میں ہوئے، اب اِن کے وہ جرائم بیان ہو رہے ہیں جن کا ارتکاب یہ خلق کے معاملے میں کرتے رہے تھے۔ اِس میں خاص طور پر علما اور مشائخ کا ذکر کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ خاص پہلو بھی ملحوظ رہے کہ عوام کے کردار کے بجائے یہاں علما اور مشائخ کے کردار کو بے نقاب کیا ہے تا کہ یہ حقیقت سامنے آ جائے کہ جن کے علما اور مشائخ کا کردار اِس درجہ فاسد ہو چکا ہے، اُن کے عوام کا کیا ذکر اور اب اُن کی اصلاح کی کیا توقع! اصلاح کا یہ ذریعہ علما و مشائخ ہی ہو سکتے تھے۔ جب وہی مال و دولت کے پجاری بن کر رہ گئے ہیں تو اصلاح کن کے ہاتھوں ہو گی۔" (تدبر قرآن ۳/ ۵۶۵)

۱۸۲۔ یعنی جب کوئی دعوت اصلاح کے لیے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے یہی اپنے الزامات،

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

میں خرچ نہیں کرتے۔[۱۸۳] اُس دن جب اُن کے اِس سونے اور چاندی پر دوزخ میں آگ دہکائی جائے گی، پھر اُن کی پیشانیاں اور اُن کے پہلو اور اُن کی پیٹھیں اُس سے داغی جائیں گی ــــــ یہی ہے جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا، سو چکھو اُس کو جو تم جمع کرتے رہے ہو۔[۱۸۴] ۳۴-۳۵

اعتراضات اور فتووں کے ساتھ اُس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۱۸۳؎ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد حال اور مستقبل کی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں کے لیے روپیہ جمع رکھنا ممنوع نہیں ہے، لیکن خلق یا خالق کی طرف سے اُس کے انفاق کا کوئی مطالبہ سامنے آجائے اور آدمی اُسے خرچ کرنے سے انکار کر دے تو اُس کی سزا وہی ہے جو قرآن نے آگے بیان کر دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہی انفاق حکمت کا خزانہ بخشتا ہے، اِسی سے نور قلب میں افزونی ہوتی ہے۔ اگر مال کے ڈھیر رکھتے ہوئے کوئی شخص اپنے پاس پڑوس کے یتیموں، بے کسوں، ناداروں سے بے پروا رہے یا دعوت دین، اقامت دین، تعلیم دین اور جہاد فی سبیل اللہ کے دوسرے کاموں سے بے تعلق ہو جائے تو وہ عند اللہ مواخذے اور مسئولیت سے بری نہیں ہو سکتا، اگرچہ اُس نے اپنے مال کا قانونی تقاضا پورا کر دیا ہو۔'' (تدبر قرآن ۳/۵۶۶)

۱۸۴؎ یہ سزا جرم کی مناسبت سے ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''... دولت جمع کرنے کی سرگردانی میں بڑا دخل دو چیزوں کو ہوتا ہے: ایک ہم چشموں میں اپنا

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوۡرِ عِنۡدَ اللّٰهِ اثۡنَا عَشَرَ شَهۡرًا فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ مِنۡهَاۤ اَرۡبَعَةٌ حُرُمٌ‌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظۡلِمُوۡا فِيۡهِنَّ اَنۡفُسَكُمۡ‌ ؕ وَقَاتِلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ كَآفَّةً‌ ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۳۶﴾ اِنَّمَا النَّسِىۡٓءُ

(ایمان والو، تم اِن سے لڑو اور یاد رکھو کہ) اللہ کے نزدیک، جس دن سے اُس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے، مہینوں کی تعداد اللہ کے نوشتے میں بارہ ہی ہے[۱۸۵]۔ جن میں چار مہینے حرمت والے ہیں[۱۸۶]۔ یہی دین قیم ہے[۱۸۷]، سو اِن چار مہینوں میں (کسی کے خلاف اقدام سے) اپنی جان پر کوئی ظلم نہ کر بیٹھو اور مشرکوں سے، (خاص کر) سب مل کر لڑو، جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے

سر اونچا رکھنے کی خواہش، دوسری اپنے ذاتی آرام و راحت کی طلب۔ فرمایا کہ جو لوگ دنیا میں سربلندی اور فخر کی خاطر دولت جمع کریں گے، اُن کی دولت بروز قیامت اُن کی پیشانی پر داغ لگائے گی۔ اِسی طرح جو لوگ نرم ریشمیں و مخملیں گدوں، غالیچوں، قالینوں اور صوفوں کے درپے ہو کر انفاق کی سعادت سے محروم رہیں گے، اُن کی یہ بچائی ہوئی دولت اُن کے پہلوؤں اور اُن کی پیٹھوں کو زخمی کرے گی۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۶۷)

۱۸۵ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اہل عرب نسی کی خاطر، جس کا ذکر آگے آرہا ہے، مہینوں کی تعداد ۱۳ یا ۱۴ بنا لیتے تھے، جب کہ چاند مہینے میں ایک ہی دفعہ ہلال بن کر طلوع ہوتا ہے اور اِس حساب سے سال کے ۱۲ ہی مہینے بنتے ہیں۔

۱۸۶ یعنی ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم حج کے لیے اور رجب عمرے کے لیے۔

۱۸۷ یعنی یہ حکم کہ سال میں چار مہینے حج و عمرہ کی غرض سے جنگ و جدال کے لیے حرام ہوں گے۔ فرمایا کہ یہ ٹھیک وہی دین ہے جو خدا نے اپنے پیغمبروں، خاص طور پر ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام

زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ

جو زیادتی سے بچنے والے ہوں۔[188] (حقیقت یہ ہے کہ) مہینوں کا ہٹا دینا[189] اِن کے کفر ہی میں ایک اضافہ ہے جس سے یہ منکرین گم راہی میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔[190] کسی سال یہ حرام مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اُس کو حرام ٹھیراتے ہیں تاکہ خدا کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی گنتی پوری کر کے خدا کے حرام کیے ہوئے کو (اپنے لیے) حلال بنا

التوبہ ۹

کے ذریعے سے اُن کے ماننے والوں کو دیا تھا۔

۱۸۸؎ مطلب یہ ہے کہ پیچھے جس قتال کا حکم دیا گیا ہے، وہ اگرچہ خدا کا عذاب ہے، لیکن اُس میں بھی حرام مہینوں کا لحاظ ضروری ہے۔ تاہم اِن کے حدود حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے جنگ لازماً کی جائے گی اور یہ جنگ مشرکین سے من حیث الجماعت ہوگی۔ اِس میں کسی رشتہ وقرابت، کسی دوستی اور کسی سیاسی، معاشرتی یا معاشی مفاد کی بنا پر کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ یہ جنگ کفر کے استیصال کے لیے ہے، اِس میں اِس نوعیت کے تمام تعلقات بالاے طاق رکھ دیے جائیں گے۔ یہی ایمان واسلام کا تقاضا ہے۔

۱۸۹؎ اصل میں 'نَسِیْٓء' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ عرب جاہلیت کی اصطلاح ہے۔ اِس کے دو طریقے تھے: ایک یہ کہ کسی کے خلاف لڑائی چھیڑنا پیش نظر ہو تو حرام مہینے کی جگہ حلال مہینہ رکھ کر لڑائی کو جائز کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ تجارتی اغراض کے لیے قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لیے اُس میں کبیسہ کا ایک مہینہ بڑھا دیا جائے تاکہ حج ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا رہے۔

۱۹۰؎ نسی کا یہ طریقہ اہل عرب اِس لیے اختیار کرتے تھے کہ اِس طرح کاروباری مفادات بھی محفوظ رہتے تھے اور حرام مہینوں کی تعداد بھی پوری ہو جاتی تھی جو دین داری کا تقاضا تھا، لیکن قرآن

زُيِّنَ لَهُمۡ سُوۡٓءُ اَعۡمَالِهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۳۷﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَا لَـكُمۡ اِذَا قِيۡلَ لَـكُمُ انْفِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ

لیں۔ اِن کے برے اعمال اِن کے لیے خوش نما بنا دیے گئے ہیں[۱۹۱]۔ اللہ کا فیصلہ ہے کہ اِس طرح کے منکر لوگوں کو وہ راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۳۶-۳۷

ایمان[۱۹۲] والو، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جہاد

نے اِسے کفر میں ایک اور اضافہ قرار دیا۔ اِس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام کے جس دین سے وہ پہلے ہی بڑی حد تک منحرف تھے، اُن کی یہ حیلے بازی اُس سے مزید انحراف کا باعث بن جاتی تھی۔ فرمایا کہ اِس سے یہ خدا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، لیکن الٹا اُس کے قانون کی زد میں آ جاتے ہیں اور گم راہی کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ خدا کا قانون یہی ہے کہ جو لوگ دین و شریعت کے معاملے میں حیلہ بازی کے طریقے اختیار کریں، وہ کبھی راہ یاب نہیں ہوتے۔ اللہ اُنھیں خود اُن کے پیدا کیے ہوئے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

۱۹۱ یعنی اِس حیلہ بازی کو بڑی فقاہت سمجھتے ہیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہ آخری درجے کی بد عملی ہے جو شیطان نے اِن کی نگاہوں میں خوش نما بنا دی ہے۔

۱۹۲ یہ چوتھا شذرہ ہے اور ۹ ہجری میں کسی وقت نازل ہوا ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی تیاری کر رہے تھے۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے خلاف اعلان جنگ کے بعد یہاں سے روے سخن اب منافقین کی طرف ہے اور سورہ کے آخر تک اُنھی کا تعاقب فرمایا ہے۔

استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس سے پہلے منافقین کے رویے پر جو تنقید بھی ہوئی، اُس کا لب و لہجہ نرم رہا ہے، لیکن اِس سورہ میں جس طرح مشرکین اور اہل کتاب کے باب میں آخری فیصلے کا اعلان کر دیا گیا

اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ۬ وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ

کے لیے) نکلو تو زمین پر ڈھیر ہوئے جاتے ہو؟[193] کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہو؟ سو (حقیقت یہ ہے کہ) دنیا کی زندگی کا یہ سروسامان تو آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔ (اِس لیے اٹھو)، اگر نہیں اٹھو گے تو (یاد رکھو کہ) خدا تمھیں دردناک سزا دے گا اور تمھاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔[194] خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[195] اگر تم پیغمبر کی مدد نہیں کرو گے تو

ہے، اُسی طرح منافقین کے بارے میں بھی ایک قطعی فیصلہ سنا دیا گیا ہے تاکہ اُن میں سے جن کے اندر توبہ اور اصلاح کی کوئی صلاحیت باقی ہے، وہ توبہ اور اصلاح کے بعد اسلامی معاشرے کے صالح جزو بن جائیں اور جو بالکل مردہ ہو چکے ہیں، وہ خس و خاشاک کے اُس ڈھیر میں شامل ہو جائیں جس کے صاف کر دینے کا آخری فیصلہ قدرت کی طرف سے ہو چکا ہے۔''

(تدبر قرآن ۳/۵۷۲)

۱۹۳ اصل الفاظ ہیں: 'اِثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ'۔ اِن میں، اگر غور کیجیے تو قرآن نے اُس حالت کی تصویر کھینچ دی ہے جسے بیان کرنا مقصود ہے۔

۱۹۴ یہ اُن لوگوں کی سزا ہے جنھیں خدا اپنے کسی مشن کے لیے منتخب کر لے اور وہ اُس کے تقاضوں کو پورا کرنے سے انکار کر دیں۔ ذریت ابراہیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہمیشہ رہا ہے، وہ اِسی قانون کے تحت ہے۔

۱۹۵ یہ مختصر سا جملہ بہ یک وقت کئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ استاذ امام امین احسن

اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ثَانِیَ اثۡنَیۡنِ اِذۡ ہُمَا فِی الۡغَارِ اِذۡ یَقُوۡلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ۚ فَاَنۡزَلَ اللّٰہُ سَکِیۡنَتَہٗ عَلَیۡہِ وَ اَیَّدَہٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡہَا وَ جَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا السُّفۡلٰی ؕ

کچھ پروا نہیں، اِس لیے کہ اُس کی مدد تو اللہ نے اُس وقت فرمائی، جب اِنھی منکروں نے اُس کو اِس طرح نکالا تھا کہ وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا[196]، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے[197]۔ اللہ نے اُس وقت اُس پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور ایسے لشکروں سے اُس کی مدد کی جو تم کو نظر

اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"...ایک یہ کہ خدا تمھیں عذاب دینے پر قادر ہے، دوسری یہ کہ تمھاری جگہ دوسروں کو اٹھا کھڑا کرنے پر قادر ہے، تیسری یہ کہ وہ اپنی ہر اسکیم بروے کار لانے پر قادر ہے، اپنے کسی بھی ارادے کی تکمیل میں وہ کسی کا محتاج نہیں۔" (تدبر قرآن ۳/۵۷۶)

۱۹۶؎ یہ سفر ہجرت کی طرف اشارہ ہے جس میں صرف سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔

۱۹۷؎ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِس اندیشے سے کہ آپ کا تعاقب کیا جائے گا، مکہ سے نکل کر تین دن کے لیے غار ثور میں پناہ گیر ہو گئے تھے۔ یہ اُسی موقع کا ذکر ہے۔ آپ کا تعاقب کرنے والے عین اُس غار کے دہانے تک پہنچ گئے تھے جس میں آپ چھپے ہوئے تھے۔ سیدنا ابوبکر کو سخت خوف لاحق ہوا کہ کہیں کوئی شخص آگے بڑھ کر غار میں جھانک نہ لے، لیکن آپ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا اور اپنے ساتھی کی تسلی کے لیے آپ کی زبان مبارک سے وہ بے مثل الفاظ نکلے جو قرآن نے یہاں نقل کیے ہیں*۔

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/۱۱۱۔

وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٤٠﴾

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۗ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٤٢﴾

التوبہ
۹

نہیں آئے اور منکروں کی بات اُس نے نیچی کر دی اور خدا کی بات ہی اونچی رہی۔ اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے[۱۹۸]۔ ۳۸-۴۰

تم نکلو، خواہ تم ہلکے ہو یا بوجھل، اور اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو[۱۹۹]۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔ (اے پیغمبر)، اگر فائدہ نزدیک اور سفر ہلکا ہوتا تو یہ لوگ ضرور تمھارے پیچھے ہو لیتے، مگر یہ منزل اِن پر کٹھن ہو گئی[۲۰۰]۔ اب یہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم نکل سکتے تو ضرور تمھارے ساتھ نکلتے۔ یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں[۲۰۱] اور اللہ جانتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۴۱-۴۲

۱۹۸؎ یہ بالاجمال اُن سب تائیدات الٰہی کا حوالہ ہے جو اُس وقت تک ظاہر ہو چکی تھیں۔

۱۹۹؎ یعنی سر و سامان کم ہو یا زیادہ، اِسے جہاد سے جی چرانے کا بہانہ نہ بناؤ۔ یہ نفیر عام کا موقع ہے۔ اِس نوعیت کا کوئی عذر بھی اِس وقت مقبول نہیں ہے۔

۲۰۰؎ یعنی تبوک کا سفر جس میں روم جیسی بڑی اور منظّم طاقت سے مقابلہ تھا، مسافت طویل تھی، موسم شدید گرم تھا اور نئے سال کی فصل پک کر کٹنے کے لیے تیار ہو چکی تھی*۔

---

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/۱۳۱۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ

اللہ تم کو معاف کرے، (اے پیغمبر)، تم نے اِس سفر سے اِنھیں رخصت کیوں دے دی؟ تمھیں چاہیے تھا کہ ایسا نہ کرتے، یہاں تک کہ تم پر کھل جاتا کہ کون سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔[۲۰۲] جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر سچا ایمان رکھتے ہیں، وہ کبھی تم سے رخصت مانگنے نہیں آئیں گے کہ اُنھیں اپنے جان و مال کے ساتھ جہاد

التوبہ ۹

۲۰۱ اللہ اور اُس کے رسول کے سامنے جھوٹے عذرات پیش کیے جائیں تو اُس کا نتیجہ، ظاہر ہے کہ یہی ہے اور یہی ہونا چاہیے۔

۲۰۲ تبوک کے موقع پر جہاد کے لیے نفیر عام کا اصلی مقصد یہی تھا کہ جزا و سزا کے اِس مرحلے میں منافقین کے چہرے سے بھی نقاب الٹ دی جائے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کریم النفسی اور چشم پوشی اُن کے آڑے آئی اور آپ نے یہ جاننے کے باوجود کہ جو عذرات وہ پیش کر رہے ہیں، سب جھوٹے ہیں، اُنھیں قبول کر لیا اور رخصت دے دی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہایت دل نواز اسلوب میں آپ کو اِس پر توجہ دلائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... بات کا آغاز ہی عفو کے اعلان سے فرمایا کہ واضح ہو جائے کہ مقصود سرزنش اور عتاب نہیں، بلکہ توجہ دلا دینا ہے کہ منافقین تمھاری کریم النفسی سے بہت غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تم اپنی چشم پوشی کی وجہ سے اُن کے عذرات کو لاطائل سمجھنے کے باوجود اُن کو اجازت دے دیتے ہو جس سے وہ دلیر ہو جاتے ہیں کہ اُن کی مکاری کامیاب ہو گئی، حالاں کہ اگر تم اجازت نہ دیتے تو اُن کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ اُن کے جھوٹوں اور سچوں میں امتیاز ہو جاتا۔ تمھاری اجازت کے بغیر جو گھر میں بیٹھ رہتے، ہر شخص پہچان جاتا کہ یہ منافق ہیں، لیکن وہ تمھاری اجازت کو اپنے چہرے کی نقاب بنا لیتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۵۸۳)

بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

التوبه
۹

سے معاف رکھا جائے۔ اللہ اُن کو خوب جانتا ہے (جن کے عذر حقیقی ہیں اور) جو اُس سے ڈرنے والے ہیں۔ تم سے رخصت مانگنے تو وہی آتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں، سو اپنے اِسی شک میں حیران بھٹک رہے ہیں۔ اگر وہ نکلنا چاہتے تو ضرور اُس کا کچھ سامان کرتے، لیکن اللہ نے اُن کا اٹھنا پسند نہیں کیا، اِس لیے اُنھیں روک کر بٹھا دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔[۲۰۳] ۴۴-۴۶

(حقیقت یہ ہے کہ) اگر یہ لوگ تمھارے اندر شامل ہو کر نکلتے تو تمھارے لیے خرابی ہی کو بڑھانے کا باعث بنتے اور تمھارے درمیان اِن کی سب دوڑ دھوپ فتنہ انگیزی کے لیے ہوتی، اِس لیے کہ تمھارے اندر ایسے بھی ہیں جو کان لگا کر اِن کی سن لیتے ہیں۔[۲۰۴]

۲۰۳؎ یہ توفیق کے باب میں سنت الٰہی کا بیان ہے اور اسلوب طنزیہ ہے۔ آگے کی بعض آیتوں میں یہ طنز اور بھی تیز ہو گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جب تم نے اٹھنا پسند نہیں کیا تو خدا نے بھی تمھیں اِس کی توفیق نہیں دی، بلکہ یہی پسند کیا کہ جاؤ گھروں میں بیٹھنے والے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کی طرح تم بھی بیٹھے رہو۔ تمھارے لیے یہی موزوں ہے۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

اللہ اِن ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اِنھوں نے پہلے بھی فتنہ انگیزی کی کوشش کی ہے اور تمھارے لیے معاملات کا الٹ پھیر کرتے رہے ہیں[۲۰۵]، یہاں تک کہ اِن کی مرضی کے خلاف حق آیا اور اللہ کا حکم ظاہر ہو گیا۔ ۴۷-۴۸

۲۰۴۔ یہ اُن سادہ لوح مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے جن کی سادہ لوحی کے سبب سے منافقین بالعموم اُنھیں چکما دینے میں کامیاب ہو جاتے اور اِس طرح فتنہ انگیزی کے لیے کچھ نہ کچھ راستہ نکال لیتے تھے۔

۲۰۵۔ قرآن کے مخاطبین اِن سب چیزوں سے واقف تھے، اِس لیے اُس نے صرف اجمالی اشارہ کر دیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"...یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ بدر کے موقع پر... اللہ اور رسول کا منشا واضح ہونے کے باوجود مسلمانوں کو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنے کی راہ سجھانے کی کوشش کی، اِنھی لوگوں نے جنگ احد کے موقع پر پہلے تو شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا، پھر جب اِن کا مشورہ قبول نہیں ہوا تو عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر عین موقع پر الگ ہو گیا۔ پھر جنگ کے بعد اِسی کے ہم خیالوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا کہ نعوذ باللہ آپ قوم کے بدخواہ ہیں کہ خیر خواہوں کے مشورے کے خلاف ایک غلط مقام پر لے جا کر ہمارے بھائیوں کو کٹوا دیا اور شکست کا سبب بنے۔ پھر یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ مریسیع کے موقع پر اپنی فتنہ انگیزی سے ایسی صورت پیدا کر دی کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان تلوار چلتے چلتے رہ گئی۔ اِسی سلسلے میں اِن کی ایک نہایت سنگین شرارت واقعۂ افک کی شکل میں ظاہر ہوئی جو بات کا بتنگڑ بنانے کی ایک نہایت گھنونی مثال ہے۔ حنین کے موقع پر تقسیم غنیمت کے معاملے میں اِنھوں نے اپنی بد طینتی سے دلوں میں سخت کدورت پیدا کر دینے کی کوشش کی۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ

اِن میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے رخصت دیجیے اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالیے[۲۰۶] ــــــ سن لو، یہ فتنے میں پڑ چکے[۲۰۷] اور (اب) دوزخ اِن منکروں کو گھیرے ہوئے ہے[۲۰۸]۔ اگر تمھیں کوئی اچھائی پیش آتی ہے تو اِنھیں دکھ ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی

التوبہ ۹

غرض جو موقع بھی اِن کے ہاتھ آیا، اُس سے فائدہ اٹھا کر اِنھوں نے مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈلوانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔'' (تدبر قرآن ۳/۵۸۵)

۲۰۶ یعنی روم جانے کے لیے نہ کہیے کہ مبادا وہاں کوئی فتنہ ہمیں اپنی گرفت میں لے لے۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ اِس سے اُن کی مراد رومی عورتوں کے حسن و جمال کا فتنہ تھا۔* یہ اُسی طرح کا عذر ہے، جیسا کہ بعض مدعیان تقویٰ مسجد کی حاضری سے متعلق پیدا کر لیتے ہیں کہ گھر ہی میں نماز پڑھ لیتے ہیں، اِس لیے کہ وہاں جائیں گے تو ریا کے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اگرچہ یہ عذر پیش تو ایک آدھ احمقوں نے ہی کیا ہوگا، لیکن یہ عذر کی ایک ایسی قسم تھی جس پر تقویٰ اور دین داری کا ملمع چڑھانے کی کوشش کی گئی تھی، اِس وجہ سے قرآن نے اِس کا خاص طور پر ذکر فرمایا تا کہ مسلمانوں کو شیطان کے ایک خاص حربے سے آگاہ کر دیا جائے کہ کبھی کبھی وہ تقویٰ کے بھیس میں بھی حملہ آور ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۵۸۶)

۲۰۷ نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تبوک جانا تو دور کی بات ہے، اپنی بدعملی پر فریب کاری کا یہ ملمع چڑھا کر اور اِس طرح کے عذرات پیش کر کے یہ گھر بیٹھے ہی فتنے میں مبتلا ہو

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/۴۷۵۔

اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ

ہے تو کہتے ہیں کہ (خوب ہوا)، ہم نے پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا اور خوش خوش لوٹتے ہیں[209]۔ اِنھیں بتا دو کہ ہمیں وہی چیز پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ رکھی ہے۔ وہ ہمارا مولیٰ ہے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ اِن سے کہہ دو کہ تم ہمارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہو، وہ اِس کے سوا کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے[210]۔ لیکن ہم تمھارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ تم پر

چکے ہیں۔

۲۰۸؎ اِس سے دو باتیں واضح ہوئیں: ایک یہ کہ اِس قسم کے تمام بہانے تراشنے والے اگرچہ بظاہر مسلمان بنے ہوئے ہیں، مگر درحقیقت منکر ہیں۔ دوسری یہ کہ تبوک کے سفر سے تو یہ اِس طرح کی بہانہ سازی سے بچ سکتے ہیں، لیکن خدا کی دہکائی ہوئی جہنم سے نہیں بچ سکتے۔ یہ جہاں چاہیں، بھاگ کر دیکھ لیں، وہ ہر طرف سے اِن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۲۰۹؎ یہ اُسی کفر سے پردہ اٹھایا ہے جس کا ذکر پیچھے ہوا کہ اِن کے سینے ایمان سے خالی ہیں، اِس لیے کہ اِن کے دلوں میں تو مسلمانوں کے لیے اِس درجے کی بدخواہی بھری ہوئی ہے۔

۲۱۰؎ یعنی جس سفر کے لیے نکل رہے ہیں، اُس میں کامیابی یا ناکامی۔ یہ دونوں ہمارے لیے بھلائی ہیں۔ اِس لیے کہ پہلی چیز حاصل ہوئی تو اپنے پروردگار کا شکر ادا کریں گے جس کے بعد ازدیاد نعمت کی توقع ہے اور دوسری چیز سے دوچار ہوئے تو صبر و استقامت کے ساتھ اور توبہ و انابت

بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿٥٢﴾
قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا
فٰسِقِيْنَ ﴿٥٣﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا
بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ

اپنے ہاں سے عذاب بھیجے گا یا ہمارے ہاتھوں سے[۲۱۱]۔ سو انتظار کرو، ہم بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہیں۔ ۴۹-۵۲

(اپنے نفاق کو چھپانے کے لیے یہ کچھ نہ کچھ خرچ کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں)، اِن سے کہہ دو، تم اپنے مال خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، وہ تم سے ہرگز قبول نہ کیے جائیں گے، اِس لیے کہ تم بدعہد لوگ ہو۔ اِن کا انفاق درخور قبول نہیں ہے تو اِس کی وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اِنھوں نے اللہ سے اور اُس کے رسول سے کفر کیا ہے[۲۱۲] اور نماز کے لیے آتے ہیں تو مارے باندھے آتے ہیں اور خرچ کرتے

کے جذبے سے اپنی کمزوریوں کی اصلاح کریں گے جس کے نتیجے میں امید ہے کہ دنیا اور آخرت، دونوں میں خدا کی رحمت وعنایت شامل حال ہو جائے گی۔

۲۱۱۔ اِس کتاب میں کئی جگہ بیان ہو چکا ہے کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد خدا کا عذاب بالعموم اِنھی دو صورتوں میں آتا ہے۔ رسول کے ساتھی تعداد میں کم ہوں اور اُنھیں کوئی دارالہجرت بھی میسر نہ ہو سکے تو ابر و باد کے لشکر منکرین کو تباہ کر دیتے ہیں۔ وہ معتد بہ تعداد میں ہوں اور کسی سرزمین میں اُن کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان بھی ہو جائے تو اُن کی تلواریں بے نیام ہوتی ہیں اور منکرین حق کا استیصال کر دیتی ہیں۔

۲۱۲۔ یعنی حقیقت میں کفر کیا ہے، اِس لیے کہ اللہ و رسول پر ایمان کے جو تقاضے ہیں، یہ اُن

كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

ہیں تو با دل ناخواستہ خرچ کرتے ہیں۔ سو اِن کے مال و اولاد کو کچھ وقعت نہ دو[۲۱۳]، اللہ تو اب یہی چاہتا ہے کہ اِن کے ذریعے سے اِنھیں دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور اِن کی جانیں اِس حالت میں نکلیں کہ یہ کافر ہوں[۲۱۴]۔ ۵۳-۵۵

یہ خدا کی قسمیں کھا کھا کر اطمینان دلاتے ہیں کہ تم میں سے ہیں، دراں حالیکہ یہ تم میں سے نہیں ہیں، بلکہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے ہیں[۲۱۵]۔ اگر یہ کوئی ٹھکانا، کوئی غار یا کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تو رسی تڑا کر اُدھر بھاگ کھڑے ہوتے[۲۱۶]۔ ۵۶-۵۷

میں سے کسی کو بھی پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

۲۱۳؎ یعنی اِس بنا پر اِن سے دین کی کسی سچی خدمت کی توقع نہ کرو، اِس لیے کہ یہ مال و اولاد اِن کے لیے آخرت میں کسی بڑے مرتبے کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ غلامی کا پھندا ہے۔ اپنی گردنیں یہ اب اِس پھندے سے چھڑا نہ سکیں گے۔

۲۱۴؎ اللہ کا یہ چاہنا اُس سنت کے مطابق ہے جو اُس نے لوگوں کی ہدایت اور گم راہی کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اِس کی وضاحت ہم پیچھے ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔

۲۱۵؎ یعنی اِس بات سے ڈرتے ہیں کہ تم سے الگ ہو گئے تو اُسی انجام کو پہنچا دیے جائیں گے جو اِس سے پہلے کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے لیے بیان ہو چکا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ

اِن میں ایسے بھی ہیں، (اے پیغمبر)، جو صدقات[۲۱۷] (کی تقسیم) کے معاملے میں تم پر عیب لگاتے ہیں۔ (یہ وہ لوگ ہیں جنھیں لالچ نے تمھارے ساتھ باندھ رکھا ہے[۲۱۸])۔ چنانچہ اگر اُس مال میں سے اِنھیں دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور اُس میں سے نہ دیا جائے تو فوراً ناراض ہو بیٹھتے ہیں۔ اِن کے لیے کہیں بہتر ہوتا، اگر یہ اُس پر راضی رہتے جو اللہ اور اُس کے رسول نے اِنھیں دیا تھا اور کہتے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے[۲۱۹]، اللہ آگے

التوبہ ۹

۲۱۶ یعنی جانتے ہیں کہ اب فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا، ورنہ بھاگ کر کہیں پناہ لے چکے ہوتے۔

۲۱۷ اِن میں زکوٰۃ بھی شامل ہے، مگر یہ لفظ اُس کی نسبت عام ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اِس میں وہ تمام عطایا شامل ہیں جو بہ نیت اجر و ثواب دیے جائیں۔ عام اِس سے کہ وہ زکوٰۃ کا مال ہو یا انفاق و تبرع کی نوعیت کا کوئی اور مال۔ چونکہ اِسی انفاق سے آدمی کے ایمان کی صداقت اور پختگی واضح ہوتی ہے، اِس وجہ سے اِس کو صدقہ کہتے ہیں جس کی اصل ’صدق‘ ہے جس کی روح قول و فعل کی کامل مطابقت اور رسوخ و استحکام ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۵۹۱)

۲۱۸ اوپر مال دار منافقین کا ذکر تھا۔ چنانچہ فرمایا کہ اِنھیں خوف نے تمھارے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ اب یہ اُن منافقین کا ذکر ہو رہا ہے جو مال دار نہیں تھے۔

۲۱۹ یہ شرطیہ جملہ ہے جس کی جزا اصل میں حذف کر دی گئی ہے تاکہ وہ شدت نمایاں ہو جائے جو متکلم اِس جملے سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ عربی زبان میں یہ اسلوب اِسی طریقے سے زجر، شفقت، حسرت و ملامت اور التفات و عنایت کے پہلوؤں کو

فَضۡلِهٖ وَرَسُوۡلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوۡنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَفِى الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِيۡنَ وَفِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ‌ ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶۰﴾

اپنے فضل سے ہم کو بہت کچھ دے گا اور اُس کا رسول بھی، ہمیں تو اللہ چاہیے۔ (اِنھیں بتا دو کہ) صدقات تو درحقیقت فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور اُن کے لیے جو اُن کے نظم پر مامور ہوں، اور اُن کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ نیز اِس لیے کہ گردنوں کے چھڑانے میں اور تاوان زدوں کے سنبھالنے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں کی بہبود کے لیے خرچ کیے جائیں۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے[۲۲۰]۔ ۵۸-۶۰

نمایاں کرنے کے لیے بھی اختیار کیا جاتا ہے۔

۲۲۰ مطلب یہ ہے کہ بیت المال میں جو صدقات جمع ہوتے ہیں، وہ اُن مصارف کے لیے خاص ہیں جو نظم اجتماعی کی ضرورتوں اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اِنھیں خدا نے اپنے علم و حکمت سے مقرر فرمایا ہے، لہٰذا صدقات اِنھی میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ یہ مال کے حریص ناخواندہ مہمانوں کے لیے نہیں ہیں اور نہ اُن کی خواہشوں کے مطابق تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

آیت میں جو مصارف بیان ہوئے ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے:

فقرا و مساکین کے لیے۔ فقیر کا لفظ اُس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنی معیشت کے لیے دوسروں کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ غنی کا مقابل ہے اور ہر قسم کے حاجت مندوں کے لیے عام ہے۔ مسکین اِس کے مقابل میں سخت ہے۔ مسکنت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بے بسی اور بے چارگی

شامل ہے۔ اِس اعتبار سے مسکین اُسے کہا جائے گا جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہو۔

'الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا'، یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں۔ اِس لیے کہ ریاست کے تمام ملازمین درحقیقت 'العاملین علی أخذ الضرائب وردھا إلی المصارف' ہی ہوتے ہیں۔ 'متصدقین' یا اِس طرح کے بعض دوسرے الفاظ کے بجائے قرآن نے یہ لفظ اِسی مدعا کو ادا کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔

'الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ'، یعنی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام سیاسی اخراجات کے لیے۔

'فِي الرِّقَابِ'، یعنی ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لیے۔

'الْغٰرِمِيْنَ'، یعنی کسی نقصان، تاوان یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی مدد کے لیے۔

'فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'، یعنی دین کی خدمت کے کاموں میں۔

'ابْنِ السَّبِيْلِ'، یعنی مسافروں کی مدد اور اُن کے لیے سڑکوں، پلوں، سراؤں وغیرہ کی تعمیر کے لیے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ زکوٰۃ اور دوسرے تمام صدقات جس طرح فرد کے ہاتھ میں دیے جا سکتے ہیں، اُسی طرح اُس کی بہبود کے کاموں میں بھی خرچ کیے جا سکتے ہیں۔ اِن کے مصارف پر تملیک ذاتی کی جو شرط بالعموم عائد کی جاتی ہے، اُس کے لیے کوئی ماخذ قرآن و سنت میں موجود نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"ہمارے فقہا کا ایک گروہ 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ' کے 'ل' کو تملیک ذاتی کے مفہوم کے لیے خاص کرتا ہے اور پھر اُس سے یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ صدقات و زکوٰۃ کی رقوم فقرا و مساکین کی کسی ایسی اجتماعی بہبود پر صرف نہیں ہو سکتیں جس سے ملکیت ذاتی تو کسی کی بھی قائم نہ ہو، لیکن اُس کا فائدہ بحیثیت مجموعی سب کو پہنچے۔ ہمارے نزدیک یہ رائے کسی مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ اول تو 'ل' کچھ تملیک ہی کے معنی کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ یہ متعدد معانی

وَمِنۡهُمُ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ النَّبِىَّ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَرَحۡمَةٌ

انھی میں وہ لوگ بھی ہیں جو (اپنی باتوں سے) پیغمبر کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص تو سراپا کان ہے۔[۲۲۱] کہہ دو، وہ تمھاری بھلائی کے لیے کان ہے۔[۲۲۲] وہ اللہ پر

کے لیے آتا ہے اور اِن سب معانی کے لیے یہ خود قرآن میں استعمال ہوا ہے، تملیک ذاتی ہی کے معنی کے لیے اِس کو خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آخر بہبود، نفع رسانی اور استحقاق کے معانی کے لیے بھی جب اِس کا استعمال معروف ہے تو اِن معانی میں یہ کیوں نہ لیا جائے؟ پھر آیت میں آپ نے دیکھا کہ بعض چیزیں 'فِیْ' کے تحت بیان ہوئی ہیں اور 'فِیْ' کا متبادر مفہوم تملیک نہیں، بلکہ خدمت، مصرف، رفاہیت اور بہبود ہی ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۹۳)

۲۲۱؎ یعنی ہر وقت ہر شخص کی بات سننے اور اُسے مان لینے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہ ہجو ملیح کا جملہ ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ مفہوم اِس جملے میں یہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ ہر ایک کی بات سن لینا جہاں آدمی کی شرافت اور کریم النفسی کی دلیل ہے، وہیں یہ اُس کی سادگی، بھولے پن اور بے بصیرتی کی بھی دلیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ لفظ اِس کے اِسی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر استعمال کرتے۔ وہ اپنی نجی مجلسوں میں اللہ، اُس کے رسول اور آیات الٰہی کا مذاق اڑاتے۔ جب آں حضرت تک کسی ذریعے سے اُس کی خبر پہنچتی اور آپ اُس پر کچھ خفگی یا ناراضی کا اظہار فرماتے تو منافقین اپنی صفائی میں لوگوں سے یہ کہتے کہ یہ نیک آدمی ہیں۔ جو بات کوئی شخص کان میں ڈال جاتا ہے، اُس کو سچ جان لیتے ہیں اور اُس کی بنا پر ہم جیسے وفا شعاروں اور اطاعت گزاروں سے بدگمان ہو جاتے ہیں، ورنہ بھلا ہماری زبانوں سے اللہ و رسول کی شان میں کوئی توہین کا کلمہ قصداً نکل سکتا ہے؟ ازراہ سخن گستری، مذاقاً اور تفریحاً بلا ارادۂ تحقیر کوئی لفظ زبان سے نکل گیا ہو تو اُس کی بات اور ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۹۸)

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦١﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ

ایمان رکھتا ہے، ایمان والوں پر اعتماد کرتا ہے اور اُن کے لیے سراسر رحمت ہے جو تم میں سے پوری سچائی کے ساتھ ایمان لائے ہیں[۲۲۳]۔ (سن لو)، جو اللہ کے رسول کو دکھ دے رہے ہیں، اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ وہ تمھارے سامنے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ تمھیں راضی کریں، حالاں کہ اگر وہ مومن ہیں تو اللہ اور اُس کا رسول زیادہ

التوبہ
۹

۲۲۲؎ یہ نہایت بلیغ اسلوب میں منافقین کی بات کا جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یقیناً سراپا گوش ہے، مگر کس لیے؟ تم اِس رحیم و شفیق ہستی کی قدر پہچانتے تو سمجھ لیتے کہ تمھاری بھلائی کے لیے سراپا گوش ہے۔ تمھاری طرف سے کسی اچھی بات، اچھے کام اور اچھے ارادے کی خبر پہنچے تو اُس کو سننے اور ماننے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔ تمھاری بری خبروں اور سازشوں کے لیے کی جانے والی سرگوشیوں کو سننے کے لیے کان نہیں لگائے ہوئے ہے کہ جو کچھ ملے، اُسے قیمتی سوغات سمجھ کر اپنے دل میں محفوظ کر لے۔

۲۲۳؎ یعنی برائی کی کوئی بات پہنچے تو تو ہر ایرے غیرے سے سن کر اُس کو باور نہیں کر لیتا۔ ہاں، خدا پر ایمان رکھتا اور سچے اہل ایمان پر ضرور اعتماد کرتا ہے۔ چنانچہ جب اُن کی طرف سے کوئی بات پہنچتی ہے تو یقیناً باور کرتا ہے۔ وہ تمھارا بدخواہ نہیں ہے، بلکہ دیکھ سکتے ہو کہ تم میں سے جن لوگوں نے صحیح ایمان کا رویہ اختیار کیا ہے، اُن کے لیے سراپا رحمت ہے۔ خدا توفیق دے تو اپنی اصلاح کر کے تم بھی اُس کی رحمت و شفقت کے سزاوار بن سکتے ہو۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ آیت میں ایمان کا صلہ 'ب' اور 'ل'، دونوں کے ساتھ آیا ہے۔ 'ب' کے ساتھ یہ ایمان لانے اور 'ل' کے ساتھ محض کسی کی بات کو ماننے اور اُسے باور کر لینے کے مفہوم میں آتا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٣﴾ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ

حق دار ہیں کہ وہ اُس کو راضی کریں۔[۲۲۴] کیا وہ نہیں جانتے کہ جو اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو کیا نہیں جانتے کہ اُس کے لیے دوزخ کی آگ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا؟[۲۲۵] یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔[۲۲۶] ۶۱-۶۳

یہ منافق ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن پر کوئی ایسی سورت نہ اتار دی جائے جو اُن کے

۲۲۴؎ اصل میں 'يُرْضُوْهُ' کا لفظ آیا ہے۔ پیچھے اللہ و رسول، دونوں کا ذکر ہے، لیکن اِس میں واحد کی ضمیر آ گئی ہے۔ یہ، اِس بات کی طرف متوجہ کر رہی ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کی رضا ایک ہی ہے۔ اِس جملے میں، اگر غور کیجیے تو منافقین کے رویے پر بڑی برمحل گرفت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... بسا اوقات آدمی کا عذر گناہ بدتر از گناہ بن جاتا ہے۔ منافقین نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے جو روش اختیار کی، وہ اُن کو اور زیادہ مجرم ثابت کرنے والی بن گئی۔ وہ راست باز ہوتے تو اللہ اور رسول کو راضی کرنے کی کوشش کرتے نہ کہ جھوٹی قسموں کے ذریعے سے مسلمانوں کے سامنے اپنے کو معصوم اور پیغمبر کو کان کا کچا ثابت کرنے میں لگ جاتے۔ یہ تو پیغمبر کے خلاف پروپیگنڈے کی نہایت عیارانہ مہم ہوئی۔" (تدبر قرآن ۵۹۹/۳)

۲۲۵؎ آیت میں 'فَاَنَّ' کا عطف 'اَنَّهٗ' پر ہے اور 'يُحَادِد' کا لفظ اُس مخالفت کو بیان کرتا ہے جس میں کوئی شخص کسی کے مقابل میں دشمن بن کر کھڑا ہو جائے۔

۲۲۶؎ یعنی اِس وقت جس رسوائی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے یہ سارے جتن کر رہے ہیں، اُس سے بڑی رسوائی ہے۔ یہ سوچیں کہ اُس رسوائی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا

قُلُوۡبِهِمۡ ؕ قُلِ اسۡتَهۡزِءُوۡا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخۡرِجٌ مَّا تَحۡذَرُوۡنَ ﴿۶۴﴾ وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوۡضُ وَنَلۡعَبُ ؕ قُلۡ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوۡلِهٖ كُنۡتُمۡ تَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۶۵﴾ لَا تَعۡتَذِرُوۡا قَدۡ كَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ ؕ اِنۡ نَّعۡفُ عَنۡ طَآئِفَةٍ مِّنۡكُمۡ نُعَذِّبۡ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ﴿۶۶﴾

دلوں کے بھید اُن پر کھول دے۔[۲۲۷] اِن سے کہو، (کچھ دیر اور) مذاق اڑا لو، اللہ اُس چیز کو کھول کر رہے گا جس سے تم ڈرتے ہو۔ (اِن کے اِس رویے کے بارے میں) اگر اِن سے پوچھو گے تو کہہ دیں گے کہ ہم تو محض سخن گستری اور دل لگی کر رہے تھے۔ اِن سے کہو، کیا تم اللہ سے، اُس کی آیتوں سے اور اُس کے رسول سے ہنسی دل لگی کر رہے تھے؟ باتیں نہ بناؤ، تم نے ایمان کے بعد کفر کیا ہے۔ اگر ہم تمھارے کسی گروہ سے درگذر بھی کر لیں گے[۲۲۸] تو دوسرے کو ضرور (اِسی دنیا میں) سزا دیں گے، اِس لیے کہ وہ فی الواقع مجرم ہیں۔[۲۲۹] ۶۴-۶۶

تدبیر کریں گے۔

۲۲۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَنۡ تُنَزَّلَ عَلَيۡهِمۡ سُوۡرَةٌ تُنَبِّئُهُمۡ بِمَا فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ'۔ اِن میں 'عَلٰی' کا صلہ بتا رہا ہے کہ 'تُنَزَّلَ' یہاں 'تقرء علیھم' کے مفہوم میں ہے، یعنی اُنھیں پڑھ کر سنا دی جائے۔ پیچھے فرمایا ہے کہ منافقین خدا کی قسمیں کھا کر مسلمانوں کو اپنی معصومیت کا قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ اُس کا پس منظر واضح کر دیا ہے کہ یہ سب اِس اندیشے سے ہو رہا ہے کہ اِس سورہ میں اُن کو لب ولہجہ بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ گھبرائے ہوئے ہیں کہ کہیں سارے راز بے نقاب نہ ہو جائیں۔

۲۲۸؎ یعنی دنیا میں درگذر کر لیں گے اور اُس کا معاملہ آخرت پر اٹھا رکھیں گے۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ منافقین کے بہت سے گروہ تھے اور اُن میں سے ہر ایک کے نفاق کی نوعیت اور اُن کے

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ

منافق مرد اور منافق عورتیں، سب ایک ہی طرح کے لوگ ہیں۔ یہ برائی کی تلقین کرتے، بھلائی سے روکتے اور اپنے ہاتھ (ہر خیر کے لیے) بند رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی اِنھیں بھلا دیا۔[۲۳۰] حقیقت یہ ہے کہ یہی منافق ہیں جو بڑے بد عہد ہیں۔[۲۳۱] اِن منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کھلے منکروں کے لیے اللہ کی طرف سے دوزخ کی آگ کی وعید ہے، جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ اِن کے لیے یہی کافی ہے۔ اِن پر اللہ کی لعنت ہے اور اِن کے لیے دائمی عذاب ہے۔ (ایمان کا جھوٹا دعویٰ کرنے

شر و فساد کا درجہ بھی ایک نہیں تھا۔

۲۲۹؎ یعنی محض کم عقل مسخرے نہیں ہیں، بلکہ اِس تمسخر سے اُن کے پیش نظر یہی ہے کہ مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیے جائیں اور وہ اُس جدوجہد میں ناکام ہو جائیں جو وہ پیغمبر کی قیادت میں کر رہے ہیں۔

۲۳۰؎ یعنی نظر انداز کر کے توفیق خیر سے محروم کر دیا۔ یہ اُن کی بے توفیقی کی وجہ بیان کر دی ہے کہ وہ جب خدا کو بھلا بیٹھے تو خدا نے بھی اپنی سنت کے مطابق اُنھیں شیطان کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ دیکھ سکتے ہو کہ اب وہی اُن کی باگ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے، اُنھیں جہاں چاہتا ہے، لے جاتا ہے۔

۲۳۱؎ اِس لیے کہ اِنھوں نے پیغمبر سے سمع و طاعت کا عہد کیا اور پھر اُسے توڑ دیا ہے۔ بظاہر یہ

مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ
فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ
وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ۬ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ
مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ

والو[۲۳۲]، اُنھی لوگوں کی طرح جو تم سے پہلے ہو گزرے۔ وہ زور میں تم سے زیادہ اور مال و اولاد کی کثرت میں تم سے بڑھے ہوئے تھے۔ سو اُنھوں نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا اور تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھالیا، اُسی طرح جیسے تمھارے اگلوں نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا تھا اور تم نے وہی بحثیں کیں، جیسی اُنھوں نے بحثیں کی تھیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور یہی نامراد ہونے والے ہیں۔ کیا اِنھیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو اِن سے پہلے گزرے[۲۳۳] ـــــ نوح کی قوم، عاد و ثمود، ابراہیم کی قوم[۲۳۴]، مدین والوں اور اُن بستیوں کی خبر، جنھیں الٹ دیا گیا؟[۲۳۵] اُن کے رسول اُن کے پاس

مسلمان ہیں، لیکن پس پردہ اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے درپے ہیں۔

۲۳۲؎ یہاں سے خطاب براہ راست ہو گیا ہے جس سے کلام میں زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے۔

۲۳۳؎ یہ 'كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ' کے اجمال کی تفصیل ہے۔

۲۳۴؎ اِس سے ابراہیم علیہ السلام کی وہ قوم مراد ہے جسے اُنھوں نے دعوت دی، مگر اُس نے اُن کی یہ دعوت رد کر دی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ اُس کو چھوڑ کر نکل آئے۔ ابراہیم علیہ السلام

لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٧٠﴾

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً

التوبه
۹

کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ سو ایسا نہ تھا کہ اللہ اُن پر ظلم کرتا، بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ ۶۷-۷۰

مومن مرد اور مومن عورتیں، وہ بھی ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ (اِن منافقوں کے برخلاف) وہ بھلائی کی تلقین کرتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز کا اہتمام کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھیں اللہ عنقریب اپنی رحمت سے نوازے گا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ اِن مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے اُن باغوں کے لیے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے، اور ابد

نبوت کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی فائز تھے۔ قرآن نے جس طریقے سے یہاں اُس قوم کا ذکر کیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ اُن سب قوموں کی طرح جن پر رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کیا گیا، اُن کی ہجرت کے بعد وہ بھی عذاب کی زد میں آ گئی تھی۔

۲۳۵؎ اِس سے قوم لوط کی بستیاں مراد ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ

کے باغوں میں پاکیزہ مکانوں کے لیے۔ اور خدا کی خوشنودی، وہ سب سے بڑھ کر ہے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۷۱-۷۲

اے پیغمبر[۲۳۶]، اِن سب منکروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور اِن کے لیے سخت بن جاؤ[۲۳۷]۔ اِن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ یہ خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اِنھوں نے وہ بات نہیں کہی، حالاں کہ کفر کی وہ بات اِنھوں نے ضرور کہی ہے[۲۳۸] اور اِس

۲۳۶؎ یہاں سے پانچواں شذرہ شروع ہوتا ہے۔ اِس کے مضامین سے واضح ہے کہ یہ تبوک میں یا تبوک سے واپسی کے سفر میں کسی وقت نازل ہوا ہے۔

۲۳۷؎ جہاد کا لفظ قتال اور شدت احتساب، سب کو شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار اور منافقین ایک ہی زمرے کے لوگ ہیں۔ تمھاری کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی شرارتوں میں اور دلیر ہو گئے ہیں۔ اُن کے ساتھ اپنا رویہ اب یکسر تبدیل کر لو اور جس کے خلاف جس اقدام کا حکم دیا گیا ہے، وہ کرو۔ چنانچہ منکروں کو جہاں پاؤ، قتل کرو، جیسا کہ پیچھے ہدایت کی گئی ہے اور منافقوں کے ساتھ احتساب اور دار و گیر کا جہاد کرو اور رأفت و شفقت کے بجائے سختی کے ساتھ پیش آؤ تا کہ اُن پر واضح ہو جائے کہ اب اُنھیں مسلمانوں کی طرح مسلمان بن کر رہنا ہوگا، ورنہ اُسی انجام سے دوچار ہوں گے جو پیغمبر کے منکروں کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

يَنَالُوا ۚ وَمَا نَقَمُوٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ

طرح اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے ہیں اور اِنھوں نے وہ چاہا ہے جو پا نہیں سکے ہیں۔[۲۳۹] اِن کا یہ عناد اِسی بات کا صلہ ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول نے اپنے فضل سے اِن کو غنی کر دیا ہے۔[۲۴۰] سو اگر یہ اب بھی توبہ کر لیں تو اِن کے لیے بہتر ہے اور

۲۳۸؎ یہ اُسی طرح کی کسی بات کا حوالہ ہے، جس طرح کی باتوں کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے کہ منافقین اپنی مجلسوں میں اللہ، اُس کے رسول اور اُس کی آیتوں کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن جب پوچھا جائے تو صاف مکر جاتے ہیں کہ اُنھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی، وہ تو محض ہنسی دل لگی کر رہے تھے۔

۲۳۹؎ یہ اُن منصوبوں کی طرف اشارہ ہے جو منافقین نے اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے بنائے، مگر اللہ نے اُن کے راز برسر موقع فاش کر دیے اور اُنھیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ہر موقع پر اُنھوں نے منہ کی کھائی۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ قرآن نے نہایت بلاغت کے ساتھ دو لفظوں میں اُن کے تمام خبیثانہ منصوبوں اور ساتھ ہی اُن کی محرومیوں اور ناکامیوں کی طرف اشارہ فرما دیا ہے۔

۲۴۰؎ اشارہ ہے اُن غنائم کی طرف جو فتوحات کے نتیجے میں حاصل ہوئے اور جن سے سب سے زیادہ فائدہ اِنھی منافقین نے اٹھایا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اول تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اِن کی دل داری کے خیال سے اِن کو دیتے بھی زیادہ تھے، پھر یہ اپنی طماعی کے سبب سے لیتے بھی سو بہانوں سے تھے۔ مزید براں اِن کے پاس صرف لینے ہی والے ہاتھ تھے، دینے والے ہاتھ تو سرے سے تھے ہی نہیں۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع آیا تو... صاف کترا جاتے۔ اِس طرح یہ لوگ مال دار بن گئے اور اِس مال داری کا صلہ اسلام کو، جس کے نام پر وہ مال دار بنے، اُنھوں نے یہ دیا کہ اُس کے خلاف سازشیں اور

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾
وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ
وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا
بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى
يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾
اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ

التوبه
۹

اگر اعراض کریں گے تو اللہ اِن کو دردناک سزا دے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور زمین میں اِن کا نہ کوئی حمایتی ہوگا، نہ مددگار۔ ۷۳-۷۴

اِن میں وہ بھی ہیں[۲۴۱] جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اُس نے ہم کو اپنے فضل سے نوازا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور خوب نیکیاں کرنے والوں میں سے ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے اُن کو عطا فرمایا تو اُس میں بخل کرنے لگے اور برگشتہ ہو کر منہ پھیر لیا[۲۴۲]۔ سو اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے اُس دن تک کہ اُس سے ملیں گے، اُن کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا، اِس لیے کہ اُنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کی اور اِس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے[۲۴۳]۔ کیا اُن کو خبر نہیں کہ اللہ اُن کے رازوں اور

ریشہ دوانیاں کرتے رہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۶۱۰)

۲۴۱۔ یعنی اِنھی لوگوں میں جو اب اسلام کی بدولت غنی ہو گئے ہیں۔

۲۴۲۔ اصل الفاظ ہیں: 'تَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ'۔ 'تَوَلَّوْا' کے بعد 'هُمْ مُّعْرِضُوْنَ' کے الفاظ واضح کرتے ہیں کہ انفاق کا نام لیا جائے تو منہ موڑ کر اِس طرح چل دیتے ہیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھتے بھی نہیں۔

الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ز وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ

اُن کی سرگوشیوں کو جانتا ہے اور اللہ ہر غیب کو خوب جاننے والا ہے؟[۲۴۴] وہ[۲۴۵] جو صدقات کے معاملے میں اُن مسلمانوں پر طعن کرتے ہیں جو خوش دلی سے دیتے ہیں اور جن کے پاس دینے کے لیے وہی کچھ ہے جو وہ اپنی محنت مزدوری سے کما لاتے ہیں تو اُن کا وہ مذاق اڑاتے ہیں[۲۴۶]۔ اللہ اِن مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور اِن کے لیے دردناک

۲۴۳؎ یہ اُس سنت کے مطابق ہوا جو اللہ تعالیٰ نے ہدایت وضلالت کے باب میں مقرر کر رکھی ہے۔ آدمی جب ایک مدت تک کسی روگ کی رضاعت و پرورش کرتا رہتا ہے تو بالآخر ہمیشہ کے لیے توبہ اور اصلاح کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے۔

۲۴۴؎ یعنی فعلاً بھی جانتا ہے اور اُس کی صفت بھی ہے کہ وہ علام الغیوب ہے۔

۲۴۵؎ آیت کی ابتدا 'اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ' کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ یہ 'اَلَّذِيْنَ' پیچھے 'نَجْوٰهُمْ' میں 'هُمْ' کی ضمیر سے بدل ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۲۴۶؎ یعنی خود کچھ کرتے نہیں اور دوسروں کے انفاق پر غصے سے کھولتے اور حسد سے جلتے ہیں۔ چنانچہ اغنیا کو طعن وتشنیع کا نشانہ بناتے اور غریبوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...جو فیاض اور مخلص مسلمان فیاضی اور خوش دلی سے خدا کی راہ میں دیتے ہیں، اُن کو تو کہتے ہیں کہ یہ ریاکار اور شہرت پسند ہے۔ اپنی دین داری اور سخاوت کی دھونس جمانے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ جو غریب بے چارے کچھ رکھتے ہی نہیں۔ اپنی محنت مزدوری کی گاڑھی کمائی ہی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اُن کی حوصلہ شکنی کے لیے اُن کا یہ مذاق اڑاتے اور اُن پر پھبتیاں چست کرتے ہیں کہ لو آج یہ بھی اٹھے ہیں کہ حاتم کا نام دنیا سے

اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَلْيَضْحَكُوْا

عذاب ہے۔ تم اِن کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔ اگر تم ستر مرتبہ بھی اِن کے لیے مغفرت چاہو گے تو اللہ اِن کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اِس لیے کہ اِنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور اِس طرح کے بدعہد لوگوں کو اللہ راہ نہیں دکھاتا[۲۴۷]۔ ۷۵-۸۰

(تبوک کے اِس سفر میں) جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے[۲۴۸]، وہ اللہ کے رسول سے پیچھے بیٹھ رہنے پر بہت خوش ہوئے اور اُنھیں اچھا نہیں لگا کہ اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ اُنھوں نے لوگوں سے کہا کہ اِس گرمی میں نہ نکلو۔ کہہ دو،

مٹا کر رکھ دیں۔" (تدبر قرآن ۳/۶۱۳)

۲۴۷؎ یعنی وہ راہ نہیں دکھاتا جو اُنھیں جہنم کے راستے سے ہٹا کر اُس غایت کی طرف گامزن کر دے جو سچے اہل ایمان کی منزل ہے۔ اِس تنبیہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس درجہ رحیم و شفیق تھے اور اِس طرح کے منافقوں کے لیے کس قدر الحاح کے ساتھ مغفرت اور نجات کی دعائیں کرتے رہتے تھے۔

۲۴۸؎ یعنی اگرچہ رخصتیں مانگ کر خود پیچھے رہے، مگر حقیقت میں پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے۔

قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ

دوزخ کی آگ اِس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔ اے کاش، وہ سمجھتے! اب وہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ، اُس کے بدلے میں جو کچھ کرتے رہے۔[۲۴۹] سو، (اے پیغمبر)، اللہ اُن میں سے کسی گروہ کی طرف اگر تمھیں واپس لے جائے[۲۵۰] اور وہ تم سے جہاد کے لیے نکلنے کی اجازت مانگیں تو صاف کہہ دینا کہ تم میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو

اِس لیے کہ اللہ ورسول کے سامنے لایعنی عذرات پیش کر کے اِس کے مستحق ہی نہیں رہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کی سعادت سے بہرہ یاب ہوں۔

۲۴۹۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کے شدائد سے بھاگ کر اُنھوں نے دوزخ میں جانا پسند کیا ہے تو یہ خوش ہونے کی نہیں، بلکہ رونے اور ماتم کرنے کی چیز ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...عام طور پر مفسرین نے یہاں انشا کو خبر کے معنی میں لیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ یہاں عمل اور جزا، دونوں کو نگاہوں کے سامنے متحضر کر دیا گیا ہے، اِس لیے کہ جس کے اندر بصیرت ہو، وہ اِس دنیا میں اپنے عمل کے آئینے میں اپنی جزا کو بھی دیکھ لیتا ہے اور اُس پر اِس کا اثر بھی وہی پڑتا ہے جو پڑنا چاہیے۔ البتہ اندھے بہرے لوگ اِس سے محروم رہتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۶۱۸/۳)

۲۵۰۔ اِس جملے کا اسلوب بیان پیش نظر رہے تو مدعا یہ ہے کہ جن کے کرتوتوں کی وجہ سے اُن کے منہ دیکھنے کے روادار نہیں ہو، اُن کے منہ اگر اپنی تقدیر سے دکھا دے اور جو یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ رومیوں کی افواج قاہرہ سے بچ کر واپس نہیں آسکو گے، اُن کی خواہشات کے علی الرغم اگر خدا تمھیں کامیاب وکامران اُن کی طرف پلٹا دے۔

مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ

کر کسی دشمن سے لڑو گے۔ تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تو اب بھی اُن کے ساتھ بیٹھے رہو جو پیچھے رہنے والے ہیں۔ ۸۱-۸۳

اور آیندہ اُن میں سے جو مر جائے، اُس کے جنازے پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ اُس کی قبر پر دعا کے لیے کھڑے ہونا، اِس لیے کہ اُنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول کا انکار کیا ہے اور اِس حال میں مرے ہیں کہ بدعہد تھے۔[۲۵۱] تم اُن کے مال و اولاد کو کچھ وقعت نہ دو، اللہ یہی چاہتا ہے کہ اِن کے ذریعے سے اُنھیں دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور اُن کی جانیں اِس حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔[۲۵۲] جب کوئی

۲۵۱؎ اِس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے لیے استغفار سے روکا گیا تھا۔ اب جہاد میں ساتھ لے جانے اور اُن میں سے کوئی مر جائے تو اُس کے جنازے کی نماز پڑھنے اور اُس کی قبر پر کھڑے ہونے سے بھی روک دیا گیا۔ اِس سے بڑی رسوائی اور اِس سے بڑی سزا کیا ہو سکتی تھی جو مسلمانوں کے معاشرے میں اور خدا کے رسول کی موجودگی میں کسی شخص کو دی جا سکتی ہے۔

۲۵۲؎ اللہ کا یہ چاہنا اُس سنت کے مطابق ہے جو اُس نے لوگوں کی ہدایت اور گم راہی کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔

اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿٨٦﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨٧﴾ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٨٨﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ

سورت اترتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ، جس طرح کہ ایمان لانے کا حق ہے[۲۵۳] اور اُس کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کرو تو اُن کے مقدرت والے بھی تم سے رخصت مانگنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجیے، ہم یہاں ٹھیرنے والوں کے ساتھ رہ جائیں گے۔[۲۵۴] اُنھوں نے پسند کیا کہ اُن عورتوں کے ساتھ ہوں جو پیچھے گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں[۲۵۵] اور اُن کے دلوں پر اِس کے نتیجے میں مہر کر دی گئی، اِس لیے کچھ نہیں سمجھتے۔ اللہ کے رسول نے، البتہ اپنے جان و مال سے جہاد کیا ہے اور اُن لوگوں نے بھی جو اُس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، اور اب وہی ہیں جن کے لیے (دنیا و آخرت کی) بھلائیاں ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے اُن کے لیے

۲۵۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ'۔ اِن میں فعل اپنے کامل معنی میں ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے کھول دیا ہے۔

۲۵۴؎ یہ اُن کے مافی الذہن کی تعبیر ہے۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات میں بھی اِس طرح کی چیزوں کو قول سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اپنے دل میں اِس طرح سوچتے ہیں کہ عذر قبول کر لیا گیا تو اُن کے ساتھ رہیں گے جن کا عذر حقیقی ہے اور جو یہاں عافیت میں بیٹھے ہیں۔

۲۵۵؎ یعنی مردوں کی طرح میدان جہاد میں اتر کر اپنے ایمان و اسلام کا حق ادا کرنے کے

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۸۹﴾
وَجَآءَ الۡمُعَذِّرُوۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ لِیُؤۡذَنَ لَهُمۡ وَقَعَدَ الَّذِیۡنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ؕ سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۹۰﴾
لَیۡسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَی الۡمَرۡضٰی وَلَا عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ مَا یُنۡفِقُوۡنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوۡا لِلّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ؕ مَا عَلَی

التوبہ ۹

ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۸۴-۸۹

بدوی[۲۵۶] عربوں میں سے بھی بہانہ کرنے والے آئے کہ اُنھیں بھی (پیچھے رہنے کی) اجازت مل جائے اور جنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول سے (ایمان کا) جھوٹا عہد کیا تھا، وہ (اِس کے بغیر ہی گھروں میں) بیٹھے رہے[۲۵۷]۔ اِن کے منکروں کو عنقریب ایک دردناک عذاب پکڑے گا[۲۵۸]۔ ۹۰

اُن لوگوں پر، البتہ کوئی گناہ نہیں جو کمزور ہیں اور اُن پر جو بیمار ہیں اور اُن پر بھی جو خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں پاتے، جب کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول کی خیر خواہی کرتے

بجاے اپنے لیے یہی پسند کیا کہ عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھیں۔

۲۵۶؎ پیچھے شہری منافقین کا رویہ زیر بحث تھا جو مدینہ اور اُس کے گردونواح میں رہتے تھے۔ یہاں سے آگے اُن منافقین کا ذکر شروع ہوتا ہے جو دیہات میں رہتے تھے۔

۲۵۷؎ یعنی کوئی جھوٹا سچا عذر پیش کرنے کی زحمت بھی نہیں اٹھائی۔

۲۵۸؎ یعنی اِن بدوی عربوں کے منکروں کو۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اِن میں سچے اہل ایمان

الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿91﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿92﴾ ؕ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ

رہیں۔[259] ایسے نیکو کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اِسی طرح اُن پر بھی کوئی الزام نہیں ہے کہ جب تمھارے پاس آتے ہیں کہ اُن کے لیے سواری کا بندوبست کر دو، تم کہتے ہو کہ میں تمھارے لیے سواری کا بندوبست نہیں کر سکتا تو اِس طرح لوٹتے ہیں کہ اُن کی آنکھوں سے اِس غم میں آنسو بہ رہے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے خرچ پر جانے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ الزام تو اُن لوگوں پر ہے جو تم سے رخصت مانگتے ہیں، دراں حالیکہ وہ مال دار ہیں۔ وہ اِس پر راضی ہو

بھی تھے جو دین کی نصرت کے ہر موقع پر ایثار و قربانی کے لیے پیش پیش رہتے تھے۔

۲۵۹ یہ قید نہایت اہم ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اِس لیے کہ بہت سے مریض اور غریب ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو گھر بیٹھے بیٹھے اپنی ریشہ دوانیوں اور فتنہ پردازیوں سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ اِس قسم کے لوگ گناہ سے بری نہیں ہوں گے۔ گناہ سے بری صرف وہی ہوں گے جو اپنی کمزوری، بیماری یا غربت کے سبب سے اگر میدان جنگ میں نہ پہنچ سکیں تو جہاں ہیں، وہیں اپنے امکان کے حد تک اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کریں اور اگر کچھ نہیں کر سکتے تو اپنے اپنے بستروں پر اور گھروں میں صدق دل سے اسلام اور مسلمانوں کی فتح مندی کی دعائیں اور اپنی محرومی پر غم کریں کہ افسوس ہے کہ وہ جہاد کے اہل نہیں رہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۶۲۶)

يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٣﴾
يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ
لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ
ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٤﴾

گئے کہ اُن کے ساتھ ہوں جو پیچھے (گھروں میں) بیٹھنے والی ہیں اور اللہ نے اِس کے نتیجے میں اُن کے دلوں پر مہر کر دی۔ اب وہ کچھ نہیں جانتے کہ کس انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں؟ ۹۱-۹۳

تم لوگ (اِس سفر سے) اُن کی طرف پلٹو گے تو وہ تمھارے سامنے طرح طرح کے عذرات پیش کریں گے۔ تم صاف کہہ دینا کہ بہانے نہ بناؤ، ہم تمھاری کسی بات کا اعتبار نہ کریں گے، اللہ نے ہم کو تمھارے حالات بتا دیے ہیں[۲۶۰]۔ اب اللہ اور اُس کا رسول تمھارا عمل دیکھیں گے، پھر تم اُس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے کا

۲۶۰۔ آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور اُنھی کے لحاظ سے ہر جگہ جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں، مگر لفظ 'قُلْ' واحد ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سب مسلمانوں کی طرف سے منافقین کو جواب دلوا دیا گیا ہے۔ گویا پیغمبر کی زبان تمام مومنین مخلصین کے دلوں کی ترجمان ہے۔ پیغمبر اور امت کے درمیان جو اعتماد، جو حسن ظن اور جو کامل ہم آہنگی تھی، یہ اسلوب اُس کو بھی نہایت لطیف طریقے سے ظاہر کر رہا ہے اور اِس میں منافقین پر تعریض کا جو پہلو ہے، وہ بھی نمایاں ہو رہا ہے۔" (تدبر قرآن ۳/ ۶۲۷)

سَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَكُمۡ اِذَا انۡقَلَبۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ لِتُعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ‌ؕ فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ‌ؕ اِنَّهُمۡ رِجۡسٌ‌ وَّمَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ‌ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۹۵﴾ يَحۡلِفُوۡنَ لَكُمۡ لِتَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ‌ ۚ فَاِنۡ تَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرۡضٰى عَنِ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۹۶﴾ اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجۡدَرُ اَلَّا يَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۹۷﴾

التوبہ ۹

جاننے والا ہے اور وہ تمھیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ تمھاری واپسی پر وہ تمھارے سامنے اب اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ تم اُن سے صرف نظر کرو۔ تو اُن سے صرف نظر ہی کر لو۔[۲۶۱] اِس لیے کہ وہ سراسر گندگی ہیں اور اُس کے بدلے میں جو کماتے رہے، اُن کا ٹھکانا جہنم ہے۔ وہ تمھارے سامنے قسمیں کھائیں گے کہ تم اُن سے راضی ہو جاؤ۔ سو اگر تم اُن سے راضی ہو بھی جاؤ تو اللہ راضی نہیں ہوگا، اِس لیے کہ ایسے بدعہد لوگوں سے اللہ ہرگز راضی ہونے والا نہیں ہے۔ یہ بدوی عرب کفر اور نفاق میں زیادہ سخت اور اِسی لائق ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ اتارا ہے، اُس کے حدود سے بے خبر رہیں۔[۲۶۲] اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۹۴-۹۷

۲۶۱؎ اصل میں لفظ 'اِعْرَاض' آیا ہے۔ یہ، اگر غور کیجیے تو نہایت بلاغت کے ساتھ دو مختلف، بلکہ متضاد معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ پہلے درگذر کر لینے کے معنی میں اور اِس کے بعد منہ پھیر لینے کے مفہوم میں۔ یعنی وہ تم کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے کہ جو کچھ ہو چکا ہے، اُسے نظر انداز کرو۔ سو ٹھیک ہے، اُنھیں اب نظر انداز ہی کر دو۔ اِس طرح کی گندگی کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے۔

۲۶۲؎ اِس لیے کہ اُنھوں نے کبھی اِن حدود کو سمجھنے اور اِن میں بصیرت پیدا کرنے کی کوشش ہی

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

اِن بدویوں میں وہ بھی ہیں جو خدا کی راہ میں خرچ کو ایک تاوان سمجھتے ہیں اور تمھارے لیے زمانے کی گردشوں کے منتظر ہیں۔ بری گردش اِنھی پر ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ اور اِنھی بدویوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر سچا ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اُس کو اور رسول کی دعاؤں کو خدا[263] کے ہاں تقرب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سو اِس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں اُن کے لیے تقرب کا ذریعہ ہیں[264]۔ اللہ اُن کو ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۹۸-۹۹

نہیں کی اور اللہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھ اور بصیرت اُنھی کو عطا فرماتا ہے جو اپنے آپ کو اِس کا سزاوار ثابت کرتے ہیں۔

۲۶۳؎ یعنی وہ دعائیں جو اُن کے ایمان و اخلاص اور اِس انفاق کے نتیجے میں اُن کو حاصل ہوتی ہیں۔

۲۶۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ'۔ اِن میں ضمیر مونث سے غلط فہمی نہ ہو۔ قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے، اُس کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جب ایک مذکر اور مونث کو جمع کر کے اُن کے لیے کوئی منصوب یا مجرور ضمیر لانا پیش نظر ہو تو وہ جس طرح عام قاعدے کے مطابق تثنیٰ

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝١٠٠

مہاجرین و انصار کے اُن لوگوں سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور وہ بھی جنھوں نے خوبی کے ساتھ اُن کی پیروی کی ہے[۲۶۵]۔ اللہ نے اُن کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۱۰۰

صورت میں آتی ہے، اِسی طرح اگر معنی میں ابہام کا اندیشہ نہ ہو اور مذکر و مونث، دونوں کی طرف ضمیر کے رجوع کے قرائن بالکل واضح ہوں تو واحد مونث بھی آسکتی ہے، بلکہ کلام عرب کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس طرح کے مواقع پر یہ بالعموم واحد مونث ہی آتی ہے۔

۲۶۵؎ یہ اب عام مسلمانوں اور منافقین، دونوں کے سامنے نمونے اور مثال کی حیثیت سے اُن لوگوں کو پیش کر دیا ہے جو پیغمبر کے ساتھیوں میں گل سر سبد اور اصل سرمایہ تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...فرمایا کہ اِس امت کا ہراول دستہ مہاجرین و انصار میں سے وہ سابقون اولون ہیں جنھوں نے سب سے پہلے نبی کی دعوت پر لبیک کہی، جو اُس وقت اسلام کی طرف بڑھے، جب ایک قدم بھی اُس کی طرف بڑھنا گوناگوں مزاحمتوں کا مقابلہ کیے بغیر ممکن نہ تھا اور جو اُس وقت نبی کی حمایت و مدافعت کے لیے اٹھے، جب اُس کی حمایت و مدافعت تمام احمر و اسود سے لڑائی مول لینے کے ہم معنی تھی۔

دوسرے درجے پر وہ لوگ ہیں جو اگرچہ اولیت و اسبقیت کا درجہ تو حاصل نہ کر سکے، تاہم اُنھوں نے پورے اخلاص اور پوری راست بازی سے سابقین اولین کے نقش قدم کی پیروی

کی۔ اِس پیروی میں اُنھوں نے کسی نمایش، کسی مصلحت، کسی غرض یا کسی نوع کے تذبذب اور نفاق کو دخیل نہیں ہونے دیا۔ ایک مرتبہ بڑھ کر اُنھوں نے پیچھے مڑنے کا نام نہیں لیا۔ جن سے کٹنا تھا، اُن کو کاٹا تو اِس طرح کہ کوئی تسمہ لگا نہیں رہنے دیا اور جن سے جڑے تو اِس طرح نہیں کہ:

منہ پھیر کر اِدھر کو اُدھر کو بڑھا کے ہاتھ

بلکہ اِس طرح جڑے کہ:

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اِسی خلوص وصداقت اور ظاہر و باطن کی اِسی کامل ہم آہنگی اور ہم رنگی کو یہاں 'اِحْسَان' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ 'اِحْسَان' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ کسی کام کو کمال حسن وخوبی سے انجام دینے کے بھی ہیں۔

...فرمایا کہ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ اُن سے اِس لیے راضی ہوا کہ وہ اپنے بندوں سے حق کی راہ میں جو صبر وثبات، جو عزیمت واستقامت، جو جاں بازی و سرفروشی چاہتا ہے، اُس کا اُنھوں نے حق ادا کر دیا اور اُنھوں نے اللہ اور رسول سے جو عہد باندھا، زندگی کے تمام نشیب وفراز میں، تمام مزاحمتوں اور مخالفتوں کے علی الرغم، پوری خوبی سے اُس کو نبھایا۔ اُن کے رب نے اُن کو جو قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائیں، اُن کو اُنھوں نے درجۂ کمال تک پروان چڑھایا اور اُن کو اپنے رب ہی کی رضا طلبی میں صرف کیا۔ شیطان کو اُن میں ساجھی بننے کا، اپنے امکان کی حد تک کوئی موقع نہیں دیا۔

اللہ سے اُن کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اُن کے ساتھ جو معاملہ کیا، اُس کو ہر رنگ میں اُنھوں نے اُس کے عدل، اُس کی حکمت اور اُس کی رحمت پر محمول کیا۔ اُن کو اگر کوئی افتاد پیش آئی تو اُس کو اُنھوں نے اپنی کسی خامی کا علاج سمجھا، کوئی مشکل پیش آئی تو اُس کو صبر و عزیمت کا امتحان جانا، سکھ ملا تو دل وجان سے اُس کے شکرگزار ہوئے، دکھ ملا تو صابر و مطمئن رہے، کسی حال میں بھی اپنی امید کے چراغ کو اُنھوں نے گل نہیں ہونے دیا۔ طوفان اٹھے، بجلیاں چمکیں، بلکہ کبھی کبھی برق خرمن سوز سارے خرمن کو جلا کر خاکستر بھی کر گئی، لیکن اُن کے

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۚ ﴿۱۰۱﴾

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

التوبه ۹

تمھارے اردگرد جو بدوی رہتے ہیں، اُن میں بھی بہت سے منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی۔ وہ اپنے نفاق میں طاق ہو چکے ہیں۔ تم اُن کو نہیں جانتے، ہم اُن کو جانتے ہیں۔[۲۶۶] اُنھیں عنقریب ہم دو مرتبہ سزا دیں گے۔[۲۶۷] پھر وہ ایک عذاب عظیم کی طرف دھکیل دیے جائیں گے۔ ۱۰۱

(اِن کے علاوہ) کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ اُنھوں نے ملے جلے عمل کیے تھے، کچھ بھلے اور کچھ برے۔ امید ہے کہ اللہ اُن پر عنایت فرمائے، اِس لیے کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۲۶۸]

نفس مطمئنہ کو کوئی چیز بھی ہلا نہ سکی۔ وہ بدستور 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کی چٹان پر جما رہا اور بالآخر اُس نے 'فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ' کی ابدی بشارت حاصل کی۔"

(تدبر قرآن ۳/ ۶۳۵)

۲۶۶؎ یہ مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہے کہ اِن کے معاملے میں ہوشیار رہو اور منافقین کو بھی کہ دوسرے تمھیں پہچاننے میں دھوکا کھا سکتے ہیں، لیکن اللہ خوب جانتا ہے کہ تم کیسے بھگل بنائے ہوئے ہو۔

۲۶۷؎ یعنی ایک مرتبہ مسلمانوں کے ہاتھوں اور دوسری مرتبہ عالم برزخ میں، جب دنیا سے رخصت ہوں گے۔

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمۡ وَ تُزَکِّیۡہِمۡ بِہَا وَصَلِّ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمۡ ؕ وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۰۳﴾ اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا

تم اُن کے مالوں کا صدقہ قبول کر لو[۲۶۹]، اِس سے تم اُنھیں پاکیزہ بناؤ گے اور اُن کا تزکیہ کرو گے[۲۷۰] اور اُن کے لیے دعا کرو، اِس لیے کہ تمھاری دعا اُن کے لیے وجہ تسکین ہو گی۔

۲۶۸؎ یہ لوگ منافق نہیں تھے۔ تاہم کمزوریوں میں ضرور مبتلا تھے۔ چنانچہ تبوک کے موقع پر بھی اِن سے کمزوری صادر ہوئی، لیکن جیسے ہی متنبہ کیے گئے، اِنھیں سخت ندامت ہوئی اور باتیں بنانے کی کوشش کرنے کے بجاے اِنھوں نے صدق دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ بعض لوگوں نے یہاں تک کیا کہ اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا اور کہا کہ ہم پر خواب و خور حرام ہے، جب تک اللہ و رسول کی طرف سے معاف نہ کر دیے جائیں*۔ اِنھیں بشارت دی گئی ہے کہ اِن کے اعمال اچھے رہے تو امید ہے کہ اللہ اِن کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اِس سے قیامت کی جزا و سزا کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اِسی طرح کے لوگ ہیں جن کے بارے میں توقع کی جا سکتی ہے کہ وہاں بھی کسی سزا کے بغیر ہی معاف کر دیے جائیں گے۔

۲۶۹؎ یعنی وہ صدقہ جو اب یہ اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے کریں گے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ توبہ اور تطہیر کے لیے سب سے زیادہ موثر چیز اللہ کی راہ میں انفاق ہی ہے۔

۲۷۰؎ آیت میں تطہیر اور تزکیہ کے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...قرآن میں اِن دونوں کے مواقع استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ 'تطہیر' میں غالب پہلو ظاہری اور باطنی نجاستوں اور رذائل سے پاک کرنے کا ہے اور تزکیہ میں رذائل سے پاک کرنے کے ساتھ ساتھ صلاحیتوں اور خوبیوں کو نشوونما دینے اور فضائل اخلاق سے آراستہ کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۶۳۹)

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/ ۵۰۵۔

اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے[۲۷۱]۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اُن کے صدقات کی پذیرائی فرماتا ہے اور نہیں جانتے کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے[۲۷۲]؟ اور اُن سے کہہ دو کہ عمل کرو، اب اللہ اور اُس کا رسول اور اُن کے ماننے والے تمھارے عمل کو دیکھیں گے اور تم جلد اُس کے حضور پیش کیے جاؤ گے جو تمام کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ۱۰۲-۱۰۵

اِسی طرح کچھ دوسرے ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے فیصلے تک ٹھیرا ہوا ہے۔ وہ اُنھیں سزا دے گا یا اُن پر شفقت فرمائے گا اور اُن کی توبہ قبول کر لے گا۔ اللہ سب کچھ

۲۷۱؎ پیچھے منافقین کے بارے میں فرمایا تھا کہ نہ اُن کے صدقات قبول کیے جائیں گے اور نہ پیغمبر اُن کے لیے دعا و استغفار کریں گے، بلکہ اُن میں سے کوئی مر جائے تو اُس کے جنازے کی نماز بھی نہیں پڑھیں گے۔ یہ اُس کے برعکس ہدایت کی گئی ہے کہ اُن لوگوں کے لیے رحمت و برکت کے یہ سب دروازے کھول دیے جائیں جنھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے۔

۲۷۲؎ اوپر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ اب یہ براہ راست اِن لوگوں کو توبہ اور توبہ کے

جانتا ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے[273]۔ ۱۰۶

اور جنھوں نے ایک مسجد بنائی ہے[274]، اِس لیے کہ اسلام کو نقصان پہنچائیں اور

لیے صدقہ وانفاق کی ترغیب ہے۔

۲۷۳۔ آگے آیت ۱۱۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین آدمی تھے۔ روایتوں میں اِن کے نام کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع بیان ہوئے ہیں۔ تبوک کے موقع پر جو کمزوری اِن سے صادر ہوئی، اُس کا اِنھوں نے بھی نہایت سچائی کے ساتھ اعتراف کر لیا تھا، مگر اللہ نے اپنے علم و حکمت کے تقاضے سے اِن کا معاملہ موخر کر دیا اور فرمایا کہ ابھی دیکھیں گے کہ اِنھیں سزا دی جائے یا معاف کیا جائے۔ اِس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ زیر عتاب ہیں اور اللہ ابھی اِن سے راضی نہیں ہوا۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ جس درجے اور مرتبے کے یہ لوگ تھے، اُس کے لحاظ سے اِس طرح کی کمزوری اِن سے متوقع نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر اپنی اِس غلطی کا اُس شدت کے ساتھ اِنھوں نے احساس بھی نہیں کیا، جس شدت کے ساتھ اُس کا احساس اِنھیں کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ تزکیہ و تطہیر کے لیے اِن کا معاملہ موخر کر دیا گیا۔

۲۷۴۔ اِس جملے میں خبر محذوف ہے۔ آگے 'وَلَيَحْلِفُنَّ' کا جملہ اُسی پر عطف ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "یہ منافقین کے سب سے زیادہ شریر گروہ کا ذکر ہے۔ اِن لوگوں کی جس شرارت کی طرف یہاں اشارہ ہے، وہ یہ ہے کہ اگرچہ مدینہ میں دو مسجدیں پہلے سے موجود تھیں، ایک مضافات شہر میں مسجد قبا، دوسری شہر کے اندر مسجد نبوی، لیکن اِنھوں نے اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی ایک الگ مسجد بنائی۔ مقصود تو اِن کا یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں وہ کرنا چاہتے تھے، اُس کے لیے ایک اڈا مہیا کریں، لیکن اُس کو نام مسجد کا دیا تا کہ اِس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر اپنی دین داری کی دھونس بھی جمائیں اور اپنے

الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٠٧﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ

کفر کو تقویت دیں اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور اُن لوگوں کے لیے ایک کمین گاہ فراہم کریں جو اِس سے پہلے خدا اور اُس کے رسول کے ساتھ برسر جنگ رہے ہیں، (وہ بھی آئیں گے) اور (آ کر) قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو صرف بھلائی چاہی تھی۔[۲۷۵] مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ تم اُس میں کبھی کھڑے نہ ہونا، (اے پیغمبر)۔ وہی مسجد اِس کی حق دار[۲۷۶] ہے کہ تم اُس میں (عبادت کے لیے) کھڑے

مقاصد بھی پورے کر سکیں۔ اُس کو مسلمانوں کی نظروں میں مقبول اور مقدس بنانے کے لیے اِنھوں نے یہ کوشش بھی کی کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اُس میں ایک مرتبہ نماز پڑھ دیں تاکہ اُس کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں وہی احترام حاصل ہو جائے جو مسجد قبا کو حاصل ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کے اغراض مشؤمہ بھانپ کر پہلے تو اِن کو ٹال دیا، پھر جب اُس کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہو گئیں تو اُس میں نماز پڑھنا تو الگ رہا، آپ نے تبوک سے واپسی پر اُس کو گروا بھی دیا۔*" (تدبر قرآن ۳/۶۴۱)

۲۷۵ مطلب یہ ہے کہ ہمارے پیش نظر تو صرف اتنی بات تھی کہ اللہ کے ذکر اور اُس کی عبادت کے لیے ایک جگہ اور بنا دی جائے اور جو مسلمان اندھیری راتوں یا سردی اور بارش میں مسجد کی دوری کے باعث جماعت کی حاضری سے محروم رہ جاتے ہیں، وہ بھی جماعت کا ثواب حاصل کر سکیں۔

۲۷۶ اصل میں 'اَحَقُّ' کا لفظ ہے، مگر موقع کلام سے واضح ہے کہ یہ نسبت اور تقابل سے مجرد

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/۵۰۸۔

اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ

ہو جس کی بنیاد اول دن سے خدا کے تقویٰ پر قائم کی گئی ہے[۲۷۷]۔ اُس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ اُنھی کو پسند کرتا ہے جو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہوں[۲۷۸]۔ پھر کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے تقویٰ اور اُس کی خوشنودی پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک کھوکھلی گگر کے کنارے پر اٹھائی جو گرنے کو ہے اور وہ اُس کو لے کر دوزخ کی آگ میں جا گری؟ اِس طرح کے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی راہ نہ دکھائے گا[۲۷۹]۔ یہ عمارت جو اُنھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ اُن کے دلوں

ہو کر آیا ہے۔ عربی زبان میں 'اَفْعَلُ' اِس طریقے سے بھی آتا ہے۔

۲۷۷؎ جملے کا اسلوب بتا رہا ہے کہ اِس سے مسجد قبا مراد ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد ضرار اِسی کے توڑ پر بنائی گئی تھی*۔

۲۷۸؎ اِس میں، اگر غور کیجیے تو مسجد قبا کے نمازیوں کی تعریف کے ساتھ مسجد ضرار کے مفسدین پر تعریض بھی ہے کہ یہ ظاہر و باطن، دونوں میں آلودۂ غلاظت ہیں اور اللہ اِس طرح کے لوگوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔

۲۷۹؎ یعنی اُس منزل کی راہ نہ دکھائے گا جو قیامت میں اہل ایمان کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/۵۰۹۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١١٠﴾

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۟ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ

میں بے یقینی کی بنیاد بنی رہے گی، الّا یہ کہ اُن کے دل ہی ٹکڑے ہو جائیں۔[۲۸۰] اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۱۰۷-۱۱۰

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ (پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کر کے) ایمان لائے ہیں، اُن کے جان و مال اللہ نے اِس وعدے پر اُن سے خرید لیے ہیں کہ اُن کے بدلے میں وہ اُن کو جنت عطا فرمائے گا۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔[۲۸۱] یہ اللہ کے ذمے ایک سچا وعدہ ہے، تورات اور انجیل اور قرآن میں۔[۲۸۲] اور اللہ سے

۲۸۰؎ یہ تعلیق بالمحال کا ایک خوب صورت اسلوب ہے۔ ہم اپنے محاورے میں کہتے ہیں کہ یہ داغ اب کپڑے کے ساتھ ہی جائے گا۔ اِسی طرح فرمایا ہے کہ 'اِلَّآ اَنْ تُقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ'۔

۲۸۱؎ اسلام کی حقیقت یہی بیع و شرا ہے، لیکن یہاں خاص طور پر اِس کا حوالہ اِس لیے دیا ہے کہ پیغمبر کی موجودگی میں اِس بیع و شرا کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اُس کے ماننے والے منکرین حق کے لیے خدا کے عذاب کا تازیانہ بن جائیں اور اُن کو ماریں، خواہ اُن میں سے بعض اِس کے نتیجے میں خود بھی مارے جائیں۔ پیچھے جن لوگوں کا ذکر ہوا ہے، اُن کے نفاق کا اصلی سبب یہی تھا کہ وہ خدا سے اپنے جان و مال چراتے تھے۔ چنانچہ واضح کر دیا ہے کہ پیغمبر کے ہاتھ پر جو بیعت کی جاتی ہے، اُس کا سب سے بڑا تقاضا اِس وقت خدا کی راہ میں قتال ہی ہے۔

الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٢﴾

بڑھ کر کون ہے جو اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہو؟ سو اپنے اِس سودے پر خوشی مناؤ جو تم نے اللہ سے کیا ہے۔ (یاد رکھو)، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ وہ توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں، شکر کرنے والے ہیں، (خدا کی راہ میں) سیاحت کرنے والے ہیں، (اُس کے آگے) رکوع اور سجدہ کرنے والے ہیں، بھلائی کی تلقین کرنے والے ہیں، برائی سے روکنے والے ہیں اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والے ہیں[۲۸۳]۔ وہی سچے مومن ہیں، (اے پیغمبر)، اور اِن مومنوں کو خوشخبری دے دو[۲۸۴]۔ ۱۱۱-۱۱۲

۲۸۲؎ یعنی جان و مال کی قربانی کے عوض جنت کا وعدہ۔ انجیل میں جس چیز کو آسمانی بادشاہی سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ یہی ہے۔ پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کو جو بادشاہی دنیا میں حاصل ہوتی ہے، وہ اِسی کی ابتدا ہے۔ تورات کے مترجمین نے اِسی بنا پر ہر جگہ اِسے ایک ایسے ملک پر چسپاں کر دیا ہے، جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے، یعنی فلسطین کی سرزمین جس کے وہ دنیا میں امیدوار تھے۔

۲۸۳؎ اصل میں مبتدا محذوف ہے، یعنی 'ھم التائبون'۔ یہ منافقین کے سامنے اُن اوصاف کی وضاحت کر دی ہے، جن کا حامل ہر سچے مومن کو ہونا چاہیے تاکہ وہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ ایمان کے تقاضے کیا ہیں اور کون سا رویہ کفر اور نفاق میں داخل ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہاں اہل ایمان کے کردار کے جو اجزا بیان ہوئے ہیں، اُن میں سب سے پہلے توبہ کا ذکر ہے۔ توبہ کے معنی رجوع الی اللہ کے ہیں۔ خدا کی بندگی اور اطاعت کی راہ میں بندے کا پہلا

قدم یہی ہے کہ وہ شیطانی راہوں میں ہرزہ گردی چھوڑ کر اپنے رب کی طرف لوٹتا ہے اور اُس کی صراطِ مستقیم پر چلنے کا عزم کرتا ہے۔ پھر یہی توبہ ہے جو ہر گام پر اُس کو سنبھالتی ہے۔ جب کبھی اُس کا کوئی قدم راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے، یہ توبہ اُس کی دست گیری کرتی اور اُس کو راہ پر لگاتی ہے۔

توبہ کے بعد عبادت کا ذکر ہے۔ یہ خدا کے سب سے بڑے حق کا حوالہ ہے۔ جو بندہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، اُس پر خدا کا اولین حق اُس کی عبادت کا عائد ہوتا ہے اور چونکہ خدا کے سوا کوئی اور اِس حق میں ساجھی نہیں ہے، اِس وجہ سے اِس کا بلا شرکت غیرے ہونا اِس کی صفت لازمی ہے اور ساتھ ہی اطاعت بھی چونکہ اِس کا بدیہی تقاضا ہے، اِس وجہ سے وہ بھی اِس کا جزو لاینفک ہے۔ عبادت کے ساتھ حمد کا ذکر ہے جو تمام عبادات کی روح ہے، اِس لیے کہ نماز اور زکوٰۃ وغیرہ... سب خدا کی شکر گزاری اور اُس کی نعمتوں کے اعتراف کے مظاہر ہیں۔ اگر بندے کے اندر شکر گزاری اور اعترافِ نعمت کا جذبہ بطور ایک صفت کے راسخ نہ ہو تو نہ تو وہ عبادت کا حق ادا کرنے پر آمادہ ہی ہوتا ہے اور نہ اُس کی عبادت کے اندر کوئی روح ہی ہوتی ہے۔

اِس کے بعد سیاحت کا ذکر ہے... یہ اُن تمام سرگرمیوں، مشقتوں اور ریاضتوں کی ایک جامع تعبیر ہے جو آدمی اپنے ظاہر و باطن کی تربیت و اصلاح، دین کو سمجھنے اور سمجھانے، اُس کو پھیلانے اور بڑھانے کے لیے والہانہ اور سرفروشانہ اختیار کرتا ہے اور جن کی راہ میں اپنی زندگی کی لذتیں، راحتیں، امنگیں اور خوشیاں بے دریغ قربان کرتا ہے۔

پھر نماز کا ذکر ہے جس کے لیے 'الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ نماز کا ذکر قرآن میں جہاں جہاں اِس اسلوب سے ہوا ہے، وہاں صرف فرض نمازیں مراد نہیں ہیں، بلکہ خلوت کی نمازیں مراد ہیں۔ یہی نمازیں اُن تمام چیزوں کی محافظ بھی ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور یہی اُس ریاضت کو بھی زندگی اور نشوونما بخشتی ہیں جو سیاحت کے لفظ سے تعبیر کی گئی۔

اِس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر ہے۔ اوپر جو باتیں بیان ہوئی ہیں، اُن کا بیش تر تعلق فرد کی اپنی اصلاح و تربیت سے ہے۔ اب یہ اُن کا تعلق قوم اور جماعت کے ساتھ

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا

نبی [۲۸۵] اور اُس کے ماننے والوں کے لیے زیبا نہیں کہ (جن) مشرکین (سے اعلان براءت ہو چکا ہے، اُن) کے لیے مغفرت کی دعا کریں، اگرچہ وہ اُن کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جب کہ اُن پر کھل چکا کہ وہ دوزخ کے لوگ ہیں [۲۸۶]۔ ابراہیم نے تو اپنے باپ

التوبة
٩

واضح کیا جا رہا ہے کہ وہ نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے ہیں۔ وہ دوسروں کے خیر و شر سے بے تعلق رہ کر زندگی نہیں گزارتے، بلکہ دوسروں کی اصلاح و تربیت کے لیے بھی اپنے اندر تڑپ رکھتے ہیں اور اپنی طاقت و صلاحیت کے مطابق اصلاح منکر کا فرض انجام دیتے ہیں۔

آخر میں حفظ حدود اللہ کا ذکر ہے۔ یہ درحقیقت تقویٰ کی تعبیر ہے اور خاتمہ پر ایک ایسی صفت کا حوالہ دے دیا گیا ہے جو سب سے زیادہ جامع ہے۔ یعنی وہ زندگی کے تمام مراحل میں برابر چوکنے رہتے ہیں کہ خدا نے جو حدود قائم فرمائے ہیں، اُن میں سے کوئی حد ٹوٹنے نہ پائے۔ نہ وہ خود کسی حد کو توڑنے کی جسارت کرتے ہیں اور نہ اپنے امکان کی حد تک کسی دوسرے کو اُس کے توڑنے کی اجازت دیتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۶۴۷)

۲۸۴۔ اِس جملے کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۲۸۵۔ یہ چھٹا اور آخری شذرہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر تبوک سے واپسی کے بعد مدینۂ طیبہ میں کسی وقت نازل ہوا ہے۔

۲۸۶۔ یہ اُس مرحلے کا حکم ہے، جب پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت اور اعلان براءت کے بعد بھی لوگ ایمان لانے سے انکار کر دیں۔ پیغمبر اور اُس کے ساتھیوں کی دعائیں قوم کے لیے خدا کی امان ہوتی ہیں۔ جزا و سزا کے اِس مرحلے میں ضروری تھا کہ اُنھیں اِس امان سے محروم کر دیا جائے

تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ

کے لیے صرف اُس وعدے کے سبب سے مغفرت مانگی تھی جو اُس نے اپنے باپ سے کر لیا تھا۔[287] مگر جب اُس پر واضح ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو وہ اُس سے بے تعلق ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑا نرم دل اور بردبار تھا۔[288] (تم یاد رکھو کہ) اللہ کا طریقہ

اور جو عذاب اُن کے لیے مقدر ہو چکا ہے، وہ اُس کو بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ پھر یہ دعائیں حمیت حق کے بھی منافی تھیں، اِس لیے کہ اِس وضاحت کے بعد کہ وہ جہنم کے مستحق ہو چکے ہیں، اگر کسی رشتہ و تعلق کی بنا پر مغفرت کی دعا کی جائے تو اِس کے صاف معنی یہی ہوں گے کہ قرابت کی حمیت حمیت حق پر غالب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، البتہ اِس طرح کے اتمام حجت اور اعلان براءت کا موقع باقی نہیں رہا۔ چنانچہ کوئی حرج نہیں کہ کفر و شرک کے کسی مرتکب کے لیے بھی اُن الفاظ میں دعا کر دی جائے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے اختیار فرمائے ہیں کہ 'اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ، وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ، فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'*، (آپ اُنھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ زبردست ہیں، بڑی حکمت والے ہیں)۔

۲۸۷ اِس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وعدے کی اہمیت کس قدر غیر معمولی ہے۔

۲۸۸ یہ باپ کے معاملے میں ابراہیم علیہ السلام کی دردمندی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پسندیدگی کا اظہار ہے۔ تاہم جب واضح ہو گیا کہ باپ فی الواقع خدا کا دشمن ہے تو اُنھوں نے سختی کے ساتھ اعلان براءت بھی کر دیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ اُس کی محبت میں موم بھی بنے اور پتھر بھی، اِس وجہ سے حضرت ابراہیم نے اپنے دل کے یہ دونوں پہلو نمایاں کیے اور یہی صحیح نمونہ ہے دین کے

* المائدہ ۵: ۱۱۸۔

مَّا يَتَّقُوْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١٥﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١١٦﴾

یہ نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد پھر گم راہی میں مبتلا کر دے، جب تک کہ اُنھیں صاف صاف وہ چیزیں نہ بتا دے جن سے اُنھیں بچنا ہے۔[۲۸۹] اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ اللہ ہی ہے کہ زمین اور آسمانوں پر جس کی بادشاہی ہے۔ وہی زندگی دیتا اور وہی مارتا ہے اور اللہ کے سوا نہ تمھارا کوئی حامی ہے اور نہ مددگار۔ ۱۱۳-۱۱۶

خدمت گزاروں کے لیے۔ جب تک اُن کے سینے میں دردمند دل نہ ہو، خلق کی ہدایت کے لیے اُن کا اٹھنا بے سود اور جب تک عزم میں لوہے کی صلابت اور پہاڑ کی استقامت نہ ہو، دین کے لیے اُن کا وجود بالکل ناکارہ!'' (تدبر قرآن ۳/۶۵۵)

۲۸۹ یہ مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ خدا نے تمھیں راہ ہدایت دکھانے کے بعد اُن خطرات سے بھی آگاہ کر دیا ہے جو اِس راہ کے مسافر کو پیش آسکتے ہیں۔ رشتہ و قرابت کی بنا پر اُن لوگوں کے لیے دعائیں جن کے بارے میں خدا نے اعلان کر دیا ہو کہ وہ اُس کے دشمن ہیں، تمھارے ایمان کے لیے فتنہ بن سکتی تھیں۔ چنانچہ صاف صاف بتا دیا ہے کہ یہ تمھارے لیے زیبا نہیں ہے۔ آگے صفات الٰہی کے حوالے سے یاد دہانی ہے۔ یہ اِسی تنبیہ کا جزو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غایت درجہ احتیاط کرو۔ تمھارا معاملہ اُس ہستی کے ساتھ ہے جو زمین و آسمان کا بادشاہ ہے، موت و حیات کا مالک ہے، ظاہر و باطن، ہر چیز کا جاننے والا ہے، اُس سے متعلق کسی نفاق کا شائبہ بھی دل و دماغ میں رہنے دو گے تو اندیشہ ہے کہ کسی بڑے خطرے سے دوچار ہو جاؤ گے۔ پھر اُس کے سوا کوئی حامی اور مددگار نہ پا سکو گے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ وَالْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ

اللہ نے نبی پر اور (نبی کے ساتھی) اُن مہاجرین و انصار پر رحمت کی نظر کی جنھوں نے تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا، اِس کے بعد کہ اُن میں سے بعض کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے۔ پھر اللہ نے اُن پر رحمت کی نظر کی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اُن پر مہربان ہے، بڑا رحم فرمانے والا ہے[۲۹۰]۔ اِسی طرح اُن تینوں پر رحمت کی نظر کی جن کا

۲۹۰؎ آیت میں فعل 'تَابَ' کا صلہ 'عَلٰی' کے ساتھ آیا ہے اور اُس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ یہ اِس طرح آئے تو رحمت و عنایت کے مضمون پر متضمن ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس طرح کی کوئی غلطی صادر نہیں ہوئی تھی، جس طرح کی غلطیوں پر پیچھے لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔ آپ کا معاملہ صرف یہ تھا کہ اپنی کریم النفسی کے باعث آپ نے بعض موقعوں پر منافقین سے چشم پوشی فرمائی تھی، دراں حالیکہ اُس وقت یہ چشم پوشی تطہیر کی اُس مہم کے خلاف تھی جو عذاب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پیش نظر تھی۔ اِس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔ اِسی طرح مہاجرین و انصار کا سواد اعظم اگرچہ ہر قسم کے شدائد و مصائب کے باوجود ثابت قدمی کے ساتھ راہ حق پر قائم رہا، مگر ایک چھوٹے سے گروہ سے تبوک کے موقع پر کچھ کمزوری صادر ہوئی۔ یہ اُسی کا حوالہ ہے کہ اُن میں سے بعض کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے۔ تاہم یہ لوگ بھی جلد بیدار ہو گئے اور توبہ و استغفار سے اپنے دلوں کو راہ حق پر استوار کر لیا۔ اِس آیت نے سب کو بشارت دے دی کہ اللہ کی رحمت اُن کی طرف متوجہ ہے۔ وہ تبوک کے موقع پر اور اِس سے پہلے بھی تنگی کے ہر وقت میں پیغمبر کے ساتھ رہے ہیں۔ اللہ نے اِسی بنا پر اُن کی ہر کوتاہی معاف کر دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِن الفاظ کا حوالہ ایک تو اِس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ اصل ایمان اُن کا ایمان ہے جو

خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَیْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ

معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود اُن پر تنگ ہو گئی اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور اُنھوں نے اندازہ کر لیا کہ خدا سے خدا کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے،[291] پھر اللہ نے اپنی رحمت سے توجہ فرمائی کہ وہ اُس کی طرف

النوبہ
۹

مصائب وشدائد کی کسوٹیوں پر جانچے اور پرکھے جا چکے ہوں۔ دوسری بات اِس سے یہ نکلی کہ دراصل مہاجرین وانصار کے ایمان کی یہی خصوصیت ہے جو اُن کے لیے سفارش بنی کہ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمت کی نظر اور اُن کی توبہ قبول فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وفادار و جاں نثار بندوں کو توفیق خیر سے محروم نہیں فرماتا۔ جب اُن سے کوئی کمزوری صادر ہو جاتی ہے، اُن کے دل میں وہ توبہ کی بے قراری پیدا کرتا ہے، پھر وہ توبہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نظر انداز صرف اُن کو کرتا ہے جو صرف زبان سے عشق کا دعویٰ کرتے ہیں، اِس راہ میں چوٹ کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔" (تدبر قرآن ۳/ ۶۵۷)

۲۹۱ اِن کا ذکر پیچھے آیت ۱۰۶ میں ہو چکا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں پورے پچاس دن زیر عتاب رہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر مسلمانوں کی پوری جماعت نے اِن کا مقاطعہ کر دیا۔ اللہ کے پیغمبر نے بھی رخ پھیر لیا۔ اعزہ واقربا، دوست احباب، یہاں تک کہ بیوی بچے بھی بالکل غیر بن کر رہ گئے۔* اِسی کو بیان کیا ہے کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود اُن پر تنگ ہو گئی۔ اِس کا اثر اِن کے باطن پر یہ پڑا کہ خدا اور رسول کی ناراضی کے احساس نے اِنھیں خود اپنے وجود سے بے زار کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نہ باہر سکون کی کوئی جگہ نظر آتی تھی اور نہ اپنے دل کے اندر سکون واطمینان کا کوئی گوشہ تلاش کر سکتے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِن کے دل پگھل اٹھے اور یہ توبہ وانابت کے اُس معیار تک پہنچ گئے جو اِس مرتبے کے لوگوں سے مطلوب تھا۔ استاذ امام لکھتے

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/ ۵۱۹۔

لِيَتُوبُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١١٨﴾

پلٹیں۔[٢٩٢] یقیناً اللہ ہی ہے جو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ١١٧-١١٨

ہیں:

"... جتنی ہی شدت کے ساتھ اِن لوگوں پر عتاب ہوا، اتنی ہی بے قراری کے ساتھ اِن لوگوں نے اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دیا کہ جب گرفت خدا کی طرف سے ہے تو اِس سے پناہ صرف وہی دے سکتا ہے۔ چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین میں سے دو صاحبوں نے تو بالکل ہی خانہ نشینی اختیار کر لی، رات دن گریہ وزاری اور توبہ واستغفار کے سوا اِن کا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا۔ تیسرے صاحب اگرچہ کسی کسی وقت باہر نکلتے، لیکن صرف اِس امید میں کہ شاید کسی گوشے سے خدا اور رسول کی رضا کی کوئی مہک آجائے۔* اگر اِن کے اندر نفاق کا کوئی جرثومہ ہوتا تو جب یہ خدا اور رسول کی طرف سے پھینکے گئے تھے، کسی اور کی پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ لیکن یہ راسخ الایمان لوگ تھے، اِس وجہ سے ٹھیک اُس بچے کی طرح جو ماں کی جھڑکی سے سہم کر خود ماں ہی سے چمٹتا ہے، یہ خدا کے عذاب سے بچنے کے لیے خدا ہی کی طرف بھاگے۔" (تدبر قرآن ٣/٦٥٩)

٢٩٢۔ اصل الفاظ ہیں: 'ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا'۔ 'لِيَتُوبُوا' میں فعل کامل اور حقیقی معنی میں ہے۔ اپنے گناہ کا اعتراف تو یہ پہلے ہی کر چکے تھے، لیکن آزمایش کے اِن سخت مراحل سے گزرنے کے بعد اِن کے دل اچھی طرح گداز ہو گئے تو اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی اور اِنھیں اُس توبہ کی توفیق بخشی جس نے دل و دماغ کو ہر آلودگی سے پاک کر دیا۔ قرآن کے اِن الفاظ سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... توبہ کی ابتدا اصلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہی پہلے بندے کے دل میں رجوع الی اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ پھر جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوبارہ اُس پر رحمت کی نظر

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ٢/٥٢٠۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾
مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ

ایمان والو، (اِن غلطیوں سے بچنا چاہتے ہو تو) اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔[۲۹۳] حقیقت یہ ہے کہ مدینہ والوں اور اُن کے گرد و نواح کے بدویوں کے لیے

فرماتا اور اُس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اگر اُس کے اندر ایمان ہو تو ہر گناہ پر اُس کا دل کڑھتا اور آزردہ ہوتا ہے اور ایک احساس ندامت کے ساتھ اُس کے اندر اپنے رب کی طرف رجوع ہونے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اگر آدمی اپنے اِس جذبے کے مطابق عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے دل اور زبان پر وہ الفاظ اور کلمات بھی جاری فرما دیتا ہے جو اُس کو پسند ہیں اور جن کو وہ شرف قبولیت بخشتا ہے۔ اِس سے محروم صرف وہ بدقسمت لوگ رہتے ہیں جن کا ضمیر کند اور جن کا ایمان مردہ ہو جایا کرتا ہے۔ ایسے لوگ خدا سے بے پروا ہو جایا کرتے ہیں جس کی سزا اُن کو یہ ملتی ہے کہ خدا بھی اُن سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ آدم و ابلیس کی سرگذشت، جو سورۂ بقرہ میں بیان ہوئی ہے، وہ اِس کی نہایت حقیقت افروز مثال ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۶۶۰)

۲۹۳۔ اصل میں لفظ 'صٰدِقِيْنَ' استعمال ہوا ہے۔ یہ منافقین کا ضد ہے، یعنی وہ لوگ جن کے قول و فعل میں پوری مطابقت ہو۔ پیچھے جن کوتاہیوں پر گرفت ہوئی ہے، اُن سے بچنے کے لیے یہاں خدا سے ڈرنے اور سچے لوگوں کی معیت اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پہلی چیز اندر سے انسان کی حفاظت کرتی ہے اور دوسری باہر سے اُس کو شیطان کے مقابل میں مدد پہنچاتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اگر آدمی کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا کافروں، منافقوں اور جاہلوں کے ساتھ ہو تو کمزور تو درکنار بسا اوقات مضبوط آدمی بھی کچھ نہ کچھ اُن کا اثر قبول کر ہی لیتا ہے۔ اِسی طرح راسخ الایمان اور راسخ العمل لوگوں کے فیض صحبت سے کمزور آدمی کے اندر بھی اپنی کمزوریوں پر غالب آنے کا

يَّتَخَلَّفُوا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۙ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً

زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر پیچھے بیٹھے رہیں اور نہ یہ زیبا تھا کہ اپنی جان کو اُس کی جان سے عزیز رکھیں۔ یہ اِس لیے کہ جو پیاس، تکان اور بھوک بھی اُن کو خدا کی راہ میں لاحق ہوتی ہے اور (پیغمبر کے) منکروں کو رنج پہنچانے والا جو قدم بھی وہ اٹھاتے ہیں اور (اُس کے) کسی دشمن کو جو چرکا بھی لگاتے ہیں، اُن سب کے بدلے میں ایک نیکی اُن کے لیے لکھ دی جاتی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ خوبی اختیار کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔[۲۹۴] اِسی طرح جو چھوٹا یا بڑا انفاق وہ کرتے ہیں اور (راہ حق میں) جو وادی

حوصلہ پیدا ہو جایا کرتا ہے اور وہ بالتدریج اُن کے زمرے کا آدمی بن جاتا ہے۔‘‘

(تدبر قرآن ۳/ ۶۶۰)

۲۹۴ اصل میں لفظ ’مُحْسِنِيْنَ‘ آیا ہے۔ یہ اُس شرط کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ کے ہاں اعمال کی مقبولیت کے لیے ضروری ہے۔ یعنی جب کوئی عمل کیا جائے تو اُس کی روح اور قالب، دونوں پورے توازن کے ساتھ پیش نظر ہوں، اُس کا ہر جز و بہ تمام و کمال ملحوظ رہے اور اُس کے دوران میں آدمی اپنے آپ کو خدا کے حضور میں سمجھے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کا معاملہ اپنی راہ میں دکھ اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے والوں سے یہ ہے تو اُن کے لیے بھی زیبا نہیں کہ وہ اپنے جان و مال کو پیغمبر کے مقابل میں ترجیح دیں۔

وَلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا

بھی قطع کرتے ہیں، سب اُن کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ اللہ اُن کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ اُنھیں دے۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ مسلمان، سب کے سب نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلتے تاکہ دین میں بصیرت پیدا کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو (اُن کے اِن رویوں پر) خبردار کرتے، جب اُن کی طرف لوٹتے، اِس لیے کہ وہ خدا کی گرفت سے بچتے؟[۲۹۵] ۱۱۹-۱۲۲

ایمان والو، (اِن تنبیہات کے بعد اب نکلو اور جس طرح کہ پیچھے حکم دیا گیا ہے)،

۲۹۵؎ یہ وہ اہتمام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے لیے تجویز فرمایا ہے جو دور دراز کے علاقوں میں رہنے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات بھی آپ سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ بالبداہت واضح ہے کہ یہی اہتمام آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ سب مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے، لیکن اُن کی ہر جماعت میں سے کچھ لوگوں کو لازماً اِس مقصد کے لیے نکلنا چاہیے کہ وہ دین کا علم حاصل کریں اور اپنی قوم کے لیے نذیر بن کر اُسے آخرت کے عذاب اور خدا کی گرفت سے بچانے کی کوشش کریں۔ یہ، اگر غور کیجیے تو بعینہٖ وہی کام ہے جو اللہ کے نبی اور رسول اپنی قوم میں کرتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دعوت و انذار کا کام آپ کے بعد اِس

فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٢٣﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

اپنے گردوپیش کے منکروں سے جنگ کرو[296] اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں[297]، اور جانے رہو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرنے والے ہوں[298]۔ (اِن پر افسوس، یہ کہاں نکلیں گے؟ اِن کا حال تو یہ ہے کہ) جب کوئی سورت اترتی ہے تو اِن میں سے بعض وہ بھی ہیں جو پوچھتے ہیں کہ اِس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا

امت کے علما کو منتقل ہوا ہے اور ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری اب قیامت تک اُنھیں ہی ادا کرنی ہے۔

۲۹۶ آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن اُنھی منافقین کی طرف ہے جو اپنی دوستیوں، رشتہ داریوں اور کاروباری تعلقات کے پیش نظر اُن لوگوں کے خلاف کسی اقدام کے لیے تیار نہیں تھے جن کے ساتھ اِس سورہ میں جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر شخص کو اُنھی سے لڑنا ہے جو اُس کے گردوپیش میں رہتے ہیں اور کسی نہ کسی لحاظ سے اُس کے اپنے ہیں۔ ایمان واخلاص کا اصلی امتحان اِسی سے ہوتا ہے۔ یادرہے کہ گوسالہ پرستی کے جرم کی پاداش میں جب بنی اسرائیل کے قتل عام کا حکم دیا گیا تھا تو اُس میں بھی یہی تقاضا کیا گیا تھا۔ آیت میں 'يَلُوْنَكُمْ' کی قید اِسی پہلو کو نمایاں کر رہی ہے۔

۲۹۷ یعنی محسوس کرلیں کہ تمھارے اندر اب اُن کے لیے دوستی، موالات اور محبت کی کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی ہے۔ جزاوسزا کے مرحلے میں یہی تقاضا ہے جس کے پیش نظر ترک موالات کا حکم دیا جاتا ہے۔ اِس کا اُن لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جو ابھی مرحلۂ دعوت کے مخاطبین ہوں۔

۲۹۸ یہ فتح ونصرت کی بشارت ہے اور ہمیشہ اِسی شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ لوگ تقویٰ پر قائم رہیں اور جنگ وجدال کے موقع پر بھی خدا کے مقرر کردہ حدود سے کوئی تجاوز نہ کریں۔

اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ

ہے؟[۲۹۹] سو حقیقت یہ ہے کہ جو فی الواقع ایمان لائے ہیں[۳۰۰]، اُن کے ایمان میں تو اُس نے اضافہ کر دیا اور وہ اُس سے خوشیاں مناتے ہیں۔ رہے وہ جن کے دلوں میں نفاق کا روگ ہے تو اُن کی نجاست پر اُس نے ایک اور نجاست بڑھا دی اور وہ مرنے تک منکر ہی رہے[۳۰۱]۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہر سال میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ وہ آزمایش میں ڈالے جاتے ہیں[۳۰۲]، پھر بھی نہ توبہ کرتے ہیں، نہ یاددہانی حاصل کرتے ہیں؟[۳۰۳] اور (کسی نئی مہم

۲۹۹؎ یہ تعریض کا جملہ ہے۔ اِس سے اُن کا مقصود خدا کے احکام کی تحقیر اور اُن لوگوں کی حوصلہ شکنی تھا جو پورے اخلاص کے ساتھ اُن احکام کو سننے اور اُس پر عمل کے لیے آمادہ رہتے تھے۔

۳۰۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'۔ اِن میں فعل اپنے کامل اور حقیقی معنی میں ہے۔ ہم نے ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳۰۱؎ یہ محض استعارہ نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...قرآن کا ہر حکم اہل ایمان کے لیے ایک میدان مسابقت کھولتا ہے اور جب وہ اِس میدان کی بازی جیت لیتے ہیں تو اُن کی قوت ایمانی میں مزید دوسرے میدان جیتنے کے لیے عزم و حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ درجہ بدرجہ وہ سعادت کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ برعکس اِس کے اہل نفاق ایک محرومی کے بعد دوسری محرومی اور ایک پسپائی کے بعد دوسری پسپائی کی ذلتیں سہتے سہتے عزم و ایمان کی آخری رمق سے بھی بالکل خالی ہو جاتے ہیں اور اُن کے دلوں پر نفاق پر نفاق کی اتنی موٹی تہیں جم جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کے اندر جتنی

اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾
لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ

کی تیاری کے لیے) جب کوئی سورت اتاری جاتی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ تمھیں کوئی دیکھتا تو نہیں، پھر نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ نے اِن کے دل (اپنے قانون کے مطابق) پھیر دیے ہیں، اِس لیے کہ یہ سمجھنے والے لوگ ہی نہیں ہیں۔[۳۰۳][۳۰۴] ۱۲۳-۱۲۷

(لوگو)، تمھارے پاس خود تم میں سے ایک رسول آیا ہے۔[۳۰۵] تمھارا نقصان میں پڑنا

صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، سب اُن کے نیچے دب دبا کر مردہ ہو جاتی ہیں۔''

(تدبر قرآن ۳/ ٦٦٥)

۳۰۲؎ یہ معاملہ ابتلا کے اُسی قانون کا حصہ ہے جو رسولوں کے براہ راست مخاطبین سے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے۔ اِس طرح کی آزمایشیں عام لوگوں کی زندگی میں بھی اُن کی تذکیر و تنبیہ کے لیے وقتاً فوقتاً پیش آتی رہتی ہیں، تاہم ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر شخص کو اور ہر سال پیش آئیں۔

۳۰۳؎ یعنی نہ عقل بیدار ہوتی ہے کہ تذکر حاصل کریں اور نہ دل پگھلتے ہیں کہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

۳۰۴؎ یعنی اپنے اُس قانون کے مطابق جو اُس نے لوگوں کی ہدایت وضلالت کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔

۳۰۵؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے تمام خلق پر عموماً اور اہل عرب پر خصوصاً جو احسان عظیم فرمایا، یہ اُس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ روے سخن اُنھی شامت زدہ لوگوں کی طرف ہے جو اِس نعمت عظمیٰ کی قدر کرنے کے بجاے اِسے اپنے لیے ایک مصیبت سمجھ رہے تھے۔

حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِىَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۱۲۹﴾

اُس پر بہت شاق ہے۔ وہ تمھاری بھلائی کا حریص ہے۔ ایمان والوں کے لیے سراپا شفقت اور سراسر رحمت ہے[۳۰۶] ـــــ پھر بھی یہ روگردانی کرتے ہیں تو، (اے پیغمبر)، کہہ دو کہ میرے لیے اللہ کافی ہے[۳۰۷]۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ میں نے اُسی پر بھروسا کیا اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔ ۱۲۸-۱۲۹

التوبه
۹

۳۰۶؎ یہ تمام صفات حرف عطف کے بغیر آئی ہیں۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ اِن میں کامل اتصال کا اظہار ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس ہستی کی ناقدری کر رہے ہو، اُس کا حال تو یہ ہے کہ جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کو ہر تکلیف، ہر پریشانی، ہر دکھ اور ہر کرب سے محفوظ رکھنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے، وہ تمھارے لیے اُسی طرح بے تاب ہے، تمھیں دنیا کی ہر سعادت سے بہرہ مند دیکھنا چاہتا ہے اور ایمان پر قائم ہو جاؤ تو تمھارے لیے سراپا رأفت و رحمت ہے۔ اِن آخری دو صفات کے بارے میں استاذ امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"...ایک کے اندر دفع شر کا پہلو نمایاں ہے، دوسرے کے اندر عطاے خیر اور پایداری رحمت کا۔ یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ کی صفات حسنیٰ میں سے ہیں جو بعینہٖ یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوئی ہیں، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ خلق کے ساتھ رأفت و رحمت کے معاملے میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم بالکل صفات الٰہی کے مظہر تھے۔"

(تدبر قرآن ۳/ ٦٦٧)

۳۰۷؎ یعنی تمھاری یہ بات اگر اِن کی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ خدا کی راہ میں اور اُس کے حکم پر جس جہاد و قتال کے لیے تم اِنھیں بلا رہے ہو، اُس میں خود اِن کے لیے دنیا اور آخرت کی کیا کیا

سعادتیں پوشیدہ ہیں تو پروانہ کرو اور اِنھیں صاف صاف بتا دو کہ یہ میری کوئی ضرورت نہیں ہے، میرے لیے میرا پروردگار ہی کافی ہے۔

کوالالمپور

۲۳ / جولائی ۲۰۱۱ء

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

باب سوم

یونس ۔ النور

قریش کو انذار

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں کو غلبۂ حق کی بشارت

اور اُن کا تزکیہ و تطہیر

باب سوم

یونس - النور

۱۰ —— ۲۴

یہ قرآن مجید کا تیسرا باب ہے۔ اِس میں 'یونس' (۱۰) سے 'النور' (۲۴) تک پندرہ سورتیں ہیں۔ اِن سورتوں کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں سے پہلی چودہ سورتیں ام القریٰ مکہ میں اور آخری سورہ ـــــ النور ـــــ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

قرآن مجید کے دوسرے ابواب کی طرح یہ چیز اِس باب میں بھی ملحوظ ہے کہ یہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا اور ایک مدنی سورہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

اِس کے مخاطب اصلاً قریش مکہ ہیں۔ اہل کتاب کو اُنھی کے ضمن میں بعض موقعوں پر تنبیہ کی گئی ہے، اِس لیے کہ اِن سورتوں کے زمانۂ نزول میں وہ بھی قریش کی حمایت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے میدان میں آ چکے تھے۔ تزکیہ و بشارت کے مضامین میں، البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والے بھی جگہ جگہ مخاطب ہوئے ہیں، بلکہ سورۂ طٰہٰ میں تمام تر خطاب آپ ہی سے کیا گیا ہے۔

اِس کا موضوع قریش کو انذار، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں کو سرزمین عرب میں غلبۂ حق کی بشارت اور اُن کا تزکیہ و تطہیر ہے، جس میں غلبۂ حق کی بشارت کا پہلو نمایاں ہے۔

یونس۔ ہود

۱۰ــــــ۱۱

یونس۔ ھود

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع انذار و بشارت ہے۔ دوسری سورہ میں اِس انذار و بشارت کے تاریخی دلائل، البتہ زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ دونوں میں خطاب قریش سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۃ یونس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ قف تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۱﴾ اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی رَجُلٍ مِّنۡہُمۡ اَنۡ اَنۡذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنَّ لَہُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ

— ۱ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورہ 'الٓرٰ' ہے[۱]۔ یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو سراسر حکمت ہے[۲]۔ کیا اِن لوگوں کو اس پر حیرانی ہوگئی کہ ہم نے اِنھی میں سے ایک شخص پر وحی کی ہے کہ لوگوں کو خبردار کرو[۳] اور جو مان لیں، اُنھیں خوش خبری پہنچا دو کہ اُن کے لیے اُن کے پروردگار کے پاس بڑی

۱۔ اِس نام کے کیا معنی ہیں؟ اِس کے متعلق ہم نے اپنا نقطۂ نظر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۲۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اِس کتاب کی صداقت کا معیار خود اِس کی حکمت ہے۔ یہ اِس کے لیے کسی خارجی شہادت کی محتاج نہیں ہے۔

۳۔ یعنی اِس میں انکار و استعجاب اور حیرانی کی کیا بات ہے؟ خدا نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے اِنھی کے اندر سے ایک شخص کو منتخب کیا ہے تو یہی قرین عقل ہے۔ یہ اُس کے ماضی و حاضر اور اخلاق و کردار سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اُس کی راست بازی اور امانت و دیانت کو جانتے ہیں۔ پھر یہی نہیں، اِن کا معلم و مرشد اور اِن کے لیے نمونہ و مثال بھی کوئی جن یا فرشتہ نہیں، بلکہ انسان ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ خدا نے اِنھی کے ایک بہترین فرد کا انتخاب کیا ہے۔ استاذ امام کے

اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲﴾

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ

عزت کا مرتبہ ہے[4]؟ (اِس حقیقت کو سمجھنے کے بجاے) اِن منکروں نے کہہ دیا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے[5]۔ ۱-۲

(لوگو[6])، حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو

الفاظ میں یہ گویا انھی کی زبان اور اِنھی کے ضمیر کی گواہی ہے جو اِن کے آگے پیش کی جارہی ہے۔

۴؎ اصل میں 'قَدَمَ صِدۡقٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی ایسا مرتبہ جس میں عزت، بلندی اور لازوال سرفرازی ہو۔ یہ معنی لفظ 'صِدۡق' سے پیدا ہوئے ہیں جو رسوخ واستحکام اور تمکن پر دلیل ہوتا ہے۔

۵؎ یعنی جب دیکھا کہ اِس کی بات لوگوں کو متوجہ کر رہی ہے تو کہہ دیا کہ یہ شخص الفاظ کی جادوگری کا ماہر ہے۔ اِس کو کوئی مافوق ہستی اور اِس کے کلام کو کوئی مافوق چیز سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ محض فصاحت و بلاغت اور حسن بیان کا کمال ہے۔ اِس سے زیادہ اِس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

۶؎ یہاں سے آگے اُس انذار و بشارت کی دلیل بیان ہو رہی ہے جس سے سورہ کی ابتدا ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...(اِس میں) مقدمات کی ترتیب اِس طرح ہے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور جس کا خالق ہونا تمھیں خود بھی تسلیم ہے، وہی تمھارا رب اور آقا و مولیٰ ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خالق تو کوئی اور ہو، آقا و مولیٰ کوئی اور بن جائے؟ اگر تم نے کچھ اور رب بنا کر اُن سے کچھ امیدیں باندھ رکھی ہیں تو یہ محض تمھاری حماقت ہے جو عقل و فطرت اور خود تمھارے اپنے مسلمہ کے خلاف ہے۔ پھر یہ کائنات کسی اتفاقی حادثے کے طور پر ظہور میں نہیں آ گئی ہے،

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ

چھ دن میں پیدا کیا، پھر معاملات کا نظم سنبھالے ہوئے اپنے عرش پر قائم ہو گیا[7]۔ اُس کی اجازت کے بغیر کوئی (اُس کے حضور میں) سفارش کرنے والا نہیں ہے[8]۔ تمھارا پروردگار وہی اللہ ہے، لہٰذا اُسی کی بندگی کرو۔ پھر کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ تم سب کو (ایک دن) اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے[9]۔ یہ خدا کا سچا وعدہ ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہی

بلکہ یہ خدائی دنوں کے حساب سے چھ دنوں یا بالفاظ دیگر چھ ادوار میں درجہ بدرجہ ارتقا پذیر ہوئی ہے۔ یہ تدریج و ترتیب اور یہ ارتقا خود شاہد ہے کہ نہ اِس کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ ہے، نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے، بلکہ یہ نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہوا ایک باغایت و بامقصد کارخانہ ہے اور اِس کی مقصدیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان جو اِس کائنات میں خلیفہ کی حیثیت رکھتا ہے یوں ہی شتر بے مہار نہ چھوڑ دیا جائے، بلکہ اُس کے سامنے ایک ایسا دن آئے جس میں وہ لوگ پورے انصاف کے ساتھ اپنے اعمال کا صلہ پائیں جنھوں نے خالق کائنات کی پسند کے مطابق زندگی بسر کی اور وہ لوگ اپنے جرائم کی سزا بھگتیں جنھوں نے اِس دنیا کو کھیل تماشا سمجھا اور ساری زندگی بطالت میں گزاری۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۲۳)

۷ یعنی پیدا کرنے کے بعد نہ کسی گوشے میں خاموش بیٹھ گیا ہے اور نہ اپنی مخلوقات کے معاملات دوسروں کے سپرد کر کے اُن سے بے تعلق ہو گیا ہے، بلکہ عرش حکومت پر متمکن ہے اور اپنی دنیا کا نظم خود چلا رہا ہے۔

۸ اِس لیے لوگوں کو اِس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ کسی کی سعی و سفارش اُنھیں خدا کے عذاب سے بچا لے گی۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۴﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ

خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اُس کو دہرا دے گا[10]، اِس لیے کہ جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُن کو انصاف کے ساتھ (اُن کے عمل کا) بدلہ دے۔ اِس کے برخلاف جنھوں نے انکار کر دیا ہے، اُن کے انکار کے بدلے میں جو وہ کرتے رہے، اُن کے لیے کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہے۔ وہی[11] ہے جس نے سورج کو

یونس
۱۰

۹ یعنی تمھیں بھی اور تمھارے اُن معبودوں کو بھی جنھیں تم اپنے گمان کے مطابق خدا کے شریک اور اُس کے حضور میں سفارش کرنے والے سمجھتے ہو۔ آیت میں 'جَمِيْعًا' کی تاکید اسی مضمون کو ظاہر کرتی ہے۔

۱۰ یعنی جس طرح ابتدا کی ہے، اُسی طرح دوبارہ پیدا کر دے گا۔ اُسے کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ اِس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جب خلق اور اعادۂ خلق، دونوں میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے تو مرجع و مولیٰ بھی وہی ہے۔ اُس کے سوا کوئی دوسرا یہ حیثیت کس بنیاد پر حاصل کر سکتا ہے؟

۱۱ اوپر توحید کا استدلال تھا۔ اب جزا و سزا کے قطعی ہونے کی دلیل بیان ہو رہی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... اِس کارخانۂ کائنات پر جو شخص بھی غور کرے گا، اُس کو یہ حقیقت نہایت نمایاں طور پر نظر آئے گی کہ یہ کسی کباڑیے کا مال گودام نہیں، بلکہ اِس کے ہر گوشے میں اِس کے خالق کی عظیم قدرت اور اُس کی بے پایاں رحمت و ربوبیت نمایاں ہے۔ اِس کے اندر نہایت اعلیٰ اہتمام ہے۔ بے نظیر ترتیب و انتظام ہے، بے مثال اقلیدس و ریاضی ہے۔ سورج معین نظام اوقات کے ساتھ نکلتا اور اپنی تابانیوں سے سارے جہان کو روشن کرتا ہے۔ اُس کے فیض سے گرمی،

لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝٥ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

تاباں اور چاند کو روشنی بنایا[12] اور اُس کے لیے منزلیں ٹھیرا دیں تاکہ تم اُس سے برسوں کی گنتی اور اُن کا حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بامقصد ہی بنایا ہے[13]۔ وہ اُن لوگوں کے

سردی، خزاں اور بہار کے مختلف موسم پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک ہماری دنیا کی زندگی اور اُس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ چاند اُس سے کسب نور کر کے اپنی معین منزلیں طے کرتا اور ہماری تاریک راتوں میں مختلف زاویوں سے ہمارے لیے شمع برداری بھی کرتا ہے اور ہمارے مہینوں اور سالوں کی تقویم بھی بناتا ہے ـــــ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دنیا خیر و شر اور نیکی و بدی کے درمیان امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے گی یا یوں ہی ختم ہو جائے گی؟ اگر یہ مان لیا جائے تو یہ ساری قدرت و حکمت بے مقصد و بے غایت ہو جاتی ہے جو اِس کائنات کے ہر گوشے میں جلوہ گر ہے۔ پھر تو یہ دنیا بالکل باطل اور ایک کھیل تماشا بن کے رہ جاتی ہے اور یہ ایک ایسی خلاف عقل، ایسی خلاف عدل اور ایسی خلاف فطرت بات ہے کہ کوئی سلیم العقل اور کوئی مستقیم الفطرت انسان ایک لمحے کے لیے بھی اِس کو باور نہیں کر سکتا۔ کچھ اینٹیں ایک جگہ بکھری ہوئی پڑی ہوں تو اُن کو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ یونہی پڑی ہوئی ہیں، لیکن کیا یہی گمان تاج محل، لال قلعہ اور لاہور و دلی کی جامع مسجدوں کے متعلق بھی کر سکتے ہیں؟" (تدبر قرآن ۴/۲۵)

۱۲؎ آیت میں سورج کے لیے 'ضِيَآء' اور چاند کے لیے 'نُوْر' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ نور خنک روشنی کو کہتے ہیں اور ضیا میں روشنی کے ساتھ تپش کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ چاند اور سورج کی روشنی میں یہ فرق ایک امر واقعی ہے۔ لفظ 'تاباں' سے یہی مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۳؎ چنانچہ جو عاقل بھی اِس نظام عالم کو دیکھے گا، یہی پکارے گا کہ یہ اتھاہ معنویت اور یہ حیرت انگیز نظم و ترتیب بے مقصد نہیں ہے، بلکہ ضرور کسی عظیم غایت کے ساتھ وجود پذیر ہوا ہے۔

وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ﴿٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ﴿٧﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ

لیے جو جاننا چاہیں، اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور جو کچھ زمین اور آسمانوں میں اللہ نے پیدا کیا ہے، اُس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ڈرتے ہیں۔[14] حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہماری ملاقات کی توقع نہیں رکھتے اور اِسی دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، اُنھی کا ٹھکانا جہنم ہے، اُن کے کرتوتوں کی پاداش میں۔ اِس کے برخلاف جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُن کا پروردگار اُن کے ایمان کی

۱۴؎ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ یہ کائنات بے مقصد نہیں ہے، بلکہ ایک عظیم نتیجے تک پہنچنے والی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اِس نظام پر جو شخص بھی غور کرتا ہے، وہ لازماً اِس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ اضداد کے اندر ایک مشترک مقصد کے لیے یہ حیرت انگیز توافق اِسی شکل میں وجود میں آسکتا ہے، جب یہ مانا جائے کہ یہ سارا کارخانہ صرف ایک قادر و قیوم کے ارادے کے تحت کام کر رہا ہے اور پھر اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس نے ربوبیت و پرورش کا یہ سارا نظام کھڑا کیا ہے اور اُس کو اِس اہتمام سے چلا رہا ہے، وہ انسان کو مطلق العنان اور غیر مسئول نہیں چھوڑے گا، بلکہ اِس کے بعد ایک ایسا دن لازماً آنا ہے جس میں وہ اِس ربوبیت کا حق پہچاننے والوں کو اُن کی حق شناسی کا انعام دے گا، اور اِس سے بے پروا رہنے والوں کو جہنم میں جھونک دے گا۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۲۶)

جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ ۝۹ دَعۡوٰىهُمۡ فِيۡهَا سُبۡحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمۡ فِيۡهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعۡوٰىهُمۡ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۱۰ وَلَوۡ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسۡتِعۡجَالَهُمۡ بِالۡخَيۡرِ لَقُضِىَ اِلَيۡهِمۡ اَجَلُهُمۡ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۝۱۱

بدولت اُنھیں (اُن کی) منزل تک پہنچا دے گا۔ اُن کے نیچے، راحت کے باغوں میں (اُن کے لیے) نہریں بہ رہی ہوں گی۔ وہاں اُن کی صدا ہو گی کہ اے اللہ، تو پاک ہے[15] اور اُن کا تحیّہ وہاں سلام ہو گا اور (جب دیکھیں گے کہ ہر طرف نعمت ہی نعمت ہے تو) اُن کی آخری بات یہ ہو گی کہ شکر اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے عالم کا پروردگار ہے۔ ۳-۱۰

(یہ عذاب مانگتے ہیں[16])، اگر اللہ لوگوں کے لیے عذاب کے معاملے میں بھی اُسی طرح جلدی کرتا، جس طرح وہ اُن کے ساتھ رحمت میں جلدی کرتا ہے[17] تو اُن کی مدت پوری کر دی گئی ہوتی۔ (لیکن یہ نہیں سمجھتے)، سو ہم اُن لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی

۱۵؎ یعنی اِس بات سے پاک ہے کہ کبھی کوئی عبث کام کرے۔

۱۶؎ یعنی جب آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے کے انجام سے اِن لوگوں کو ڈرایا جاتا ہے تو فوراً مطالبہ کرتے ہیں کہ تم سچے رسول ہو تو جس عذاب کی دھمکیاں سناتے ہو، اُس کی کوئی جھلک دکھا کیوں نہیں دیتے؟ آگے اِسی مطالبے کا جواب ہے۔

۱۷؎ اصل میں 'اِسۡتِعۡجَالَهُمۡ بِالۡخَيۡرِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'اِسۡتِعۡجَال' 'تعجیل' کے معنی میں اور اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ اِس کی وجہ وہی ہے جو زمخشری نے بیان کر دی ہے کہ 'تعجیله لهم الخیر' کی جگہ یہ الفاظ سرعتِ اجابت پر دلالت کے لیے آ گئے ہیں۔*

---

* الکشاف ۲/۳۱۶۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢﴾
وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٣﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِم

توقع نہیں رکھتے، اُن کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں[۱۸]۔ (حقیقت یہ ہے کہ اِنھیں کوئی عذاب دکھا بھی دیا جائے تو ایمان نہ لائیں گے۔ اِس لیے کہ) انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب اُس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو وہ لیٹے، بیٹھے یا کھڑے، (ہر حال میں) ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب اُس کی تکلیف ہم اُس سے ٹال دیتے ہیں تو اِس طرح چل دیتا ہے گویا جو تکلیف اُسے پہنچی، اُس میں کبھی اُس نے ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ حد سے گزرنے والوں کے لیے اُن کے اعمال اِسی طرح خوش نما بنا دیے گئے ہیں۔ ۱۱-۱۲

تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا تھا، جب اُنھوں نے (اِسی طرح) ظلم کا ارتکاب کیا[۱۹]۔ اُن کے رسول اُن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور اُنھوں نے ایمان لا کر نہیں دیا۔ ہم مجرم لوگوں کو اِسی طرح (اُن کے جرائم کا) بدلہ دیتے

۱۸؎ اِس لیے کہ عذاب سے پہلے اِنھیں زیادہ سے زیادہ مہلت مل جائے اور جب گرفت کی جائے تو یہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں۔

۱۹؎ یعنی پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود اُسے ماننے سے انکار کر دیا۔ قرآن کی اصطلاح میں یہی ظلم ہے جس کے نتیجے میں قوموں پر اللہ کا عذاب آتا رہا ہے۔ قرآن نے آگے

لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ

یونس ۱۰

ہیں۔ اب اُن کے بعد ہم نے زمین میں اُن کی جگہ تمھیں دی ہے تاکہ دیکھیں، تم کیسے عمل کرتے ہو۔ ۱۳-۱۴

لیکن اِن کا حال بھی وہی ہے، (اے پیغمبر) کہ جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں اِنھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہماری ملاقات کا کھٹکا نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ اِس کے بجاے کوئی اور قرآن لاؤ یا اِس میں ترمیم کر دو۔[۲۰] کہہ دو، (یہ خدا کا کلام ہے)، مجھے کیا حق ہے کہ میں اِس میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم کروں؟ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہہ دو، اگر

اِس کی وضاحت کر دی ہے۔

[۲۰] یعنی قرآن کو آپ کی تصنیف سمجھتے اور مطالبہ کرتے ہیں کہ اُس میں ایسی ترمیم کر دی جائے جس کے بعد وہ اُن کے دینی تصورات کے مطابق ہو جائے۔ اِس وقت جو قرآن پیش کیا جا رہا ہے، وہ اُنھیں گوارا نہیں ہے، اِس لیے کہ وہ نہ اُن کے مشرکانہ عقائد کے ساتھ کسی مصالحت کے لیے تیار ہے اور نہ دین داری کے اُن رسوم کو کوئی اہمیت دیتا ہے جنھیں وہ اپنا سرمایۂ فخر بنائے ہوئے ہیں۔

مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖؗ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

اللہ چاہتا تو نہ میں یہ قرآن تمھیں سناتا، نہ اللہ اِس کی خبر تمھیں دیتا۔ یہ اُسی کا فیصلہ ہے، اِس لیے کہ میں تو اِس سے پہلے ایک عمر تمھارے درمیان گزار چکا ہوں۔ (میں نے کب اِس طرح کی کوئی بات کبھی کی ہے)؟ پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟[۲۱] سو اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اُس کی

یونس ۱۰

۲۱؎ اوپر جو کچھ فرمایا ہے، یہ اُس کی ایسی زبردست دلیل ہے کہ کوئی سلیم الطبع انسان اِس کو جھٹلانے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے کب دیکھا ہے کہ میں اُن مباحث میں دل چسپی لے رہا ہوں یا اُن کے بارے میں کچھ خیالات وافکار کا اظہار کر رہا ہوں یا اُن کی ترتیب و تدوین کے لیے مشق و مزاولت میں مصروف ہوں یا اُن سے متعلق کسی علم و فن کا اکتساب کر رہا ہوں جو اِس وقت قرآن کی سورتوں میں پے در پے زیر بحث آ رہے ہیں؟ پورے چالیس سال میں نے تمھارے درمیان گزارے ہیں۔ میری باتوں اور میری حرکات و سکنات میں تم نے کب ایسی کوئی چیز محسوس کی ہے جسے اُس دعوت کی تمہید کہا جا سکے جو میں اِس وقت پیش کر رہا ہوں؟ جو کچھ میں آج کہہ رہا ہوں، اُس کے نشو و ارتقا کے کوئی نشانات تم نے کبھی میری زندگی میں پائے ہیں؟ تم جانتے ہو کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشو و ارتقا کے نشانات اُس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں؟ تم کہتے ہو کہ میں خدا پر جھوٹ باندھ رہا ہوں۔ اِس سے پہلے کسی جھوٹ، فریب، جعل یا مکاری و عیاری کا کوئی ادنیٰ شائبہ تم نے کبھی میری سیرت و کردار میں دیکھا ہے؟ آج تک تم مجھے صادق اور امین سمجھتے رہے ہو۔ اب کس طرح کہہ رہے ہو کہ وہی صادق اور امین راتوں رات بر خود غلط، لپاٹیا اور مفتری بن گیا

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿١٨﴾

آیتوں کو جھٹلا دے[۲۲]؟ حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کے مجرم کبھی فلاح نہیں پائیں گے[۲۳]۔ ۱۵-۱۷

(یہ اِس وقت بھی جھوٹ باندھ رہے ہیں۔ چنانچہ) اللہ کے سوا اُن کی پرستش کر رہے ہیں جو اِن کو نہ نقصان پہنچا سکیں، نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اِن سے کہو، کیا تم اللہ کو اُس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ خود بھی نہیں جانتا، نہ آسمانوں میں کہیں اور نہ زمین میں[۲۴]! وہ پاک اور برتر ہے اُن چیزوں سے جنھیں

ہے؟ خدا کے بندو، تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟

۲۲ یعنی اگر یہ خدا کی آیات نہیں ہیں اور میں اِنھیں خود تصنیف کر کے آیات الٰہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں تو مجھ سے بڑا کوئی ظالم نہیں ہے، اور اگر میں سچا ہوں اور تم خدا کی آیات کو جھٹلا رہے ہو تو پھر تم سے بڑا کوئی ظالم نہیں ہے۔

۲۳ یعنی دنیا میں تو ہوسکتا ہے کہ اُن کی یہ باتیں چل جائیں، لیکن خدا کے حضور میں کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔

۲۴ یہ 'نفی الشئ بنفی لازمه' کا اسلوب ہے، جس طرح امرؤالقیس ایک صحرائی راستے کی تعریف میں کہتا ہے کہ 'لا یهتدی بمناره'۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے اِن شریکوں کا کوئی وجود ہوتا تو سب سے زیادہ اُس کو پتا ہوتا جس کی خدائی میں اِنھیں شریک کر رہے ہو۔ پھر جب اُس کو پتا نہیں تو خود اندازہ کر سکتے ہو کہ خدا پر کتنا بڑا جھوٹ باندھ رہے ہو۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ

یونس ۱۰

یہ شریک ٹھیراتے ہیں[25]۔ (اپنے اِس شرک کے لیے یہ باپ دادوں کا حوالہ نہ دیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ ایک ہی امت تھے[26]، اُنھوں نے بعد میں اختلاف کیا ہے اور اگر تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ کر لی گئی ہوتی[27] تو اِن کے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کر دیا جاتا جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ ۱۸-۱۹

اور یہ جو کہتے ہیں کہ نبی پر اُس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی[28] کیوں نہیں

۲۵؎ اِس لیے کہ نہ اُس کی صفات سے اِن چیزوں کو کوئی مناسبت ہے اور نہ اُس کی صفات میں کوئی تضاد مانا جا سکتا ہے۔

۲۶؎ یعنی خدا نے انسانیت کی ابتدا دین فطرت سے کی تھی۔ اُس وقت تمام انسان توحید کے ماننے والے تھے۔ انسانیت کی ابتدا شرک سے نہیں ہوئی۔ یہ نجاست تو انسان کے عقائد کو بہت بعد میں لاحق ہوئی ہے۔

۲۷؎ یعنی یہ بات کہ اختلافات کا حتمی فیصلہ قیامت کے دن سنایا جائے گا۔ اُس سے پہلے اُنھیں گوارا کیا جائے گا تاکہ لوگوں کے عقل و فہم اور ضمیر و وجدان کو آزمایش میں ڈال کر اُنھیں جنت کے لیے منتخب کیا جائے۔

۲۸؎ اصل میں لفظ 'اٰيَةٌ' آیا ہے۔ آگے کی آیات سے واضح ہے کہ اِس سے یہاں عذاب کی نشانی مراد ہے جسے دیکھ کر واضح ہو جائے کہ پیغمبر جس فیصلہ کن عذاب کی وعید سنا رہا ہے، وہ بھی آ کر رہے گا۔

لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۲۰﴾ وَ اِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِیْۤ اٰیَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا یَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اتاری گئی تو اِن سے کہو، (یہ غیب کے معاملات ہیں[۲۹] اور) غیب کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ سو انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں[۳۰]۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ (عذاب کی نشانی مانگتے ہیں، مگر) جب کسی تکلیف کے بعد جو اُنھیں پہنچی ہو، ہم اِن لوگوں کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو ہماری نشانیوں کے معاملے میں یہ اُسی وقت حیلے بنانے لگتے ہیں[۳۱]۔ اِن سے کہو، اللہ اپنے حیلوں میں کہیں تیز ہے۔ یاد رکھو، جو حیلہ بازیاں تم کر رہے ہو، ہمارے فرشتے اُنھیں لکھ رہے ہیں[۳۲]۔ ۲۰-۲۱

۲۹؎ یعنی یہ معاملات کہ اللہ عذاب کی کوئی نشانی دکھائے یا کسی قوم پر وہ عذاب نازل کرے جس کی وعید سنائی جا رہی ہے۔

۳۰؎ یہ قوم کو مبتلاے عذاب دیکھنے کی تمنا نہیں، بلکہ حسرت واندوہ کے ساتھ ایک ایسی چیز کا انتظار ہے جو قوم کی ضد کے باعث خدا کا فیصلہ بن چکی ہے۔

۳۱؎ چنانچہ کبھی وعدے کرتے ہیں کہ اِس مرتبہ ہلاکت سے بچ گئے تو خدا کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے اور کبھی اِس طرح کے فلسفے بیان کرتے ہیں کہ یہ گردش زمانہ ہے۔ اِس قسم کے نرم گرم حالات ہر قوم کو پیش آتے ہیں۔ اِنھیں خدا کی تنبیہ یا عقیدہ وعمل کے کسی فساد کا نتیجہ کیوں سمجھا جائے؟

۳۲؎ یہ نہایت سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لکھ رہے ہیں تو عنقریب اِن حیلہ بازیوں کا نوٹس بھی لیں گے۔

هُوَ الَّذِيۡ يُسَيِّرُكُمۡ فِي الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا كُنۡتُمۡ فِي الۡفُلۡكِ ۚ وَجَرَيۡنَ بِهِمۡ بِرِيۡحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوۡا بِهَا جَآءَتۡهَا رِيۡحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الۡمَوۡجُ مِنۡ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ اُحِيۡطَ بِهِمۡ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۚ لَئِنۡ اَنۡجَيۡتَنَا مِنۡ هٰذِهٖ لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيۡنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنۡجٰىهُمۡ اِذَا هُمۡ يَبۡغُوۡنَ فِي الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ

(اِس کی مثال یہ ہے کہ) وہ اللہ ہی ہے جو تمھیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے،[۳۳] یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں لوگوں کو لے کر موافق ہوا سے چل رہی ہوتی ہیں[۳۴] اور لوگ اُس سے شاداں وفرحاں ہوتے ہیں کہ یکایک اُس پر تند ہوا آجاتی ہے اور کشتی کے مسافروں پر ہر طرف سے موجیں اُٹھنے لگتی ہیں اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اُس وقت وہ اپنی اطاعت کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اُس کو پکارنے لگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اِس سے نجات دے دی تو یقیناً ہم شکر گزار ہو کر رہیں گے۔ پھر جب وہ اُنھیں نجات دے دیتا ہے تو فوراً ہی بغیر کسی حق

۳۳؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ زمین میں سفر کے تمام ذرائع و وسائل خدا ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور وہ تدبیر و حکمت بھی اُسی نے عطا فرمائی ہے جس سے کام لے کر انسان نئی نئی ایجادات کرتا اور اِس طرح اپنے لیے سفر کی مزید سہولتیں پیدا کر لیتا ہے۔

۳۴؎ اصل میں فعل 'جَرَيۡنَ' آیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ 'فُلۡك' مذکر مونث، واحد جمع، سب کے لیے آجاتا ہے۔ یہاں سے اسلوب میں بھی تبدیلی ہوئی ہے اور وہ تمثیل کے تقاضے سے حاضر کے بجائے غائب کا ہو گیا ہے تا کہ عموم پر دلالت کرے۔ تمثیلات میں یہی اسلوب زیادہ موزوں اور موثر ہوتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ ۙ اَتٰهَاۤ اَمْرُنَا

کے[۳۵] زمین میں سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ لوگو،[۳۶] تمھاری سرکشی کا وبال تمھی پر آنے والا ہے۔[۳۷] دنیا کی زندگی کا نفع اٹھالو،[۳۸] پھر تم کو پلٹ کر ہمارے ہی پاس آنا ہے، اُس وقت ہم تمھیں بتا دیں گے جو کچھ تم کر رہے تھے۔ دنیا کی یہ زندگی (جس نے تمھیں غفلت میں ڈال دیا ہے)، اِس کی مثال اِس طرح ہے جیسے بارش کہ ہم نے اُسے آسمان سے برسایا تو زمین کی نباتات اُس سے خوب گھنی نکلیں، وہ بھی جنھیں آدمی کھاتے ہیں اور وہ بھی جنھیں جانور کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی رونق پر آگئی اور اُس نے بناؤ سنگھار کر لیا اور زمین والوں نے خیال کیا کہ اب وہ اُس پر پوری قدرت رکھتے ہیں[۳۹] تو

۳۵؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ مخلوق اپنے خالق کے سامنے سرکشی کرے تو وہ ہر حال میں بغیر کسی حق کے ہوگی۔

۳۶؎ یہاں سے خطاب پھر براہ راست قریش سے ہو گیا ہے۔

۳۷؎ یہ نہایت سخت وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری یہ سرکشی تم پر خدا کی حجت پوری کر دے گی اور بالآخر اُس کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آجاؤ گے جو کسی کو باقی نہ چھوڑے گا۔

۳۸؎ اصل الفاظ ہیں: 'مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'۔ اِن میں لفظ 'مَتَاع' ایک فعل محذوف سے منصوب ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

لَيۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِيۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۲۵﴾ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرۡهَقُ وُجُوۡهَهُمۡ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِيۡنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثۡلِهَا ۙ

اچانک رات یا دن میں (کسی وقت) ہمارا حکم اُس پر آ گیا، پھر ہم نے اُسے ایسا کاٹ کر ڈھیر کر دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ ہم اُن لوگوں کے لیے جو غور کریں، اپنی نشانیاں اِسی طرح کھول کر بیان کرتے ہیں۔ ۲۲-۲۴

(لوگو، تم اِس زندگی کے فریب میں مبتلا ہو) اور اللہ تمھیں سلامتی کے گھر کی طرف[۴۰] بلاتا ہے اور اِس کے لیے جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق)، سیدھی راہ دکھا دیتا ہے[۴۱]۔ (پھر) جن لوگوں نے بھلائی کی، اُن کے لیے بھلائی ہے اور اُس پر مزید بھی۔ اُن کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی، نہ ذلت۔ وہی جنت

۳۹؎ یہ اُس حوصلے اور امنگ کی تعبیر ہے جس سے فصل کو اُس کے جوبن پر دیکھ کر اُس کے مالکوں کے دل لبریز ہو جاتے ہیں۔

۴۰؎ یعنی جنت کی طرف، جس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہاں نہ ماضی کے پچھتاوے ہوں گے نہ مستقبل کے اندیشے، وہ سراسر سلامتی ہو گی۔

۴۱؎ یعنی اِس قانون کے مطابق کہ جو سیدھی راہ کے سچے طالب ہوں، وہ اِس کے مستحق ہیں کہ اللہ اُنھیں سیدھی راہ دکھائے۔

وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٧﴾

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ

کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اِس کے برخلاف جنھوں نے برائیاں کمائی ہیں تو (خدا کا قانون یہ ہے کہ) برائی کا بدلہ اُس کے برابر ہے[۴۲]۔ اُن پر ذلت چھائے گی —— اُنھیں کوئی خدا سے بچانے والا نہ ہو گا[۴۳] —— اُن کے چہرے ایسے ہوں گے جیسے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیے گئے ہیں۔ وہی دوزخ کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۵-۲۷

یہ اُس دن کو یاد رکھیں، جب ہم اِن سب کو اکٹھا کریں گے[۴۴]، پھر جنھوں نے شرک کیا ہے، اُن سے کہیں گے کہ تم اپنی جگہ ٹھیرو[۴۵] اور تمھارے بنائے ہوئے شریک

۴۲؎ یعنی بھلائی کے لیے تو مزید بھی ہے، لیکن برائی کا بدلہ پورے انصاف کے ساتھ بالکل برابر ہے، اُس میں کمی بیشی نہ ہو گی۔

۴۳؎ سلسلۂ کلام کے بیچ میں یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن ہستیوں سے مدد اور سفارش کی امیدیں باندھتے ہو، اُن میں سے کوئی بھی وہاں کام نہ آئے گا۔

۴۴؎ یعنی اِن کو بھی اور اِن کے معبودوں کو بھی۔ آیت میں 'جَمِیْعًا' کی تاکید اِسی مدعا کے لیے ہے۔

۴۵؎ اصل میں 'مَکَانَکُمْ' کا لفظ ہے۔ اِس سے پہلے 'أمکثوا' یا 'قفوا' یا اِن کے ہم معنی کوئی

إِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٢٨﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ أَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا إِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٣٠﴾

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ

بھی۔ پھر اُن کے درمیان جدائی ڈال دیں گے[۴۶] اور اُن کے شریک کہیں گے: تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ سو اللہ ہمارے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تمھاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے[۴۷]۔ اُس وقت ہر شخص اپنے اُس عمل سے دوچار ہوگا[۴۸] جو اُس نے پہلے کیا تھا اور لوگ اللہ، اپنے مالک حقیقی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے اور (دوسروں کو معبود بنا کر) جو جھوٹ اُنھوں نے گھڑ رکھے تھے، سب اُن سے جاتے رہیں گے۔ ۲۸-۳۰

اِن سے پوچھو، زمین و آسمان سے کون تمھیں روزی دیتا ہے؟ یا تمھارے کان اور

لفظ محذوف ہے۔ عربی زبان میں یہی اسلوب ہے۔ اِس طرح کے موقعوں پر ہماری زبان میں ظرف یا مفعول کو حذف کر دیتے ہیں۔

۴۶؎ مطلب یہ ہے کہ معبود اپنے عابدوں سے اظہار براءت کر دیں گے اور بالکل الگ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے۔ آگے اِس کی وضاحت کر دی ہے۔

۴۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ'۔ اِن میں 'اِنْ' درحقیقت 'اِنَّ' ہے جس پر 'لَغٰفِلِيْنَ' کا لام دلالت کر رہا ہے۔

۴۸؎ اصل میں 'تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ' کے الفاظ ہیں۔ 'بلا یبلو' کے معنی جانچنے اور تجربہ کرنے

وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ

آنکھیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ کون اِس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ اِس کے جواب میں وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ[۴۹]، تو کہو، پھر اُس سے ڈرتے نہیں ہو[۵۰]؟ سو یہی اللہ تمھارا پروردگار حقیقی ہے[۵۱]۔ پھر حق کے بعد گم راہی کے سوا اور کیا ہے[۵۲]؟ آخر تم کدھر پھرے جاتے ہو[۵۳]؟ اِسی طرح تیرے پروردگار کی بات

یونس ۱۰

کے ہیں۔ یعنی اپنے عمل کا تجربہ کرے گا اور اُس کے نتائج بھگتے گا۔

۴۹؎ اِس سے واضح ہے کہ خدا کی جو صفات یہاں بیان ہوئی ہیں، اہل عرب اُن میں سے کسی کو بھی اپنے معبودوں سے متعلق نہیں سمجھتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...وہ جن دیویوں دیوتاؤں کو پوجتے تھے، اُن کے متعلق اُن کا عقیدہ یہ نہیں تھا کہ یہ آسمان و زمین کے خالق ہیں یا ابر و ہوا اور سورج اور چاند کے موجد ہیں یا زندگی اور موت پر متصرف ہیں یا نظام کائنات کا سررشتہ اِن کے ہاتھ میں ہے، بلکہ صرف یہ مانتے تھے کہ یہ خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ خدا اِن کی سنتا ہے، جو کام خدا سے کرانا چاہیں، کرا سکتے ہیں، اِن کو اگر راضی رکھا جائے تو یہ خدا سے سفارش کر کے دنیا کی نعمتیں بھی دلواتے ہیں اور اگر بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی ہوا اور حساب کتاب کی نوبت آئی تو اُس وقت بھی یہ دست گیری کریں گے اور اپنی بندگی کرنے والوں کو نہ صرف بخشوالیں گے، بلکہ اونچے اونچے درجے دلوائیں گے۔"

(تدبر قرآن ۴/۴۷)

۵۰؎ یعنی جب یہ ساری باتیں مانتے ہو تو اُس خدا کے قہر و جلال سے ڈرتے نہیں کہ اُس پر افترا کر کے دوسروں کو اُس کی خدائی میں شریک بنا دیتے ہو؟

۵۱؎ مطلب یہ ہے کہ جس کو خدا مانتے ہو، تمھارا رب حقیقی بھی وہی ہے۔ اُس کے سوا جنھیں

فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾
قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ
قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ قُلْ هَلْ مِنْ

اِن سرکشی کرنے والوں کے حق میں پوری ہو چکی ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں گے۔[۵۴] ۳۱-۳۳
اِن سے پوچھو، تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہو، پھر اُس کا اعادہ بھی کرے؟ کہہ دو، اللہ ہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر

رب بنائے بیٹھے ہو، اُن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

۵۲ یعنی خدا سے متعلق جن باتوں کو مانتے ہو، اُن کا منطقی نتیجہ تو یہی نکلتا ہے کہ اپنا رب بھی تنہا اُسی کو تسلیم کرو۔ اِس کے معنی یہ ہوئے کہ یہی حق ہے تو اِس حق کے خلاف جو کچھ بھی مانتے ہو، اُسے صریح ضلالت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

۵۳ اصل میں 'تُصْرَفُوْنَ' کا لفظ آیا ہے جس کے معنی پھرائے جانے کے ہیں۔ اِس میں یہ اشارہ ہے کہ عقل و منطق تو کسی اور طرف لے جا رہی ہے، لیکن تم نے اپنی باگ کس کے ہاتھ میں دے دی ہے جو تمھیں اِس طرح ہرزہ گردی کرا رہا ہے؟

۵۴ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے آپ کی طرف التفات ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اِن کے تضادات فکر و عمل کو دیکھ کر آپ پریشان نہ ہوں۔ سنت الٰہی یہی ہے کہ ایمان و ہدایت کی راہ اُنھی لوگوں پر کھلتی ہے جو اُس کے سچے طالب ہوں اور اپنے اِس مطلوب تک پہنچنے کے لیے عقل و دل کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اِس کے برخلاف جو لوگ عقل و فطرت کو ٹھکرا کر اپنی باگ خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے لیے ہدایت کی راہ کبھی نہیں کھولتا، بلکہ اُن کی اختیار کردہ ضلالت ہی کو اُن پر مسلط کر دیتا ہے۔ آیت میں 'كَلِمَتُ رَبِّكَ' سے یہی سنت الٰہی مراد ہے اور 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ مشرکین کے اُس رویے کی طرف ہے جو پیچھے مذکور ہوا ہے۔

شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۗ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾

اُس کا اعادہ کرے گا۔ سو کہاں بھٹکے جاتے ہو؟[55] پوچھو، تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟ کہہ دو، اللہ ہی ہے جو حق کی رہنمائی کرتا ہے۔ پھر بتاؤ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ اِس کا مستحق ہے کہ اُس کی پیروی کی جائے یا وہ جو رہنمائی کے بغیر خود بھی راہ نہیں پاتے؟ آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟[56] حقیقت یہ ہے کہ اِن میں سے اکثر محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان ذرا بھی حق کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یقیناً اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔[57] ۳۴-۳۶

---

۵۵ یعنی جب یہ مانتے ہو کہ خلق کا ابدا اور اعادہ صرف خدا ہی کی شان ہے تو اُس کی جزا و سزا میں دوسروں کو کس طرح شریک ٹھیراتے ہو؟ یہ اِس لیے پوچھا ہے کہ مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ اگر قیامت ہوئی بھی تو اُن کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، اُن کے شرکا وشفعا اُنھیں خدا کی پکڑ سے بچالیں گے۔

۵۶ مطلب یہ ہے کہ جو دنیا اور آخرت، دونوں کے لحاظ سے بے کار ہیں، اُنھیں کس طرح معبود بنا کر پوجنے کے لیے تیار ہو جاتے ہو؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مخلوق کی ایک بہت بڑی ضرورت خالق سے یہ وابستہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں رہنمائی فرماتا ہے کہ کیا حق ہے اور کیا باطل، کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تمھارے اِن معبودوں سے تمھیں اِس طرح کی کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے؟ کیا عقل جو تمھارے اندر

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ

یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے کہ خدا سے پرے ہی پرے تصنیف کر لیا جائے،[58] بلکہ اُن پیشین گوئیوں کی تصدیق ہے جو اِس سے پہلے موجود ہیں[59] اور قانون الٰہی کی تفصیل ہے۔[60]

یونس ۱۰

رہنمائی کا چراغ ہے، یہ اُن کی بخشی ہوئی تمھیں ملی ہے؟ کیا یہ تمھاری ہدایت کے لیے کوئی وحی بھیجتے ہیں؟ کیا اِنھوں نے تمھاری تربیت و تزکیہ کے لیے کوئی کتاب اتاری، کوئی رسول بھیجا، کوئی شریعت نازل کی، کوئی قانون اتارا؟ اگر اِن کاموں میں کوئی کام بھی اِنھوں نے نہیں کیا، نہ کرتے ہیں، نہ کریں گے تو آخر کس غرض کے لیے اِن کے پیچھے لگے ہو؟ پیروی کا سزاوار وہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اُس کی توفیق بخشتا ہے یا وہ جو خود رہنمائی اور دست گیری کے محتاج ہیں؟ تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے الٹے فیصلے کرتے ہو؟''

(تدبر قرآن ۴/ ۵۰)

۵۷؎ یہ مخاطبین کے لیے دھمکی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اللہ اِن کے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے، اِس لیے وہ وقت عنقریب آجائے گا، جب وہ یہ سب کچھ اِن کے سامنے رکھ دے گا اور اِن میں سے کوئی اپنے جرائم کا انکار نہ کر سکے گا۔

۵۸؎ اِس لیے کہ اِس کا مافوق انداز کلام خود بتا رہا ہے کہ کوئی انسان اِس شان کی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا۔

۵۹؎ اشارہ ہے آخری نبوت کے لیے تورات و انجیل کی اُن پیشین گوئیوں کی طرف جو اپنے محمل و مصداق کی منتظر تھیں۔ قرآن کے نزول سے وہ سب سچی ثابت ہوئیں اور نتیجے کے طور پر قرآن کے بارے میں بھی ثابت ہو گیا کہ وہ فی الواقع اُس خدا کا کلام ہے جس نے صدیوں پہلے سے بتا رکھا تھا کہ وہ اِس شان کی ایک کتاب نازل کرے گا۔

۶۰؎ اصل میں لفظ 'الْكِتٰب' آیا ہے۔ اِس کے ایک معنی قانون و شریعت کے بھی ہیں۔ ہمارے

مِن رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٧﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٣٨﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٩﴾

اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پروردگار عالم کی طرف سے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اِسے گھڑ لیا ہے؟ اِن سے کہو، اگر تم سچے ہو تو اِس جیسی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جن کو (مدد کے لیے) بلا سکتے ہو، بلا لو۔[61] نہیں، یہ بات نہیں ہے، بلکہ یہ اُس چیز کو جھٹلا رہے ہیں جو اِن کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کی حقیقت ابھی اِن پر ظاہر نہیں ہوئی۔[62] اِن سے پہلے کے لوگوں نے بھی اِسی طرح جھٹلایا تھا، پھر دیکھ لو کہ اُن ظالموں کا انجام کیا ہوا۔ ۳۷-۳۹

نزدیک یہاں یہ اِسی معنی میں ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ابراہیمی دین کے جن احکام سے تم واقف ہو، یہ اُسی کی تفصیل ہے اور یہ اِس بات کا مزید ثبوت ہے کہ قرآن اُسی خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جس کی طرف سے ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام اور دوسرے نبیوں کے صحیفے نازل کیے گئے تھے۔

۶۱ مطلب یہ ہے کہ تم اگر اِسے خدا کی کتاب نہیں سمجھتے تو اپنی ہدایت، مضامین اور اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے جس شان کا یہ کلام ہے، اُس شان کی کوئی ایک سورہ ہی بنا کر پیش کر دو۔ تمھارے گمان کے مطابق یہ کام اگر بغیر کسی علمی اور ادبی پس منظر کے تمھاری قوم کے ایک فرد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کر سکتے ہیں تو تمھیں بھی اِس میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔

۶۲ یعنی یہ بات نہیں ہے کہ قرآن کی صداقت کے دلائل اِن پر واضح نہیں ہو سکے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن اپنی تکذیب کے جو نتائج بیان کر رہا ہے، وہ اِن کے علم کی گرفت میں نہیں آ رہے اور

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٤٠﴾ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٤١﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ

(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر)۔ اِن میں وہ بھی ہیں جو اِس قرآن کو مانیں گے اور وہ بھی جو نہیں مانیں گے۔ (یہ آمادۂ فساد ہیں)، اور تیرا پروردگار اِن مفسدوں سے خوب واقف ہے[۶۳]۔ یہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل، تم پر میرے عمل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور مجھ پر تمھارے عمل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے[۶۴]۔ (تم اُن کے درپے کیوں ہوتے ہو جو اندھے اور بہرے ہو چکے ہیں)؟ اِن میں وہ بھی تو ہیں جو تمھیں کان لگا کر سنتے ہیں۔ پھر کیا بہروں کو سناؤ گے، اگرچہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں؟ اور اِن میں وہ بھی تو ہیں

اُن کی حقیقت ابھی اِن پر ظاہر نہیں ہوئی، لہٰذا بے خوف ہیں اور بار بار مطالبہ کرتے ہیں کہ جس عذاب کی خبر دی جا رہی ہے، اُس کا کوئی نمونہ دکھا دیا جائے تو یہ مان لیں گے۔ اِن کے انکار کی وجہ اِن کی یہ بے خوفی ہے۔ اِسی نے اِنھیں غیر سنجیدہ بنا دیا ہے اور یہ اِس طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ علم و استدلال کی بنیاد پر مطمئن ہو گئے ہیں کہ قرآن خدا کی کتاب نہیں ہے۔

۶۳۔ اِس میں پیغمبر کے لیے تسلی کے ساتھ مکذبین قرآن کے لیے دھمکی بھی ہے کہ تیرا پروردگار خوب واقف ہے تو ایک دن اِن کی شرارتوں کا مزہ بھی اِنھیں چکھا دے گا۔

۶۴۔ یہ پیغمبر کے لیے اظہار براءت کا حکم ہے جس کے بعد صرف عذاب ہی کا انتظار ہوتا

وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ

جو پوری توجہ سے تمھیں دیکھتے ہیں۔ پھر کیا اندھوں کو راہ دکھاؤ گے، اگرچہ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔[۶۵] ۴۰-۴۴

(اِس وقت یہ مست ہیں، لیکن) جس دن اللہ اِنھیں اکٹھا کرے گا، اُس دن محسوس کریں گے کہ گویا دن کی ایک گھڑی ہی کے لیے دنیا میں تھے۔ یہ ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے، (گویا ابھی مل کر آئے ہیں)۔ (اُس دن واضح ہو جائے گا کہ) فی الواقع سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلا دیا اور راہ راست پر نہیں آئے۔ ہم جس چیز کا وعدہ اُن سے کر رہے ہیں، اُس کا

ہے۔

۶۵؎ یعنی یہ جو دیکھتے ہو کہ لوگوں میں سے زیادہ ایسے اندھے بہرے ہو جاتے ہیں کہ بالآخر عذاب کے مستحق ٹھیرتے ہیں تو اِس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ نے اِن پر کوئی ظلم کیا ہے۔ ہرگز نہیں، یہ اِن کی خواہشیں اور اِن کے تعصّبات ہیں جنھوں نے اِنھیں اِس طرح اندھا بہرا کر دیا ہے کہ حق کی ہر صدا اور اُس کا ہر داعی اِن کے لیے اجنبی ہو گیا ہے۔ اِن کے اِس رویے کا نتیجہ یہی نکلنا تھا اور یہی نکلا ہے کہ اب یہ عذاب کی زد میں ہیں۔

فَاِلَيۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوۡلُهُمۡ قُضِىَ بَيۡنَهُمۡ بِالۡقِسۡطِ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۴۸﴾

کوئی حصہ ہم تمھیں دکھائیں، (اے پیغمبر)، یا تم کو وفات دیں اور اِس کے بعد اِن سے نمٹیں، بہرکیف اِن کو لوٹنا ہماری ہی طرف ہے، پھر اللہ اُس پر گواہ ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ (اُس کا قانون یہی ہے کہ) ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا[66]۔ (اِس کے جواب میں) یہ کہتے ہیں کہ تم لوگ

یونس ۱۰

۶۶؎ یہ اُسی قانون کا بیان ہے جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ نبوت و رسالت کو ذریت ابراہیم کے لیے خاص کر دینے سے پہلے دنیا کی تمام قوموں پر خود اُنھی کے رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کیا گیا۔ قرآن میں اِس کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول اپنے مخاطبین کے لیے خدا کی عدالت بن کر آئے اور اُن کا فیصلہ کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ رسولوں کی دعوت میں یہ فیصلہ انذار، انذار عام، اتمام حجت اور ہجرت و براءت کے مراحل سے گزر کر صادر ہوتا اور اِس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی عدالت زمین پر قائم ہوتی، خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا اور رسول کے مخاطبین کے لیے قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔ اِس دعوت کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس موقع پر بالعموم دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں: ایک یہ کہ پیغمبر کے ساتھی بھی تعداد میں کم ہوتے ہیں اور اُسے کوئی دارالہجرت بھی میسر نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وہ معتد بہ تعداد میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلتا ہے اور اُس کے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کسی سرزمین میں اُس کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان کر دیتا ہے۔

پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑ دینے کے بعد، عام اِس سے کہ وہ اُس کی وفات کی صورت میں ہو یا ہجرت کی صورت میں، یہ فیصلہ اِس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی فوجیں نازل

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ

سچے ہو تو (ہمارے لیے) یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ اِن سے کہو، (میں اِس معاملے میں کیا کہہ سکتا ہوں)؟ میں تو اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے۔ (اُس کے ہاں) ہر قوم کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جب اُن کا وقت آجاتا ہے تو پھر نہ ایک گھڑی پیچھے ہوتے ہیں، نہ آگے۔ اِن سے کہو، یہ بتاؤ کہ اگر اُس کا عذاب تم پر رات یا دن میں کسی وقت آپڑے تو کیا کرلو گے؟

ہوتیں، ساف و حاصب کا طوفان اٹھتا اور ابر و باد کے لشکر قوم پر اِس طرح حملہ آور ہو جاتے ہیں کہ رسول کے مخالفین میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہتا۔ تاہم یہ معاملہ اُنھی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کے لیے قرآن اپنی اصطلاح میں 'مُشْرِکِیْن' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہوتے ہیں، اُن کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا۔ اُن کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ اُن کے استیصال کے بجاے اُن پر ذلت اور محکومی کا عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا اور قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط، قوم شعیب اور اِس طرح کی بعض دوسری قومیں اِس کے برخلاف زمین سے مٹا دی گئیں۔*

دوسری صورت کے لیے بھی یہی قانون ہے، لیکن اُس میں عذاب کا یہ فیصلہ رسول اور اُس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اِس صورت میں قوم کو کچھ مزید مہلت مل جاتی ہے۔ رسول اِس عرصے میں دارالہجرت کے مخاطبین پر اتمام حجت بھی کرتا ہے۔ اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی تربیت اور تطہیر و تزکیہ کے بعد اُنھیں اِس معرکۂ حق و باطل کے لیے منظم بھی

* یہ وہی ضابطہ ہے جو قیامت میں اختیار کیا جائے گا۔ چنانچہ سورۂ نساء (۴: ۴۸) میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں بھی شرک کو معاف نہیں کرے گا۔ اِس کے نیچے، البتہ جس کے لیے جو گناہ چاہے گا، معاف فرما دے گا۔

الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۵۰﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ ؕ آٰلۡئٰنَ وَقَدۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ
تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ قِيۡلَ لِلَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡخُلۡدِ ۚ
هَلۡ تُجۡزَوۡنَ اِلَّا بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ﴿۵۲﴾
وَيَسۡتَنۡۢبِـُٔوۡنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلۡ اِىۡ وَرَبِّىۡۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔۚ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ
بِمُعۡجِزِيۡنَ ﴿۵۳﴾ وَلَوۡ اَنَّ لِكُلِّ نَفۡسٍ ظَلَمَتۡ مَا فِى الۡاَرۡضِ لَافۡتَدَتۡ

یونس ۱۰

آخر کیا چیز ہے جس کے بھروسے پر یہ مجرم جلدی مچائے ہوئے ہیں؟[67] پھر کیا جب آ پڑے گا، اُسی وقت اُس کو مانو گے؟ اب مانے ہو، تم اِسی کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے۔ اُس وقت اِن ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو، یہ اُسی کا بدلہ مل رہا ہے جو کچھ تم کماتے تھے۔ ۴۵-۵۲

وہ تم سے پوچھتے ہیں: کیا یہ واقعی سچ ہے؟[68] کہہ دو، ہاں، میرے پروردگار کی قسم، یہ شدنی ہے اور تم خدا کو عاجز نہیں کر سکتے۔[69] اُس وقت ہر شخص کے پاس جس

کرتا ہے اور دارالہجرت میں اپنا اقتدار بھی اِس قدر مستحکم کر لیتا ہے کہ اُس کی مدد سے وہ منکرین کے استیصال اور اہل حق کی سرفرازی کا یہ معرکہ سر کر سکے۔

67۔ یہاں اسلوب تبدیل کر کے اُن کے لیے 'مجرم' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہاں مجرموں کے لفظ میں ایک لطیف اشارہ اِس بات کی طرف بھی ہے کہ جو لوگ جرم سے بری ہیں، اگر وہ اِس طرح کا سوال کرتے تو اِس کے لیے تو ایک جواز ہو سکتا تھا، لیکن جو لوگ مجرم ہیں اور جن کے جرم ہی کی پاداش میں یہ برق خاطف گرنے والی ہے، اُن کی یہ ڈھٹائی اُن کی بدبختی اور شامت کے سوا اور کس چیز کی دلیل ہے!'' (تدبر قرآن ۴/۶۱)

68۔ اِس سوال میں انکار و استہزا کا وہ پہلو نمایاں ہو گیا ہے جو اوپر 'مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ' کے سوال میں ذرا مخفی تھا۔

بِهٖ ۚ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ۬ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ

یونس ۱۰

نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے، اگر وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو (اپنے آپ کو بچانے کے لیے) وہ اُس کو فدیے میں دینا چاہے گا۔ (اُس وقت) یہ دل ہی دل میں پچھتائیں گے، جب عذاب کو (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے اور اِن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور اِن پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ سنو، زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے۔ سن رکھو، اللہ کا وعدہ شدنی ہے، مگر (افسوس کہ) اِن میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں۔ (حقیقت یہ ہے کہ) وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔[70] ۵۳-۵۶

لوگو، تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس نصیحت آگئی ہے اور جو سینوں میں (دھڑکتے) ہیں، اُن کی شفا[71] اور اُن کے لیے ہدایت و رحمت[72] جو ماننے والے

[69] یہ اُن کی رعونت پر ضرب لگائی ہے کہ اِس وقت تو مذاق اڑا رہے ہو، لیکن جب حقیقت سامنے آجائے گی تو خدا کے مقابلے میں بے بسی کے سوا تمھارے پاس کچھ بھی نہ ہوگا۔

[70] مطلب یہ کہ تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی وہاں تمھارا استقبال کرنے کے لیے نہیں ہوگا، بلکہ تنہا خدا ہوگا جس کے حضور میں پیش کر دیے جاؤ گے۔

اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

ہوں۔ اِنھیں بتاؤ، (اے پیغمبر)، یہ اللہ کے فضل اور اُس کی رحمت سے آئی ہے[3]۔ سو چاہیے کہ اِس پر وہ خوشی منائیں۔ یہ اُس سے بہتر ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں[4]۔ ۵۷-۵۸

اِن سے پوچھو، ذرا بتاؤ تو سہی کہ اللہ نے تمھارے لیے جو رزق اتارا تھا، پھر تم نے اُس میں سے کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال ٹھیرا لیا۔ پوچھو، اِس کا حکم تمھیں اللہ نے دیا ہے یا تم اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہو؟ اُن لوگوں کا قیامت کے دن کیا گمان

---

[1] یہ اُن بیماریوں کی طرف اشارہ ہے جو دلوں کو لگ جاتی ہیں اور انسان کو تمام انسانی اوصاف سے محروم کر کے حیوانات کے درجے تک گرا دیتی ہیں۔

[2] یعنی دنیا میں ہدایت اور آخرت میں خدا کی رحمت و عنایت جو اُس کے ماننے والوں کو لازماً حاصل ہو جائے گی۔

[3] اِس جملے میں فعل محذوف ہے، یعنی 'قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ جَآءَ'۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

[4] اِس سلسلۂ کلام کی ابتدا آیت ۳۷ میں منکرین کے اِس خیال کی تردید سے ہوئی تھی کہ قرآن کو یہ پیغمبر خود گھڑ کر لے آئے ہیں۔ اُن سب چیزوں پر استدلال کے بعد جو اِس معاملے میں الجھن کا باعث بن رہی تھیں، یہ اب بطور التفات قرآن کی قدر و قیمت واضح کر دی ہے۔

لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾
وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ
مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ
عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ

ہے جو اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں[۵]؟ (یہ اللہ کی عنایت ہے کہ اُس نے اِنھیں مہلت دے رکھی ہے، ورنہ اِس جسارت پر اِن کا قصہ ابھی پاک ہو جاتا)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اُن میں سے اکثر شکر ادا نہیں کرتے۔ ۵۹-۶۰

(تم اِن کی پروا نہ کرو اور اپنا کام کیے جاؤ، اے پیغمبر)۔ تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور (ہم نے جو کچھ نازل کیا ہے)، اُس میں سے قرآن کا جو حصہ بھی پڑھ کر سناتے ہو[۶] اور تم لوگ جو کام بھی کرتے ہو[۷]، ہم تمھیں دیکھ رہے ہوتے ہیں،

۵ے یہ افتراء علی اللہ کے جرم کی انتہائی شناعت کا اظہار ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...سوال کر کے جواب دیے بغیر بات ختم کر دی ہے جو متکلم کے انتہائی غضب کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا یہ شامت زدہ لوگ اِس جرم عظیم کو کوئی معمولی بات سمجھے بیٹھے ہیں؟ قیامت آئے گی تو اِنھیں پتا چلے گا کہ اِس جسارت کی اِن کو کیا سزا ملتی ہے۔"

(تدبر قرآن ۴/۶۴)

۶ے اصل الفاظ ہیں: 'مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ'۔ اِن میں ضمیر مجرور کا مرجع وہی کتاب ہے جس کا ذکر آیت ۵۷-۵۸ میں گزر چکا ہے اور قرآن سے مراد اُس کا کوئی جز و یا حصہ ہے۔

۷ے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ آپ کے جاں نثار ساتھیوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے تسلی و بشارت کے اِس پیغام میں شامل کر لیا ہے۔

ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٤﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ

جس وقت تم اُس میں مشغول ہوتے ہو۔[۷۸] حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار سے ذرّہ برابر بھی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، نہ زمین میں، نہ آسمان میں اور نہ ذرّے سے چھوٹی، نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ (لوگو) سنو، (خدا کا پیغمبر اور اُس کے ساتھی، سب اللہ کے دوست ہیں اور) اللہ کے دوستوں کے لیے، جو ایمان لائے اور خدا سے ڈرتے رہے، (قیامت کے دن) نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔ اُن کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی خوش خبری ہے[۷۹] اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ (یہ خدا کی بات ہے اور) خدا کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔[۸۰] یہی بڑی کامیابی ہے۔ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ تمھیں رنجیدہ نہ کرے،[۸۱]

یونس ۱۰

۷۸۔ پیچھے کی بات پر اِس قید سے کیا پیش نظر ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’... اِس قید سے ایک تو اُس غیر معمولی انہماک پر بھی روشنی پڑی جو اقامت دین کی اِس جدوجہد میں صحابہ کو تھا۔ دوسرے اِس سے تسلی کے مضمون کی بلاغت بھی دو چند ہوگئی ہے، اِس لیے اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم اپنے تن، من، دھن ہر چیز سے بے پروا ہو کر خدا کے کلمہ کی سربلندی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہوتے ہو تو اُس وقت ہم تمھارے پیچھے تمھاری حفاظت و نگرانی میں مصروف ہوتے ہیں۔‘‘ (تدبر قرآن ۴/۶۵)

۷۹۔ اِس لیے کہ رسولوں کے باب میں خدا کی سنت یہی ہے کہ اُنھیں اور اُن کے ساتھیوں کو دنیا میں بھی لازماً غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ

(اے پیغمبر)۔ تمام عزت اللہ ہی کے لیے ہے، (تم اُس پر بھروسا رکھو اور اپنا کام کیے جاؤ)، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ ۶۱ - ۶۵

سن رکھو کہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سب اللہ ہی کے ہیں اور جو اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں، وہ شریکوں کی پیروی نہیں کرتے۔[۸۲] حقیقت

یونس ۱۰

۸۰۔ باتوں سے یہاں خدا کے وعدے مراد ہیں جنھیں دوسرے مقامات میں سنن الٰہیہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

۸۱۔ اشارہ ہے منکرین کی اُن باتوں کی طرف جو وہ طنز و استہزا کے طور پر کہتے تھے کہ یہ اگر خدا کے پیغمبر ہیں تو اِن پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا یا اِن کے منصب کی منادی کے لیے اِن کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اِن آیات کے نزول کے دور میں مسلمانوں کا جو حال تھا، اُس کے لحاظ سے تمکن اور غلبہ کی وہ بشارت جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی، کفار کے لیے طنز و استہزا کا موضوع بن سکتی تھی۔ وہ کہہ سکتے تھے اور اُنھوں نے کہا بھی ہوگا کہ ذرا اِس نئے دین کے سر پھروں کا حوصلہ دیکھو کہ کسی کو دو وقت کی قرینے کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو سلیقے کا لباس نصیب نہیں، لیکن حکومت و سلطنت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اِسی کو پیش نظر رکھ کر فرمایا کہ تمھیں مخالفین کی اِس طرح کی باتیں غم میں نہ ڈالیں۔ تمھارے لیے جو بشارت ہے، وہ حتمی اور قطعی ہے۔ عزت کا مالک اللہ ہے۔ یہ چیز جس کو بھی ملتی ہے، اللہ ہی کے دیے ملتی ہے۔ اب اللہ نے اگر یہ عزت تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو دینے کا فیصلہ فرما لیا ہے تو اُس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے؟'' (تدبر قرآن ۴/۶۶)

اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿٦٦﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا

یہ ہے کہ وہ محض گمان کی پیروی کرتے اور نرے اٹکل دوڑاتے ہیں۔(سنو)، وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے رات کو تاریک بنایا تاکہ اُس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنادیا تاکہ معاش کی جدوجہد کرو۔[83] اِس میں یقیناً اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں۔[84] اِنھوں نے کہا ہے کہ خدا نے اولاد بنا رکھی ہے۔ وہ اِس سے پاک ہے

یونس ۱۰

۸۲؎ اِس لیے کہ خدا کا تو کوئی شریک ہے ہی نہیں کہ اُس کی پیروی کی جائے۔

۸۳؎ اِس جملے میں عربیت کے اسلوب پر مقابل کے الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ اِنھیں کھول دیجیے تو پوری بات اِس طرح ہے: 'جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ (مُظْلِمًا) لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (لِتَعْمَلُوْا فِيْهِ)'۔

۸۴؎ یہ کیا نشانیاں ہیں؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سب سے پہلے تو اُس توافق پر نگاہ کیجیے جو رات اور دن کے اندر باوجودیکہ وہ دونوں ضدین کی نسبت رکھتے ہیں، پایا جاتا ہے کہ دونوں مل کر انسان کی خدمت کر رہے ہیں۔ رات اُس کے لیے راحت کا بستر بچھاتی ہے اور دن اُس کے لیے سرگرمیوں کا میدان کھولتا ہے۔ یہی حال اِس کائنات کے تمام اضداد کا ہے کہ وہ پوری وفاداری اور سازگاری کے ساتھ اپنے سے بالاتر مقصد کی خدمت میں سرگرم ہیں اور اُس سے ذرا انحراف اختیار نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ اِس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ ایک بالاتر اور حکیم ارادہ اِس کائنات کے پورے نظام پر حاوی اور قاہر ہو اور وہ اِس کے اجزاے مختلفہ میں ربط و تعلق پیدا کر کے اِس کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہا ہو ـــــ یہ اُس توحید کی دلیل ہوئی جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہے۔

فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٨﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾ مَتَاعٌ فِی الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

(کہ کسی کو اولاد بنائے)۔ وہ ایسی ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اُسی کا ہے۔ تمھارے پاس اِس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا تم خدا پر ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے؟ کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ جو اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں، وہ ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ اُن کے لیے یہی تھوڑا سا فائدہ ہے جو دنیا میں اُٹھالیں گے۔ پھر اُن کو ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔ پھر اُن کے اِس کفر کی پاداش میں ہم اُن کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ۶۶-۷۰

دوسری چیز جو ظاہر ہو رہی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ کارخانۂ کائنات نہ کوئی اتفاقی حادثے کے طور پر ظہور میں آ جانے والی شے ہے اور نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے، بلکہ اِس کے ہر گوشے میں عظیم قدرت، حیرت انگیز حکمت اور نہایت گہری غایت و مصلحت پائی جاتی ہے۔ یہ چیز مقتضی ہے کہ یہ دنیا نہ یوں ہی چلتی رہے، نہ یوں ہی تمام ہو جائے، بلکہ ضروری ہے کہ یہ کسی عظیم غایت پر منتہی ہو اور یہ غایت بغیر اس کے پوری نہیں ہو سکتی کہ اِس کے بعد آخرت کو تسلیم کیا جائے۔

تیسری چیز وہ ربوبیت کا نظام ہے جو اس کے ہر گوشے میں جلوہ گر ہے۔ ربوبیت مسئولیت کو مقتضی ہے۔ جس نے ہمارے لیے زندگی اور پرورش کا یہ سارا نظام قائم کیا ہے، اُس کا ہم پر فطری طور پر حق قائم ہوتا ہے اور لازم ہے کہ ایک دن اُس حق کی بابت ہم سے پرسش ہو۔ جنھوں نے اِس حق کو پہچانا ہو، وہ اُس کا انعام پائیں اور جنھوں نے اِس کی ناقدری کی ہو، وہ اُس کی سزا بھگتیں۔ اِس اعتبار سے یہ جزا و سزا کی دلیل ہوئی۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۶۸)

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ نُوۡحٍ ۘ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكُمۡ مَّقَامِىۡ وَتَذۡكِيۡرِىۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَكُمۡ وَشُرَكَآءَكُمۡ ثُمَّ لَا يَكُنۡ اَمۡرُكُمۡ عَلَيۡكُمۡ غُمَّةً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَىَّ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَمَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۷۲﴾ فَكَذَّبُوۡهُ فَنَجَّيۡنٰهُ وَمَنۡ مَّعَهٗ فِى الۡفُلۡكِ وَجَعَلۡنٰهُمۡ خَلٰۤئِفَ وَاَغۡرَقۡنَا الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ﴿۷۳﴾

اِنھیں نوح کی سرگذشت سناؤ، (اے پیغمبر)، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: میری قوم کے لوگو، اگر میرا دعوت کے لیے کھڑا رہنا اور اللہ کی آیتیں سنا کر یاددہانی کرنا تم پر گراں ہو گیا ہے[85] تو سن لو کہ میں نے اللہ ہی پر بھروسا کیا۔ سو تم سب مل کر اپنی بات ٹھیرا لو اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ ملا لو، پھر تمھارے اِس فیصلے میں تمھیں کوئی تردد نہ رہے، پھر میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو، کر گزرو[86] اور مجھے مہلت نہ دو۔ اِس کے بعد بھی اعراض کرو گے تو میرا کیا نقصان ہے کہ میں نے تم سے کوئی صلہ نہیں مانگا ہے۔ میرا صلہ تو اللہ کے ذمے ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خدا کا) فرماں بردار بن کر رہوں۔ اِس پر بھی اُنھوں نے اُسے جھٹلا دیا تو ہم نے اُس کو نجات دی اور اُن کو بھی جو اُس کے ساتھ کشتی میں تھے اور اُنھیں جانشین بنایا اور اُن سب لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا۔ سو دیکھ لو کہ اُن کا انجام کیا ہوا جنھیں (اِس عذاب سے پہلے) متنبہ کر دیا گیا تھا۔ ۷۱-۷۳

۸۵؎ دوسری جگہ تصریح ہے کہ نوح علیہ السلام یہ ذمہ داری سیکڑوں برس تک ادا کرتے رہے۔ اُنھوں نے یہ غالباً اِسی بنا پر فرمایا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿٧٤﴾

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٦﴾ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ

یونس
۱۰

پھر نوح کے بعد ہم نے کتنے رسولوں کو اُن کی قوموں کی طرف بھیجا۔ سو وہ کھلی کھلی نشانیاں لے کر اُن کے پاس آئے، مگر جس چیز کو پہلے جھٹلا چکے تھے، اُسے پھر اُنھوں نے مان کر نہیں دیا۔ ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر اِسی طرح مہر لگا دیا کرتے ہیں[۸۷]۔ ۷۴

اُن کے بعد پھر ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف بھیجا تو وہ بھی اکڑ بیٹھے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ مجرم لوگ تھے[۸۸]۔ چنانچہ جب ہماری طرف سے حق اُن کے سامنے آیا[۸۹] تو اُنھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا

۸۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَیَّ'۔ اِن میں 'اِلٰی' کا صلہ اقدام پر دلیل ہے۔ یعنی جو فیصلہ کرنا ہے، کر لو اور میرے خلاف جو اقدام کرنا چاہتے ہو، کرو۔

۸۷۔ یہ اُسی سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی رو سے کوئی شخص حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتا اور جانتے بوجھتے اُسے ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے مہلت دی جاتی ہے۔ پھر اِس مہلت سے وہ اگر فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اِس جرم کی پاداش میں اُس کے دل و دماغ پر مہر کر دی جاتی ہے تاکہ وہ قبول حق کی سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے۔

لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ

جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا: کیا تم حق کے بارے میں یہ کہتے ہو،[۹۰] جب کہ وہ تمھارے پاس آ گیا ہے؟[۹۱] کیا یہ جادو ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ قطعی حق ہے اور حق کے مقابلے میں جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔[۹۲] اُنھوں نے جواب دیا: کیا تم ہمارے پاس اِس لیے آئے ہو کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دو جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اِس ملک میں تم دونوں کی بڑائی قائم ہو جائے؟[۹۳] ہم تمھاری بات ماننے والے نہیں

۸۸۔ یعنی عقل و فطرت کے تقاضوں سے انحراف کے باعث پہلے ہی مجرم ہو چکے تھے۔

۸۹۔ اشارہ ہے اُن معجزات کی طرف جن کے ساتھ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اپنا یہ دعویٰ اُن کے سامنے پیش کیا کہ وہ دونوں خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے اُن کے پاس آئے ہیں۔

۹۰۔ اصل الفاظ ہیں: 'اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ؟' اِن میں 'لِلْحَقِّ' کا 'ل' 'فی' کے معنی میں ہے اور 'تَقُوْلُوْنَ' کا مفعول بلاغت کے تقاضے سے حذف ہو گیا ہے۔

۹۱۔ اِس جملے کی بلاغت بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...حق جب تک نگاہوں سے اوجھل ہو، اُس وقت تک تو اُس کی نسبت کوئی شخص اگر کوئی نظریاتی بحث اٹھائے تو اُس کو کسی حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب حق سامنے موجود ہو تو اُس کے باب میں کٹ حجتی کرنا ویسا ہی ہے، جس طرح کوئی نصف النہار کے سورج کے بارے میں تردد کا اظہار کرے۔" (تدبر قرآن ۴/ ۷۷)

۹۲۔ مطلب یہ ہے کہ معجزے کو جادو کہنے کی جسارت کر رہے ہو تو اِسے جادوگروں کے سامنے پیش کر کے دیکھ لو، تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کیا ہے اور جادو کیا ہوتا ہے؟ تم دیکھو گے کہ جادوگر

ائۡتُوۡنِیۡ بِکُلِّ سٰحِرٍ عَلِیۡمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَۃُ قَالَ لَہُمۡ مُّوۡسٰۤی اَلۡقُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ مُّلۡقُوۡنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا قَالَ مُوۡسٰی مَا جِئۡتُمۡ بِہِ ۙ السِّحۡرُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَیُبۡطِلُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۸۱﴾

ہیں۔فرعون نے حکم دیا کہ تمام ماہر جادوگروں کو میرے پاس حاضر کرو۔ چنانچہ جب جادوگر آ گئے تو موسیٰ نے اُن سے کہا: تمھیں جو ڈالنا ہے، ڈالو۔[۹۴] پھر جب اُنھوں نے ڈالا تو موسیٰ نے کہا: یہ جو کچھ تم لائے ہو، یہ جادو ہے۔[۹۵] یقین رکھو، اللہ ابھی اِسے باطل کیے دیتا ہے، اِس لیے کہ اللہ (اِس طرح کے موقعوں پر) فساد کرنے والوں کے کام کو

اِس کے مقابلے میں بالکل خائب و خاسر ہو کر رہ جائیں گے۔

۹۳ مصر کے ارباب اقتدار اسرائیلیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے پہلے ہی خوف زدہ تھے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون پر اپنی حکومت قائم کرنے اور لوگوں کو اُن کے آبائی دین سے برگشتہ کرنے کا یہ الزام اِسی پس منظر میں لگایا گیا ہے تاکہ قبطی عصبیت پوری قوت کے ساتھ اِس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ دعوت حق کے جواب میں اِس طرح کے اشغلے ہر دور کے ارباب اقتدار چھوڑتے رہے ہیں۔

۹۴ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد بتا رہا ہے کہ اُنھیں اپنے رب کے وعدوں پر کس درجہ اعتماد تھا۔استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اُن کو اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت پر پورا بھروسا تھا کہ خواہ جادوگر جتنا بڑا جادو بھی دکھائیں، اُن کے پاس اِس کا توڑ موجود ہے۔اِس وجہ سے اُنھوں نے کسی پیش بندی سے بے نیاز ہو کر اُنھی کو پہل کرنے کا موقع دیا اور یہ گویا میدان مقابلہ میں اُن کی پہلی جیت تھی۔اِس لیے کہ اِس کے بعد حریف کو جو شکست ہوئی، وہ خود اُس کے اپنے منتخب کیے ہوئے میدان میں ہوئی۔“ (تدبر قرآن ۴/۷۸)

۹۵ یہ فرعونیوں کی بات کا جواب ہے کہ جو کچھ میں نے پیش کیا تھا، وہ جادو نہیں ہے، بلکہ جادو

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

سدھرنے نہیں دیتا اور اللہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھاتا ہے، اگرچہ مجرموں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔[۹۶] پر موسیٰ کو اُس کی قوم کے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہیں مانا،[۹۷] فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے بڑوں کے ڈر سے کہ کہیں فرعون اُنھیں کسی فتنے میں نہ ڈال دے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعون اُس ملک میں بڑا جبار تھا اور اُن لوگوں میں سے تھا جو حد

در حقیقت یہ ہے جو تمھارے جادوگر پیش کر رہے ہیں۔

۹۶ یعنی اُن موقعوں پر فساد کرنے والوں کے عمل کو باطل کر دیتا اور حق کو حق کر دکھاتا ہے، جب اُس کے پیغمبر اتمام حجت کے لیے کسی قوم کی طرف مبعوث کیے جاتے ہیں۔ یہ اُسی سنت الٰہی کا حوالہ ہے جس کی وضاحت ہم آیت ۴۷ کے تحت کر چکے ہیں۔

۹۷ اصل میں 'فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰى' کے الفاظ آئے ہیں۔ اللہ و رسول پر ایمان کو بالعموم 'اٰمن به' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس کے بجائے 'اٰمَنَ لَهٗ' کے الفاظ یہاں اِس لیے اختیار کیے گئے ہیں کہ اِن نوجوانوں نے حضرت موسیٰ کے دعوے کی صداقت تو بے شک تسلیم کر لی تھی، مگر تسلیم و تفویض اور اطاعت و انقیاد کے اُس مقام تک ابھی نہیں پہنچے تھے جس پر 'اٰمن به' کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ آگے کی آیات میں اِسی بنا پر اُنھیں ایمان کے اِن تقاضوں کو پورا کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے کہ 'اٰمَنَ لَهٗ' کی یہ سعادت بھی بنی اسرائیل کے نوجوانوں ہی کو حاصل ہوئی۔ دعوت حق کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ معاملہ صرف موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نہیں ہوا۔ اِس دعوت پر لبیک کہنے کی سعادت پہلے مرحلے میں بالعموم نوجوانوں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

یونس ۱۰

وَقَالَ مُوسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾

سے گزر جاتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا: میری قوم کے لوگو، تم خدا پر ایمان لائے ہو تو اُسی پر بھروسا کرو، اگر تم واقعی اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر چکے ہو[98]۔ اِس پر اُنھوں نے جواب دیا: ہم نے خدا ہی پر بھروسا کیا ہے ـــــ اے ہمارے رب، ہمیں اِن ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا[99] اور اپنی رحمت سے ہمیں اِس منکر قوم سے نجات عطا فرما دے۔ ۸۶-۷۵

”...اِس کی واضح نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیا جس ہمہ گیر دعوت اسلام کو لے کر اٹھتے ہیں، اُس کو ابتدائی مراحل میں آگے بڑھ کر قبول کرنا بڑی بلند حوصلگی، بلکہ بڑے جان جوکھم کا کام ہوتا ہے۔ اِس کی ہمت وہ لوگ آسانی سے نہیں کر سکتے جو روایات و رسوم سے مرعوب اور حالات و مصالح کی رعایت کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگوں کا حجاب آہستہ آہستہ ہی ٹوٹتا ہے۔ نوجوانوں میں اِس طرح کی مرعوبیت و مغلوبیت کم ہوتی ہے، اِس وجہ سے اُن کو جب دعوت حق اپیل کر لیتی ہے تو وہ اُس کے لیے دنیوی عواقب سے بے پروا ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، نہ وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی سرزنش کی کچھ زیادہ پروا کرتے نہ وقت کے ارباب اقتدار کی برہمی کو خاطر میں لاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے معاملے میں حالات کا یہ خاص پہلو بھی قابل لحاظ ہے کہ ملک میں جو ارسٹوکریسی برسر اقتدار تھی، وہ نسلاً بھی حضرت موسیٰ کی قوم سے بالکل الگ تھی اور اُس دور میں جو شخص تخت حکومت پر تھا، وہ بھی، جیسا کہ آیت کے الفاظ سے واضح ہے، طبعاً نہایت جبار اور سرکش تھا۔ ایسے حالات میں، ظاہر ہے کہ وہی لوگ اُن کا ساتھ دینے کے لیے آگے بڑھ سکتے تھے جو اپنی حمیت حق کے جوش و جذبہ کو دبا سکنے پر قادر نہ ہوں۔“ (تدبر قرآن ۴/۷۹)

۹۸ اسلام کی حقیقت یہی حوالگی ہے۔ سچا ایمان اِسی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے جس کا لازمی تقاضا خدا پر توکل ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایمان کا یہی تقاضا لوگوں کو سمجھایا ہے۔

وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰی وَاَخِیۡہِ اَنۡ تَبَوَّاٰ لِقَوۡمِکُمَا بِمِصۡرَ بُیُوۡتًا وَّاجۡعَلُوۡا بُیُوۡتَکُمۡ قِبۡلَۃً وَّاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالَ مُوۡسٰی رَبَّنَاۤ اِنَّکَ اٰتَیۡتَ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَاَہٗ زِیۡنَۃً وَّاَمۡوَالًا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۙ رَبَّنَا لِیُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِکَ ۚ رَبَّنَا اطۡمِسۡ عَلٰۤی

(خدا سے یہی تعلق جوڑنے کے لیے) ہم نے موسیٰ اور اُس کے بھائی (ہارون) کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھیرا لو[۱۰۰] اور جو گھر تم لوگ اپنے لیے ٹھیراؤ، اُنھیں قبلہ بنا لو[۱۰۱] اور (اُن میں) نماز کا اہتمام رکھو اور (اے موسیٰ)، ایمان والوں کو خوش خبری دو (کہ کامیابی بالآخر اُنھی کو حاصل ہوگی)۔[۱۰۲] موسیٰ نے دعا کی: اے ہمارے رب، تو نے فرعون کو اور اُس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں شان و شوکت اور

۹۹؎ فتنہ کے معنی یہاں ہدف اور نشانہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کو اتنی ڈھیل نہ دے کہ وہ ہم کو بالکل ہی ظلم و ستم کی آماج گاہ بنا لیں۔

۱۰۰؎ یعنی مصر کے مختلف حصوں میں کچھ گھر مسجد کی حیثیت سے مخصوص کر لیے جائیں جن میں بنی اسرائیل نماز کے اوقات میں جمع ہوں اور مل کر خدا کی عبادت کریں۔ انبیا علیہم السلام کے دین میں اصلاح و تربیت کا یہی نظام ہمیشہ سے قائم رہا ہے۔ حضرت موسیٰ نے بھی اپنی قوم کی مذہبی تنظیم کا آغاز کیا تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اِسی کی ہدایت فرمائی۔

۱۰۱؎ اِس سے مراد وہ گھر ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے اپنے اور اپنے متعلقین اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی نماز کے لیے مخصوص کیے ہوں گے۔ فرمایا کہ عارضی طور پر اِنھی گھروں کو قبلہ کی حیثیت دے دی جائے تاکہ نماز کی اقامت میں وہ وحدت پیدا ہو جائے جو اُس کے لیے ہمیشہ مطلوب رہی ہے۔ مصر سے ہجرت کے بعد بنی اسرائیل کے لیے یہی حیثیت تابوت کو حاصل ہوئی، یہاں تک کہ بیت المقدس تعمیر ہوا اور اُنھوں نے اُس کو اپنا قبلہ بنا لیا۔

اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٨٨﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٩﴾

مال واسباب سے نوازا ہے۔ اے ہمارے رب، تاکہ اِس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکا دیں[۱۰۳]۔ اے ہمارے رب، اُن کے مال اب تو غارت کر دے اور اُن کے دلوں کو اِس طرح بند کر دے کہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں[۱۰۴]۔ فرمایا: تمھاری اور تمھارے بھائی کی دعا قبول ہوئی۔ اب تم دونوں ثابت قدم رہو اور اُن لوگوں کے راستے پر نہ چلو جو علم نہیں رکھتے[۱۰۵]۔ ۸۷-۸۹

۱۰۲۔ یہ بشارت جس طرح ظاہر ہوئی، اُس کا ذکر آگے آیت ۹۳ میں ہوا ہے۔

۱۰۳۔ اصل الفاظ ہیں: 'رَبَّنَا، لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ'۔ اِن میں 'ل' انجام اور نتیجے کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی مال واسباب عطا ہوئے تو اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی اِس عنایت پر شکر گزار ہونے کے بجائے سرکشی پر اتر آئے۔

۱۰۴۔ یہ ہجرت سے پہلے کی دعا ہے جو فرعون اور اُس کے اکابر پر اتمام حجت کے بعد کی گئی۔ اِس طرح کی دعا اللہ کے رسول اُسی وقت کرتے ہیں، جب وہ اپنے مخاطبین کے ایمان سے آخری درجے میں مایوس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ محض دعا نہیں ہوتی، بلکہ خود خدا کے فیصلے کا اعلان ہوتا ہے۔

۱۰۵۔ مطلب یہ ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی اب اِن سرکشوں کی چھوت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں اور اِن کے ساتھ جو معاملہ ہونے والا ہے، اُس پر اپنے دل میں نرمی کے جذبات نہ پیدا ہونے دیں کہ مبادا کوئی سفارش کا کلمہ تمھاری زبان سے نکل جائے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

البیان

یونس ۱۰

بنی اسرائیل کو، (اِس کے بعد)، ہم نے سمندر پار کرایا تو فرعون اور اُس کے لشکروں نے سرکشی اور شرارت کی راہ سے[۱۰۶] اُن کا پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا: میں نے مان لیا کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہوئے ہیں اور میں بھی سراطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں ـــــ کیا اب؟ اِس سے پہلے تو تم نافرمانی کرتے رہے اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے[۱۰۷]۔ سو آج ہم تیرے بدن کو بچالیں گے تاکہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے تو (خدا کے عذاب کی) نشانی بن کر رہے[۱۰۸]۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل

بظاہر یہ تنبیہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو کی گئی ہے، لیکن روے سخن، اگر غور کیجیے تو اُنھی سرکشوں کی طرف ہے جو اب عذاب کے مستحق ہو گئے ہیں۔

۱۰۶؎ فرعون کا یہ فعل یوں تو ہر پہلو سے سرکشی اور شرارت تھا، لیکن یہاں یہ الفاظ خاص طور پر اُس سرکشی اور شرارت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اُس نے بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دینے کے بعد پھر اُن کا پیچھا کر کے کی۔

۱۰۷؎ یہ الفاظ ضروری نہیں ہے کہ کہے گئے ہوں۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ صورت حال کی تصویر ہو۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٩٣﴾

ہی رہتے ہیں۔ ہم نے بنی اسرائیل کو عزت کا ٹھکانا دیا اور اُنھیں نہایت عمدہ رزق عطا فرمایا۔ پھر اُنھوں نے جو کچھ بھی اختلافات کیے، اُس وقت کیے جب اُن کے پاس (خدا کا بھیجا ہوا) علم آچکا تھا[109]۔ یقین رکھو کہ تمھارا پروردگار قیامت کے دن اُن کے درمیان

یونس ۱۰

۱۰۸؎ خدا کی یہ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ فرعون کی لاش کو غرقابی کے بعد سمندر نے قبول نہیں کیا، بلکہ عذاب الٰہی کی ایک عبرت ناک نشانی کے طور پر باہر پھینک دیا۔ یہ لاش بعد میں لوگوں کو ملی بھی اور اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا کے مقابلے میں سرکشی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ جزیرہ نماے سینا کے مغربی ساحل پر جبل فرعون اور حمام فرعون اِسی واقعے کی یادگاریں ہیں۔ ابوزنیمہ سے چند کلومیٹر اوپر شمال کی جانب علاقے کے باشندے آج بھی اُس جگہ کی نشان دہی کرتے ہیں، جہاں یہ لاش پڑی ہوئی ملی تھی۔ دور حاضر میں اہل مصر کی جو ممی کی ہوئی لاشیں دریافت ہوئی ہیں، اُن میں سے بھی ایک لاش کے بارے میں، جسے فرعون منفتہ کی لاش قرار دیا جاتا ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ اُسی فرعون کی لاش ہے۔ یہ لاش قاہرہ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس لاش کے بارے میں اثریات کے ماہرین، چاہے اختلاف کریں کہ یہ اُسی فرعون کی لاش ہے یا کسی اور کی، لیکن اُن کے اٹکل پچو اندازوں کے مقابل میں قرآن کا یہ چودہ سو سال پہلے کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے۔ اِس طرح قدرت نے اُس کی لاش کو عبرت کی ایک ایسی نشانی بنا دیا جو آج کے فرعونوں کے لیے بھی محفوظ ہے، لیکن دیکھنے کے لیے آنکھوں کی ضرورت ہے اور اِس دنیا میں عبرت پذیر آنکھوں سے زیادہ کم یاب کوئی شے بھی نہیں۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۸۴)

فَاِنۡ كُنۡتَ فِىۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ فَسۡـَٔلِ الَّذِيۡنَ يَقۡرَءُوۡنَ
الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ لَقَدۡ جَآءَكَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ
مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ۙ‏ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوۡنَ
مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ‏ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ حَقَّتۡ عَلَيۡهِمۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ

اُن چیزوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں[۱۱۰]۔ ۹۰-۹۳

سو، (اے پیغمبر)، تمھیں اگر اُس چیز کے بارے میں کوئی شک ہو جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے[۱۱۱] تو (اہل کتاب کے) اُن (صالحین) سے پوچھ لو جو تم سے پہلے خدا کی کتاب پڑھ رہے ہیں[۱۱۲]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس حق ہی آیا ہے، لہٰذا ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ بنو اور نہ اُن لوگوں میں شامل ہو جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا ہے کہ تم بھی نامرادوں

۱۰۹؎ یعنی حق کے پوری طرح واضح ہو جانے کے بعد اختلاف کیا جس کی وجہ، ظاہر ہے کہ فرقہ بندی کے داعیات اور تعصّبات ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اِس کی تمام ذمہ داری اب اُنھی پر ہے۔

۱۱۰؎ یہ بڑی سخت وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس وقت تو ہر دھاندلی اور کتمان حق کی ہر کوشش کے لیے توجیہات تلاش کر سکتے ہو، مگر جب فیصلے کا دن آئے گا تو تمام حقائق بے نقاب ہو جائیں گے اور تمھارا سب کچا چٹھا تمھارے سامنے ہوگا۔ اُس وقت کہنے کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

۱۱۱؎ یہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر بات درحقیقت اُنھی لوگوں کو سنانی مقصود ہے جو آپ کی دعوت میں شک کر رہے تھے۔ مدعا یہ ہے کہ جو کچھ نازل کیا گیا ہے، وہ ایسا واضح حق ہے کہ کسی سلیم الطبع شخص کو اُس کے بارے میں کوئی تردد لاحق نہیں ہونا چاہیے۔

۱۱۲؎ اصل میں فعل 'یَقْرَءُوْنَ' استعمال ہوا ہے۔ یہ اپنے حقیقی مفہوم میں ہے، یعنی جو کتاب کو

لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٩٧﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٩٨﴾

میں سے ہو جاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار کی بات جن لوگوں پر پوری ہو چکی ہے،[۱۱۳] اُن کے سامنے، خواہ ساری نشانیاں آ جائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے، جب تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ سو ایسا کیوں نہ ہوا کہ قوم یونس کے سوا کوئی اور بستی بھی ایمان لاتی، پھر اُس کا ایمان اُسے نفع دیتا؟[۱۱۴] جب اُس بستی کے لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب اُن سے ٹال دیا تھا اور ایک مدت کے لیے اُن کو رہنے بسنے کا موقع دیا تھا۔ ۹۴-۹۸

پڑھنے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اہل کتاب میں اِسی طرح کے لوگ تھے جن سے تائید و تصدیق کی توقع کی جا سکتی تھی۔

۱۱۳؎ یعنی یہ بات کہ جو لوگ حق کے سچے طالب نہیں ہوتے اور اپنے دلوں پر ضد اور ہٹ دھرمی کے قفل چڑھا لیتے ہیں، اُنھیں کبھی ایمان کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہ سنت الٰہی اِس سے پہلے کئی جگہ بیان ہو چکی ہے۔

۱۱۴؎ یہ قریش کے لیے ترغیب و ترہیب ہے کہ اب بھی موقع ہے، تم چاہو تو قوم یونس کی طرح تم بھی خدا کے پیغمبر پر ایمان لا کر اپنے آپ کو اُس عذاب سے بچا سکتے ہو جو اتمام حجت کے بعد اب تمھارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، اگر غور کیجیے تو اِس میں تسلی کا یہ مضمون بھی پیدا ہو گیا ہے کہ تمھاری قوم کے لوگ اگر نہیں مان رہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم سے پہلے جتنے رسول آئے ہیں، اُن کی قوم کے لوگ بھی عذاب الٰہی کو آنکھوں سے دیکھ لینے کے

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ

اگر تمھارا پروردگار چاہتا تو زمین پر جتنے لوگ ہیں، سب کے سب ایمان لے آتے۔ پھر کیا لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن ہو جائیں[115]؟ (اچھی طرح سمجھ لو کہ) اللہ کی

بعد ہی مان لینے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ یونس علیہ السلام کی قوم کے سوا اِس معاملے میں کوئی استثنا نہیں ہے۔ یہی ایک قوم تھی جس کے لوگ عذاب کی گھڑی ظاہر ہونے سے پہلے پہلے متنبہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ اللہ نے اُنھیں ایمان کی توفیق بخشی اور وہ عذاب سے محفوظ رہے۔

یونس علیہ السلام وہی پیغمبر ہیں جن کا نام بائیبل میں یوناہ آیا ہے۔ اِن کا زمانہ ۸۶۰ اور ۷۸۴ قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ یہ اشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق میں مبعوث ہوئے تھے۔ نینویٰ کا مشہور شہر اِنھی اشور والوں کا دار السلطنت تھا اور اُس زمانے میں تقریباً ۶۰ کلومیٹر کے دور میں پھیلا ہوا تھا۔ اِن کی قوم کے ایمان کا واقعہ بائیبل کے صحیفہ یوناہ میں اِس طرح بیان ہوا ہے:

”...تب یوناہ خداوند کے کلام کے مطابق اُٹھ کر نینویٰ کو گیا اور نینویٰ بہت بڑا شہر تھا۔ اُس کی مسافت تین دن کی راہ تھی۔ اور یوناہ شہر میں داخل ہوا اور ایک دن کی راہ چلا۔ اُس نے منادی کی اور کہا: چالیس روز کے بعد نینویٰ برباد کیا جائے گا۔ تب نینویٰ کے باشندوں نے خدا پر ایمان لا کر روزہ کی منادی کی اور ادنیٰ و اعلیٰ، سب نے ٹاٹ اوڑھا۔ اور یہ خبر نینویٰ کے بادشاہ کو پہنچی اور وہ اپنے تخت پر سے اٹھا اور بادشاہی لباس کو اتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا۔ اور بادشاہ اور اُس کے ارکان دولت کے فرمان سے نینویٰ میں یہ اعلان کیا گیا اور اِس بات کی منادی ہوئی کہ کوئی انسان یا حیوان، گلہ یا رمہ کچھ نہ چکھے اور نہ کھائے پیے۔ لیکن انسان اور حیوان ٹاٹ سے ملبس ہوں اور خدا کے حضور گریہ وزاری کریں، بلکہ ہر شخص اپنی بری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے باز آئے۔ شاید خدا رحم کرے اور اپنا ارادہ بدلے اور اپنے قہر شدید سے باز آئے اور ہم ہلاک نہ ہوں۔ جب خدا نے اُن کی یہ حالت دیکھی کہ وہ اپنی اپنی بری روش سے باز آئے تو وہ اُس

اللّٰہِ ؕ وَ یَجۡعَلُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾
قُلِ انۡظُرُوۡا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَا تُغۡنِی الۡاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ عَنۡ قَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾ فَہَلۡ یَنۡتَظِرُوۡنَ اِلَّا مِثۡلَ اَیَّامِ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ قُلۡ فَانۡتَظِرُوۡۤا اِنِّیۡ مَعَکُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّیۡ

اجازت کے بغیر کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ (پیغمبر پر) ایمان لائے۔ (یہ اجازت اُنھی کو ملتی ہے جو عقل سے کام لیں) اور جو عقل سے کام نہیں لیتے، اُن پر وہ گم راہی کی نجاست ڈال دیتا ہے۔ ۹۹-۱۰۰

(یہ نشانی مانگتے ہیں)۔ اِن سے کہو، زمین اور آسمانوں میں کیا کچھ ہے، اُسے دیکھو۔ حقیقت یہ ہے کہ نشانیاں اور تنبیہات اُن لوگوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچاتیں جو ایمان لانا نہیں چاہتے[۱۱۶]۔ سو کیا یہ اُسی طرح کے کسی دن کا انتظار کر رہے ہیں، جس طرح

عذاب سے جو اُس نے اُن پر نازل کرنے کو کہا تھا، باز آیا اور اُسے نازل نہ کیا۔'' (۳:۳-۱۰)

۱۱۵ مطلب یہ ہے کہ جب خدا نے اِس معاملے میں جبر کو پسند نہیں کیا تو تمھیں بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ خدا اگر یہی چاہتا کہ زمین میں سب مومن و فرماں بردار ہی ہوں تو شجر و حجر کی طرح انسانوں کو بھی اِس طرح پیدا کر دیتا کہ وہ ہمیشہ اُس کے حکم کے پابند رہتے۔ مگر اُس نے ایسا نہیں چاہا۔ انسانوں کے معاملے میں اُس کی اسکیم یہ ہے کہ وہ آزادی اور اختیار کے ساتھ ایمان یا کفر میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔ جنت کی ابدی نعمتیں اِسی ایمان کا صلہ ہیں۔ تمھارا فرض وہی ہے جو تم نے پورا کر دیا ہے۔ خدا نے تم پر یہ ذمہ داری عائد نہیں کی ہے کہ لوگوں کو زبردستی راہ راست پر لے آؤ۔

۱۱۶ اصل میں فعل 'یُؤۡمِنُوۡنَ' آیا ہے۔ آیت کے اسلوب سے واضح ہے کہ یہ یہاں ارادۂ فعل کے معنی میں ہے۔

رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٤﴾ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٥﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ

یونس ۱۰

کے دن اِن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو پیش آئے تھے؟ کہو، پھر انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ (اِنھیں بتا دو کہ) پھر (جب وہ دن آجاتا ہے تو) ہم اپنے رسولوں کو بچا لیتے ہیں اور اُن کو بھی جو اُن پر ایمان لائے ہوں۔ اِسی طرح ہمارا ذمہ ہے، ہم اُن کو بچا لیں گے جو ایمان لے آئے ہیں[۱۷۱]۔ ۱۰۱-۱۰۳

(اے پیغمبر)، کہہ دو کہ لوگو، میرے دین کے بارے میں اگر (اب بھی) شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہو، میں اُنھیں نہیں پوجتا، بلکہ اُس اللہ کو پوجتا ہوں جو تمھیں موت دیتا ہے (کہ جواب دہی کے لیے اُس کے سامنے حاضر ہو جاؤ)۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں اور حکم دیا گیا ہے کہ اپنا رخ یک سوئی کے ساتھ سیدھا اِسی دین کی طرف کر لو اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو۔ اور یہ بھی کہ اللہ کے سوا اُن کو نہ پکارو جو نہ تم کو نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان۔ پھر اگر یہی کرو گے تو اُس وقت تم بھی یقیناً ظالموں میں سے ہو گے۔ اگر اللہ تمھیں کسی تکلیف

۱۷۱؎ اور تمھارے معاملے میں وہی کریں گے جو پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد منکرین

اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ہُوَ ۚ وَاِنۡ یُّرِدۡکَ بِخَیۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِہٖ ؕ یُصِیۡبُ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ ؕ وَہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۰۷﴾

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَکُمُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۚ فَمَنِ اہۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَہۡتَدِیۡ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡہَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ وَاصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ ۚۖ وَہُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾

یونس
۱۰

میں پکڑ لے تو اُس کے سوا کوئی نہیں جو اُس کو دور کر سکے اور اگر تمھارے لیے کوئی بھلائی چاہے تو اُس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ بخشنے والا، بڑا رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۰۴-۱۰۷

اِن سے کہو کہ لوگو، تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس حق آ گیا ہے۔ اب جو ہدایت قبول کرے گا، وہ اپنے ہی لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا، اُس کا وبال بھی اُسی پر آئے گا اور میں تمھارے اوپر کوئی ذمہ دار نہیں ہوں[118]۔ (اے پیغمبر)، تم اُس کی پیروی کرو جو تمھاری طرف وحی کی جاتی ہے اور صبر کرو، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے[119]۔ ۱۰۸-۱۰۹

حق کے معاملے میں کرتے آئے ہیں۔

۱۱۸ یہ اعلان براءت ہے جو اتمام حجت کے بعد اور عذاب سے پہلے ہر پیغمبر کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

۱۱۹ یہ اُسی فیصلے کا حوالہ ہے جس کا ذکر آیت ۴۷ اور اُس کے بعد آیت ۱۰۳ میں ہوا ہے۔

سورة هود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ ۙ﴿۱﴾ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنَّنِیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ ۙ﴿۲﴾ وَّ اَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ یُمَتِّعۡکُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤی

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورہ 'الٓرٰ' ہے[۱۲۰]۔ یہ کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں، پھر خداے حکیم و خبیر کی طرف سے اُن کی تفصیل کی گئی ہے[۱۲۱] کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو[۱۲۲]۔ میں اُس کی طرف سے تمھیں خبردار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ اور یہ کہ تم اپنے پروردگار سے معافی چاہو، پھر اُس کی طرف رجوع کرو، وہ تمھیں ایک متعین مدت تک

۱۲۰۔ یہ سورہ کا نام ہے۔ اِس کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق ہم نے اپنا نقطۂ نظر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۱۲۱۔ یعنی پہلے ایجاز، جامعیت اور اختصار کا طریقہ اختیار کیا گیا، پھر اُنھی گٹھے ہوئے، جامع اور مختصر گویا دریا بہ کوزہ جملوں کی تفصیل کر دی گئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس چیز کا حوالہ دینے سے مقصود اُس اہتمام خاص کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے جو اُن کی تعلیم و تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اِس کتاب میں ملحوظ رکھا ہے... آخر میں 'حکیم و خبیر' کی صفات کا حوالہ ہے، اِس لیے کہ خداے حکیم ہی جان سکتا تھا کہ وہ حکمت کے خزانوں کو کس طرح مختصر لفظوں میں بند کرے اور پھر خداے خبیر ہی کی یہ شان تھی کہ وہ کھول کر دکھائے کہ ایک

اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿۳﴾ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴﴾

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ

ہود
۱۱

اچھی طرح بہرہ مند کرے گا اور ہر اُس شخص کو جو اُس کے فضل کا مستحق ہے، اپنے فضل سے نوازے گا۔ لیکن اگر منہ پھیرو گے تو میں تمھارے اوپر ایک بڑے ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔[۱۲۳] تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۱۲۴] ۱-۴

اِنھیں دیکھتے ہو، یہ اپنے سینے موڑتے ہیں کہ خدا سے چھپ جائیں۔ خبردار، جب (اِس مقصد سے) اپنے اوپر چادریں لپیٹتے ہیں، (یہ اُس وقت بھی اُس کی نظر میں ہوتے ہیں)۔[۱۲۵] وہ جانتا ہے جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اُن

کوزے میں کتنے دریا اور کتنے سمندر بند ہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/۱۰۷)

۱۲۲؎ یہ قرآن کا بنیادی پیغام ہے جو انبیا علیہم السلام کی دعوت میں ہر جگہ کم و بیش اِنھی الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

۱۲۳؎ یہ اُس انذار و بشارت کی تفصیل کر دی ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ بڑے ہول ناک دن کے عذاب سے مراد وہی عذاب ہے جو رسولوں کے منکرین پر اِسی دنیا میں آ جاتا ہے اور وہ یک قلم ختم کر دیے جاتے ہیں۔

۱۲۴؎ اِس ابہام کے اندر جو تخویف ہے، وہ اگر غور کیجیے تو ہر صراحت سے بڑھ گئی ہے۔

عَلِيمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۞ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ ۞ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّكَانَ

بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہوتے ہیں۔ زمین پر چلنے والا کوئی جان دار نہیں ہے، جس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو۔ اور وہ اُس کے ٹھکانے کو بھی جانتا ہے اور اُس جگہ کو بھی جہاں وہ (مرنے کے بعد زمین کے) سپرد کیا جائے گا۔ یہ سب ایک کھلی کتاب میں درج ہے[۱۲۶]۔ ۵-۶

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا ہے[۱۲۷] اور (تمھاری

هود ۱۱

۱۲۵۔ سینہ موڑنا اور چادر لپیٹ کر چل دینا، یہ دونوں تعبیریں اُن کے گریز و فرار کی تصویر کے لیے ہیں، جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار سے بچنے کے لیے آپ کی بات کو نظر انداز کرتے اور جہاں آپ بیٹھے ہوتے، وہاں سے متکبرانہ نکل جانے کی کوشش کرتے تھے۔ فرمایا کہ اِنھیں دیکھو، یہ اُس سے چھپنا چاہتے ہیں جو اِن کے سینوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔ اِس سے بڑھ کر حماقت کیا ہو سکتی ہے جس میں یہ تمھارے انذار کے بعد مبتلا ہو گئے ہیں۔

۱۲۶۔ اِن آیتوں میں انذار کے جو تہ در تہ پہلو ہیں، اُنھیں کھول دیجیے تو جو مضمون سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ خدا سے کیا چھپانا چاہتے ہو؟ اُس کا علم تو ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جو ہر جان دار کو جہاں کہیں بھی وہ ہو، اُس کی روزی پہنچا سکتا ہے، اُس سے تمھاری کوئی چیز کس طرح مخفی ہو سکتی ہے؟ تم بھی اُسی کے رزق پر پلتے، مگر اُس کی دعوت سے گریز کرتے ہو۔ یاد رکھو، خدا تمھارے ٹھکانوں سے بھی واقف ہے اور مرنے کے بعد جس زمین کے سپرد کیے جاؤ گے، اُسے بھی جانتا ہے۔ ایک دن آئے گا، جب زمین یہ امانت اپنے پروردگار کے حوالے کرے گی اور تم جواب دہی کے لیے پیش کر دیے جاؤ گے۔ اُس کے لیے ہر چیز ایک کھلی کتاب میں درج کر کے محفوظ کر لی گئی

عَرۡشُهٗ عَلَى الۡمَآءِ لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّكُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَيَقُوۡلَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۞ ۷ وَلَئِنۡ اَخَّرۡنَا عَنۡهُمُ الۡعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعۡدُوۡدَةٍ

پیدائش سے پہلے) اُس کا عرش پانی پر تھا[128] ـــــ اِس لیے پیدا کیا ہے کہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے[129]۔ اب، (اے پیغمبر)، اگر تم اِن سے کہتے ہو کہ (لوگو)، مرنے کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو یہ منکرین ضرور بول اٹھیں گے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے[130]۔ اور اگر کچھ مدت کے لیے ہم اِن سے دنیا کے اِس عذاب کو

ہے۔

۱۲۷؎ یہ اللہ کے ایام ہیں جن کے بارے میں قرآن نے صراحت فرمائی ہے کہ ہمارے حساب سے ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اور پچاس ہزار سال کے برابر بھی۔ مدعا یہ ہے کہ دنیا کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے، بلکہ یہ خدا کے ارادے سے، اُس کی اسکیم کے مطابق اور ایک ترتیب وحکمت کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔ چنانچہ یہ بے مقصد نہیں ہو سکتی، اِس کے پیچھے لازماً ایک غایت ہے جو جلد یا بدیر ظہور میں آ کر رہے گی۔

۱۲۸؎ یعنی اِس سے پہلے یہ کرۂ ارض پانی ہی پانی تھا اور خدا کی حکومت بھی اِسی پانی پر قائم تھی۔ زمانۂ رسالت میں لوگ قرآن کے اِس بیان پر اظہار تعجب کر سکتے تھے، مگر دور حاضر کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کے بارے میں یہی حقیقت ہے جو قرآن نے صدیوں پہلے بیان کر دی تھی۔

۱۲۹؎ یہ اُس غایت کا بیان ہے جس کے لیے دنیا اہتمام کے ساتھ اور چھ دن میں پیدا کی گئی ہے جو ہمارے حساب سے ہزاروں لاکھوں سال کے برابر ہو سکتے ہیں۔ انسان کو ارادے کی آزادی اور خیر وشر میں امتیاز کی صلاحیت اِسی مقصد سے دی گئی ہے۔ اُس کا خالق دیکھ رہا ہے کہ وہ

لَيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ

ٹال دیں گے[۱۳۱] تو ضرور پوچھیں گے کہ اِسے کیا چیز روکے ہوئے ہے؟ سنو، جس دن وہ اِن کے اوپر آپڑے گا تو اِن سے پھیرا نہ جاسکے گا اور وہی چیز اِن کو آ گھیرے گی جس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ ہم اُس کو اگر اپنے کسی فضل سے نوازیں، پھر اُس سے اُسے محروم کر دیں تو لازماً شکایت کرے گا، اِس لیے کہ وہ جلد مایوس ہو جانے والا اور نہایت ناشکرا ہے۔ اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اُس کو پہنچی ہو، ہم اُسے نعمت کا مزہ چکھائیں تو ضرور کہے گا کہ میری سب مصیبتیں مجھ سے دور ہوئیں (اور پھولا نہیں سمائے گا)، اِس لیے کہ وہ بڑا اترانے والا اور شیخی بگھارنے والا ہے[۱۳۲]۔ اِس سے وہی مستثنیٰ ہیں جو

خیر کا راستہ اختیار کرتا ہے یا شر کا۔ اُسے بتا دیا گیا ہے کہ اپنے اِس انتخاب کے لیے وہ ایک دن جواب دہ ٹھیرایا جائے گا اور اِس کی جزا یا سزا پائے گا۔

۱۳۰؎ یعنی زبان و بیان کی جادوگری ہے، اِس سے زیادہ اِس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

۱۳۱؎ یعنی اُس عذاب کو جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں لازماً آتا ہے۔

۱۳۲؎ یہ بات اگرچہ لفظ 'انسان' کے ساتھ کہی گئی ہے، لیکن مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر سے آرہا ہے۔ اُن سے منہ پھیر کر ایک کلیے کے انداز میں بتایا ہے کہ یہ معاملہ اِنھی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ انسان کی بدقسمتی ہے کہ عام طور پر وہ یہی کرتا ہے۔

مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ

صبر کرتے اور اچھے عمل کرتے ہیں۔ اُنھی کے لیے مغفرت بھی ہے اور بڑا اجر بھی۔ ۷-۱۱

سو، (اِن کے اِس رویے کی وجہ سے، اے پیغمبر)، تم اُس میں سے شاید کچھ چھوڑ نا چاہتے ہو[۱۳۳] جو تمھاری طرف وحی کیا جا رہا ہے اور اِس بات پر تنگ دل ہو رہے ہو کہ یہ لوگ کہیں گے کہ اِس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا اِس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ (حقیقت یہ ہے کہ) تم تو صرف خبردار کرنے والے ہو اور آگے ہر چیز اللہ کے حوالے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اِسے خود گھڑ لیا ہے[۱۳۴]؟ اِن سے کہو، پھر تم بھی

۱۳۳؎ یعنی وہ چیزیں پیش کرنے سے گریز کرنا چاہتے ہو جو تمھارے مخاطبین کو پسند نہیں ہیں۔ اِس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ فی الواقع ایسا کرنا چاہتے تھے۔ یہ درحقیقت پیش بندی کا جملہ اور حالات کی سنگینی، مخالفانہ ردعمل کی شدت اور طنز واستہزا کے طوفان میں پامردی اور استقامت کی تلقین ہے جو اِس اسلوب میں کی گئی ہے تاکہ اِس طرح کا کوئی خیال بھی آپ کے دل میں نہ گزرے۔ آیت میں لفظ 'لَعَلَّ' اِسی پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ خطاب میں جو تیزی محسوس ہوتی ہے، اُس کا رخ بھی، اگر غور کیجیے تو اُنھی معاندین کی طرف ہے جو اپنے رویے سے یہ صورت حال پیدا کر رہے تھے۔

۱۳۴؎ یہ استفہام اظہار تعجب کے لیے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَكُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰهِ وَاَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾

اِسی طرح کی گھڑی ہوئی دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو بلا سکتے ہو، بلا لو، اگر تم سچے ہو۔[۱۳۵] لیکن اگر وہ تمھاری مدد کو نہ پہنچیں تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوا ہے اور یہ بھی کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔[۱۳۶] پھر کیا تم مانتے ہو؟ ۱۲-۱۴

”...اوپر کے اعتراضات تو سادہ اسلوب میں نقل کر دیے ہیں، لیکن قرآن کو پیغمبر کی گھڑی ہوئی کتاب قرار دینا ایک نہایت عجیب بات تھی، بالخصوص اُن لوگوں کی زبان سے جو کلام کے حسن و قبح کے نقاد اور اُس کے ایجاز و اعجاز کے قدر دان بھی تھے اور موازنے اور مقابلے کے لیے اُن کے پاس اپنے چوٹی کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا ایک دفتر بھی موجود تھا۔ اِس وجہ سے اِس کا ذکر تعجب کے اسلوب میں فرمایا۔“ (تدبر قرآن ۴/۱۱۲)

۱۳۵؎ یعنی اپنے اِس گمان میں سچے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کتاب اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کر رہے ہیں تو اِس کا فیصلہ نہایت آسانی کے ساتھ اِس طرح ہو سکتا ہے کہ اِس شان کی دس سورتیں تم بھی بنا لاؤ۔ تمھارے گمان کے مطابق یہ کام اگر بغیر کسی علمی اور ادبی پس منظر کے تمھاری قوم کے ایک فرد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کر سکتے ہیں تو تمھیں بھی اِس میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔ سورۂ طور (۵۲) کی آیات ۳۳-۳۴ میں یہی بات 'بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖ' کے الفاظ میں فرمائی ہے۔ یہ سورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ اِس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن نے یہ مطالبہ منکرین کے سامنے پہلے بالاجمال پیش کیا، پھر اِسی اجمال کو حسب موقع مختلف الفاظ میں کھول دیا ہے۔ اِس میں کوئی ترتیب و تدریج ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۳۶؎ اِس آیت میں خطاب براہ راست ہو گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ تمھارے معبود اگر اِس موقع پر بھی تمھاری مدد کو نہ پہنچیں تو مان لو کہ یہ علم الٰہی کا فیضان ہے۔ چنانچہ تم سب مل کر بھی اِس

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَزِيۡنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فِيۡهَا وَهُمۡ فِيۡهَا لَا يُبۡخَسُوۡنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ لَيۡسَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِيۡهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ وَيَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ وَمِنۡ

(یہ اِس لیے منکر ہو رہے ہیں کہ دنیا کی زندگی نے اِنھیں دھوکے میں ڈال دیا ہے، اِنھیں بتا دو کہ) جو دنیا کی زندگی اور اُس کی زینت چاہتے ہیں، ہم اُن کے اعمال کا بدلہ اُن کو یہیں چکا دیتے ہیں اور اُس میں اُن کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے[۱۳۷]۔ دنیا میں جو کچھ اُنھوں نے بنایا، وہ سب ملیامیٹ ہوا اور اُن کا کیا دھرا اب باطل ہے۔ ۱۵-۱۶

سو کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے ایک برہان[۱۳۸] پر ہے، پھر (اُس کی تائید

شان کی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتے اور اِس کا یہ دعویٰ بھی بالکل سچا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

۱۳۷؎ یہ ایک سنت الٰہی کے حوالے سے اُن کے مغالطے پر تنبیہ فرمائی ہے کہ جو لوگ دنیا کے طالب ہوتے ہیں، اُسی کے لیے جیتے، اُسی کے لیے مرتے اور آخرت سے بالکل بے پروا ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اُن کا حساب اللہ تعالیٰ جس کو جتنا دینا چاہتا ہے، دے کر اِسی دنیا میں بے باق کر دیتا ہے اور اُن کی تمام کارگزاریوں کا پھل اُنھیں یہیں مل جاتا ہے۔ اِس سے وہ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ آخرت اگر ہوئی بھی تو اُس میں بھی وہی خدا کے محبوب ہوں گے۔ فرمایا کہ اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ آخرت میں اُن کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰۤى اِمَامًا وَّرَحۡمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ

میں) اُس کے بعد ایک گواہ بھی اُس کے پروردگار کی طرف سے آجاتا ہے[139] اور اُس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت[140] کے طور پر آئی ہوئی موجود ہے، اِس قرآن کا انکار کرسکتا ہے[141]؟ (ہرگز نہیں)۔ اِس طرح کے لوگ تو اِس پر ایمان ہی لائیں گے۔ اور (تمھارے مخاطبین کے) اِن گروہوں میں جو شخص بھی اِس کا منکر ہو گا، اُس کے

۱۳۸ اِس سے مراد وہ نور فطرت ہے جو حق و باطل اور خیر و شر کے مبادی میں امتیاز کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود انسان کے اندر ودیعت کر دیا ہے۔

۱۳۹ یعنی وحی الٰہی جو 'نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ' (روشنی پر روشنی) ہو کر آتی اور انسانی فطرت کے اندر خدا کے ودیعت کردہ مبادی کی تصدیق کر دیتی ہے۔ لفظ 'یَتْلُوْہُ' میں ضمیر مذکر آئی ہے۔ اِس کا مرجع لفظ 'بَیِّنَۃ' ہے، لیکن اُس کی تانیث چونکہ غیر حقیقی ہے، اِس لیے یہ معنی کے لحاظ سے آگئی ہے۔

۱۴۰ یعنی دنیا میں رہنما اور آخرت میں خدا کی رحمت جو ایمان والوں کو لازماً اپنے دامن میں لے لے گی۔

۱۴۱ اِس طرح کے استفہامیہ جملوں میں بعض اوقات کلام کا ایک حصہ حذف کر دیا جاتا ہے۔ ہم نے اُسے کھول دیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ قرآن کا انکار اِس طرح کے دنیا پرست ہی کر سکتے ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، اِس لیے کہ اُن کی غلط روی کی وجہ سے اُن کی فطرت کا نور بجھ چکا ہوتا ہے اور جن کی فطرت کا نور بجھ چکا ہو، وہ قرآن پر ایمان لانے والے نہیں بن سکتے۔ اِس سے، اگر غور کیجیے تو اللہ تعالیٰ نے ایک لطیف اشارہ اُن اہل کتاب کی طرف بھی کر دیا ہے جو اگرچہ ابھی پوری طرح سامنے تو نہیں آئے تھے، لیکن اندر اندر مخالفت کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٧﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ط اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ج اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ

لیے وعدے کی جگہ دوزخ ہے۔ سو، (اے پیغمبر)، تم اِس کے بارے میں کسی شک میں نہ پڑو[۱۴۲]، اِس لیے کہ یہ حق ہے تمھارے پروردگار کی طرف سے، مگر اکثر لوگ مانتے نہیں ہیں۔ (اِنھیں بتادو کہ) اُن سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑیں[۱۴۳]؟ وہ اپنے پروردگار کے حضور پیش کیے جائیں گے اور گواہی دینے والے[۱۴۴] گواہی دیں گے کہ یہی

۱۴۲ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ شامت زدہ لوگ قرآن کو جھٹلا رہے ہیں تو جھٹلائیں، اِن کے اِس رویے پر تمھیں کسی الجھن میں نہیں پڑنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے یہ بات درحقیقت اُنھی بدبختوں کو سنائی گئی ہے جو قرآن کی مخالفت کے درپے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... اِس طرح کے جملوں میں جو عتاب ہوتا ہے، اُس کا رخ... مخالفین کی طرف ہوتا ہے، لیکن وہ لائق التفات نہیں رہ جاتے، اِس وجہ سے اُن کو خطاب کرکے بات براہ راست کہنے کی بجائے پیغمبر کو خطاب کرکے کہہ دی جاتی ہے۔ زجر و ملامت کا یہ اسلوب بسا اوقات براہ راست زجر و تنبیہ سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ قرآن میں اِس کی نہایت دلآویز مثالیں موجود ہیں۔" (تدبر قرآن ۴/ ۱۱۸)

۱۴۳ یعنی اُس کے شریک ٹھیرائیں۔ قرآن میں یہ تعبیر شرک کے لیے بھی اختیار کی گئی ہے اور اپنی طرف سے تحلیل و تحریم کے لیے بھی، جو شرک ہی کی ایک صورت ہے۔ سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہاں شرک ہی مراد ہے۔

۱۴۴ یہ گواہی خدا کے پیغمبر بھی دیں گے جنھیں اتمام حجت کے لیے بھیجا گیا اور اُس کے فرشتے بھی جو لوگوں کے اعمال کا ریکارڈ رکھنے پر مامور ہیں۔

عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٨﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا
عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿١٩﴾ اُولٰۗىِٕكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ
فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ
الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿٢٠﴾
اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢١﴾
لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿٢٢﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ

ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو، اللہ کی لعنت ہے اُن ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اُس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں[145] اور وہی آخرت کے منکر ہیں۔ وہ زمین میں خدا کی گرفت سے باہر نہیں تھے اور نہ خدا کے سوا اُن کا وہاں کوئی حمایتی تھا۔ (تاہم جو ڈھیل ہم نے اُنھیں دے رکھی تھی، اُس کی بنا پر وہ یہی سمجھتے رہے)۔ اُنھیں اب دہرا عذاب[146] دیا جائے گا، اِس لیے کہ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے[147]۔ وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو کچھ گھڑتے تھے، وہ سب اُن سے کھویا گیا۔ اِس میں شک نہیں کہ آخرت میں وہی سب سے زیادہ گھاٹے میں ہوں گے۔ اِس کے برخلاف جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل

۱۴۵؎ یعنی توحید کی صراط مستقیم سے ہٹا کر لوگوں کو مشرکانہ عقائد کی بھول بھلیاں میں الجھانا چاہتے ہیں۔

۱۴۶؎ دہرا اِس لیے کہ یہ خود بھی خدا کی راہ سے رکے اور دوسروں کو بھی روکتے رہے۔

۱۴۷؎ مطلب یہ ہے کہ نہ اللہ و رسول کی بات سننے کے لیے تیار تھے اور نہ انفس و آفاق میں خدا

فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الۡفَرِيۡقَيۡنِ كَالۡاَعۡمٰى وَالۡاَصَمِّ وَالۡبَصِيۡرِ وَالسَّمِيۡعِ ؕ هَلۡ يَسۡتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾
وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖۤ ۫ اِنِّىۡ لَـكُمۡ نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۙ﴿۲۵﴾

کیے اور اپنے پروردگار کی طرف جھکے رہے، وہی جنت کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اِن دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور ایک دیکھنے والا اور سننے والا[۱۴۸]۔ کیا دونوں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے؟ پھر کیا سوچتے نہیں ہو؟ ۱۷-۲۴

اِسی طرح نوح کو ہم نے اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا۔ (اُس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا): میں تمھارے لیے ایک کھلا ہوا خبردار کرنے والا ہوں[۱۴۹] کہ تم

کی نشانیاں دیکھ کر اُن سے کوئی سبق حاصل کرتے تھے۔

۱۴۸؎ یہ اُنھی منکرین کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر اوپر 'مَا كَانُوۡا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ السَّمۡعَ وَمَا كَانُوۡا يُبۡصِرُوۡنَ' کے الفاظ میں ہوا ہے۔

۱۴۹؎ اصل میں 'نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی پوری قطعیت کے ساتھ اور صاف صاف خبردار کرنے والا۔ اِس میں ایک لطیف تلمیح بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...عرب میں دستور رہا ہے کہ ہر قوم کے لوگ کسی بلند ٹیلے یا پہاڑی پر دیدبان بناتے، جہاں ہر وقت ایک نگران مقرر رہتا جس کا کام یہ ہوتا کہ جب وہ دیکھتا کہ کسی طرف سے حملہ آوروں کی کوئی جماعت اُس کی قوم پر حملہ کیا چاہتی ہے تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر ننگا ہو جاتا اور 'واصباحا' کا نعرہ لگاتا۔ یہ پوری قوم کے لیے الارم ہوتا اور سب تلواریں سونت سونت کر مدافعت کے لیے باہر نکل آتے۔ اِس کو 'نذیر عریاں' کہتے تھے۔ خدا کے رسول بھی اپنی قوم کو آنے والے عذاب سے آگاہ کرنے کے لیے آئے اور اُنھوں نے بالکل اِس طرح لوگوں کو اُس سے آگاہ کیا

اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ مَا نَرٰىکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثۡلَنَا وَ مَا نَرٰىکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیۡنَ ہُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاۡیِ ۚ وَ مَا نَرٰی لَکُمۡ عَلَیۡنَا مِنۡ فَضۡلٍۭ بَلۡ نَظُنُّکُمۡ کٰذِبِیۡنَ ﴿۲۷﴾

قَالَ یٰقَوۡمِ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کُنۡتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَ اٰتٰىنِیۡ رَحۡمَۃً مِّنۡ عِنۡدِہٖ فَعُمِّیَتۡ عَلَیۡکُمۡ ؕ اَنُلۡزِمُکُمُوۡہَا وَ اَنۡتُمۡ لَہَا

ھود
۱۱

اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔[150] (ایسا کرو گے تو) میں تم پر ایک دردناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اِس پر اُس کی قوم کے سرداروں نے، جو منکر تھے، جواب دیا: ہم تو تمھیں اپنے جیسا ایک آدمی ہی دیکھتے ہیں اور ہمارے اندر جو اراذل ہیں، اُنھی کو دیکھتے ہیں کہ بے سمجھے بوجھے تمھارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ ہم نہیں دیکھتے کہ ہمارے اوپر تمھیں کوئی بڑائی حاصل ہے، بلکہ ہم تو تمھیں بالکل جھوٹا سمجھ رہے ہیں[151]۔ ۲۵-۲۷

نوح نے جواب دیا: میری قوم کے لوگو، ذرا سوچو، اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل[152] پر ہوں، پھر اُس نے مجھے خاص اپنی جناب سے رحمت بھی عطا فرمائی[153] اور

گویا وہ عقب سے نمودار ہی ہونے والا ہے۔ اِس وجہ سے قرآن میں اُن کے لیے 'نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۳۶)

۱۵۰؎ اِس سورہ کی آیت ۲ کو دیکھیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی دعوت کی ابتدا اِسی بات سے کی تھی۔

۱۵۱؎ یہ تین معارضات ہیں جو نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے اُن کی دعوت کے جواب میں پیش کیے۔ آگے اِنھی کا جواب ہے۔

كُرِهُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿٢٩﴾ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٣٠﴾ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ

وہ تمھیں نظر نہیں آئی تو کیا ہم (زبردستی) اُس کو تم پر چپکا دیں، جب کہ تم اُس سے بے زار ہو؟[154] میری قوم کے لوگو، میں اِس خدمت پر تم سے کوئی مال نہیں مانگ رہا ہوں (کہ تمھاری ہر بات ماننے کے لیے مجبور ہو جاؤں)۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے اور (تمھاری خوشنودی کے لیے) میں اُن لوگوں کو ہرگز نکال دینے والا نہیں ہوں جو ایمان لے آئے ہیں۔ وہ (اپنے اِسی ایمان کے ساتھ) اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں۔ (اُن کی قدر و قیمت کا فیصلہ وہی کرے گا)، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت میں مبتلا ہو۔ میری قوم کے لوگو، اگر میں اُن کو نکال دوں تو خدا سے بچانے کے لیے کون میری مدد کرے گا؟ پھر کیا سوچتے نہیں ہو؟ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس

۱۵۲ اصل میں لفظ 'بَيِّنَة' آیا ہے۔ اِس سے مراد وہی نور فطرت ہے جس کا ذکر اِس سے پہلے آیت ۱۷ میں ہو چکا ہے۔

۱۵۳ یعنی اپنی وحی میری طرف نازل کر دی۔

۱۵۴ مطلب یہ ہے کہ تمھارے کرتوتوں کی وجہ سے فطرت کا چراغ بھی تمھارے اندر گل ہو چکا اور اِس کے نتیجے میں وحی کے ذریعے سے آنے والی ہدایت بھی تاریکیوں میں کھو گئی، پھر اپنے فساد طبیعت کے باعث تم اِس طرح کی چیزوں سے بے زار بھی ہو تو میں تمھارے اوپر ایک ایسی چیز کس طرح چپکا سکتا ہوں، جس کے چپکنے کے لیے تمھارے اندر سرے سے کوئی مادۂ قبولیت ہی

الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ

خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، نہ یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں[۱۵۵] اور نہ اُن لوگوں کے بارے میں جنھیں تمھاری آنکھیں حقیر دیکھتی ہیں، (تمھاری طرح) یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ اللہ اُنھیں کوئی بھلائی دے ہی نہیں سکتا۔[۱۵۶] اُن کے دلوں میں جو کچھ ہے، اُسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ میں اگر ایسا کروں تو پھر میں ظالم ہوں گا۔ (اِس پر) اُن لوگوں نے کہا: اے نوح، تم نے ہم سے بحث کی ہے اور بہت کرلی ہے، اب اگر تم سچے ہو تو وہ چیز ہم پر لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی سنا رہے ہو۔ نوح نے جواب دیا: وہ تو اللہ ہی تم پر لائے گا، اگر چاہے گا اور اُس وقت تم اُس کی گرفت سے نکل نہیں سکو گے۔ میں اگر تمھاری کچھ خیر خواہی کرنا بھی چاہوں تو

باقی نہیں رہ گیا ہے؟

۱۵۵؎ یہ اُس بات کا جواب ہے جو مخاطبین نے کہی تھی کہ تم تو ہمیں اپنے جیسے ایک انسان ہی لگتے ہو، پھر تمھیں پیغمبر کس طرح مانیں؟

۱۵۶؎ وہ یہ بات اِس بنیاد پر کہتے تھے کہ جب خدا نے دنیا کی رفاہیت کے لیے اِن کا نہیں، بلکہ ہمارا انتخاب کیا ہے تو آخرت کی نعمتوں کے لیے یہ کس طرح منتخب کیے جاسکتے ہیں؟

وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ۝٣٤

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ اِنِ افۡتَرَيۡتُهٗ فَعَلَىَّ اِجۡرَامِىۡ وَاَنَا
بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تُجۡرِمُوۡنَ ۝٣٥

وَاُوۡحِىَ اِلٰى نُوۡحٍ اَنَّهٗ لَنۡ يُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِكَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ
فَلَا تَبۡتَـئِسۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ۝٣٦ ۚۖ وَاصۡنَعِ الۡـفُلۡكَ بِاَعۡيُنِنَا وَوَحۡيِنَا
وَلَا تُخَاطِبۡنِىۡ فِى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ ۝٣٧ وَيَصۡنَعُ الۡـفُلۡكَ ۚ قف

البیان

هود
١١

میری خیر خواہی تمھیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی، اگر (تمھارے اِس رویے کے نتیجے میں) اللہ نے تم کو بھٹکا دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہی تمھارا پروردگار ہے اور تمھیں اُسی کی طرف پلٹنا ہے۔ ۲۸-۳۴

کیا یہ کہتے ہیں کہ (ہم پر چسپاں کرنے کے لیے) اِس شخص نے یہ قصہ خود گھڑ لیا ہے؟ اِن سے کہو، (اے پیغمبر)، اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے تو میرے جرم کا وبال میرے ہی اوپر ہے، لیکن (جانتے بوجھتے حقائق کو جھٹلا دینے کا) جو جرم تم کر رہے ہو، اُس کی ذمہ داری تمھی پر ہے، میں اُس سے بری ہوں[۱۵۷]۔ ۳۵

(پھر) نوح کو وحی کی گئی کہ تمھاری قوم کے لوگوں میں سے جو ایمان لا چکے، اب اُن کے سوا کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ سو اِن کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑو اور ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق کشتی بناؤ۔ اِن ظالموں کے حق میں مجھ سے

---

۱۵۷ سورہ کی تلاوت کے دوران میں یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے جس میں سلسلۂ کلام کو روک کر مخاطبین کے ردِ عمل پر برسرِ موقع تبصرہ کیا گیا ہے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۟ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ

کوئی بات نہ کرنا، یہ اب غرق ہو کر رہیں گے۔ نوح (اِس ہدایت کے مطابق) کشتی بنانے لگا اور اُس کی قوم کے سردار جب اُس کے پاس سے گزرتے تو اُس کی ہنسی اڑاتے[۱۵۸]۔ وہ اُنھیں جواب دیتا کہ اگر ہمارے اوپر ہنستے ہو تو جس طرح تم ہنستے ہو، اُسی طرح (ایک دن) ہم بھی تم پر ہنسیں گے[۱۵۹]۔ پھر عنقریب جان لو گے کہ وہ کون ہیں جن پر وہ عذاب آتا ہے جو اُنھیں رسوا کر کے رکھ دیتا ہے اور وہ قہر نازل ہوتا ہے جو اُن پر (نازل ہو کر) ٹھیر جاتا ہے[۱۶۰]۔ وہ یہی کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور طوفان ابل پڑا[۱۶۱] تو ہم

۱۵۸؎ اِس لیے کہ عذاب کی دھمکی کو وہ سرے سے لاف زنی سمجھتے تھے۔ چنانچہ کشتی بننے لگی تو اُنھوں نے یہی خیال کیا ہو گا کہ یہ نوح اور اُس کے ساتھیوں کے خلل دماغ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

۱۵۹؎ یہ الفاظ مجانست کے اسلوب پر آئے ہیں اور اُس سرور و ابتہاج اور ازدیاد ایمان و اطمینان کی سرشاری کو بیان کرتے ہیں جو خدا کی نصرت کے ظہور پر اہل ایمان کو حاصل ہو گی۔ اِن کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بھی اُسی ابتذال پر اتر آئیں گے، جس پر تم اترے ہوئے ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...کسی کی مصیبت پر خوش ہونا عام حالات میں تو اچھی بات نہیں ہے، لیکن جن لوگوں پر اُس طرح حجت تمام ہو چکی ہو، جس طرح حضرت نوح اور اُن کے ساتھیوں نے اپنی قوم پر تمام کی، اُن پر عذاب الٰہی کا نزول حق کی فتح مندی اور باطل کی ہزیمت کا ایک یادگار واقعہ ہوتا ہے جس پر

اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ

نے کہا: ہر قسم کے (جانوروں کے) جوڑے اِس میں رکھ لو،[۱۶۲] (نر و مادہ) دو دو اور اپنے گھر والوں کو بھی اِس کشتی میں سوار کرا لو، سوائے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے،[۱۶۳] اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں ـــــ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔[۱۶۴] نوح نے کہا: اِس میں سوار ہو جاؤ، اِس کا چلنا اور

اہل ایمان کا خوش ہونا عین مقتضائے ایمان ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۴۱)

۱۶۰؎ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد جو عذاب آتا ہے، اُس کی نوعیت یہی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے تو اُسی وقت جاتا ہے، جب پوری قوم ایک داستان عبرت بن کر تاریخ کے عجائب خانوں کی نذر ہو جاتی ہے۔

۱۶۱؎ اصل میں 'فَارَ التَّنُّوْرُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ استعارے کے طور پر اُس طوفان کی تعبیر ہے جس میں تند سائیکلونی ہواؤں کے ساتھ بارش ہوئی اور پاس کے سمندر اور دریا بھی ابل پڑے۔

۱۶۲؎ آیت میں 'مِنْ كُلٍّ' کے الفاظ معہود ذہنی کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی اُن جانوروں کا ایک ایک جوڑا جو اُس وقت لوگوں کے تصرف میں تھے اور طوفان کے بعد کی زندگی کے لیے ضروری تھے۔

۱۶۳؎ یعنی جن کے بارے میں پہلے دن سے طے ہو چکا ہے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے دنیا میں بھی عذاب سے دوچار ہوں گے اور آگے بھی جہنم کا ایندھن بن جائیں گے۔

۱۶۴؎ یہ حسرت و افسوس کا جملہ ہے کہ لوگوں کی بڑی اکثریت نوح علیہ السلام کی طرف سے کئی سو سال تک دعوت و انذار کے باوجود حق سے گریزاں رہی اور بالآخر طوفان کی نذر ہو گئی۔ اِس میں

رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٤١﴾
وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۟ وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٢﴾ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ

ٹھیرنا اللہ ہی کے نام سے ہے۔[۱۶۵] میرا پروردگار، البتہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۱۶۶] ۳۶-۴۱

وہ کشتی پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہوئی موجوں کے درمیان اُن کو لے کر چلنے لگی اور نوح نے اپنے بیٹے[۱۶۷] کو آواز دی، جو (کچھ فاصلے پر اُس سے) الگ تھا۔ بیٹا، ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور اِن منکروں کے ساتھ نہ رہو۔[۱۶۸] اُس نے پلٹ کر جواب دیا: میں

بالواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے تسلی کا پیغام بھی ہے کہ قریش کی مغرور اکثریت بھی اِنھی کے انجام کو پہنچتی ہے تو اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اِس سے پہلے بہت سی قومیں اِسی انجام کو پہنچ چکی ہیں۔

۱۶۵؎ یہ تفویض کا کلمہ ہے جس سے بندۂ مومن اسباب سے ماورا اپنے آپ کو مسبب الاسباب کے سپرد کر دیتا ہے۔

۱۶۶؎ اللہ تعالیٰ کی صفات کا یہ حوالہ انتہائی عجز کو ظاہر کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اِس قابل تو نہیں تھے کہ ہم پر یہ عنایت کی جاتی، لیکن وہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور نہایت مہربان ہے کہ نزول عذاب کی اِس گھڑی میں اُس نے ہمیں ہر تکلیف سے بچا لیا ہے۔

۱۶۷؎ تورات میں نوح علیہ السلام کے اِس بیٹے کا نام کنعان آیا ہے۔

۱۶۸؎ اِس جملے میں جذبۂ دعوت اور شفقت پدری، دونوں کی روح جس طرح سموئی ہوئی ہے، اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ

ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے اِس پانی سے بچالے گا[169]۔ نوح نے کہا: آج اللہ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں ہے، مگر جس پر وہ رحم فرمائے۔ اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہوئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا[170]۔ حکم ہوا: اے زمین، اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان، تھم جا[171]۔ چنانچہ پانی اتار دیا گیا، فیصلہ چکا دیا گیا، کشتی جودی[172] پر ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ اِس ظالم قوم پر خدا کی پھٹکار ہے۔ نوح نے

۱۶۹۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی انسان کو کہاں تک لے جا سکتی ہے۔

۱۷۰۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ منظر نوح علیہ السلام کو نہ دکھایا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہی چاہا کہ وہ یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...یہ حضرت نوح کی وفاداری کا آخری امتحان تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات انبیا کیسے کیسے امتحانوں سے گزارے جاتے ہیں، لیکن اللہ کی توفیق سے وہ ہر امتحان میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ نیز اِس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا کا قانون جب اتنا بے لاگ ہے کہ نوح کا بیٹا بھی نافرمان ہو تو وہ اُس کی گردن بھی عین باپ کے سامنے دبا دیتا ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۴۴)

۱۷۱۔ یعنی اُدھر وہ ڈوبا اور اِدھر یہ حکم صادر ہو گیا۔ استاذ امام کے الفاظ میں یہ اِس ہول ناک ٹریجڈی کا آخری منظر تھا۔ اِس کے سامنے آجانے کے بعد فوراً آسمان و زمین، سب کو احکام صادر ہو گئے کہ بس اب کام پورا ہو چکا!

وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْۤ اَعِظُكَ

اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ پروردگار، میرا بیٹا تو میرے گھر والوں میں سے ہے[۱۷۳] اور اِس میں شبہ نہیں کہ تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے[۱۷۴]۔ فرمایا: اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے[۱۷۵]، وہ نہایت نابکار ہے۔ سو

۱۷۲۔ یہ کوہستان اراراط کی ایک چوٹی کا نام ہے۔ آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر یہ سلسلۂ کوہستان جنوب میں کردستان تک چلتا ہے۔ بائیبل میں اِسی بنا پر صرف اراراط کا نام آیا ہے۔ قرآن نے خاص اُس چوٹی کا ذکر، جہاں کشتی جا کر رکی تھی، اِس لیے کیا ہے کہ اِس سے طوفان کی ہول ناکی کا کچھ اندازہ کیا جا سکے کہ اُس میں پانی کہاں تک پہنچ گیا تھا۔

۱۷۳۔ اوپر بیان ہوا ہے کہ نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے اہل و عیال کو بھی کشتی میں سوار کرا لو۔ یہ بات اُنھوں نے اِسی بنا پر کہی ہے، اِس لیے کہ اُس وقت تک تعین کے ساتھ اُن کے علم میں نہیں تھا کہ اُن کا یہ بیٹا بھی خدا کے فیصلے کی زد میں آ چکا ہے۔

۱۷۴۔ یہ دعا اُس وقت کی ہے، جب نوح علیہ السلام نے بیٹے کو ڈوبتے دیکھا، لیکن اِس کا ذکر یہاں ہوا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...خدا کی نگاہوں میں یہ شخص حضرت نوح کا بیٹا ہونے کے باوجود ایسا نابکار تھا کہ جب تک خدا نے اُس کو غرق نہیں کر لیا، اُس کے باب میں حضرت نوح کی دعا کو زیر بحث لانا بھی پسند نہیں فرمایا۔ اِس غضب کی وجہ، ظاہر ہے کہ اِس دنیا میں اگر کسی انسان کو سب سے بڑی سعادت اور خوش بختی حاصل ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو کسی پیغمبر کے گھر میں جنم دے، لیکن یہی خوش بختی سب سے بڑی بد بختی بھی ہو سکتی ہے، اگر وہ اِس کی قدر نہ کرے اور ولی کے گھر میں شیطان بن کر اٹھے۔ چنانچہ کلام کی ترتیب ہی سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ اِس

اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۴۷﴾ قِيۡلَ يٰـنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ‌ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۴۸﴾

مجھ سے اُس چیز کے بارے میں سوال نہ کرو جس کا تجھے کچھ علم نہیں ہے۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ نوح نے فوراً عرض کیا: پروردگار، میں تیری پناہ میں آتا ہوں کہ تجھ سے کوئی ایسی چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ اب اگر تو مجھے معاف نہ کرے گا اور مجھ پر رحم نہ فرمائے گا تو میں نامراد ہو جاؤں گا۔ ارشاد ہوا: اے نوح، اتر جاؤ، ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور برکتوں کے ساتھ، تم پر بھی اور اُن امتوں پر بھی جو اُن سے ظہور میں آئیں گی جو تمھارے ساتھ ہیں[۱۷۶]۔ اور (اِن کے بعد) کچھ ایسی امتیں بھی ہیں جنھیں ہم آگے بہرہ مند کریں گے، پھر (اُن کے جرائم کی پاداش میں) اُن کو بھی ہماری طرف سے ایک دردناک عذاب پکڑ لے گا[۱۷۷]۔ ۴۶-۴۸

شخص کو خدا نے سب سے زیادہ مبغوض قرار دیا۔ گویا سارے طوفان کا اصلی ہدف تھا ہی یہی کہ جب یہ ڈوب گیا تو معاً طوفان کے خاتمے کا اعلان ہو گیا۔'' (تدبر قرآن ۴/۱۴۵)

۱۷۵؎ اِس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ 'اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ' (وہ نہایت نابکار ہے)۔ اِس سے واضح ہو گیا کہ پیغمبر کا گھرانا محض نسب سے نہیں بنتا، بلکہ ایمان اور عمل صالح سے بنتا ہے۔

۱۷۶؎ اِس برکت اور سلامتی کا ظہور اِس طرح ہوا کہ بعد میں اِنھی چند نفوس کی اولاد تمام روے زمین پر چھا گئی۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ

یہ غیب کی خبریں ہیں جو، (اے پیغمبر)، ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اِس سے پہلے نہ تم اِن کو جانتے تھے، نہ تمھاری قوم کے لوگ اِن سے واقف تھے۔ اِس لیے ثابت قدم رہو، انجام کار کی کامیابی اُنھی کے لیے ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں[۱۷۸]۔ ۴۹

اِسی طرح عاد کی طرف ہم نے اُن کے بھائی ہود کو بھیجا[۱۷۹]۔ اُس نے اُنھیں دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ اُس کے مقابل میں) تم محض جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ میری قوم کے

۱۷۷ یعنی جو دینونت اِس وقت برپا ہوئی ہے، وہ بعد میں بھی وقتاً فوقتاً برپا ہوتی رہے گی اور جن لوگوں کو نجات ہوئی ہے، اُن کی اولاد میں سے جو ظالم ہوں گے، پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد وہ بھی اِسی طرح کیفر کردار کو پہنچتے رہیں گے۔

۱۷۸ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ رسولوں سے متعلق سنت الٰہی یہی ہے کہ وہ اور اُن کے ساتھی کامیاب ہوتے اور اُن کے مخالفین لازماً نامراد ہو جاتے ہیں۔

۱۷۹ عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے۔ یہ سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن کا مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عرب کے لٹریچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنی قوت و شوکت کے لیے بھی۔ حضرت ہود اِنھی کے ایک فرد تھے جنھیں رسول کی حیثیت سے اِن کی طرف مبعوث کیا گیا۔ قرآن

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَیٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا وَّیَزِدْکُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِکُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِکِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِکَ وَمَا نَحْنُ لَکَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۳﴾

لوگو، (میں یہ بات تمھاری خیر خواہی کے لیے کہتا ہوں)، میں اِس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اُسی کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ پھر کیا سمجھتے نہیں ہو؟ میری قوم کے لوگو، اپنے رب سے معافی مانگو، پھر اُس کی طرف پلٹو[180]، وہ تم پر چھاجوں مینہ برسائے گا اور تمھاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا[181]۔ تم مجرم ہو کر روگردانی نہ کرو۔ اُنھوں نے جواب دیا: اے ہود، تم ہمارے پاس کوئی کھلی نشانی[182] لے کر تو آئے

نے امتنان و احسان کے لیے فرمایا ہے کہ عاد کی طرف ہم نے کسی اجنبی شخص کو نہیں، بلکہ اُنھی کے بھائی ہود کو بھیجا تا کہ اُن پر ہماری حجت ہر لحاظ سے پوری ہو جائے۔

۱۸۰؎ توبہ کے دو ارکان ہیں: ایک یہ کہ آدمی غلطی سے دست بردار ہو جائے اور دوسرا یہ کہ صحیح بات کی طرف پلٹ آئے۔ پہلے رکن کے لیے قرآن میں استغفار اور دوسرے کے لیے توبہ کا لفظ آتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِن میں سے پہلے کی بنیاد خشیت پر ہے اور دوسرے کی محبت پر۔ پھر شعور اور احساس اِن کا لازمی جزو ہے۔ جب تک یہ تمام عناصر جمع نہ ہوں، مجرد 'توبہ توبہ' یا 'استغفر اللّٰہ' کے ورد سے وہ توبہ وجود میں نہیں آتی جو خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ پائے۔“ (تدبر قرآن ۱۴۸/۴)

۱۸۱؎ یہ رسولوں کی دعوت پر اجتماعی توبہ کی برکتیں ہیں جو قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی بیان ہوئی ہیں، یعنی رزق و فضل اور سیاسی قوت میں اضافہ جس کے لیے اللہ تعالیٰ آسمان کے دروازے کھول دیتے اور توبہ کرنے والوں کے لیے زمین پر اقتدار اور تمکن کے راستے ہموار کر

اِنۡ نَّقُوۡلُ اِلَّا اعۡتَرٰىكَ بَعۡضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوۡٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّىۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ وَاشۡهَدُوۡۤا اَنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ۝۵۴ مِنۡ دُوۡنِهٖ فَكِيۡدُوۡنِىۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ۝۵۵ اِنِّىۡ تَوَكَّلۡتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّىۡ وَرَبِّكُمۡ ؕ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّىۡ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝۵۶ فَاِنۡ

نہیں ہوا اور اِدھر ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ محض تمھارے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور نہ تمھاری بات ماننے والے ہیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تمھارے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑی ہے۔ ہود نے کہا: میں خدا کو گواہ ٹھیراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جنھیں تم خدا کے ساتھ شریک بناتے ہو، میں اُن سے بالکل بری ہوں[۱۸۳]۔ سو تم سب مل کر، (جس طرح چاہو)، میرے خلاف چالیں چلو، پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میں نے اللہ پر بھروسا کرلیا ہے، اپنے اور تمھارے پروردگار پر۔ ہر جان دار کی چوٹی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ میرا پروردگار یقیناً سیدھی راہ پر ہے[۱۸۴]۔

دیتے ہیں۔

۱۸۲؎ یعنی کوئی ایسا حسی معجزہ جو فیصلہ کن ہو جائے۔

۱۸۳؎ اُن لوگوں کی بات چونکہ انتہائی بے ہودہ تھی، اِس لیے ہود علیہ السلام کی غیرت توحید بھڑک اٹھی ہے اور اُنھوں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ شرک سے براءت کا اعلان کر دیا ہے۔ پھر آگے دیکھیے تو اِسی بنا پر اُنھیں چیلنج بھی کر دیا ہے کہ تم اور تمھارے معبود میرے خلاف جو کر سکتے ہو، کر کے دیکھ لو۔ تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ خدا پر سچا ایمان کیا ہوتا ہے اور میں کس کے بھروسے پر توحید کی یہ دعوت لے کر اٹھا ہوں۔

۱۸۴؎ یعنی اُس کی معرفت کے لیے کج پیچ کے راستوں سے گزرنے اور اُس کی بارگاہ تک

تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

اِس پر بھی اعراض کر رہے ہو تو میں نے وہ پیغام تمھیں پہنچا دیا ہے جو مجھے دے کر تمھاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اب میرا رب تمھاری جگہ کسی دوسری قوم کو اقتدار کا مالک بنائے گا اور تم اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔[۱۸۵] یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ (پھر ہوا یہ کہ) جب ہمارا فیصلہ صادر ہو گیا تو ہم نے ہود کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے نجات دی اور اِس طرح ایک نہایت سخت عذاب سے اُنھیں بچا لیا۔[۱۸۶] ۵۰-۵۸

رسائی کے لیے واسطے اور وسیلے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عقل و فطرت اُسے براہ راست پہچانتی ہے اور آدمی دل کی سچائی کے ساتھ اُس کی طرف متوجہ ہو جائے تو وہ بالکل سیدھی راہ پر اُس کے سامنے موجود ہوتا ہے۔

۱۸۵؎ مطلب یہ ہے کہ اب عذاب استیصال آئے گا، تمھاری جڑ کاٹ دی جائے گی اور کوئی دوسری قوم تمھاری جگہ لینے کے لیے اٹھے گی۔ اپنی تمام قوت و شوکت کے باوجود تم خدا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔

۱۸۶؎ یہ عذاب کس طرح نازل ہوا؟ قرآن میں اِس کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرما کے بادل رعد و برق کے ساتھ نمودار ہوئے اور بادِ صرصر آندھی اور طوفان بن کر پوری بستی پر ٹوٹ پڑی، یہاں تک کہ ہر چیز فنا ہو گئی۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ

یہ تھے عاد، اِنھوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا، اُس کے رسولوں کی بات نہیں مانی[۱۸۷] اور ہر جبار اور سرکش دشمن حق کے معاملے کی پیروی کرتے رہے۔ آخر کار اِس دنیا میں بھی اِن کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ سن لو، عاد نے اپنے پروردگار سے کفر کیا، سن لو کہ عاد دھتکار دیے گئے، ہود کی قوم کے لوگ! ۵۹-۶۰

اِسی طرح ثمود[۱۸۸] کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالح کو رسول بنا کر بھیجا۔ اُس نے اُنھیں دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ اُسی نے تمھیں زمین سے اٹھا کھڑا کیا اور اُس کی آبادی میں لگا دیا ہے۔

۱۸۷؎ اُن کی طرف اگرچہ ایک ہی رسول کی بعثت ہوئی تھی، مگر کوئی رسول بھی یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کرتا، اُس کے ساتھ وہ یہی کرتے، اِس لیے ایک رسول کی نافرمانی کو تمام رسولوں کی نافرمانی قرار دیا ہے۔

۱۸۸؎ یہ عاد کے بقایا میں سے ہیں۔ اِسی بنا پر اِنھیں عاد ثانی کہا جاتا ہے۔ عرب کی قدیم اقوام میں سے یہ دوسری قوم ہے جس نے عاد کے بعد غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اِن کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ ہے جسے الحجر کہا جاتا ہے۔ اِن کے اور عاد کے اوصاف قرآن میں بھی اور عرب کی روایات میں بھی تقریباً ایک ہی جیسے بیان ہوئے ہیں۔

ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

اِس لیے اُس سے معافی چاہو، پھر اُس کی طرف رجوع کرو۔ میرا پروردگار قریب بھی ہے اور (اپنے بندوں کی) دعائیں قبول کرنے والا بھی۔ اُنھوں نے جواب دیا: اے صالح، اِس سے پہلے تو ہمارے اندر تم سے بڑی امیدیں کی جاتی تھیں۔ (لیکن تم اچھے نکلے)! کیا اب ہمیں اُن معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتے ہو[189] جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں؟ ہم تو اُس چیز کے باعث جس کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو[190]، بڑے سخت شبہے میں ہیں جس نے خلجان میں ڈال دیا ہے۔ اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، ذرا غور کرو، اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور اُس نے مجھے اپنی طرف سے (خاص اپنی) رحمت سے بھی نواز دیا ہے[191] تو مجھے خدا کی پکڑ سے کون بچائے گا، اگر میں اُس کی نافرمانی کروں۔ سو (جو کچھ تم چاہتے ہو[192]، اُس سے تو) تم

۱۸۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ'۔ اِن میں 'عَنْ' محذوف ہو گیا ہے، یعنی 'اَتَنْهٰىنَا عَنْ اَنْ نَّعْبُدَ'۔

۱۹۰؎ یعنی تمام معبودوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی پرستش جس سے ہر پیغمبر نے اپنی دعوت کی ابتدا کی ہے۔

۱۹۱؎ یہی الفاظ پیچھے نوح علیہ السلام کی سرگذشت میں بھی آئے ہیں۔ وہاں ہم نے اِن کی

وَ يٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿٦٤﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ

میری بربادی ہی میں اضافہ کرو گے۔۶۱-۶۳

میری قوم کے لوگو، یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمھارے لیے نشانی کے طور پر، لہٰذا اِس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے اور کسی برے ارادے سے اِس کو ہاتھ نہ لگانا، ورنہ کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم پر عذاب آ جائے گا۔[۱۹۳] پھر ہوا یہ کہ اُنھوں نے اُس کی کوچیں کاٹ دیں۔[۱۹۴] اِس پر صالح نے خبردار کر دیا کہ اب تین دن اپنی اِس بستی میں اور رہ بس لو۔ یہ دھمکی جھوٹی ہونے والی نہیں ہے۔[۱۹۵] چنانچہ جب ہمارا حکم صادر ہو گیا[۱۹۶] تو ہم

وضاحت کر دی ہے۔

۱۹۲؎ اشارہ ہے اُن توقعات کی طرف جو اُن کی قوم کے لوگ اُن سے رکھتے تھے کہ اُن سے باپ دادا کا نام روشن ہو گا اور اُن کے آبائی دین اور قومی روایات کی عزت بڑھے گی۔

۱۹۳؎ مطلب یہ ہے کہ خدا کے حکم پر میں نے اپنی اونٹنیوں میں سے ایک اونٹنی نامزد کر دی ہے۔ یہ خدا کی نذر ہے، چنانچہ اِس لحاظ سے اللہ کی اونٹنی ہے۔ تمھارے لیے یہ خدا کے عذاب کی نشانی ہے۔ اِس کو گزند پہنچاؤ گے تو سمجھ لو کہ امان کی دیوار گر گئی۔ اِس کے بعد قہر الٰہی کے سیلاب کو کوئی چیز تمھاری بستیوں میں داخل ہونے سے روک نہیں سکے گی۔

۱۹۴؎ اونٹنی کو مارنے کا جرم اگرچہ اُن کے ایک سرکش سردار نے کیا تھا، مگر قرآن نے اُسے پوری قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ باقی متمردین بھی اُس پر راضی تھے۔

۱۹۵؎ یہ اونٹنی قوم کی سرکشی کو جانچنے کا ایک پیمانہ تھی۔ اِس کو مارنے سے واضح ہو گیا کہ یہ لوگ

خِزْيِ يَوْمِىٕذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَالْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٦٧﴾ ۙ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿٦٨﴾

وَلَقَدْ جَاۗءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ

نے خاص اپنی رحمت سے صالح کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، (اُس عذاب سے) نجات دی اور اُس دن کی رسوائی سے بچا لیا۔[197] اِس میں شبہ نہیں کہ تیرا پروردگار ہی قوی اور زبردست ہے۔[198] اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، اُن کو بڑے زور کی کڑک نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اِس طرح اوندھے پڑے رہ گئے کہ گویا وہاں کبھی بسے ہی نہیں تھے۔ سن لو، ثمود نے اپنے پروردگار سے کفر کیا! سن لو کہ ثمود دھتکار دیے گئے! ۶۴-۶۸

(اور لوط کے معاملے میں یہ ہوا کہ پہلے) ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوش خبری

اب مزید مہلت کے مستحق نہیں رہے۔ چنانچہ صالح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے ایما سے اُنھیں یہ نوٹس دے دیا۔

۱۹۶۔ یعنی عذاب کا حکم صادر ہو گیا۔ اِس کے لیے اصل میں لفظ 'اَمْر' آیا ہے۔ اِس میں بلاغت یہ ہے کہ جیسے ہی حکم صادر ہوا، اُس کے ساتھ ہی عذاب آ گیا۔ گویا عذاب اُسی ایک لفظ کے اندر چھپا ہوا تھا۔

۱۹۷۔ اِس جملے میں ایک جگہ فعل اور ایک جگہ اُس کا متعلق عربیت کے اسلوب پر محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔

۱۹۸۔ اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے تسلی ہے کہ مطمئن رہو، اُس

سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ؕ ﴿٧٠﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿٧١﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا

لے کر پہنچے تھے۔ اُنھوں نے کہا: سلامتی ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا: تم پر بھی سلامتی ہو۔ پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیم بھنا ہوا بچھڑا (اُن کی ضیافت کے لیے) لے آیا۔[199] لیکن جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ اُس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اُن سے اجنبیت محسوس کی اور دل میں اُن سے کچھ ڈرنے لگا۔[200] اُنھوں نے کہا: ڈرو نہیں، ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ابراہیم کی بیوی پاس ہی کھڑی تھی، سو (خوشی سے) ہنس پڑی۔[201] پھر ہم نے اُس کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی بشارت دی۔[202] وہ بولی: ہاے شامت!

کی یہی قوت و عزت قریش کے معاملے میں بھی ظاہر ہوگی اور بالآخر وہی غالب رہے گا۔

۱۹۹ اِس سے سیدنا ابراہیم کی فیاضی اور مہمان نوازی کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے مہمانوں کے لیے فوراً گلے کا ایک بچھڑا ذبح کرادیا۔ اُن کے سامنے، ظاہر ہے کہ اُس کا کچھ گوشت پیش کیا گیا ہوگا، مگر قرآن نے ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کے اِس پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے گوشت کے بجاے بچھڑے کا ذکر کیا ہے۔

۲۰۰ ڈرنے کی وجہ غالباً یہ اندیشہ تھا کہ کھانا نہیں کھا رہے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ فرشتے ہوں اور اگر فرشتے ہیں اور انسانی صورت میں آئے ہیں تو کہیں میری یا میرے گھر والوں کی کسی غلطی پر تنبیہ کے لیے تو نہیں آئے۔

۲۰۱ انسان اگر خوف کی حالت میں ہو اور خوف کا سبب اچانک دور ہو جائے تو اِس طرح کی ہنسی بعض اوقات بے اختیار آجاتی ہے۔

بَعۡلِیۡ شَیۡخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ عَجِیۡبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَکٰتُهٗ عَلَیۡکُمۡ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ ﴿۷۳﴾ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنۡ اِبۡرٰهِیۡمَ الرَّوۡعُ وَ جَآءَتۡهُ الۡبُشۡرٰی یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبۡرٰهِیۡمَ لَحَلِیۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیۡبٌ ﴿۷۵﴾ یٰۤاِبۡرٰهِیۡمُ

کیا میں بچہ جنوں گی، جب کہ میں خود بھی بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہو چکے ہیں؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔[۲۰۳] فرشتوں نے کہا: خدا کی بات پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم کے گھر والو، تم پر تو اللہ کی رحمت اور اُس کی برکتیں ہیں۔[۲۰۴] یقیناً اللہ ستودہ صفات ہے، وہ بڑی شان والا ہے۔ ۶۹-۷۳

پھر جب ابراہیم کا خوف دور ہوا اور اُسے بشارت مل گئی تو وہ قوم لوط کے بارے میں ہم سے بحث کرنے لگا۔[۲۰۵] حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑا بردبار، بڑا دردمند اور اپنے

۲۰۲ فرشتوں نے یہ خوش خبری خدا کی طرف سے دی تھی، اِس لیے فرمایا ہے کہ ہم نے خوش خبری دی۔ استاذ امام کے الفاظ میں اِس خوش خبری کے اندر عنایت خاص اور تکمیل مسرت کے جو گوناگوں پہلو ملحوظ ہیں، وہ محتاج بیان نہیں اور بیٹے کے ساتھ پوتے کی بشارت نے گویا یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ بیٹا زندہ رہے گا، اچھی عمر پائے گا اور اُس کے صلب سے نام ور پوتا بھی پیدا ہو گا۔

۲۰۳ یہ اظہار تعجب جن الفاظ میں ہوا، اُن کے پیچھے یہ خواہش صاف نظر آ رہی ہے کہ بشارت کے ظہور میں جو ظاہری رکاوٹیں ہیں، اُن کے بارے میں بھی اطمینان ہو جائے کہ اُن کے باوجود یہ بشارت پوری ہو جائے گی۔

۲۰۴ اصل الفاظ ہیں: 'رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَکٰتُهٗ عَلَیۡکُمۡ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ'۔ اِن میں 'عَلَیۡکُمۡ' کی ضمیر جمع مذکر ہے۔ عربی زبان میں گھر کی عورتوں کے لیے یہی شایستہ انداز خطاب ہے۔ اِس میں پردہ داری اور ادب و احترام کے جو تقاضے ملحوظ ہیں، اُن کا اندازہ ہر صاحب ذوق آسانی کے

اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمۡ اٰتِیۡهِمۡ عَذَابٌ غَیۡرُ مَرۡدُوۡدٍ ﴿۷۶﴾

پروردگار کی طرف بڑا دھیان رکھنے والا تھا ـــــ ابراہیم، یہ بحث چھوڑو، تمھارے پروردگار کا حکم ہو چکا ہے اور اب اِن لوگوں پر وہ عذاب آنے والا ہے جو لوٹایا نہیں جاتا۔[۲۰۶] ۷۴-۷۶

ساتھ کرسکتا ہے۔

۲۰۵؎ یہ بحث کیا تھی اور اپنے اندر ابراہیم علیہ السلام کی دردمندی، محبت، دل سوزی، غم خواری اور اپنے پروردگار سے ناز و اعتماد کے کیا کیا پہلو سمیٹے ہوئے تھی، اُنھیں دیکھنے کے لیے بائیبل میں اِس کی روداد پڑھنی چاہیے۔ پیدائش میں ہے:

''... پر ابراہام خداوند کے حضور کھڑا ہی رہا۔ تب ابراہام نے نزدیک جا کر کہا: کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اُس شہر میں پچاس راست باز ہوں۔ کیا تو اُسے ہلاک کرے گا اور اُن پچاس راست بازوں کی خاطر جو اُس میں ہوں، اُس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راست باز ملیں تو میں اُن کی خاطر اُس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابراہام نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھیے، میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی، اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس راست بازوں میں پانچ کم ہوں۔ کیا اُن پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا؟ اُس نے کہا: اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اُسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اُس نے اُس سے کہا کہ شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اُس نے کہا کہ میں اُن چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔ پھر اُس نے کہا: خداوند ناراض نہ ہو تو میں کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔ اُس نے کہا: اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اُس نے کہا، دیکھیے، میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں

وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّقَالَ هٰذَا یَوۡمٌ عَصِیۡبٌ ﴿۷۷﴾ وَجَآءَهٗ قَوۡمُهٗ یُهۡرَعُوۡنَ اِلَیۡهِ ؕ وَمِنۡ قَبۡلُ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیۡ هُنَّ

(اِس کے بعد) جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے[207] تو اُن کے آنے سے وہ بہت رنجیدہ اور دل تنگ ہوا اور کہنے لگا کہ یہ تو بڑی مصیبت کا دن ہے[208]۔ اُس کی قوم کے لوگ (یہ دیکھ کر کہ خوب رو لڑکے آئے ہیں)، بے اختیار دوڑتے ہوئے اُس کے پاس آ پہنچے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔ اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو،

بیس ملیں۔ اُس نے کہا: میں بیس کی خاطر بھی اُسے نیست نہیں کروں گا۔ تب اُس نے کہا: خداوند ناراض نہ ہوں تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں۔ اُس نے کہا: میں دس کی خاطر بھی اُسے نیست نہیں کروں گا۔'' (۱۸:۲۲-۳۳)

۲۰۶؎ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد جو عذاب آتا ہے، اُس کی نوعیت یہی ہوتی ہے۔ وہ جب ایک مرتبہ آ جاتا ہے تو اُسی وقت جاتا ہے، جب کچھ باقی نہیں رہتا۔

۲۰۷؎ حضرت لوط سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اُن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔ بائیبل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔ لوط علیہ السلام کا تعلق اُس قوم کے ساتھ وہی تھا جو حضرت موسیٰ کا قوم فرعون کے ساتھ تھا۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں اُن کی بیوی کا ذکر جس اسلوب میں ہوا ہے، اُس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اُن کی شادی اُسی قوم کے اندر ہوئی تھی اور اِس لحاظ سے وہ اُنھی کے ایک فرد بن چکے تھے۔

۲۰۸؎ آگے کی آیتوں سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ فرشتے نہایت خوب رو اور نوخیز لڑکوں کی

اَطۡهَرُ لَكُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِیۡ ضَیۡفِیۡ ؕ اَلَیۡسَ مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوۡا لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَنَا فِیۡ بَنٰتِكَ مِنۡ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعۡلَمُ مَا نُرِیۡدُ ﴿۷۹﴾ قَالَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِكُمۡ قُوَّةً اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُكۡنٍ

یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ اِس لیے خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟[۲۰۹] اُنھوں نے جواب دیا: تمھیں معلوم ہی ہے کہ تمھاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔[۲۱۰] لوط نے کہا: اے کاش، میرے پاس

صورت میں آئے تھے۔ حضرت لوط جانتے تھے کہ اُن کی قوم اِس معاملے میں کیسی بدکردار اور کتنی بے حیا ہو چکی ہے۔ یہی سبب تھا کہ اُن کو دیکھ کر وہ سخت پریشان ہو گئے۔

۲۰۹ لوط علیہ السلام کی طرف سے یہ اُن اوباشوں کے لیے کیا کوئی پیش کش تھی؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ پیش کش نہیں، بلکہ اپنی قوم کے ضمیر کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لیے گویا حضرت لوط کی آخری بے تابانہ فریاد تھی کہ وہ سوچیں کہ ایک اللہ کا بندہ یہ ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت کے معاملے میں اتنا حساس ہے کہ اُس کے لیے اپنی عزیز سے عزیز شے کو قربان کرنے پر تیار ہے اور ایک ہم ہیں کہ اندھے ہو کر اُس کے مہمانوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اِسی طرح اُنھوں نے اللہ کا خوف بھی یاد دلایا اور آخر میں 'اَلَیۡسَ مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ' کہہ کر گویا پوری طرح اُن پر حجت تمام کر دی۔ اِس لیے کہ کسی کے اندر اگر رائی برابر بھی حق کی حمیت وحمایت کا احساس ہوتا تو اِس فقرے کے بعد تو اُس کو ضرور حرکت میں آجانا تھا، لیکن جب اِس کے بعد بھی کوئی ضمیر بیدار نہیں ہوا تو اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کسی کے اندر حس انسانیت و شرافت سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۱۵۸)

شَدِيۡدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوۡا يٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنۡ يَّصِلُوۡۤا اِلَيۡكَ فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيۡبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمۡ ؕ اِنَّ مَوۡعِدَهُمُ الصُّبۡحُ ؕ اَلَيۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِيۡبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۙ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِىَ مِنَ

تم سے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لے سکتا۔[۲۱۱] فرشتوں نے کہا: اے لوط، ہم تمھارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔ (مطمئن رہو)، یہ تمھارے قریب بھی نہیں آسکیں گے۔ سواپنے اہل وعیال کو لے کر کچھ رات رہے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ تمھاری بیوی نہیں، اِس لیے کہ اُس پر وہی کچھ گزرنے والا ہے جو اِن لوگوں پر گزرنا ہے۔ اِن (پر عذاب) کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے۔ (تم پریشان کیوں ہوتے ہو)؟ کیا صبح قریب نہیں ہے؟ ۷۷-۸۱

پھر جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے اُس بستی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور اُس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائے، تہ برتہ،[۲۱۲] جو تمھارے پروردگار کے ہاں نشان لگائے ہوئے تھے[۲۱۳]

۲۱۰؎ مطلب یہ ہے کہ بات کو الجھانے کی کوشش نہ کرو۔ ہم یہاں تمھاری بیٹیوں کو بیاہ کر لے جانے کے لیے نہیں آئے اور تم جانتے ہو کہ اُس کے بغیر ہمارا کوئی حق اُن پر قائم نہیں ہوتا۔ اِس لیے جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں، کرنے دو، اُس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنو۔

۲۱۱؎ یہ انتہائی اضطراب، مایوسی اور بے بسی کا جملہ ہے جس نے گویا آخری حجت تمام کر دی۔ چنانچہ فرشتوں نے بھی اِس کے بعد حقیقت سے پردہ اٹھا دیا۔

۲۱۲؎ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قوم میں بالعموم پتھر برسانے والی آندھی

الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٣﴾

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿٨٤﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ

اور وہ اِن ظالموں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھے[۲۱۴]۔ ۸۲-۸۳

اور مدین[۲۱۵] کی طرف اُن کے بھائی شعیب کو رسول بنا کر بھیجا۔ اُس نے دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو[۲۱۶]۔ میں تمھیں خوش حال دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے تم پر ایک ایسے دن

سے تباہ کی گئی ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ اِسے 'حَاصِب' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اُسی کا بیان ہے۔

۲۱۳ یعنی پہلے سے مقدر کر دیے گئے تھے کہ یہ پتھر قوم لوط کی بستی پر برسانے کے لیے ہیں۔

۲۱۴ مطلب یہ ہے کہ ہماری بھیجی ہوئی باد تند نے اُنھی کے پاؤں میں سے اٹھا کر اُن کے سروں پر برسا دیے۔ اُن کے لانے کے لیے ہمیں کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا۔

۲۱۵ یہ بستی ابراہیم علیہ السلام کے صاحب زادے مدیان کے نام پر مدین یا مدیان کہلاتی تھی، جو اُن کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے۔ اِس میں زیادہ تر اُنھی کی نسل آباد تھی۔ اِس کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں، بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا، مگر اِس کا کچھ سلسلہ جزیرہ نماے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ اُس زمانے کی دو بڑی تجارتی شاہ راہیں اِسی علاقے سے گزرتی تھیں، اِس وجہ سے مدین کے لوگوں نے بھی تجارت میں بہت ترقی کر لی تھی۔

۲۱۶ اِس سے معلوم ہوا کہ شرک کے بعد جو سب سے بڑی برائی سیدنا شعیب کی قوم میں پیدا ہو چکی تھی، وہ یہی ناپ تول میں کمی تھی جسے اُن ظالموں نے اپنے لیے ہنر بنا لیا تھا۔

وَالۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَهُمۡ وَلَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۸۵﴾ بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۬ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ ﴿۸۶﴾ قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُکَ تَاۡمُرُکَ اَنۡ نَّتۡرُکَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّکَ

کے عذاب کا اندیشہ ہے جو گھیر نے والا ہے۔[217] میری قوم کے لوگو، ناپ اور تول کو ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا رکھو اور لوگوں کو اُن کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ کا دیا ہوا نفع ہی تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سچے مومن ہو۔ (مجھے سمجھانا ہی ہے) اور میں تم پر نگران مقرر نہیں کیا گیا ہوں۔[218] اُنھوں نے جواب دیا: اے شعیب، کیا تمھاری نماز تمھیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم اُن چیزوں کو چھوڑ دیں جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے رہے یا اپنے مال میں ہم اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں؟[219]

---

۲۱۷ یہ اُنھوں نے اِس لیے فرمایا کہ وہ خدا کے رسول تھے اور رسولوں کے باب میں یہی سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ جاری رہی۔

۲۱۸ یعنی میرا کام تبلیغ و دعوت اور انذار و بشارت ہے۔ اِس سے زیادہ میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مجھے تم پر داروغہ نہیں بنایا گیا کہ میں ضرور ہی تمھیں راہ راست پر لے آؤں۔

۲۱۹ یہ درحقیقت ایک طنزیہ فقرہ ہے اور نماز کا ذکر اِس میں دین داری کی علامت کے طور پر ہوا ہے، اِس لیے کہ اُس کا سب سے نمایاں ظہور نماز ہی کی صورت میں ہوتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ کہ تم نماز وغیرہ پڑھتے تھے تو اُس سے خیال تو یہ ہوتا تھا کہ تم سے باپ دادا کا نام بھی روشن ہوگا اور قوم کے لیے بھی کچھ کامیابی کی راہیں کھلیں گی، مگر خوب نکلی تمھاری یہ نماز کہ وہ ماضی و حاضر، سب کی بساط لپیٹ کر رکھ دینا چاہتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت

هود
۱۱

لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَرَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰی مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ ﴿۸۸﴾ وَیٰقَوْمِ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ

(تمھاری نگاہ میں سب اگلے پچھلے بے وقوف اور گم راہ تھے اور ہمارے اندر) بس تمھی ایک دانش منداور راست باز آدمی رہ گئے ہو! اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، ذرا غور تو کرو، اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل[۲۲۰] پر ہوں، پھر اُس نے (وحی کی صورت میں) مجھے ایک رزق حسن[۲۲۱] بھی اپنی طرف سے عطا فرمادیا تو اِس کے سوا کس چیز کی دعوت دوں؟[۲۲۲] میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تمھاری مخالفت کرکے وہی کام خود کروں جس سے تمھیں روک رہا ہوں۔[۲۲۳] میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جس حد تک کرسکوں۔ اِس کی توفیق مجھے اللہ ہی سے ملے گی۔ میں نے اُسی پر بھروسا کیا ہے اور

شعیب کی نیک اور پاکیزہ زندگی سے چونکہ مفسدین کو اندیشہ تھا کہ وہ لوگ متاثر ہوں گے جو بالطبع نیک ہیں، اِس وجہ سے اُنھوں نے اُن کی نیکیوں ہی کو اپنے طنز کا ہدف بنالیا، گویا سارے فساد کی جڑ وہی ہیں۔'' (تدبرقرآن ۴/۱۶۱)

۲۲۰۔ یعنی نور فطرت جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔

۲۲۱۔ وحی کو رزق حسن سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی روحانی زندگی کی بقا اِسی پر منحصر ہے۔

۲۲۲۔ یہ جواب شرط ہے جو اصل میں محذوف ہے۔

۲۲۳۔ یعنی تمھارے خریداروں کو تم سے بدگمان کرکے بستی میں فساد پیدا کردوں، دراں حالیکہ

شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ

اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میری قوم کے لوگو، میرے خلاف تمھاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ تم پر بھی وہی آفت آپڑے جو نوح کی قوم یا ہود کی قوم یا صالح کی قوم پر آپڑی تھی اور لوط کی قوم تو تم سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ اور دیکھو، (خیریت چاہتے ہو تو) اپنے پروردگار سے معافی چاہو، پھر اُس کی طرف پلٹ آؤ۔[۲۲۴] حقیقت یہ ہے کہ میرا پروردگار نہایت مہربان اور بڑی محبت کرنے والا ہے۔[۲۲۵] اُنھوں نے جواب دیا: اے شعیب، تمھاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں[۲۲۶] اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان تم ایک کمزور آدمی ہو، تمھاری برادری نہ ہوتی تو

تم سے کہہ رہا ہوں کہ 'لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ'۔

۲۲۴۔ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ توبہ کے لیے استغفار اور اصلاح، دونوں ضروری ہیں۔ یہ اُنھی کی ہدایت فرمائی ہے۔

۲۲۵۔ یہ ترغیب و تشویق بھی ہے اور قبولیت توبہ کی بشارت بھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...مدعا یہ ہے کہ تمھارے جرائم کتنے ہی سنگین ہوں، لیکن جب تم صدق دل سے اُس کی طرف رجوع کرو گے تو وہ تمھیں ٹھکرائے گا نہیں، بلکہ معاف کر کے اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔ وہ نہایت مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔" (تدبر قرآن ۴/ ۱۶۳)

۲۲۶۔ لوگوں کو اُن کے مالوفات کے خلاف کوئی دعوت دی جائے تو وہ بالعموم اِسی طرح کا تبصرہ کرتے ہیں۔ اِس میں ایک نوعیت کی تعریض بھی ہوتی ہے کہ تمھاری باتیں سمجھنے کی کہاں ہیں کہ

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾

ہم تمھیں سنگ سار کر دیتے، تم ہم پر کچھ بھاری نہیں ہو۔ شعیب نے کہا: میری قوم کے لوگو، کیا میری برادری تم پر خدا سے زیادہ بھاری ہے؟ (اُس کا تمھیں خوف ہے) اور خدا کو تم نے بھلا کر پس پشت ڈال رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو، میرا پروردگار اُس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میری قوم کے لوگو، (جو کچھ کر رہے ہو)، اپنی جگہ کیے جاؤ، میں بھی کر رہا ہوں۔ تمھیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اُس کو رسوا کر کے رکھ دے گا اور کون اپنی بات میں جھوٹا ہے۔ تم انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ (اِس پر) جب ہمارا حکم صادر ہو گیا تو ہم نے شعیب کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، خاص اپنی رحمت سے نجات دی اور جنھوں نے (اپنی جان پر) ظلم ڈھایا تھا، اُن کو کڑک نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے، گویا اُن میں کبھی بسے ہی نہیں تھے۔ سنو، مدین والے بھی دھتکارے گئے، جس طرح ثمود دھتکار دیے گئے! ۸۴-۹۵

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ﴿۹۷﴾ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

اِسی طرح موسیٰ کو ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ اور ایک کھلی ہوئی سند[۲۲۷] کے ساتھ فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا تو اُنھوں نے فرعون کی بات مانی، دراں حالیکہ فرعون کی بات راست نہیں تھی۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور اُنھیں دوزخ میں لے جا اتارے گا۔ کیا ہی برا گھاٹ ہے جس پر وہ اتریں گے! اُن کے پیچھے دنیا میں بھی لعنت لگا دی گئی اور آخرت کے دن بھی۔ کیا ہی برا صلہ ہے جو اُنھیں دیا گیا![۲۲۸] ۹۶-۹۹

کوئی معقول آدمی اُن کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ایسی مہمل اور دور از کار باتیں کب کسی کی سمجھ میں آتی ہیں۔

۲۲۷۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اِس سے عصا کا معجزہ مراد ہے۔ اِس لیے کہ یہی وہ سند ماموریت تھی جس نے ساحروں کے مقابلے میں ایک حجت قاہرہ بن کر موسیٰ علیہ السلام کے دعواے نبوت کو بالکل آخری درجے میں ثابت کر دیا تھا۔ آیت میں اِسی لحاظ سے اِس کو 'سُلْطٰنٌ مُّبِیْنٌ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

۲۲۸۔ موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت سورۂ یونس میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور دوسرے پیغمبروں کا حوالہ بالاجمال آیا ہے۔ اِس سورہ میں معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ قرآن مجید کی سورتوں میں اِسی طرح کی چیزیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ دونوں سورتیں توام ہیں۔

ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيۡكَ مِنۡهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيۡدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰـكِنۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَمَاۤ اَغۡنَتۡ عَنۡهُمۡ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِىۡ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ‌ؕ وَمَا زَادُوۡهُمۡ غَيۡرَ تَتۡبِيۡبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَخۡذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الۡقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ‌ ؕ اِنَّ اَخۡذَهٗۤ اَلِيۡمٌ شَدِيۡدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنۡ

یہ اِن بستیوں کی سرگذشتیں ہیں جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں[۲۲۹]۔ اِن میں سے بعض کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے[۲۳۰]۔ ہم نے اِن پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ اِنھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔ پھر تیرے پروردگار کا حکم صادر ہوا تو اِن کے وہ معبود اِن کے کچھ بھی کام نہ آئے جنھیں خدا کے سوا پکارتے تھے۔ اِن کی بربادی کے سوا اُنھوں نے اِن لوگوں کے حق میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔ تیرا پروردگار جب بستیوں کو پکڑتا ہے اور وہ ظلم کر رہی ہوتی ہیں تو اُس کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ کہ اُس کی پکڑ بڑی دردناک اور

۲۲۹۔ یہاں سے آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین کو اُس سبق کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جو اُن سرگذشتوں سے اُنھیں حاصل کرنا چاہیے جو پیچھے بیان ہوئی ہیں۔

۲۳۰۔ اصل میں 'قَآئِمٌ' اور 'حَصِيۡدٌ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...'قَآئِمٌ' کی ایک مثال مصر ہے جس کے اندر سے فرعون اور اُس کی قوم کو خدا نے نکالا اور لے جا کر سمندر میں غرق کر دیا۔ مکان قائم رہ گئے، مکین ناپید ہو گئے۔ 'حَصِيۡدٌ' سے مراد قوم ہود اور قوم لوط وغیرہ کی بستیاں ہیں جن کے مکان و مکین سب ناپید ہو گئے۔ صرف کسی کسی کے کچھ آثار اپنے مکینوں کی بدبختی کی داستان عبرت سنانے کے لیے رہ گئے۔"

(تدبر قرآن ۴/ ۱۷۰)

خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ ؕ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ

سخت ہے۔ اِس میں یقیناً اُن لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈریں۔ وہ ایک ایسا دن ہے جس کے لیے سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے اور وہ حاضری کا دن ہوگا۔[۲۳۱] ہم اُس کو بس ایک گنتی کی مدت کے لیے ٹال رہے ہیں۔[۲۳۲] جب وہ دن آجائے گا تو کوئی شخص خدا کی اجازت کے بغیر کلام نہ کر سکے گا۔[۲۳۳] پھر لوگوں میں سے کچھ بد بخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔ سو جو بد بخت ہوں گے، وہ دوزخ میں جائیں گے۔ اُنھیں وہاں چیخنا اور چلانا ہے۔[۲۳۴] وہ اُسی میں پڑے رہیں گے، جب تک

۲۳۱۔ یعنی سب کی حاضری کا دن تا کہ معاملے کے تمام فریق سامنے موجود ہوں اور جو کچھ فیصلہ سنایا جائے، پورے انصاف کے ساتھ سنایا جائے۔

۲۳۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ پر نبوت کا خاتمہ بجائے خود اِس بات کی علامت ہے کہ قیامت اب زیادہ دور نہیں ہے اور یہ فی الواقع ایک گنتی کی مدت ہی ہے جس کے لیے اُسے موخر کیا گیا ہے۔

۲۳۳۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اُن بے بنیاد توقعات کا خاتمہ ہو جائے جو لوگ اُن ہستیوں سے وابستہ کر لیتے ہیں جنھیں وہ اپنے زعم کے مطابق خدا کے حضور میں شفاعت کرنے والا سمجھتے ہیں۔

۲۳۴۔ 'زَفِیْر' اور 'شَھِیْق' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، دونوں گدھے کی چیخ کے لیے آتے ہیں۔ ایک اُس چیخ کے لیے جو سانس کو باہر نکالتے وقت اور دوسرا اُس کے لیے جو سانس کو

السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿١٠٧﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿١٠٨﴾ فَلَا تَكُ فِيْ

(اُس عالم کے) زمین و آسمان قائم ہیں،[۲۳۵] الّا یہ کہ تیرا پروردگار کچھ اور چاہے۔ اِس میں شک نہیں کہ تیرا پروردگار جو چاہے، کر گزرنے والا ہے۔[۲۳۶] رہے وہ جو نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے۔ وہ اُسی میں رہیں گے، جب تک (اُس عالم کے) زمین و آسمان قائم ہیں، الّا یہ کہ تیرا پروردگار کچھ اور چاہے،[۲۳۷] اُس کی طرف سے ایسی عطا کے طور پر جو

اندر کی طرف لے جاتے وقت پیدا ہوتی ہے۔

۲۳۵؎ یعنی وہ عالم جو قیامِ قیامت کے وقت وجود میں آئے گا۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اُس دن ہمارے یہ زمین و آسمان ایک نئے زمین و آسمان میں تبدیل کر دیے جائیں گے۔ دوام اور ہمیشگی کے معنی میں یہ تعبیر ہماری زبان میں بھی اِسی طرح اختیار کی جاتی ہے۔

۲۳۶؎ قرآن کی یہی آیت ہے جس کی بنا پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ایک دن دوزخ کی بساط لپیٹ دی جائے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا عذاب وعدہ نہیں، بلکہ وعید ہے اور عالم کا پروردگار یہ حق یقیناً رکھتا ہے کہ اپنی رحمت سے مجرموں کی سزا میں تخفیف کرے یا خاک اور راکھ بنا کر اُنھیں ہمیشہ کے لیے اِسی دوزخ کی مٹی میں دفن کر دے۔ آیت کے آخر میں 'اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ' کے الفاظ اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

۲۳۷؎ یہ استثنا بتا رہا ہے کہ اہلِ جنت کے احوال و مراتب میں بھی تبدیلیاں ہوں گی، لیکن یہ خوب سے خوب تر کی نوعیت کی ہوں گی۔ چنانچہ آگے وضاحت کر دی ہے کہ خدا کی اِس بخشش میں کبھی انقطاع نہ ہوگا۔ پچھلی آیت کا خاتمہ 'اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ' کے الفاظ پر ہوا ہے۔ یہاں اُن کی جگہ 'عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ تبدیلی جنت اور دوزخ کے دوام

مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾

کبھی منقطع نہ ہوگی۔ سو، (اے پیغمبر)، تم اُن چیزوں کے معاملے میں کسی تردد میں نہ پڑو جنھیں یہ پوجتے ہیں۔[۲۳۸] یہ اُسی طرح پوج رہے ہیں، جس طرح اِن سے پہلے اِن کے باپ دادا پوجتے رہے۔ ہمارا فیصلہ ہے کہ اِن کا حصہ ہم بھی بغیر کسی کمی کے اِنھیں پورا پورا ادا کردیں گے۔[۲۳۹] ۱۰۰-۱۰۹

ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی تو اُس کے بارے میں بھی (اِسی طرح) اختلاف کیا گیا تھا۔[۲۴۰] تیرے پروردگار کی طرف سے اگر ایک بات پہلے ہی طے نہ کردی گئی ہوتی تو

میں اِسی فرق کی بنا پر کی گئی ہے۔

۲۳۸؎ یعنی تمھیں یہ تردد نہ ہو کہ اچھے بھلے لوگ ہیں، آخر کسی دلیل کی بنیاد پر ہی اِن چیزوں کو پوجتے ہوں گے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ عتاب کا رخ اُنھی لوگوں کی طرف ہے جو یہ حماقت کر رہے تھے۔

۲۳۹؎ یعنی جس انجام کے مستحق ہیں، ٹھیک اُسی کو پہنچ جائیں گے۔ اِن میں سے کسی کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ہر ایک کے لیے اُس کے اعمال کی پاداش میں جو صلہ مقرر کیا گیا ہے، وہ اُسے پورا مل جائے گا۔

۲۴۰؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمھاری قوم کے لوگ جو معاملہ قرآن کے ساتھ کر رہے ہیں، اِس سے پہلے یہی معاملہ تورات کے ساتھ ہو چکا ہے۔ چنانچہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ

اِن کے درمیان (اِس اختلاف کا) فیصلہ چکا دیا جاتا[۲۴۱]۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ تم پیش کر رہے ہو، اُس کی طرف سے یہ لوگ ایسے شک میں پڑے ہوئے ہیں جو الجھا دینے والا ہے۔ (تم مطمئن رہو)، تمھارا پروردگار اِن میں سے ہر ایک کو اُس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا[۲۴۲]۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ اُس سے یقیناً باخبر ہے۔ سو تم ثابت قدم رہو، جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے، اور وہ بھی جنھوں نے تمھارے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف رجوع کیا ہے اور تم لوگ کجی اختیار نہ کرو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اُسے وہ دیکھ رہا ہے۔ (اِن کی ترغیب و ترہیب کے باوجود) اِن ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا، ورنہ تمھیں بھی آگ پکڑ لے گی اور خدا کے

پریشانی کا باعث بن جائے۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت کے ساتھ اُن کی قوموں کا رویہ بالعموم یہی رہا ہے۔

۲۴۱ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اُس کی بنا پر کسی رعایت کے مستحق تو نہیں رہے، مگر اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اُس نے ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ لہٰذا انتظار کرو، اِن کا فیصلہ بھی اُسی وقت ہوگا، جب وہ مدت پوری ہو جائے گی۔

۲۴۲ اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ'۔ اِن میں 'ل' تاکید اور قسم کا ہے اور 'مَا' محض صوت و آہنگ کی ضرورت سے آ گیا ہے۔ اِس کی مثالیں قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی ہیں۔

النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكۡرٰى لِلذّٰكِرِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۱۵﴾

سو تمھارا کوئی حامی نہ ہوگا، پھر کہیں سے مدد بھی نہیں پاؤ گے۔[۲۴۳] اور دیکھو، (اے پیغمبر، اِس راہ میں ثابت قدمی کے لیے) دن کے دونوں حصوں میں نماز کا اہتمام کرو اور رات کے اوائل میں بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ایک یاددہانی ہے اُن کے لیے جو یاددہانی حاصل کرنے والے ہوں۔ اور صبر کرو، اِس لیے کہ اللہ اُن لوگوں کا اجر ضائع نہ کرے گا جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں۔[۲۴۴] ۱۱۰-۱۱۵

۲۴۳؎ اِس لیے کہ معاملہ اُس پروردگار سے ہوگا جس کے مقابل میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔

۲۴۴؎ راہ حق کی مشکلات میں قرآن نے ہر جگہ دو ہی چیزوں کی تلقین کی ہے: ایک نماز اور دوسرے صبر و استقامت۔ یہاں یہ مضمون جس طریقے سے آیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کے بعض پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...نماز سے پہلے استقامت اور نماز کے بعد صبر کے ذکر میں ایک اشارہ اِس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ پامردی اور استقلال محمود اُسی صورت میں ہے، جب آدمی کا رخ صحیح سمت میں ہو۔ علاوہ ازیں ایک اور نکتہ بھی اِس آیت میں ہے۔ وہ یہ کہ یوں نہیں فرمایا کہ 'صبر کرو، اِس لیے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا'، بلکہ یوں فرمایا کہ 'صبر کرو، اِس لیے کہ اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا'۔ اِس سے اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ صبر بھی خدا کے ہاں عزیز و محبوب اور سزاوار اجر اُنھی لوگوں کا ہے جو اُس طرح صبر کریں، جس طرح صبر کرنے کا حق ہے۔ رو دھو کر اور گلے شکوے کر کے تو سب ہی صبر کر لیتے ہیں۔ خوب کاروں کا صبر یہ ہے کہ سروں پر آرے چل جائیں، لیکن نہ دل گلہ مند ہو نہ پیشانی پر بل آنے پائے۔ جو لوگ اِس شان و وقار سے صبر کرتے ہیں، اُن کا اجر کبھی ضائع نہیں

فَلَوۡلَا كَانَ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ اُولُوۡا بَقِيَّةٍ يَّنۡهَوۡنَ عَنِ الۡفَسَادِ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّمَّنۡ اَنۡجَيۡنَا مِنۡهُمۡ‌ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مَاۤ اُتۡرِفُوۡا فِيۡهِ وَكَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهۡلِكَ الۡقُرٰى بِظُلۡمٍ وَّاَهۡلُهَا مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾

وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوۡنَ مُخۡتَلِفِيۡنَ ﴿۱۱۸﴾

ھود ۱۱

پھر (اِس پر بھی غور کرو کہ) ایسا کیوں نہ ہوا کہ تم سے پہلے کی امتوں میں[۲۴۵] ایسے اہل خیر ہوتے جو (لوگوں کو) زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت تھوڑے جنھیں ہم نے اُن میں سے نجات دی اور ظالم جس عیش میں تھے، اُسی کے پیچھے پڑے رہے، اور وہ تھے ہی مجرم لوگ۔ (اے پیغمبر)، تیرا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو (اُن کے) کسی ظلم کی پاداش میں ہلاک کر دے، جب کہ اُن کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں[۲۴۶]۔ ۱۱۶-۱۱۷

تیرا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی گروہ بنا دیتا، (مگر اُس نے ایسا نہیں

جاتا۔'' (تدبر قرآن ۴/۱۷۶)

۲۴۵؎ یعنی اُن امتوں میں جن کی سرگذشتیں پیچھے بیان ہوئی ہیں۔

۲۴۶؎ یہ نہایت سبق آموز طریقے سے اُن کی تباہی کے اصل سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد وہ اِس لیے ہلاک کر دیے گئے کہ اُن کی اکثریت آمادۂ فساد تھی اور اصلاح کرنے والے بہت تھوڑے رہ گئے تھے۔ فرمایا کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ قوم میں اکثریت اصلاح کرنے والوں کی ہو اور وہ چند لوگوں کے کسی ظلم کی پاداش میں پوری قوم کو تباہ کر دے۔ اِس طرح کی تباہی اُسی وقت آتی ہے، جب قوم بحیثیت مجموعی فساد میں مبتلا ہو

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۱۹﴾

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَ جَآءَكَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَ انْتَظِرُوْا ۚ

کیا، بلکہ اُنھیں ارادہ واختیار عطا فرمایا ہے تو اب یہی ہو گا کہ) وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے، سوائے اُن کے جن پر تیرا پروردگار رحم فرمائے[۲۴۷]۔ اُس نے اِسی لیے اُن کو پیدا کیا ہے (کہ وہ اپنے اختیار سے فیصلہ کریں)۔ سو تیرے پروردگار کی بات پوری ہو گئی (جو اُس نے کہی تھی) کہ کیا جن اور کیا انسان، میں سب سے جہنم کو بھر دوں گا[۲۴۸]۔ ۱۱۸-۱۱۹

اور، (اے پیغمبر)، رسولوں کی سرگذشتوں میں سے ہر ایک ہم تمھیں سنا رہے ہیں، جس سے ہم تمھارے دل کو مضبوط کریں۔ اِن کے اندر تمھارے پاس حق آیا ہے[۲۴۹] اور ماننے والوں کے لیے اِن میں نصیحت اور یاددہانی ہے۔ اُن سے کہہ دو، (اے پیغمبر)، جو نہیں مان رہے کہ تم اپنے طریقے پر کرو جو چاہتے ہو، ہم اپنے طریقے پر کریں

جاتی ہے۔

۲۴۷؎ یعنی اپنے اُس قانون کے مطابق رحم فرمائے جو اُس نے لوگوں کی ہدایت وضلالت کے لیے مقرر کر رکھا ہے اور وہ بدی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کر لیں۔

۲۴۸؎ یہ اُس بات کا حوالہ ہے جو ابلیس کے جواب میں ارشاد ہوئی تھی، جب اُس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں ذریت آدم کو اِس طرح گھیروں گا کہ اُن کی

اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰہِ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاِلَیۡہِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّہٗ فَاعۡبُدۡہُ وَتَوَکَّلۡ عَلَیۡہِ ؕ وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾

گے۔ تم بھی انتظار کرو (کہ خدا کا فیصلہ کب صادر ہوتا ہے)، ہم بھی منتظر ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے، سب خدا کے پاس ہے اور تمام معاملات اُسی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں۔ سو، (اے پیغمبر)، اُسی کی بندگی کرو اور اُسی پر بھروسا رکھو۔ تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو، تیرا پروردگار اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۱۲۰-۱۲۳

اکثریت تیری شکر گزار نہیں رہے گی۔

۲۴۹ یعنی یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ اہل حق کو غلبہ حاصل ہوا اور منکرین تباہ کر دیے گئے۔

کوالالمپور

۳؍مارچ ۲۰۱۲ء

یوسف - الرعد

۱۲ ــــ ۱۳

یوسف - الرعد

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع اُن نتائج کے حوالے سے انذار و بشارت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد آپ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے لیے اِسی دنیا میں نکلنے والے تھے۔ استدلال کا طریقہ، البتہ الگ الگ ہے۔ پہلی سورہ جن حقائق کو یوسف علیہ السلام کی سرگذشت کے حوالے سے مبرہن کرتی ہے، دوسری میں وہی حقائق عقل و فطرت کے دلائل سے مبرہن کیے گئے ہیں۔ دونوں میں خطاب قریش سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۃ یوسف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ قف تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۟﴿۱﴾ قف اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۲﴾

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡکَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ ٭ۖ وَ اِنۡ کُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِیۡنَ ﴿۳﴾ اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡہِ یٰۤاَبَتِ

یوسف
۱۲

—— ۱ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'الٓرٰ' ہے[۱]۔ یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو اپنا مدعا پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ ہم نے اِس کو عربی زبان میں قرآن بنا کر اتارا ہے تاکہ (اے قریش مکہ)، تم اِس کو اچھی طرح سمجھ سکو[۲]۔ ۱-۲

(اے پیغمبر)، اِس قرآن کی بدولت جو ہم نے تمھاری طرف وحی کیا ہے، ہم تمھیں ایک بہترین سرگذشت[۳] سناتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (اِس طرح کی چیزوں

۱۔ سورۂ یونس اور سورۂ ہود کی طرح اس سورہ کا نام بھی 'الٓرٰ' ہے۔ اِس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ اِس کا مضمون بھی اصلاً وہی ہے جو پچھلی سورتوں میں زیر بحث رہا ہے۔ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ہم سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ا کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

۲۔ سورہ کے مخاطب قریش ہیں۔ یہ اُنھی پر امتنان و احسان کا اظہار ہے جس میں یہ تنبیہ بھی چھپی ہوئی ہے کہ نہیں سمجھو گے تو یاد رکھو، اِس کے بعد تمھارے پاس کوئی عذر نہیں ہو گا جسے خدا کے حضور میں پیش کر سکو۔

۳۔ یہ کس لحاظ سے بہترین سرگذشت ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے جن پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے، اُن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ اِس میں حسن و عشق کی چاشنی ہے، مگر یوسف علیہ السلام جو اِس قصے کا مرکزی کردار ہیں، اُن کی شخصیت اِسے پاکیزگیِ سیرت و کردار کا ایک ایسا مرقع بنا دیتی ہے کہ پڑھنے والا اِس کے اندر اپنے ایمان کے لیے غذا اور اپنی روح کے لیے لذت و حلاوت محسوس کرتا ہے۔

۲۔ یوسف علیہ السلام کی فطرت کے جو جوہر اِس قصے میں نمایاں ہوتے ہیں، وہ ایسے شان دار ہیں کہ ہر پڑھنے والے کے اندر اُن کی تقلید کا جذبہ ابھرتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ یہ تقلید ناممکن نہیں، بلکہ ممکن محسوس ہوتی ہے۔

۳۔ یہ سرگذشت بتاتی ہے کہ انسان کا ظاہری حسن تو زنانِ مصر کی آنکھیں بھی دیکھ لیتی ہیں، لیکن اُس کے باطن کا حسن اُس وقت نمایاں ہوتا ہے، جب وہ زندگی کے مختلف مراحل میں اُس کی آزمایشوں سے گزرتا ہے۔ سیدنا یوسف کی شخصیت کا یہ حسن بھی اِسی طرح نمایاں ہوا ہے اور اِس سرگذشت میں وہ ذہانت، صداقت، پاکیزگی، پاک دامنی اور انتقام کی قدرت کے باوجود عفو و درگذر کی ایک زندہ جاوید مثال بن کر ابھرے ہیں۔

۴۔ اِس میں جو حالات و واقعات پیش آئے ہیں، وہ نہایت حیرت انگیز ہیں، مگر کسی جگہ محسوس نہیں ہوتا کہ اُن میں کوئی چیز بے جوڑ اور بے ربط ہو گئی ہے یا حالات کی فطری رفتار کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

۵۔ اِس کے اولین مخاطبین قریش تھے۔ اُن کے لیے تو گویا اِسے ایک آئینہ بنا دیا گیا ہے، جس میں وہ اپنی عاقبت بھی دیکھ سکتے تھے اور اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل بھی۔ اِس لحاظ سے یہ ایک صریح پیشین گوئی تھی جسے آیندہ دس سال کے واقعات نے حرف بہ حرف صحیح ثابت کر کے دکھا دیا۔ چنانچہ اِس کے نزول پر ڈیڑھ دو سال ہی گزرے تھے کہ قریش نے برادرانِ یوسف کی طرح دارالندوہ میں رسول اللہ کے قتل کی سازش کی، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اُن کے شر سے محفوظ

اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ④

سے) تم اِس سے پہلے بالکل بے خبر تھے۔[4] یہ اُس وقت کا قصہ ہے، جب یوسف نے اپنے باپ سے[5] کہا: ابا جان، میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج

رکھا۔ آپ مکہ سے نکلے اور غارِ ثور میں جا چھپے۔ اِس کے بعد وہاں سے نکل کر مدینہ پہنچ گئے۔ پھر قریش کی توقعات کے بالکل خلاف آپ کو وہاں ایسا وقار اور اقتدار حاصل ہوا کہ چشمِ فلک نے اُس کی نظیر نہیں دیکھی۔ اہلِ مکہ کو طوعاً و کرہاً آپ کی اطاعت میں داخل ہونا پڑا، یہاں تک کہ فتحِ مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی صورت پیدا ہو گئی جو مصر کے پایۂ تخت میں یوسف علیہ السلام کے سامنے اُن کے بھائیوں کی حاضری کے موقع پر پیدا ہوئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کے لوگوں سے پوچھا: بتاؤ، میں تمھارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ اُنھوں نے عرض کیا: 'أخ کریم و إبن أخ کریم'، آپ ایک عالی ظرف بھائی اور عالی ظرف بھائی کے بیٹے ہیں۔ اِس پر آپ نے فرمایا: میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: 'لا تثریب علیکم الیوم، إذھبوا فأنتم الطلقاء' جاؤ، تم آزاد ہو، آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔

[4] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ قرآن کے مخاطبین اِس قصے پر اِس پہلو سے بھی غور کریں کہ اگر آپ وحیِ الٰہی سے مشرف نہیں ہوئے تو آپ کے لیے یہ کس طرح ممکن ہوا کہ اِس استقصا اور اِس صحت و صداقت کے ساتھ یہ قصہ سنا سکیں؟ آخر اِس قرآن کے نزول سے پہلے بھی آپ کم و بیش چالیس سال اپنی قوم میں گزار چکے تھے۔ آپ کو اِس سرگذشت سے کچھ بھی واقفیت ہوتی تو اِس طرح کی کوئی بات اِس مدت میں بھی کبھی تو آپ کی زبان پر آتی۔ آپ کے مخاطبین جانتے تھے کہ جس وضاحت اور جس یقین و اذعان کے ساتھ آپ یہ قصہ سنا رہے ہیں، اُس کے کوئی آثار اِس سے پہلے کبھی آپ کی کسی گفتگو میں نہیں دیکھے گئے۔ چنانچہ قرآن نے توجہ دلائی ہے کہ سننے والے اِس پر بھی غور کریں۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡيَاكَ عَلٰۤى اِخۡوَتِكَ فَيَكِيۡدُوۡا لَكَ كَيۡدًا ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۵﴾ وَكَذٰلِكَ يَجۡتَبِيۡكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ

اور چاند ہیں۔ میں نے اُن کو دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں[۶]۔ جواب میں اُس کے باپ نے کہا: بیٹا، اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا، ایسا نہ ہو کہ وہ تمھارے خلاف کوئی سازش کرنے لگیں[۷]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ (تمھارا

یوسف
۱۲

۵ یعنی یعقوب علیہ السلام سے۔ حضرت یوسف اُن کے بیٹے، حضرت اسحاق کے پوتے اور حضرت ابراہیم کے پر پوتے تھے۔ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے اُن کی چار بیویوں سے تھے۔ اُن میں سے حضرت یوسف اور اُن کے چھوٹے بھائی بن یمین ایک بیوی سے تھے اور باقی دس دوسری بیویوں سے۔ یہ لوگ فلسطین کے علاقے حبرون کی وادی میں رہتے تھے۔ اِسے اب الخلیل کہا جاتا ہے۔ یہاں جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، بائیبل کے علما کی تحقیق کے مطابق وہ ۱۸۹۰ قبل مسیح کے قریب زمانے میں کسی وقت پیش آیا تھا۔ حضرت یوسف کی عمر اُس وقت سترہ برس کی تھی۔

۶ یوسف علیہ السلام نے یہ خواب جس طرح سنایا ہے، اُس سے اُن کی طبیعت کے اندر جو تواضع تھی، وہ پوری طرح نمایاں ہوگئی ہے۔ اُنھوں نے پہلے صرف اتنی بات کہی کہ میں نے گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں۔ پھر آگے کی بات سے چونکہ اُن کی بڑائی سامنے آرہی تھی، اِس لیے کسی قدر رک کر جھجکتے ہوئے بیان کیا ہے کہ میں نے دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ آیت میں فعل 'رَاَیْتُ' کے اعادے نے یہ جھجک پوری طرح ظاہر کر دی ہے۔

۷ اِس سے معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی پرخاش اُن کے ساتھ واضح تھی۔ اُن کی اعلیٰ صلاحیتوں کو دیکھ کر حضرت یعقوب اُن سے غیر معمولی طور پر محبت کرنے لگے تھے اور یہی چیز اُن کے بھائیوں کے لیے اُن کے ساتھ حسد کا باعث بن گئی تھی۔

مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۶

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۷ اِذْ قَالُوْا

یہ خواب بتا رہا ہے کہ) تمھارا پروردگار تمھیں اِسی طرح برگزیدہ کرے گا[8] اور تمھیں باتوں کی حقیقت تک پہنچنا سکھائے گا[9] اور تم پر اور آلِ یعقوب پر اپنی نعمت تمام کرے گا،[10] جس طرح وہ اِس سے پہلے تمھارے بزرگوں ابراہیم اور اسحٰق پر کر چکا ہے۔ یقیناً تیرا پروردگار علیم و حکیم ہے۔۴-۶

حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اُس کے بھائیوں (کی اِس سرگذشت) میں پوچھنے

۸۔ یعنی نبوت عطا کرے گا۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت یعقوب نے خواب سنتے ہی اندازہ فرما لیا کہ یہ منصب نبوت پر سرفرازی کا اشارہ ہے۔

۹۔ یعنی اِس رویا کی حقیقت بھی تم پر واضح ہو جائے گی اور اِس نوعیت کی دوسری چیزوں کو سمجھنے کا علم بھی عطا ہوگا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...رویا چونکہ علم نبوت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اور رویا میں حقائق مجاز کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جن کو سمجھنا ایک خاص ذہنی مناسبت کا مقتضی ہے، اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ حضرات انبیا علیہم السلام کو تعبیر رویا کا ایک خاص ذوق اور ایک خاص علم بھی عطا فرماتا ہے۔" (تدبر قرآن ۱۹۲/۴)

۱۰۔ یہ خاص تعبیر ہے جو دین و شریعت کی نعمت کے لیے قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی اختیار کی گئی ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ دین بالاجمال ودیعت ہے۔ انبیا علیہم السلام چونکہ اِس کی تمام فروع اور تفصیلات کے ساتھ اِس کو بالکل واضح اور متعین کر دیتے ہیں، اِس لیے قرآن اِسے اتمام نعمت سے تعبیر کرتا ہے۔

لَيُوسُفُ وَاَخُوهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۚ ﴿٨﴾ اقْتُلُوْا يُوسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ﴿٩﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا

والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں[11]۔ جب اُس کے بھائیوں نے آپس میں کہا کہ یوسف اور اُس کا بھائی[12]، ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں، حالاں کہ ہم ایک پورا جتھا ہیں[13]۔ یقیناً ہمارا باپ ایک کھلی ہوئی غلطی میں مبتلا ہے۔ (اِس کا علاج یہی ہے کہ) یوسف کو قتل کر دو یا اُس کو کہیں پھینک دو، تمھارے باپ کی توجہ اِس سے صرف تمھاری طرف ہو جائے گی اور اِس کے بعد تم لوگ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے[14]۔

یوسف
۱۲

۱۱۔ یعنی اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جن کے ذہنوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت سے متعلق اِس طرح کے سوالات پیدا ہو رہے ہیں کہ آگے کیا ہو گا اور کس طرح ہو گا؟ اِس دعوت کے جن شان دار نتائج کی طرف اشارے کیے جا رہے ہیں، وہ کیسے نمودار ہوں گے، جب کہ اِس وقت تو اِس کے علم بردار وقت کے متمردین کے ہاتھوں ہر قسم کے آلام و مصائب کا ہدف بنے ہوئے ہیں اور ہر طرف اُنھی عقائد و افکار کا غلبہ نظر آتا ہے جنھیں یہ لوگ ہدف تنقید بنا رہے ہیں؟

۱۲۔ اِس سے یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بن یمین مراد ہیں۔ یہ اُن سے کئی سال چھوٹے تھے۔

۱۳۔ بدویانہ زندگی میں آدمی کی قوت کا انحصار جوان بیٹوں ہی پر ہوتا تھا۔ وہی دشمنوں کے مقابلے میں اُس کے کام آتے تھے۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اِسی کے پیش نظر کہا ہے کہ والد، معاذ اللہ، ایسے ناعاقبت اندیش ہو گئے ہیں کہ بیٹوں کا جو جتھا مشکل وقت میں اُن کے کام آ سکتا تھا، اُسے تو نظر انداز کر رہے ہیں اور اپنی محبت اُن چھوٹے بچوں پر نچھاور کرتے ہیں جو اُن

يُوۡسُفَ وَاَلۡقُوۡهُ فِیۡ غَیٰبَتِ الۡجُبِّ یَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ السَّیَّارَةِ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ ﴿۱۰﴾

قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا مَالَكَ لَا تَاۡمَنَّا عَلٰی یُوۡسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾ اَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدًا یَّرۡتَعۡ وَ یَلۡعَبۡ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۱۲﴾ قَالَ اِنِّیۡ

اِس پر اُن میں سے ایک کہنے والے نے کہا: یوسف کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اُس کو کسی اندھے کنویں کی تہ میں پھینک دو، کوئی راہ چلتا قافلہ اُسے نکال لے جائے گا۔[15] ۷-۱۰

(اِس کے بعد وہ گئے اور) اُنھوں نے اپنے باپ سے کہا: ابا جان، کیا بات ہے کہ یوسف کے معاملے میں آپ ہم پر بھروسا نہیں کرتے، دراں حالیکہ ہم اُس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ اُسے کل ہمارے ساتھ جانے دیجیے، ذرا کچھ چر چگ لے اور

کے کسی کام نہیں آسکتے، بلکہ خود ہی حفاظت کے محتاج ہیں۔

۱۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'تَكُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ قَوۡمًا صٰلِحِیۡنَ'۔ یہ فقرہ سابق جواب امر پر معطوف ہے، اِس لیے اِس کا حکم اُس سے مختلف نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ لفظ 'صَالِح' یہاں نیک کے معنی میں نہیں، بلکہ ٹھیک اپنے لغوی مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی اِس کے بعد ہم ایسے لوگ ہوں گے جن کا حال بالکل ٹھیک ہوگا، تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور یہ کانٹا جو اِس وقت چبھ رہا ہے، نکل جائے گا۔ ہم نے ترجمے میں یہی مدعا ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۵؎ یہ مشورہ بتا رہا ہے کہ دس بھائیوں میں سے کسی ایک کے دل میں یوسف علیہ السلام کے لیے نرم گوشہ تھا۔ وہ یہ تو ضرور چاہتا تھا کہ پہلو کا یہ کانٹا نکل جائے، مگر اِس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اِس کے لیے اُن کی جان لے لے۔

لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿١٣﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿١٤﴾

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٥﴾ وَجَآءُوْٓ

يوسف
١٢

کھیلے کودے[16]، ہم اُس کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ باپ نے کہا: مجھے یہ چیز افسردہ کر دیتی ہے کہ تم اُسے لے جاؤ اور ڈرتا ہوں کہ تم اُس سے غافل ہو اور اُسے بھیڑیا کھا جائے[17]۔ اُنھوں نے جواب دیا: اگر اُسے بھیڑیے نے کھا لیا، جب کہ ہم ایک جتھا ہیں، تب تو ہم بڑے ہی نامراد ہوئے۔ ۱۱-۱۴

اِس طرح (اصرار کر کے) جب وہ یوسف کو لے گئے اور بالآخر طے کر لیا کہ اُس کو کنویں کی تہ میں پھینک دیں[18] اور اُدھر ہم نے اُس کو وحی کر دی کہ تم (ایک دن) اِن کی اِس حرکت سے اِنھیں ضرور آگاہ کرو گے، جب اِنھیں کچھ خیال بھی نہ ہو گا[19]۔ اور (اُس کو

۱۶؎ بدویانہ زندگی میں دل بہلانے کا یہ طریقہ نہایت مقبول رہا ہے کہ بستی سے باہر جا کر دشت وصحرا یا کسی نخلستان میں کچھ وقت اِس طرح گزارا جائے کہ سب مل کر کھائیں پکائیں اور کھیلیں کودیں۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ہاں پکنک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱۷؎ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ گردوپیش کے علاقے میں بھیڑیوں کی کثرت تھی اور وہ باہر جانے والوں پر وقتاً فوقتاً حملے کرتے رہتے تھے۔

۱۸؎ یعنی لانے کے بعد اگرچہ پھر کچھ اختلاف ہوا، لیکن بالآخر یہی بات طے ہوئی کہ کنویں میں ڈال دینا ہی بہتر ہے۔ بائیبل اور تالمود کی روایات کے مطابق یہ کنواں سکم کے شمال میں دوتن

اَبَاهُمۡ عِشَآءً یَّبۡکُوۡنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوۡا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَتَرَکۡنَا یُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَکَلَهُ الذِّئۡبُ ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَلَوۡ کُنَّا صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۷﴾ وَجَآءُوۡ عَلٰی قَمِیۡصِهٖ بِدَمٍ کَذِبٍ ؕ قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَکُمۡ اَنۡفُسُکُمۡ اَمۡرًا ؕ فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ ؕ وَاللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۸﴾

کنویں میں گرا کر) وہ روتے پیٹتے کچھ رات گئے اپنے باپ کے پاس پہنچ گئے۔[20] اُنھوں نے (آ کر) کہا: ابا جان، ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا (آیا اور) اُس کو کھا گیا۔[21] مگر آپ تو ہماری بات کا یقین نہ کریں گے، اگرچہ ہم بالکل سچے ہوں۔[22] وہ (اِس بات کو ثابت کرنے کے لیے) یوسف کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا کر لے آئے تھے۔ باپ نے کہا: نہیں، بلکہ یہ تو تمھارے دل نے تمھارے لیے ایک بات گھڑ لی ہے۔ سو اب صبر جمیل کی توفیق ملے[23] اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو، اُس پر خدا ہی سہارا ہے۔[24] ۱۵-۱۸

(موجودہ دثان) کے قریب واقع تھا۔

۱۹؎ یعنی اُس وقت آگاہ کرو گے، جب اِن کے تصور میں بھی نہیں ہو گا کہ جس بھائی کو ہم نے اندھے کنویں میں ڈال دیا تھا، وہ اِس مقام بلند پر فائز ہے اور ہم سے بات کر رہا ہے۔

۲۰؎ رات گئے واپس آنے میں غالباً یہ مصلحت رہی ہو گی کہ باپ اگر کسی کو تلاش کے لیے بھیجنا چاہے تو اِس کا بھی امکان باقی نہ رہے۔

۲۱؎ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب نے جو کچھ کہا تھا، اُنھوں نے اُسی سے بات بنا لی کہ باپ کے ذہن میں بھیڑیے کا اندیشہ پہلے سے موجود ہے، اِس لیے جلد باور کر لیں گے۔

وَجَآءَتۡ سَيَّارَةٌ فَاَرۡسَلُوۡا وَارِدَهُمۡ فَاَدۡلٰى دَلۡوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشۡرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوۡهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوۡهُ بِثَمَنٍۢ بَخۡسٍ دَرَاهِمَ مَعۡدُوۡدَةٍ ۚ وَكَانُوۡا فِيۡهِ مِنَ الزّٰهِدِيۡنَ ﴿۲۰﴾

اُدھر ایک قافلہ آیا اور اُنھوں نے اپنا پانی بھرنے والا بھیجا[۲۵] اور اُس نے اپنا ڈول (کنویں میں) ڈالا، (پھر یوسف کو دیکھا تو) پکار اٹھا: خوش خبری ہو، یہ تو ایک لڑکا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے (اُس کو نکالا اور) اُس کو پونجی سمجھ کر چھپا لیا[۲۶] اور جو کچھ وہ کر رہے تھے، اللہ اُس سے خوب واقف تھا۔ (پھر لے کر مصر پہنچ گئے) اور اُس کو تھوڑی سی قیمت، چند درہموں کے عوض بیچ دیا اور وہ اُس کے معاملے میں کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے[۲۷]۔ ۱۹-۲۰

يوسف
۱۲

---

۲۲ یہ دل کا چور ہے جو زبان پر آ گیا ہے۔

۲۳ آیت میں 'صَبۡرٌ جَمِيۡلٌ' کا ترجمہ اچھا صبر ہو سکتا ہے، یعنی وہ صبر جس میں فریاد نہ ہو، گلہ شکوہ نہ ہو، جزع فزع اور نوحہ و ماتم نہ ہو۔ یہ اصل میں مبتدا کے طور پر آیا ہے، جس کی خبر محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۲۴ مطلب یہ ہے کہ اب یہ عقدہ اُسی کی مدد سے کھل سکتا ہے کہ تم نے کیا کیا ہے اور کیا بات بنا کر لے آئے ہو۔

۲۵ اصل میں لفظ 'وَارِد' آیا ہے۔ اِس کے اصل معنی تو کسی گھاٹ یا چشمے پر اترنے والے کے ہیں، لیکن یہاں یہ اُس شخص کے لیے استعمال ہوا ہے جو قافلے والوں کی طرف سے پانی کے انتظام کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔ بائیبل اور تالمود، دونوں کی روایت ہے کہ یہ قافلہ جلعاد (شرق اردن) سے مصر جا رہا تھا جس کا دارالسلطنت اُس زمانے میں ممفس تھا جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں ۲۱ کلومیٹر کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۭ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ

مصر کے لوگوں میں سے جس نے اُسے خریدا[۲۸]، اُس نے اپنی بیوی[۲۹] سے کہا: اِس کو خاطر سے رکھنا، امید ہے کہ ہم کو نفع پہنچائے یا ہم اِسے بیٹا ہی بنا لیں[۳۰]۔ اِس طرح یوسف کو ہم نے اُس ملک میں جگہ دی، اِس لیے کہ اُسے برگزیدہ کریں[۳۱] اور اِس لیے کہ اُسے باتوں کی حقیقت تک پہنچنا سکھائیں[۳۲]۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اپنے ارادے کو نافذ

۲۶۔ اِس لیے چھپالیا کہ گردوپیش سے آکر کوئی شخص اُس پر اپنا دعویٰ پیش نہ کر دے۔

۲۷۔ اِس لیے بے رغبت تھے کہ جو کچھ ملا تھا، بغیر کسی قیمت کے ملا تھا، لہٰذا جو خریدار بھی سب سے پہلے سامنے آیا اور اُس نے جو کچھ بھی پیش کر دیا، اُسی پر بیچ کر فارغ ہو گئے۔

۲۸۔ بائیبل میں اُس شخص کا نام فوطیفار لکھا ہے۔ یہ شاہی جلوداروں کا کوئی بڑا افسر تھا۔ آگے قرآن نے اِسے 'عزیز' کے لقب سے یاد کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے مصر میں یہ کوئی خاص منصب تھا جو سلطنت کے امرا کو دیا جاتا تھا۔

۲۹۔ اِس کا نام تالمود میں زلیخا (Zelicha) لکھا ہے۔

۳۰۔ اِس سے واضح ہے کہ حضرت یوسف کو دیکھتے ہی اُس نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی غلام نہیں ہے، بلکہ شریف خاندان کا لڑکا ہے جو کسی وجہ سے اِن بیچنے والوں کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ مزید یہ کہ اُس وقت تک وہ غالباً بے اولاد تھا، اِس لیے اُس نے سوچا کہ یہ لڑکا اُس کی امیدوں پر پورا اترا تو وہ اِسے متبنیٰ کر لے گا۔

۳۱۔ یہ جملہ معللہ کا معطوف علیہ ہے جسے غایت وضاحت کی بنا پر اصل میں حذف کر دیا ہے۔

اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ

کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (چنانچہ اِسی طرح ہوا) اور جب وہ پختگی کو پہنچ گیا تو ہم نے اُس کو حکم اور علم عطا فرمایا[۳۳]۔ اُن کو جو خوبی والے ہوں، ہم اِسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ ۲۱-۲۲

اور یوسف جس عورت کے گھر میں تھا، وہ اُس پر ڈورے ڈالنے لگی۔ اُس نے (ایک دن) دروازے بند کر لیے اور بولی: آ جاؤ۔ یوسف نے کہا: خدا کی پناہ، وہ میرا آقا ہے[۳۴]، اُس نے مجھے خاطر سے رکھا ہے، میں یہ خیانت نہیں کر سکتا، اِس لیے کہ ایسے ظالم کبھی

۳۲؎ یعنی بدویت سے نکال کر مصر جیسے متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں جگہ دی تاکہ باتوں کی تہ تک پہنچ جانے کی جو غیر معمولی صلاحیت اُس کے اندر ودیعت ہے، وہ نمایاں ہو کر مصر کی بادشاہی کے لیے بھی زمین ہموار کر دے اور اُسے ایک متمدن علاقے میں کارِ نبوت کے لیے بھی پوری طرح تیار کر دے۔

۳۳؎ یعنی وہ علم جو انسان کی رہنمائی کے لیے آسمان سے نازل ہوتا ہے۔

۳۴؎ یعنی تمھارا شوہر میرا آقا ہے۔ اِس کے لیے اصل میں لفظ 'رَبِّیْ' استعمال ہوا ہے۔ یہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے لیے آتا ہے، اُسی طرح مالک اور آقا کے لیے بھی آتا ہے۔ عربی زبان میں 'رب المال'، 'رب البیت' اور 'رب الدار' وغیرہ کی ترکیبیں عام استعمال ہوتی ہیں۔ اِس زبان میں ایسے الفاظ کی مثالیں کم نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور

لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ

فلاح نہیں پایا کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس عورت نے تو یوسف کا ارادہ کر ہی لیا تھا، وہ بھی اگر اپنے پروردگار کی برہان[۳۵] نہ دیکھ لیتا تو اُس کا ارادہ کر لیتا[۳۶]۔ اِسی طرح ہوا

بندوں کے لیے بھی، لیکن دونوں صورتوں میں اُن کے مفہوم بالکل الگ الگ ہوتے ہیں۔ تاہم یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اِس موقع پر خدا کا حوالہ دینے کے بجاے زلیخا کو اُس کے شوہر کا حوالہ کیوں دیا؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...حضرت یوسف کے اِس فقرے پر غور فرمایے تو معلوم ہو گا کہ اِس میں بڑی نفسیاتی بلاغت ہے۔ جذبات سے اندھی اور خدا اور آخرت سے ایک بے خبر عورت کے سامنے خدا اور آخرت کا وعظ، ظاہر ہے کہ بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔ اُس کے ہیجان کو اگر کچھ ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا تو اِسی فقرے سے کیا جا سکتا تھا جو حضرت یوسف نے فرمایا۔ اُس میں اگر شرافت کی رمق بھی ہوتی تو وہ ضرور سوچتی کہ ایک یہ نوجوان ہے جو اپنے آقا کی معمولی سی مہربانی سے اتنا متاثر اور اُس کی آقائی کا اِس کو اتنا اہتمام و لحاظ ہے کہ میری بے محابا دعوت کے باوجود اُس کے ساتھ کوئی بے وفائی کرنا اپنی دنیا اور عاقبت، دونوں کی بربادی تصور کرتا ہے اور ایک میں ہوں کہ اُس کی بیوی ہوں، میں نے اپنے آپ کو اُس کی زوجیت میں دیا ہے، اپنی عصمت کا اُس کو مالک بنایا ہے، اُس کے گھر کی ملکہ بنی بیٹھی ہوں، اُس کے مال پر مالکانہ متصرف ہوں، لیکن اُس کے ساتھ وفاداری کا یہ حال ہے کہ اُس کے زرخرید غلام کو اِس طرح ہوس سے اندھی ہو کر دعوت عشق دے رہی ہوں۔" (تدبر قرآن ۴/ ۲۰۵)

۳۵۔ اِس سے وہ نور یزدانی مراد ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، لیکن اِس طرح کے موقعوں پر نمودار اُنھی کے لیے ہوتا ہے جو اُس کی قدر کرتے اور زندگی کے ہر موڑ پر اُس کی

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾
وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ

تا کہ ہم اُس سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں، اِس میں شبہ نہیں کہ وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھا۔۲۳-۲۴

وہ دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے[۳۷] اور (یوسف کو روکنے کی کوشش میں) عورت نے اُس کا کرتا پیچھے سے (کھینچ کر) پھاڑ دیا[۳۸]۔ دروازے پر دونوں نے اُس کے شوہر کو موجود پایا۔ (اُسے دیکھتے ہی) عورت نے کہا: جو تیری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے، اُس کی سزا اِس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ قید کیا جائے یا اُسے کوئی

رہنمائی قبول کرتے ہیں۔ اُن کے لیے یہ اِس قدر قوی ہوجاتا ہے کہ اِس طرح کی صورت حال میں اُنھیں نفس اور شیطان کے حملوں سے بچالیتا ہے جو زلیخا کی ترغیب کے نتیجے میں ایک اٹھارہ، بیس سال کے غیر شادی شدہ نوجوان کے لیے پیدا ہوگئی۔

۳۶؎ اِس لیے کہ یوسف علیہ السلام بھی انسان ہی تھے اور اگرچہ نبوت کے لیے منتخب ہوچکے تھے، مگر اِس کے نتیجے میں انسانی خواہشات، جذبات اور احساسات اُن سے سلب نہیں کرلیے گئے تھے۔

۳۷؎ یعنی یوسف اپنے آپ کو فتنے سے بچانے کے لیے بھاگے تو عورت بھی پیچھے دوڑی تاکہ اُنھیں روک لے۔

۳۸؎ دوڑتے ہوئے کسی شخص کا کرتا پکڑ کر اُسے روکنے کی کوشش کی جائے گی تو پورا امکان ہے کہ یہی صورت پیش آجائے۔

یوسف
۱۲

اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ كَانَ قَمِيۡصُهٗ قُدَّ مِنۡ قُبُلٍ فَصَدَقَتۡ وَهُوَ مِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنۡ كَانَ قَمِيۡصُهٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ فَكَذَبَتۡ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيۡصَهٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنۡ كَيۡدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ ﴿۲۸﴾ يُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ۜ وَاسۡتَغۡفِرِىۡ لِذَنۡۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنۡتِ مِنَ الۡخٰطِـئِيۡنَ ﴿۲۹﴾

وَقَالَ نِسۡوَةٌ فِى الۡمَدِيۡنَةِ امۡرَاَتُ الۡعَزِيۡزِ تُرَاوِدُ فَتٰٮهَا عَنۡ نَّفۡسِهٖ ۚ

يوسف ۱۲

اور دردناک سزا دی جائے؟ یوسف نے کہا: اِسی نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ (معاملہ آگے بڑھا تو) عورت کے اپنے خاندان کے لوگوں میں سے ایک شخص نے (قرینے کی) شہادت پیش کی کہ اگر یوسف کا کرتا آگے سے پھٹا ہو تو عورت سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے، اور اگر اُس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے۔ پھر جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو (غصے میں) بول اٹھا کہ یہ تم عورتوں کے فریب ہیں، اِس میں شبہ نہیں کہ تمھارے فریب بڑے غضب کے ہوتے ہیں[۳۹]۔ یوسف، اِس بات کو جانے دو اور اے عورت، تو اپنے گناہ کی معافی مانگ، اِس لیے کہ اصل میں تو ہی خطا کار ہے۔ ۲۵-۲۹

شہر میں کچھ عورتیں (آپس میں) چرچا کرنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام پر

۳۹؎ یہ واضح طور پر اِس بات کا ثبوت تھا کہ اقدام یوسف علیہ السلام کی طرف سے نہیں، بلکہ زلیخا کی طرف سے ہوا ہے۔ اِس پر شوہر کو جیسا کچھ غصہ آیا ہوگا، اُس کا اظہار اُس نے اِس آخری جملے میں کیا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں گویا زلیخا کے اِس فعل نے تنہا اُس کو نہیں، بلکہ اُس کی پوری جنس کو اُس کے شوہر کی نگاہوں میں کیاد اور مبغوض بنا دیا۔

قَدۡ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَکۡرِهِنَّ اَرۡسَلَتۡ اِلَیۡهِنَّ وَ اَعۡتَدَتۡ لَهُنَّ مُتَّکَاً وَّ اٰتَتۡ کُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنۡهُنَّ سِکِّیۡنًا وَّ قَالَتِ اخۡرُجۡ عَلَیۡهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیۡنَهٗۤ اَکۡبَرۡنَهٗ وَ قَطَّعۡنَ اَیۡدِیَهُنَّ

ڈورے ڈال رہی ہے۔ وہ اُس کی محبت میں فریفتہ ہوگئی ہے۔ ہمارے نزدیک تو وہ کھلی حماقت میں مبتلا ہے[40]، (شاید نہیں جانتی کہ اِیسے لوگ کس طرح رام کیے جاتے ہیں)۔ سو اُن کے فریب کا حال جب اُس عورت نے سنا تو اُس نے اُنھیں بلا بھیجا (کہ وہ بھی اپنا ہنر آزمالیں[41]) اور اُن کے لیے ایک مجلس آراستہ کی[42] اور اُن میں سے ہر ایک کو ایک

یوسف
۱۲

۴۰؎ اِس فقرے میں ملامت، شماتت اور ادعا کے جو پہلو مضمر ہیں، وہ ہم نے اِس کے بعد قوسین کی عبارت سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِن کی تفصیل فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’...اُن کا مطلب یہ تھا کہ اول تو یہی بات بڑی عجیب ہے کہ ایک اعلیٰ عہدہ دار کی بیگم ہو کر اپنے غلام کے پیچھے اپنے کو خوار کرے۔ پھر اِس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ کہ اُس کو بھی رام نہ کر سکے۔ یہیں سے اِس ملامت کے اندر یہ مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ عورت احمق ہے کہ بدنام بھی ہوئی اور نامراد بھی رہی، اگر کہیں ہم ہوتے تو ایک ہی غمزے میں یوسف کو ایسی پٹخنی دیتے کہ اُن کی پارسائی کی ساری دھوم ختم ہو جاتی۔‘‘ (تدبر قرآن ۴/۲۰۸)

۴۱؎ اور اُنھیں اندازہ ہو جائے کہ جس شخص کے مقابل میں وہ ناکام رہی ہے، اُس کے لیے اُن کے عشوے، غمزے، چرتر اور فریب کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

۴۲؎ اصل میں لفظ ’مُتَّکَاً‘ آیا ہے۔ یہ اُس مجلس کے لیے آتا ہے جو گاؤتکیوں سے آراستہ کی جائے۔ اُس زمانے کے مصر میں امرا کی مجلسیں بالعموم اِسی طریقے سے آراستہ کی جاتی تھیں۔

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿٣١﴾ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ

ایک چھری دی[43] اور یوسف سے کہا کہ اِن کے سامنے آ جاؤ۔ پھر جب عورتوں نے اُس کو دیکھا تو اُس کی عظمت سے مبہوت ہو گئیں[44] اور (اپنی بات اُس سے منوانے کے لیے) اپنے ہاتھ جگہ جگہ سے زخمی کر لیے[45] لیکن (ناکام رہیں اور بالآخر) پکار اُٹھیں کہ حاشا للہ،[46] یہ آدمی نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے[47]۔ اُس نے کہا: دیکھ لیا، یہی ہے جس کے

یوسف
۱۲

۴۳؎ آگے کے مضمون سے واضح ہے کہ یہ چھری اُنھی عورتوں کی فرمایش پر اور اُس چرتر کے لیے دی گئی جس سے وہ یوسف علیہ السلام کو رام کرنا چاہتی تھیں۔

۴۴؎ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف کیسے جوان رعنا تھے اور سیرت و اخلاق کی پاکیزگی نے اُن کی رعنائی شخصیت کو دل ربائی کے کس مقام تک پہنچا دیا تھا۔

۴۵؎ اصل میں فعل 'قَطَّعْنَ' آیا ہے۔ یہ 'قطع' سے تفعیل ہے جو تکثیر کے لیے آ گیا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۴۶؎ یہ تنزیہ کا کلمہ ہے اور اُس وقت بولا جاتا ہے، جب کسی الزام سے براءت مقصود ہو۔

۴۷؎ یہ قرآن نے اپنے اسلوب کے مطابق چند فقروں میں ایک پوری داستان سمیٹ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام سامنے آئے تو حسن و جمال اور پاکیزگی و تقدس کے اُس پیکر کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر پہلے تو دنگ رہ گئیں، پھر ذرا سنبھلیں اور چونکہ بڑے دعوے اور طنطنے کے ساتھ آئی تھیں، اِس لیے اپنے چلتر آزمانا شروع کیے۔ جب اندازہ ہو گیا کہ اُن کی سب ادائیں، غمزے اور عشوے ناکام ہو رہے ہیں تو دھمکی دی کہ نہیں مانو گے تو ہم یہیں جان دے دیں گی۔ چنانچہ اپنی اِس دھمکی کو سچ ثابت کرنے کے لیے اُن میں سے بعض نے اپنے ہاتھ جگہ جگہ سے زخمی کر لیے۔ لیکن جب یہ حربہ بھی کامیاب نہیں ہوا تو پکار اُٹھیں کہ یہ آدمی نہیں ہے، یہ تو کوئی

فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿٣٢﴾ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ

بارے میں تم مجھے ملامت کر رہی تھیں۔ بے شک، میں نے اِسے رجھانے کی کوشش کی تھی، مگر یہ بچ نکلا۔ تاہم میں جو کرنے کے لیے اِسے کہہ رہی ہوں، اِس نے اگر نہیں کیا تو ضرور قید کیا جائے گا اور ضرور ذلیل ہوگا۔[48] اِس پر یوسف نے دعا کی کہ پروردگار،

فرشتۂ یزدانی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''ان بیگمات کا یہ اعتراف حضرت یوسف کی کمال درجہ تعریف بھی ہے اور اپنی شکست کے لیے ایک عذر بھی۔ اِس کے اندر یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ اگر ہم اُن کو جیت نہ سکے تو اِس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے فن یا ہمارے حسن و جمال میں کوئی نقص تھا، بلکہ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں مقابلہ ایک معزز فرشتہ سے کرنا پڑا، جب کہ ہمارے سارے اسلحے صرف انسانوں ہی پر کارگر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/۲۱۰)

یہ سرگذشت اِس درجہ ایجاز و اختصار کے ساتھ کیوں نقل کی گئی ہے؟ اِس کا سبب غالباً یہ ہے کہ قرآن نے اِسے اپنے شایان شان نہیں سمجھا کہ اُن خرافات کی تفصیل کرے جو حضرت یوسف کا دل جیتنے کے لیے وہاں ہوئی ہوں گی۔

۴۸؎ یہ ایک مزید دھمکی ہے۔ زلیخا نے پہلے بڑے تیکھے انداز میں عورتوں کے ادعا کا جواب دیا ہے، پھر صاف کہہ دیا ہے کہ میں اِس کی جان چھوڑنے والی نہیں ہوں۔ اِس لیے یہ اپنی روش پر قائم رہا تو لازماً جیل کی ہوا کھائے گا۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ ہوس کی محبت دھمکی بھی دے رہی ہے اور اپنے سب حربوں میں ناکام ہو جانے کے بعد اپنی ناکامی کا انتقام لینے کا فیصلہ بھی کر رہی ہے۔ حضرت یوسف کے لیے یہ ایک نئی آزمایش تھی جس سے وہ اب دوچار ہونے والے تھے۔ زنان مصر کی اِس مجلس سے اُس زمانے کے مصر کی اخلاقی حالت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اِس طرح کے

وَاِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ کَیۡدَہُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡہِنَّ وَاَکُنۡ مِّنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۳۳﴾
فَاسۡتَجَابَ لَہٗ رَبُّہٗ فَصَرَفَ عَنۡہُ کَیۡدَہُنَّ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۴﴾
ثُمَّ بَدَا لَہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا رَاَوُا الۡاٰیٰتِ لَیَسۡجُنُنَّہٗ حَتّٰی حِیۡنٍ ﴿۳۵﴾
وَدَخَلَ مَعَہُ السِّجۡنَ فَتَیٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُہُمَاۤ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا ۚ

قید خانہ مجھے اُس چیز سے زیادہ پسند ہے جس کی یہ مجھے دعوت دے رہی ہیں۔ اب اگر اِن کے فریب کو تو نے مجھ سے دفع نہ کیا تو میں اِن کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور اُن لوگوں میں شامل ہو رہوں گا جو جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں[۴۹]۔ سو اُس کے پروردگار نے اُس کی یہ دعا قبول کر لی اور اُن کا فریب اُس سے دفع کر دیا۔ بے شک، وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۳۰-۳۴

پھر (اُس کی بے گناہی کی) یہ نشانیاں دیکھ لینے کے بعد بھی اُن لوگوں نے مصلحت یہی سمجھی کہ یوسف کو کچھ مدت کے لیے لازماً قید کر دیں[۵۰]۔ اُس کے ساتھ دو اور نوجوان بھی قید خانے میں داخل ہوئے[۵۱]۔ اُن میں سے ایک نے (ایک دن) اُس سے کہا: میں

معاملات میں وہ دورِ حاضر کی تہذیب سے کسی طرح کم ''ترقی یافتہ'' نہیں تھے۔

۴۹۔ یہ بڑے عجز کے ساتھ خدا سے مدد کی التجا ہے جو اپنے ایمان و اخلاق کو بچانے کے لیے پوری طاقت نچوڑ دینے کے بعد اُن کی زبان پر آ گئی ہے۔ آگے وضاحت ہے کہ یہ دعا فوراً قبول ہو گئی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جب بندہ شیطان کے مقابلے میں اِس حد تک استقامت دکھانے کے بعد اپنے آپ کو اپنے پروردگار کے آگے ڈال دیتا ہے تو اُس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور فوراً قبول ہوتی ہے۔

۵۰۔ یوسف علیہ السلام چونکہ غلام تھے، اِس لیے قدیم رواج کے مطابق آپ کو جیل بھیجنے کے

وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٣٦﴾ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ

خواب میں دیکھتا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں۔[52] دوسرے نے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھا رہی ہیں۔ ہمیں اِس کی تعبیر بتائیے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جو خوبی اختیار کرتے ہیں۔[53]

لیے کسی عدالتی کارروائی کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس زمانے کے آقاؤں کو اپنے غلاموں پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ چنانچہ آپ کے آقا نے بھی اپنے اِسی اختیار کے تحت آپ کو اِس خیال سے جیل بھجوا دیا کہ زلیخا کے دماغ سے اِن کا خبط بھی نکل جائے گا اور لوگ بھی یہی سمجھیں گے کہ جس کو سزا ملی ہے، قصور بھی اُسی کا ہو گا۔ قرآن کے الفاظ سے واضح ہے کہ دوسرے اعزہ واقربا بھی اِس فیصلے میں شریک تھے، اِس لیے کہ اپنی ناک بچانے کے لیے وہ بھی مصلحت اِسی میں دیکھ رہے تھے۔

۵۱؎ بائیبل کی روایت ہے کہ اِن میں سے ایک بادشاہ کا ساقی اور دوسرا نان پز تھا۔ تلمود میں مزید وضاحت ہے کہ شاہ مصر نے اِن نوجوانوں کو اِس قصور پر جیل بھیجا تھا کہ ایک دعوت کے موقع پر روٹیوں میں کچھ کرکراہٹ پائی گئی تھی اور شراب کے پیالے میں ایک مکھی نکل آئی تھی۔ ہمارے ہاں کی روایتوں میں اِس کے برخلاف یہ بیان کیا گیا ہے کہ دونوں پر الزام تھا کہ اُنھوں نے بادشاہ کے کھانے میں زہر ملانے کی کوشش کی ہے۔

۵۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا'۔ شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑے جاتے ہیں، لیکن قرآن نے یہاں شے کو اُس کی غایت کے لحاظ سے تعبیر کرنے کا اسلوب اختیار کیا ہے۔

۵۳؎ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قید خانے میں یوسف علیہ السلام کس نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اِن نوجوانوں نے جس طرح اُنھیں مخاطب کیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ جیل کے

تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٣٧﴾

یوسف نے کہا: یہاں جو کھانا تمھیں ملتا ہے، وہ آئے گا نہیں کہ اُس کے آنے سے پہلے میں تمھیں اِس کی تعبیر بتا دوں گا۔[54] یہ اُس علم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے۔[55] واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کے مذہب کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں

لوگ اُنھیں کوئی مجرم نہیں، بلکہ ایک نہایت نیک نفس انسان سمجھتے تھے اور اُنھیں معلوم تھا کہ اپنے اخلاق و کردار کی پاکیزگی وہ کیسی سخت آزمایشوں میں ثابت کر چکے ہیں۔ چنانچہ بائیبل کا بیان ہے کہ صرف قیدی ہی نہیں، قید خانے کے حکام اور اہل کار بھی اُن کے معتقد ہو چکے تھے۔ پیدایش میں ہے:

''قید خانے کے داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے، یوسف کے ہاتھ میں سونپا اور جو کچھ وہ کرتے، اُسی کے حکم سے کرتے تھے۔ اور قید خانے کا داروغہ سب کاموں کی طرف سے جو اُس کے ہاتھ میں تھے، بے فکر تھا۔'' (۳۹: ۲۲-۲۳)

۵۴؎ قید خانے کی زندگی میں کھانے کی تقسیم وغیرہ کے مواقع ہی شب و روز کی یکسانی میں کچھ تغیر پیدا کرتے ہوں گے۔ حضرت یوسف نے غالباً اِسی بنا پر اِس کا حوالہ دیا ہے۔ آگے کی آیتوں سے واضح ہے کہ تعبیر بتانے کے لیے یہ مہلت آپ نے صرف اِس لیے حاصل کی تھی کہ اِس سے فائدہ اٹھا کر آپ اپنی دعوت اُن کے سامنے پیش کر سکیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس کا اثر تعبیر پوچھنے والوں پر تو یہ پڑا ہو گا کہ حضرت یوسف نے اُن کے خوابوں کو اہمیت دی ہے۔ وہ سرسری طور پر الٹی سیدھی کوئی بات بتا کر اُن کو ٹالنا نہیں چاہتے، بلکہ سوچ کر یا اپنے رب سے رجوع کرنے کے بعد اُن کی تعبیر بتائیں گے اور اُدھر خود حضرت یوسف نے اِس التوا سے اُس حق کی تبلیغ کے لیے ایک نہایت اچھا موقع پیدا کر لیا جو اُن کی زندگی کا سب سے زیادہ محبوب مقصد بن چکا تھا۔ اُنھوں نے جب دو دلوں کو اپنی طرف مائل دیکھا تو صرف اُن کی

وَاتَّبَعۡتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَاِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنۡ نُّشۡرِكَ بِاللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ عَلَیۡنَا وَعَلَی النَّاسِ

رکھتے اور وہی آخرت کے منکر ہیں۔[55] اور میں نے اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کا مذہب اختیار کر لیا ہے۔[56] ہم کو حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھیرائیں۔ یہ ہم پر

اندھی بہری عقیدت ہی پر قانع نہیں ہو گئے، بلکہ چاہا کہ اُن کو اللہ کی بندگی کی وہ دعوت پہنچا دیں جو اگر وہ قبول کر لیں تو اُن کی دنیا اور آخرت، دونوں سنور جائیں۔'' (تدبر قرآن ۴/۲۱۸)

۵۵ یہ نہایت عمدہ تمہید ہے جس سے یوسف علیہ السلام نے اُن نوجوانوں کی ضرورت کو اپنی ذات سے اٹھا کر نہایت خوبی کے ساتھ اپنے پروردگار سے متعلق کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کے لیے میرے پاس آئے ہو، اُس کا منبع اور سرچشمہ میں نہیں، بلکہ میرا پروردگار ہے۔ چنانچہ خواب کی تعبیر جاننا چاہتے ہو تو تھوڑی دیر کے لیے ٹھیر کر تعبیر کا علم دینے والے کی معرفت بھی حاصل کر لو۔

۵۶ یہ اِس حقیقت کا اظہار ہے کہ میں نے جو کچھ چھوڑا اور جو کچھ اختیار کیا ہے، اپنے باطن میں اچھی طرح اُس کا تجزیہ کر کے اور علم و عقل کی میزان میں اُس کو تول کر چھوڑا اور اختیار کیا ہے۔ اِس سے، اگر غور کیجیے تو اُنھوں نے یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ خدا پر ایمان کے ساتھ مشرکانہ عقائد کے پیوند کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اِسے اختیار کیا جائے تو اُن لوگوں کے طریقے کو لازماً چھوڑنا پڑتا ہے جو خدا کے شریک ٹھیراتے یا خدا اور آخرت پر سچا ایمان نہیں رکھتے۔

۵۷ یہ حوالہ جس انداز سے دیا گیا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن بزرگوں کے نام اُن لوگوں کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام نے اِن کا نام لے کر ایک ہی جملے میں پوری دعوت کا تعارف بھی کرا دیا اور یہ بات بھی واضح کر دی کہ میں کوئی نئی بات لے کر نہیں آیا، بلکہ وہی پیغام تمھیں پہنچا رہا ہوں جو یہ اکابر و مشاہیر اِس سے پہلے پہنچاتے رہے ہیں۔ اُن کے

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

اور تمام انسانوں پر اللہ کا فضل ہے (کہ اُس نے یہ حقیقت اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے واضح کر دی ہے)، لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ میرے زنداں کے ساتھیو، کیا الگ الگ بہت سے خدا بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ تم اُس کے سوا چند ناموں ہی کی بندگی کر رہے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے اُن کی کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اقتدار صرف اللہ کا ہے۔ اُس نے حکم دیا ہے کہ خود اُس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی دین قیم ہے، مگر بہت سے لوگ (اِس حقیقت کو) نہیں جانتے[۵۸]۔ ۳۵-۴۰

مخاطبین نے اِس پر کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ اِس سے یہ بات مزید واضح ہوئی کہ اُس وقت تک جیل کے لوگ جان چکے تھے کہ وہ کس خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔

۵۸؎ یوسف علیہ السلام کی یہ تقریر قرآن میں توحید کی بہترین تقریروں میں سے ہے، اور ٹھیک اُس موقع پر کی گئی، جب مخاطبین اِس کو سننے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔ اِس میں اُنھوں نے پہلے اُن کی توجہ علم و حکمت کے اصل سرچشمے کی طرف مبذول کرائی ہے۔ پھر اُس سفر کا حوالہ دیا ہے جو خود اُنھوں نے باطل کو چھوڑ کر حق تک پہنچنے کے لیے کیا ہے۔ اِس کے بعد ملت توحید کی تاریخی عظمت اور اہمیت واضح کی ہے۔ پھر بندگی کا یہ تقاضا واضح کیا ہے کہ بندہ ہو کر کسی کو خدا کا

يَٰصَٰحِبَيِ ٱلسِّجۡنِ أَمَّآ أَحَدُكُمَا فَيَسۡقِي رَبَّهُۥ خَمۡرٗاۖ وَأَمَّا ٱلۡأٓخَرُ فَيُصۡلَبُ فَتَأۡكُلُ ٱلطَّيۡرُ مِن رَّأۡسِهِۦۚ قُضِيَ ٱلۡأَمۡرُ ٱلَّذِي فِيهِ تَسۡتَفۡتِيَانِ ﴿٤١﴾

میرے زنداں کے ساتھیو، (تمھارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ) تم میں سے ایک تو (اپنے منصب پر بحال ہو جائے گا اور) اپنے آقا کو شراب پلائے گا۔ رہا دوسرا تو اُسے سولی دی جائے گی، پھر پرندے اُس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ اُس بات کا فیصلہ ہوا جس کے بارے میں تم دونوں پوچھ رہے تھے۔ ۴۱

یوسف
۱۲

شریک ٹھیرایا جائے، اِس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اِس کے بعد خدا کے اُس امتنان و احسان کی طرف توجہ دلائی ہے جو اُس نے پیغمبروں کی بعثت سے انسانیت پر کیا ہے۔ پھر اُن نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے اور دیکھیے کہ کس دل نواز انداز سے مخاطب کیا ہے۔ ہم دردی اور محبت کے جذبات جو مصیبت کے اشتراک سے ایک دوسرے کے لیے پیدا ہو جاتے ہیں، یہ خطاب اُن کو بڑی بلاغت کے ساتھ ابھارتا ہے تاکہ مخاطبین اِس کو پوری توجہ کے ساتھ سنیں اور اِس کے ہر لفظ کو باہمی خیر خواہی اور اخلاص پر محمول کریں۔ اِس کے بعد اصل دعوت پیش کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک خدا کا تعلق ہے، وہ تو ایک بدیہی حقیقت، بلکہ ابدہ البدیہیات ہے اور اُس کے بندے مجبور ہیں کہ اُس کی آقائی کو تسلیم کریں، لیکن اُس کے ساتھ کچھ دوسروں کو بھی آقا تسلیم کر لیا جائے، یہ کہاں کی دانش مندی ہے؟ کون یہ پسند کرے گا کہ بغیر کسی ضرورت کے کسی کی غلامی کا پٹا اپنی گردن میں ڈال لے؟ پھر مزید یہ کہ ایک ایسی بات کیوں مانی جائے جس کی کوئی ادنیٰ شہادت نہ ہماری عقل میں ہے، نہ فطرت میں اور نہ انفس و آفاق میں؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ خدا نے بتایا ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اِس کے حق میں بھی کوئی چیز پیش نہیں کی جا سکتی۔ جو کچھ مانا جا رہا ہے، وہ محض نام ہیں جو بغیر کسی دلیل کے لوگوں نے رکھ لیے ہیں۔ تمام اقتدار خدا کا ہے اور جو دین اُس نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے اتارا ہے، اُس میں بھی ہمیشہ یہی ہدایت کی گئی

وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ؗ فَاَنْسٰهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ ﴿۴۲﴾ؕ وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ

اُن میں سے جس کی نسبت یوسف نے خیال کیا کہ وہ رہا ہو جائے گا، اُس نے اُس سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا۔[59] مگر شیطان نے اُس کو اپنے آقا سے یہ ذکر کرنا بھلا دیا[60] اور یوسف کئی سال تک (اُسی طرح) قید خانے میں پڑا رہا۔۴۲

(پھر ایک دن) بادشاہ نے (اپنے دربار کے لوگوں سے) کہا: میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں جنھیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات بالیں ہری اور دوسری سات سوکھی ہیں (اور وہ بھی ہری بالیوں کو کھا رہی ہیں)[61]۔ دربار کے

ہے کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، اِس لیے اُسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھا دین ہے، مگر افسوس کہ لوگوں کی اکثریت اِس سے بے خبر ہے۔

۵۹۔ اوپر گزر چکا ہے کہ یہ بادشاہ کا ساقی تھا، اِس لیے آقا سے مراد شاہ مصر ہے۔ یوسف علیہ السلام نے یہ خواہش اِس توقع کی بنا پر کی کہ یہ اپنے مشاہدات، خاص طور پر خواب کی تعبیر بتانے کا واقعہ بادشاہ کو بتائے گا تو ہوسکتا ہے کہ ایسی کوئی ضرورت وہاں بھی پیش آ جائے اور اِس طرح اِس مظلومانہ قید سے رہائی کی صورت پیدا ہو۔

۶۰۔ اصل الفاظ ہیں: 'فَاَنْسٰهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ'۔ اِس میں 'ذِكْرَ رَبِّهٖ' کی اضافت اُسی نوعیت کی ہے جو 'مَكْرُ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ' وغیرہ میں ہے۔ انسان کو نیکی کے کاموں سے شیطان ہی غافل کرتا ہے، مگر اِس کی مہلت اُسے خدا کے اذن سے ملتی ہے۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی

فِىْ رُءْيَاىَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَقَالَ الَّذِىْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

لوگو، مجھے میرے خواب کی تعبیر بتاؤ، اگر تم خواب کی تعبیر دیتے ہو[۶۲]۔ لوگوں نے کہا: یہ پریشان خواب ہیں اور ہم اِس طرح کے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے[۶۳]۔ اُن دو قیدیوں میں سے جو چھوٹ گیا تھا اور اُسے ایک مدت کے بعد یاد پڑا[۶۴]، اُس نے کہا: میں آپ لوگوں کو اِس کی تعبیر بتاؤں گا، (جاننا چاہتے ہوں) تو مجھے ذرا (قید خانے میں یوسف کے پاس) بھیج دیجیے[۶۵]۔ ۴۳-۴۵

حکمت و مصلحت کا تقاضا ابھی یہی تھا کہ حضرت یوسف کچھ سال اور اِسی طرح قید خانے میں گزاریں۔ چنانچہ وہ شخص جیل سے باہر آیا تو اُسے بالکل یاد نہیں رہا کہ زنداں کے ساتھی نے اُس سے کیا بات کہی تھی۔

۶۱؎ یہ حصہ آیت میں محذوف ہے۔ آگے آیت ۴۸ میں اِس کی وضاحت ہوگئی ہے۔

۶۲؎ اِس آخری فقرے سے مترشح ہے کہ بادشاہ اگرچہ اپنے اِس خواب سے بہت زیادہ متاثر تھا، مگر یہ بھی جانتا تھا کہ اِس کی تعبیر بتانا اتنا آسان نہیں ہے۔

۶۳؎ یہ فقرہ اُنھوں نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا خواب بامعنی ہوتا تو ضرور ہم اُس کی تعبیر بتاتے، لیکن یہ تو بالکل پریشان خواب ہے، اِس لیے مطمئن ہو جائیے، اِس طرح کے خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

۶۴؎ یہ بھی خدا کے اذن سے ہوا، اِس لیے کہ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ یوسف قید سے باہر آئیں اور مصر کے سیاہ وسفید کے مالک بن جائیں۔

۶۵؎ قرآن نے یہاں بھی اپنے اسلوب کے مطابق تفصیلات حذف کر دی ہیں۔ بائیبل اور

يُوسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ

(اُس نے جا کر کہا): یوسف، اے سراپا راستی،[۶۶] ہمیں سات موٹی گایوں کے بارے میں بتاؤ جنھیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری اور دوسری سات سوکھی بالیوں کے بارے میں، اِس لیے کہ میں لوٹ کر اُن لوگوں کے پاس جاؤں تا کہ (اٹکل کے تیر چلانے کے بجاے) وہ بھی جان لیں (کہ اِس خواب کی حقیقت کیا ہے)۔ یوسف نے کہا: سات برس تک تم برابر کھیتی کرو گے، لہٰذا جو فصل تم کاٹو، اُس میں سے تھوڑا سا نکال کر جو تم کھاؤ گے، باقی سب اُس کی بالیوں میں چھوڑ دو (تا کہ خراب نہ ہو)۔ اِس کے بعد پھر سات برس بہت سخت آئیں گے جو تھوڑی مقدار کے سوا جسے تم محفوظ کر لو گے، وہ غلہ کھا جائیں گے جو اُن برسوں کے لیے تم نے فراہم کیا

تالمود سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس شخص نے پہلے یوسف علیہ السلام اور جیل میں اُن سے اپنی ملاقات اور خوابوں کی تعبیر پوچھنے کا پورا قصہ بادشاہ اور اُس کے درباریوں کو تفصیل کے ساتھ سنایا، اِس کے بعد اُن سے کہا کہ مجھے جانے دیجیے، میں اِس خواب کی تعبیر بھی اُنھی سے پوچھ کر آتا ہوں۔

۶۶؎ یہ خطاب بتا رہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو وہ محض خوابوں کی تعبیر بتانے والا ایک شخص نہیں سمجھتا تھا، بلکہ جیل میں اپنے تجربات کی بنا پر جان چکا تھا کہ آپ فی الواقع ایک پیکر صداقت اور

یوسف ۱۲

يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿٤٩﴾

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۚ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي

ہوگا۔[٦٧] اِس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا کہ جس میں (بارانِ رحمت سے) لوگوں کی فریاد رسی کی جائے گی[٦٨] اور وہ اُس میں انگور نچوڑیں گے۔[٦٩] ٤٦-٤٩

(یہ تعبیر دربار میں سنائی گئی تو) بادشاہ نے کہا: اُسے میرے پاس لاؤ۔ مگر جب قاصد یوسف کے پاس (اُسے لینے کے لیے) پہنچا تو اُس نے کہا: اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اُس سے پوچھو کہ اُن عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ

صدق مجسم شخصیت ہیں جو خوابوں کی تعبیر بھی بتا دیتے ہیں۔

٦٧۔ یوسف علیہ السلام نے صرف تعبیر نہیں بتائی، اُس کے ساتھ اُس تدبیر کی طرف بھی رہنمائی فرما دی ہے جو قحط کے اِن سات برسوں کی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے اختیار کرنی چاہیے۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل کی منصوبہ بندی کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر صوفیانہ مذاہب سے کس قدر مختلف ہے۔

٦٨۔ اصل میں لفظ 'یُغَاثُ' آیا ہے۔ یہ 'غوث' سے ہے۔ تاہم اِس کے لازم کی حیثیت سے اِس کا ترجمہ بارش بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن ہم نے اِسے لغوی مفہوم میں لیا ہے تاکہ قحط سے جو ہمہ گیر اثرات لوگوں پر ہوں گے، اُن کی پوری تصویر سامنے آ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا غیر معمولی ہوگا کہ لوگ چیخ اُٹھیں گے اور اپنے پروردگار کے آگے رونے اور گڑگڑانے پر مجبور ہو جائیں گے، یہاں تک کہ بالآخر اُن کی فریاد سن لی جائے گی۔

٦٩۔ اصل میں لفظ 'یَعْصِرُوْنَ' آیا ہے۔ اِس کی جگہ کوئی دوسری تعبیر بھی اختیار کی جا سکتی تھی، لیکن پوچھنے والا چونکہ بادشاہ کا ساقی تھا، اِس لیے اِس لفظ کا انتخاب کیا گیا جس سے ایک خاص

بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴿۵۰﴾ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ز اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ

لیے تھے؟[69] میرا پروردگار تو اُن کے فریب سے خوب واقف ہے۔ بادشاہ نے اُنھیں (بلا کر) پوچھا: تمھارا کیا ماجرا ہے، جب تم نے یوسف کو پھسلانے کی کوشش کی تھی؟[70] سب نے گواہی دی کہ حاشاللہ، ہم نے اُس میں برائی کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا۔ عزیز کی بیوی بھی بول اٹھی: اب حق کھل چکا ہے۔ یہ میں ہی تھی جس نے اُس کو پھسلانے کی

لطف کلام میں پیدا ہو گیا ہے۔

۷۰۔ یوسف علیہ السلام کی جگہ کوئی اور ہوتا تو رہائی کا مژدہ پا کر فوراً ساتھ ہو لیتا، مگر اُنھوں نے اصرار کیا کہ پہلے اُس معاملے کی تحقیق کی جائے جس کو بہانہ بنا کر مجھے جیل بھیجا گیا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...حضرت یوسف کے اِس ارشاد کی تہ میں اتر کر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ اُنھوں نے مجرد بادشاہ کے وقتی حسن ظن سے فائدہ اٹھا کر اپنی رہائی اور بادشاہ کے تقرب کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ سب سے زیادہ اہمیت الزام سے براءت کو دی اور اپنی سچائی اور اپنے رب پر اُنھیں اِس درجہ اعتماد تھا کہ اِس بات کی ذرا پروا نہ ہوئی کہ فریق ثانی اُنھیں ملزم بنانے کے لیے کیا دروغ بافیاں کر سکتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۲۲۴)

۷۱۔ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ اُس وقت تک یہ حقیقت بادشاہ پر بھی بڑی حد تک واضح ہو چکی تھی کہ سارا چھل فریب عورتوں ہی کا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اصل یہ ہے کہ سچائی اپنے ظہور کے لیے صبر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اُس کو اختیار کر لے اور جو صبر اُس کے لیے مطلوب ہے، اُس کا حق ادا کر دے تو وہ وقت لازماً آتا ہے، جب اُس کی صداقت کی صداے بازگشت در و دیوار سے سنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ دشمن

الصّٰدِقِيْنَ ﴿٥١﴾
ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿٥٢﴾ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٥٣﴾
وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ

کوشش کی تھی، اِس میں شبہ نہیں کہ وہ بالکل سچا ہے۔۵۰-۵۱

(یوسف نے کہا): اِس سے میری غرض یہ تھی کہ عزیز یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اُس کی خیانت نہیں کی تھی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں، اُن کی چال کو اللہ چلنے نہیں دیتا۔[2] میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو برائی پر اکساتا ہی ہے، اِلّا یہ کہ جب میرا پروردگار رحم فرمائے۔[3] حقیقت یہ ہے کہ میرا پروردگار بڑا بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔۵۲-۵۳

بادشاہ نے کہا: اُس کو میرے پاس لاؤ، میں اُسے اپنے لیے خاص رکھوں گا۔[4]

بھی... اُس کی گواہی دیتے ہیں۔'' (تدبرقرآن ۴/ ۲۲۴)

۲؎ یہ حضرت یوسف نے معاملے کی تحقیق پر اپنے اصرار کی وجہ بتائی ہے۔ اِس کا موقع غالباً اُس وقت آیا ہوگا، جب قید خانے میں اُنھیں تحقیقات کے نتائج بتائے گئے ہوں گے۔

۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ'۔ اِن میں 'مَا' ہمارے نزدیک زمان کے معنی میں ہے۔ ترجمے میں اُسی کی رعایت ملحوظ ہے۔

۴؎ اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ بادشاہ کے خواب کی نہایت دل نشیں تعبیر اور اُس کے ساتھ جس ہول ناک قحط کے ظہور کی خبر خواب میں دی گئی تھی، اُس کے مقابلے کی تدبیر، الزامات کی تحقیق

قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

پھر جب اُس سے بات چیت کی تو (اِس قدر متاثر ہوا کہ) اُس نے کہا: اب تم ہمارے ہاں صاحب اقتدار ہو اور تم پر بھروسا کیا جائے گا۔[۵۷] یوسف نے کہا: اِس ملک کے خزانے میرے سپرد کر دیجیے، اِس لیے کہ میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔[۶۷] ۵۴-۵۵

کے بغیر رہائی کی پیش کش قبول کرنے سے انکار اور اِس کے نتیجے میں عزیز کی بیوی اور دوسری عورتوں کا اعتراف حق، استاذ امام کے الفاظ میں، اِن تینوں میں سے کوئی ایک بات بھی بادشاہ کو حضرت یوسف کا گرویدہ بنانے کے لیے کافی ہو سکتی تھی، لیکن جس شخص کے باب میں یہ تینوں باتیں اکٹھی بادشاہ کے علم میں آئیں، آخر وہ اُس کا نادیدہ عاشق نہ ہو جاتا تو اور کیا کرتا۔ چنانچہ اُس نے اعلان کر دیا کہ میں یوسف کو اپنا معتمد خاص بنا رہا ہوں۔

۵۷۔ یہ بادشاہ کی طرف سے نظم حکومت میں بڑے سے بڑے منصب کی پیش کش ہے جو اُس نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ گفتگو کے نتیجے میں آپ کے علم، آپ کی لیاقت اور صلاحیت و استعداد کو دیکھ کر کی ہے، لیکن آپ اِس پیش کش کو کس صورت میں قبول فرماتے ہیں، اِسے آپ کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔

۶۷۔ یوسف علیہ السلام جس قحط کی پیشین گوئی کر چکے تھے، اِس وقت سب سے بڑی مہم اُسی میں ملک کو سنبھالنے کی تھی۔ بادشاہ کی سب سے بڑی خواہش بھی اِس صورت حال میں یہی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے اِسی کے مطابق اپنی رائے بادشاہ کے سامنے رکھ دی۔ یہ کم و بیش اُسی اختیار و اقتدار کا مطالبہ ہے جو پارلیمانی نظام حکومت میں کسی ملک کے وزیر اعظم کو حاصل ہوتا ہے۔ بائیبل میں ہے:

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

یوسف کو اِس طرح ہم نے اُس ملک میں اقتدار عطا فرمایا، وہ اُس میں جہاں چاہے، اپنی جگہ بنائے۔ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں، نوازتے ہیں اور خوبی

یوسف
۱۲

''اور فرعون نے یوسف سے کہا: چونکہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ سمجھا دیا ہے، اِس لیے تیری مانند دانش ور اور عقل مند کوئی نہیں۔ سوتو میرے گھر کا مختار ہوگا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا۔ اور فرعون نے یوسف سے کہا کہ دیکھ میں تجھے سارے ملک مصر کا حاکم بناتا ہوں۔ اور فرعون نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسف کے ہاتھ میں پہنا دی اور اُسے باریک کتان کے لباس میں آراستہ کروا کر سونے کا طوق اُس کے گلے میں پہنایا۔ اور اُس نے اُسے اپنے دوسرے رتھ میں سوار کرا کر اُس کے آگے آگے یہ منادی کروا دی کہ گھٹنے ٹیکو اور اُس نے اُسے سارے ملک مصر کا حاکم بنا دیا اور فرعون نے یوسف سے کہا: میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اِس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پائے گا۔'' (پیدایش ۴۱: ۳۹-۴۴)

یہاں یہ بات واضح رہے کہ یوسف علیہ السلام کے ہم عصر اِس بادشاہ کے لیے لفظ 'فرعون' کا استعمال بائیبل کے مرتبین کی غلطی ہے۔ یہ بادشاہ مصری حکمرانوں کے پندرھویں خاندان سے تھا جو تاریخ میں چرواہے بادشاہوں (Hyksos Kings) کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ عربی النسل تھے اور شام و فلسطین سے مصر جا کر ۲ ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں مصر کی حکومت پر قابض ہو گئے تھے۔ عرب مورخین اِنھیں عمالیق کہتے ہیں۔ دور حاضر کے محققین کی عام رائے ہے کہ چرواہے بادشاہوں میں سے جس حکمران کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس (Apophis) ملتا ہے، وہی حضرت یوسف کا ہم عصر تھا۔ فرعون مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ مصری مذہب کو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ یہ نام اُن قبطی النسل بادشاہوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اِن کی حکومت

وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ ﴿۵۷﴾ وَجَآءَ اِخۡوَةُ يُوۡسُفَ فَدَخَلُوۡا عَلَيۡهِ فَعَرَفَهُمۡ وَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ ﴿۵۸﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُمۡ بِجَهَازِهِمۡ قَالَ ائۡتُوۡنِىۡ بِاَخٍ لَّكُمۡ

اختیار کرنے والوں کا اجر ہم کبھی ضائع نہیں کرتے۔[۷۸] آخرت کا اجر، البتہ اُن لوگوں کے لیے اِس سے کہیں بڑھ کر ہے جو ایمان لائے اور (خدا سے) برابر ڈرتے رہے۔ ۵۶-۵۷

(اِس کے کئی برس بعد) یوسف کے بھائی مصر آئے[۷۹] اور اُس کے ہاں بھی حاضر ہوئے[۸۰] تو اُس نے اُنھیں پہچان لیا، مگر اُنھوں نے یوسف کو نہیں پہچانا۔[۸۱] (پھر اُن کی واپسی کے وقت)، جب اُس نے اُن کا سامان تیار کرایا تو اُن سے کہا: (اب آؤ گے

ختم کر کے اِن کے بعد پندرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں کسی وقت برسر اقتدار آئے۔

۷۷؎ یعنی جہاں چاہے، فروکش ہو، جس حصۂ ملک کا چاہے، دورہ کرے، مصر اُس کا ہے، اُس میں جو نظم و نسق جس جگہ اور جس کے لیے ضروری سمجھے، اُس کا حکم جاری کر دے۔ یہ اُس ہمہ گیر اقتدار و اختیار کا بیان ہے جو بادشاہ کے فرمان سے یوسف علیہ السلام کو اُس ملک میں حاصل ہو گیا۔

۷۸؎ مطلب یہ ہے کہ اُن کی خوبی عمل کا اجر اُن کو دنیا میں بھی کسی نہ کسی صورت میں لازماً دیتے ہیں۔

۷۹؎ آگے کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی غلہ خریدنے کی غرض سے مصر آئے تھے۔ حضرت یوسف نے جس قحط کی پیشین گوئی کی تھی، وہ شروع ہو چکا تھا اور اُس نے مصر اور اُس کے ملحقہ ممالک شام و فلسطین وغیرہ، سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تاہم یوسف علیہ السلام کی پیش بندی اور حسن انتظام کی وجہ سے مصر نہ صرف یہ کہ اپنے جمع شدہ غلے سے اپنی ضروریات پوری کر رہا تھا، بلکہ پاس پڑوس کے ملکوں سے دوسرے ضرورت مندوں کو بھی اجازت دی گئی تھی کہ وہ اگر چاہیں تو وہاں آ کر ایک معین مقدار میں غلہ خرید سکتے ہیں۔

مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

تو) اپنے سوتیلے بھائی کو بھی میرے پاس لانا، دیکھتے نہیں ہو کہ میں غلہ بھی پورے پیمانے سے دیتا ہوں اور بہت اچھی میزبانی کرنے والا بھی ہوں۔ لیکن اگر تم اُس کو میرے پاس نہیں لاؤ گے تو نہ میرے پاس تمھارے لیے غلہ ہے اور نہ تم میرے قریب پھٹکنا۔[۸۲] اُنھوں نے کہا: ہم اُس کے بارے میں اُس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم یہ ضرور کرلیں گے۔[۸۳] ۵۸-۶۱

۸۰۔ یوسف علیہ السلام کے بھائی چونکہ بیرونی تھے، اِس لیے غلہ خریدنے کے لیے اُنھیں خاص اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ یہ حاضری غالباً اِسی مقصد سے ہوئی۔

۸۱۔ یہ نہ پہچاننا کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔ جس وقت اُنھوں نے آپ کو کنویں میں پھینکا تھا، اُس وقت آپ صرف ۱۷ سال کے تھے اور اب آپ کی عمر ۳۸ سال ہو چکی تھی۔ یہ کم و بیش ۲۰ سال کا عرصہ ہے۔ اتنی مدت آدمی کو بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ آگے آیت ۹۰ سے اشارہ نکلتا ہے کہ آپ کی شکل و صورت میں اُنھیں اپنے بھائی کی جھلک ضرور نظر آئی، مگر جلد ہی اِس خیال کو اُنھوں نے اپنے دل سے نکال دیا، اِس لیے کہ وہ یہ گمان کسی طرح نہیں کر سکتے تھے کہ جس شخص کو اُنھوں نے اندھے کنویں میں ڈال دیا تھا، وہ آج مصر کے تخت حکومت پر متمکن ہے۔

۸۲۔ غلے کی ضابطہ بندی کی جائے تو بالعموم یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر ضرورت مند کو اُس کے افراد خاندان کے حساب سے غلہ دیا جائے۔ اِن لوگوں نے اپنے بھائی بن یمین کے نام پر بھی غلہ حاصل کیا ہوگا۔ اِس سے حضرت یوسف کو موقع مل گیا کہ وہ اصرار کریں کہ اِس وقت تو میں نے تمھاری بات مان لی ہے کہ پیچھے تمھارا ایک بھائی اور بھی ہے، لیکن آیندہ اُس کو لے کر آنا ہوگا۔

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾ فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾

یوسف
۱۲

یوسف نے اپنے خدام سے کہا کہ اِن لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے، وہ (چپکے سے) اِن کے کجاووں ہی میں رکھ دو۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ جب وہ اپنے اہل و عیال میں پہنچیں تو اُسے پہچان لیں (کہ اُنھی کا مال ہے جو اُنھیں واپس کر دیا گیا ہے) تاکہ وہ پھر آئیں۔[۸۴] سو جب وہ اپنے باپ کے پاس لوٹے تو کہا: ابا جان، (آیندہ) ہم سے غلہ روک دیا گیا ہے، لہٰذا ہمارے بھائی، (بن یمین) کو بھی ہمارے ساتھ جانے دیجیے کہ ہم (اپنی سچائی ثابت کر سکیں اور) غلہ لائیں، ہم اُس کی حفاظت کا عہد کرتے ہیں۔ باپ نے جواب دیا: کیا میں اُس کے معاملے میں بھی تم پر ویسا ہی بھروسا کروں، جیسا اِس سے پہلے اُس کے بھائی کے معاملے میں تم پر بھروسا کر چکا

نہیں لاؤ گے تو تمھیں جھوٹا سمجھا جائے گا، لہٰذا اِس کے بعد تم میرے قریب بھی پھٹکنے کی کوشش نہ کرنا۔

۸۳؎ یعنی اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ اِس فقرے میں اُن کے دل کا چور نمایاں ہے کہ نہ لا سکے تو اِس کی وجہ صرف یہ ہو گی کہ باپ نے اجازت نہیں دی۔ اِس لیے کہ جو کچھ وہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ کر چکے تھے، اُس کے بعد اِس کا پورا امکان تھا۔

۸۴؎ یہ اِس لیے فرمایا کہ مال کی کمی اُن کے دوبارہ آنے میں رکاوٹ نہ بن جائے۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿٦٥﴾ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ

ہوں؟ سو اللہ بہترین محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے[۸۵]۔ ۶۲-۶۴

(اِس کے بعد) جب اُنھوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ اُن کی پونجی بھی اُنھیں لوٹا دی گئی ہے۔ (یہ دیکھ کر) وہ پکار اُٹھے: ابا جان، ہمیں اور کیا چاہیے! (دیکھیے)، یہ ہماری پونجی ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔ اب ہم جائیں گے، اپنے اہل وعیال کے لیے رسد لائیں گے[۸۶]، اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے، ایک بار شتر غلہ زیادہ حاصل کریں گے[۸۷]، یہ غلہ (جو اِس وقت ہم لائے ہیں، یہ) تھوڑا ہے[۸۸]۔ باپ نے جواب دیا: میں اُس کو ہرگز تمھارے ساتھ نہ بھیجوں گا، جب تک تم خدا کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرو کہ تم اُس کو

۸۵۔ مدعا یہ ہے کہ تمھارے بھروسے کا تجربہ تو اِس سے پہلے کر چکا ہوں، لہٰذا بھیجنا پڑا تو خدا ہی کے بھروسے پر بھیجوں گا، تمھارے بھروسے پر نہیں بھیجوں گا۔

۸۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا'۔ اِن کا معطوف علیہ وضاحت قرینہ کی بنا پر محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۸۷۔ اِس سے معلوم ہوا کہ غلے کی ضابطہ بندی اِس طرح کی گئی تھی کہ اُس میں بیرونی ضرورت مند ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ حاصل کر سکتے تھے۔

۸۸۔ اِن جملوں کی بلاغت دیکھیے، قرآن نے اُن کی بات اِس طرح نقل کی ہے کہ استاذ امام کے الفاظ میں اُن کی خوشی اُن کے فقرے فقرے سے ابلی پڑ رہی ہے۔

فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿٦٦﴾

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا

یوسف ۱۲

ضرور میرے پاس واپس لاؤ گے، الّا یہ کہ تم کہیں گھِر جاؤ۔ سو (اُس کے اصرار پر) جب اُنھوں نے اُس کو اپنا پکا قول دے دیا تو اُس نے کہا: یہ قول و قرار جو ہم کر رہے ہیں، اِس پر اللہ نگہبان ہے۔۶۵-۶۶

(پھر روانہ ہونے لگے تو) اُس نے اُن کو ہدایت کی کہ میرے بیٹو، تم سب ایک ہی دروازے سے (مصر کے دارالسلطنت میں) داخل نہ ہونا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا[۸۹]۔ (مجھے معلوم ہے کہ یہ محض ایک تدبیر ہے) اور اللہ کے مقابل میں میں تمھارے کچھ بھی کام آنے والا نہیں ہوں۔ تمام اختیار تو اللہ ہی کا ہے۔ میں نے اُسی پر بھروسا کیا ہے اور بھروسا کرنے والوں کو اُسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ چنانچہ جس وقت وہ شہر میں داخل ہوئے، جہاں سے اُن کے باپ نے اُن کو ہدایت کی تھی تو ایسا ہی تھا کہ (اگر اللہ کی طرف سے اُن کے لیے کچھ لکھا ہوتا تو) اللہ کے

۸۹؎ یہ اِس لیے فرمایا کہ ایک ہی وقت میں گیارہ قبائلی جوان جب ایک جتھے کی صورت میں شہر میں داخل ہوں گے تو ہو سکتا ہے کہ اُنھیں مشتبہ سمجھا جائے اور شہر کے لوگ یہ گمان کریں کہ اِس قحط کے زمانے میں یہ لوٹ مار کی غرض سے یہاں آئے ہیں۔

عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾
وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْۤ اَنَا اَخُوْكَ
فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ
جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ

مقابل میں وہ اُن کے کچھ بھی کام آنے والا نہیں تھا۔ ہاں، بس یعقوب کے دل میں ایک خواہش تھی جو اُس نے پوری کر لی[۹۰]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ اُس علم سے بہرہ مند تھا جو ہم نے اُسے سکھایا تھا، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۹۱]۔ ۶۷-۶۸

اور یہ لوگ جب یوسف کے حضور پہنچے تو اُس نے اپنے بھائی کو خاص اپنے پاس جگہ دی۔ (پھر تنہائی کے کسی وقت میں) اُس نے اُسے بتایا کہ میں تمھارا بھائی، (یوسف) ہوں۔ سو جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں، اب اُس کا غم نہ کرو[۹۲]۔ پھر (اُن کی واپسی کے وقت)، جب اُن کا سامان تیار کرایا تو اپنا پیالہ (ازراہ محبت) اپنے بھائی

۹۰ یہ تدبیر اور تقدیر کے باہمی تعلق کو واضح کر دیا ہے کہ تقدیر بہرحال اٹل ہے، کوئی تدبیر بھی اُس کو بدل نہیں سکتی۔ انسان صرف یہ کر سکتا ہے کہ حالات و مصالح کے لحاظ سے جو خیال اُس کے دل میں آئے، اُسے پورا کر لے۔ اِس سے زیادہ کوئی چیز اُس کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنی ہر تدبیر کے بارے میں بندۂ مومن کو یہی حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے۔

۹۱ یعنی اُس علم سے بہرہ مند تھا جو انسان کو بتاتا ہے کہ خدا کی مشیت ہر چیز پر حاوی ہے، لیکن اِس کے باوجود انسان کا فرض ہے کہ وہ ضروری تدبیر کرے، اِس لیے کہ خدا کی تقدیر بعض اوقات اُسی تدبیر سے وابستہ ہوتی ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۹۲ مطلب یہ ہے کہ تمھارے آزردہ خاطر رہنے کے دن ختم ہوئے۔ خدا کی مدد شامل حال

لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَبَدَاَ

کے سامان میں رکھ دیا۔[۹۳] اِس کے بعد (خدا کی قدرت سے ایسا ہوا کہ عین اُسی وقت) ایک پکارنے والے نے پکارا کہ قافلے والو، تم یقیناً چور ہو۔ اُنھوں نے اُن کی طرف پلٹ کر پوچھا: تمھاری کیا چیز کھوئی گئی ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہم بادشاہ کا پیمانہ نہیں پا رہے ہیں۔ (اُن کے جمعدار نے کہا): اور جو اُس کو لائے گا، اُس کے لیے ایک بارِ شتر غلہ ہے، میں اِس کا ذمہ لیتا ہوں۔ یوسف کے بھائیوں نے کہا: خدا کی قسم، تمھیں معلوم ہے کہ ہم اِس لیے نہیں آئے کہ اِس ملک میں فساد کریں اور ہم چوری کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ اُنھوں نے کہا: اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو چور کی کیا سزا ہے؟ اُنھوں نے کہا: اُس کی سزا؟ جس کے سامان سے کھوئی ہوئی چیز نکلے، وہ

رہی تو اب راحت ہی راحت ہے، اِس لیے غم نہ کرو۔ یہ اب تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔

۹۳؎ یوسف علیہ السلام نے جس طرح پچھلی ملاقات کے موقع پر اپنے بھائیوں کا دیا ہوا مال اُن کے کجاووں میں رکھوا دیا تھا، اُسی طرح یہ پیالہ بھی بن یمین کو کچھ بتائے بغیر اُس کے سامان میں رکھ دیا تاکہ واپس جا کر اپنا سامان کھولے تو اُن کا یہ تحفہ پا کر خود بھی مسرور ہو اور بھائی کے اختیار و اقتدار کی یہ نشانی اپنے باپ کو بھی دکھائے۔

بِاَوۡعِیَتِهِمۡ قَبۡلَ وِعَآءِ اَخِیۡهِ ثُمَّ اسۡتَخۡرَجَهَا مِنۡ وِّعَآءِ اَخِیۡهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدۡنَا لِیُوۡسُفَ ؕ مَا كَانَ لِیَاۡخُذَ اَخَاهُ فِیۡ دِیۡنِ الۡمَلِكِ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ وَفَوۡقَ كُلِّ ذِیۡ عِلۡمٍ عَلِیۡمٌ ﴿۷۶﴾

آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے۔[۹۴] اِس طرح کے ظالموں کو ہم یہی سزا دیا کرتے ہیں۔[۹۵] اِس پر اُس شخص نے یوسف کے بھائی کی خرجی سے پہلے اُن کی خرجیوں کی تلاشی لینا شروع کی، پھر (بادشاہ کا پیمانہ تو نہیں ملا،[۹۶] لیکن) اُس کے بھائی کی خرجی سے اُس نے وہ پیالہ برآمد کر لیا (جو یوسف نے رکھا تھا)۔ ہم نے اِس طرح یوسف کے لیے (اُس کے بھائی کے روکنے کی) تدبیر کی، (اِس لیے کہ) بادشاہ کے قانون کی رو سے وہ اپنے بھائی کو روکنے کا مجاز نہ تھا،[۹۷] الّا یہ کہ خدا ہی چاہے۔[۹۸] ہم جس کے درجے چاہتے ہیں، بلند کر دیتے ہیں[۹۹] اور حقیقت یہ ہے کہ ایک علم والا ہر صاحب علم سے بالاتر ہے۔[۱۰۰] ۶۹-۷۶

۹۴؎ یعنی غلام بنا کر روک لیا جائے۔

۹۵؎ یہ اُن کے علاقے کا کوئی رواج بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ اِسے دین ابراہیمی کا حکم سمجھا جائے۔ ابراہیم علیہ السلام کو کسی خطۂ ارض میں کبھی سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہوا، اِس لیے یہ ماننا قرین قیاس نہیں ہے کہ اُنھیں جو شریعت دی گئی تھی، اُس میں جرم و سزا سے متعلق بھی احکام موجود تھے۔

۹۶؎ اِس کی دلیل یہ ہے کہ بن یمین کے سامان میں 'السِّقَایَة' (پیالہ) رکھا گیا تھا جس کے لیے مونث کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔ اِس کے برخلاف شاہی کارندے 'صُوَاعَ الْمَلِكِ' (بادشاہ کا پیمانہ) تلاش کر رہے تھے۔ چنانچہ آیت میں دیکھ لیجیے، اِس کے لیے مذکر اور جو چیز برآمد کی گئی

ہے، اُس کے لیے مونث کی ضمیر آئی ہے۔

۹۷۔ یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بن یمین کو پا جانے کے بعد اب یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے کہ اُس کو واپسی کے سفر میں بھی اُنھی ظالموں کے حوالے کر دیں جو اُس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اِس کے لیے ضروری تھا کہ اُسے ساتھ جانے سے روکا جائے۔ اِس مرحلے میں وہ اپنے آپ کو ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اور ملکی قانون کی رو سے بھائی کو بغیر کسی وجہ کے روک لینا بھی ممکن نہیں تھا، اِس لیے کہ تمام اختیارات کے باوجود اُن کے شایان شان یہی تھا کہ جو قدم بھی اٹھائیں، قانون کے مطابق اٹھائیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اِس موقع پر خدا نے مدد فرمائی اور عین اُسی وقت جب وہ اپنا پیالہ بن یمین کے سامان میں رکھ چکے تھے اور اُن کے بھائی رخصت ہونے کو تھے، بادشاہ کا پیمانہ کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا اور تلاش کے باوجود نہیں ملا۔ اِس پر دربار کے کارندوں کا شبہ اُنھی بھائیوں کی طرف گیا جو وہاں سے جانے کے لیے نکل رہے تھے اور اِس طرح وہ صورت پیدا ہو گئی جس کے نتیجے میں یوسف علیہ السلام کے بھائی بن یمین کو اُن کے پاس چھوڑ دینے کے لیے مجبور ہو گئے۔ یہ خدائی تدبیر تھی جو بالکل اُسی طرح سامنے آئی، جس طرح اِس نوعیت کے غیر معمولی اتفاقات کبھی کبھی ہمارے مشاہدے میں بھی آجاتے ہیں اور ہم اُن کی کوئی توجیہ نہیں کر پاتے۔ حضرت یوسف اور اُن کے بھائی نے اِس موقع پر اِس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ جو کچھ ہوتا رہا، اُسے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ بن یمین پر اِس کے نتیجے میں وقتی طور پر ایک الزام کا دھبا لگا، لیکن اُسے معلوم تھا کہ اِسے بہت جلد دھل جانا ہے۔ لہٰذا وہ بھی مطمئن رہا اور کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔

۹۸۔ اور اپنی قدرت سے کوئی ایسی صورت پیدا کر دے کہ قانون کی خلاف ورزی بھی نہ ہو اور بن یمین کو روک بھی لیا جائے۔

۹۹۔ یوسف علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کو ایسے مقام بلند پر پہنچا دیتے ہیں کہ کائنات کا پروردگار اُس کے لیے تدبیریں فرماتا ہے۔

۱۰۰۔ یعنی خداے لایزال جس کا علم ہی علم حقیقی ہے۔ چنانچہ وہی جانتا ہے کہ کیا چیز پردۂ غیب

قَالُوْۤا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَلَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیْخًا كَبِیْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۷۸﴾ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا

بھائیوں نے (یہ دیکھا تو) کہا: اگر یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے، اِس سے پہلے اِس کا ایک بھائی بھی چوری کر چکا ہے[۱۰۱]۔ (یہ سراسر تہمت تھی)، مگر یوسف نے اِس کو اپنے دل ہی میں رکھا، اُن پر اِسے ظاہر نہیں کیا، بس (اپنے جی میں) اتنی بات کہہ کر رہ گیا کہ تم لوگ بڑے ہی برے ہو اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو، اللہ اُس کو خوب جانتا ہے۔ اُنھوں نے کہا: اے عزیز، اِس کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے، سو اِس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجیے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ بڑے نیک نفس انسان ہیں۔ یوسف نے کہا: خدا کی پناہ کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے[۱۰۲]، ہم

سے کس وقت اور کس صورت میں نمودار ہو جائے گی اور جو کچھ بظاہر ناممکن نظر آ رہا ہے، اُسے ممکن بنا دے گی۔

۱۰۱؎ یہ اُنھوں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے کہا۔ پہلے کہہ چکے تھے کہ ہم چور نہیں ہیں۔ اب جو دیکھا کہ بھائی کی خرجی سے مال برآمد ہو گیا ہے تو فوراً ایک جھوٹی بات بنا کر اپنے آپ کو بھائی سے الگ کر لیا اور دوسرے بھائی کو بھی اُسی الزام میں لپیٹ لیا۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ یہ ہمارا حقیقی بھائی نہیں ہے، بلکہ سوتیلا بھائی ہے اور چوری کی خصلت اپنی ماں کی طرف سے لایا ہے۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوسف اور اُن کے بھائی بن یمین کے لیے اُن کے دلوں میں

اسۡتَيۡـَٔسُوۡا مِنۡهُ خَلَصُوۡا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيۡرُهُمۡ اَلَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اَبَاكُمۡ قَدۡ اَخَذَ عَلَيۡكُمۡ مَّوۡثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنۡ قَبۡلُ مَا فَرَّطۡتُّمۡ فِىۡ يُوۡسُفَ ۚ فَلَنۡ اَبۡرَحَ الۡاَرۡضَ حَتّٰى يَاۡذَنَ لِىۡۤ اَبِىۡۤ اَوۡ يَحۡكُمَ اللّٰهُ لِىۡ ۚ وَهُوَ خَيۡرُ الۡحٰكِمِيۡنَ ﴿۸۰﴾ اِرۡجِعُوۡۤا اِلٰٓى اَبِيۡكُمۡ فَقُوۡلُوۡا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابۡنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدۡنَاۤ اِلَّا

اُس کے سوا کسی اور کو پکڑیں۔ اِس صورت میں تو ہم بڑے ہی ظالم ٹھیریں گے۔ اُس کا یہ جواب سن کر جب وہ اُس سے مایوس ہو گئے تو آپس میں مشورے کی غرض سے الگ بیٹھ گئے۔ اُن کے بڑے[۱۰۳] نے کہا: کیا تم جانتے نہیں ہو کہ تمھارے باپ نے خدا کے نام پر تم سے پکا قول و قرار لیا ہے اور اِس سے پہلے یوسف کے معاملے میں جو تقصیر تم سے ہو چکی ہے، اُسے بھی جانتے ہو؟ لہٰذا میں تو اِس سرزمین سے ٹلنے کا نہیں، جب تک میرا باپ مجھے اجازت نہ دے یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ فرما دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے[۱۰۴]۔ تم اپنے باپ کے پاس جاؤ اور اُن سے کہو کہ ابا جان،

کس قدر بغض اور کینہ چھپا ہوا تھا۔

۱۰۲۔ یوسف علیہ السلام کی احتیاط ملحوظ رہے کہ جب اُنھیں مجبوراً بولنا پڑا تو اُنھوں نے یہ نہیں کہا کہ جس نے ہماری چیز چرائی ہے، بلکہ صرف یہ فرمایا کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے۔ یہ اُس توریے کی نہایت عمدہ مثال ہے جس پر اخلاقی لحاظ سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

۱۰۳۔ آیت میں اِس کے لیے 'اَکبرھم' کا نہیں، بلکہ 'کَبِیۡرُھُمۡ' کا لفظ آیا ہے۔ عربیت کی رو سے یہ علم و دانش اور عقل و رائے میں بڑے کے لیے بھی آ سکتا ہے۔ لہٰذا اِس سے اگر یہوذا کو مراد لیا جائے تو زیادہ اقرب ہوگا۔ بائیبل میں صراحت ہے کہ یہ مشورہ اُسی نے دیا تھا۔

۱۰۴۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھائی دوسروں سے مختلف تھا۔ یوسف کو قتل نہ کرنے کا

بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٨٢﴾ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿٨٣﴾

آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور ہم نے وہی بات کہی ہے جو ہمارے علم میں آئی ہے، ہم غیب کے نگہبان نہیں ہیں۔ آپ اُس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجیے، جہاں ہم رہے ہیں اور اُس قافلے سے پوچھ لیجیے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں، ہم بالکل سچے ہیں۔ اُن کے باپ نے (یہ داستان سنی تو) کہا: نہیں، بلکہ تمھارے دل نے تمھارے لیے ایک بات بنالی ہے[۱۰۵]، اِس لیے صبر جمیل ہی بہتر ہے۔ امید ہے کہ اللہ اِن سب کو میرے پاس لے آئے گا[۱۰۶]۔ یقیناً وہی علیم و حکیم ہے۔ ۷۷-۸۳

مشورہ بھی غالباً اِسی نے دیا تھا۔ چنانچہ اُس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ ایک کے بعد اب وہ دوسرے بھائی کو بھی کھونے کا مجرم بن کر باپ کے سامنے حاضر ہو۔

۱۰۵؎ یعنی یہ بات کہ بن یمین نے فی الواقع چوری کی ہے، دراں حالیکہ یہ لوگ وہاں بھی کہہ سکتے تھے کہ ہم اپنے بھائی کو جانتے ہیں، وہ کبھی چوری نہیں کرسکتا۔ یہ پیالہ شاید کسی اور نے رکھ دیا ہو یا کسی غلطی سے وہ اُس کے اسباب میں بندھ گیا ہو۔ پھر باپ کے پاس آ کر بھی اُنھوں نے یہ نہیں کہا کہ بن یمین پر چوری کا الزام لگا دیا گیا ہے، بلکہ پورے یقین کے ساتھ کہہ دیا کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے۔

۱۰۶؎ یوسف علیہ السلام نے جو خواب ابتدائی زمانے میں دیکھا تھا، حضرت یعقوب اُسے خدائی بشارت سمجھتے تھے، لہٰذا اُنھیں یقین تھا کہ یوسف زندہ ہے، وہ اُسے ملیں گے اور اُس کا

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا

اُس نے (یہ کہہ کر) اُن سے منہ پھیر لیا اور کہا: ہاے یوسف[۱۰۷] ـــــ اور غم سے اُس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں[۱۰۸] اور وہ گھٹا جا رہا تھا ـــــ بیٹوں نے کہا: خدا کی قسم، آپ یوسف ہی کو یاد کیے جائیں گے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا ہلاک ہو جائیں گے۔[۱۰۹] اُس نے کہا: میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ اللہ ہی سے کرتا ہوں[۱۱۰] اور اللہ کی

خواب پورا ہو کر رہے گا۔ یہ اُسی یقین کا اظہار ہے۔

۱۰۷۔ اِس وقت اگرچہ بن یمین کا معاملہ تھا، مگر یعقوب علیہ السلام نے یوسف ہی کو یاد کیا۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”یہ بات کچھ عجیب نہیں کہ اِس تازہ حادثے نے بھی حضرت یعقوب کے دل میں حضرت یوسف ہی کے غم کو ہرا کیا۔ اول تو بن یمین کے حادثے کی نوعیت وہ نہیں تھی جو حضرت یوسف کے حادثے کی تھی، ثانیاً حضرت یعقوب کو حضرت یوسف سے جو دل بستگی تھی، وہ صرف بیٹے ہونے کے سبب سے نہیں تھی، بلکہ اُس میں اصلی دخل اُن کی اُن اعلیٰ صلاحیتوں کو تھا جن کی بنا پر حضرت یعقوب اُن سے اِس درجہ محبت کرتے تھے کہ وہ اپنے تمام بھائیوں کے محسود بن گئے اور بالآخر اُسی کے نتیجے میں بھائیوں کے ہاتھوں اُنھیں نہایت زہرہ گداز آزمایشوں سے گزرنا پڑا۔“
>
> (تدبر قرآن ۴/۲۴۸)

۱۰۸۔ عام مشاہدہ ہے کہ غم والم کی شدت اور بہت روتے رہنے سے پتلیوں اور پلکوں کی سیاہی متاثر ہو جاتی ہے اور آنکھوں کے سرخ ڈورے بھی آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے ہیں، یہ اُسی

فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ

طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ میرے بیٹو، جاؤ یوسف اور اُس کے بھائی کی ٹوہ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔[۱۱۰] اللہ کی رحمت سے تو صرف منکر لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔ ۸۴-۸۷

پھر جب وہ (اگلی مرتبہ) یوسف کی پیشی میں داخل ہوئے تو اُنھوں نے (گڑگڑا کر) عرض کیا: اے عزیز، ہم اور ہمارے اہل وعیال بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں اور ہم

حالت کا بیان ہے۔

۱۰۹؎ یہ بظاہر ہم دردی کا جملہ ہے، مگر غور کیجیے تو اِس میں بھی وہی جذبۂ حسد کارفرما ہے جو اُن کے تمام اقدامات کا باعث ہوا۔ اُن کا خیال تھا کہ یوسف کو ٹھکانے لگا کر وہ باپ کی تمام توجہ حاصل کر لیں گے، لیکن اُنھوں نے دیکھا کہ اِس کے نتیجے میں جو کچھ اُنھیں حاصل تھا، وہ بھی اُن سے چھن گیا ہے اور باپ کا اِس کے سوا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا کہ جب تنہا ہوں، یوسف کی یاد میں نالہ و فریاد کرتے رہیں۔

۱۱۰؎ یہی ایک بندۂ مومن کے شایانِ شان ہے۔ وہ اپنے غم والم کا اظہار اپنے رب ہی سے کرتا ہے، اِس لیے کہ اُس کی تمام امیدیں اُسی سے وابستہ ہوتی ہیں اور وہ جانتا ہے کہ اُس کا یہ گریہ اور یہ زاری بالآخر اُس کی رحمت کو جوش میں لے آئے گی۔

۱۱۱؎ اِس سے واضح ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو جس طرح حضرت یوسف کے معاملے میں اُن کے بیان کا یقین نہیں ہوا تھا، اُسی طرح بن یمین کے معاملے میں بھی نہیں ہوا۔

إِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿٨٨﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿٨٩﴾ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ز قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿٩١﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ

یوسف
۱۲

کچھ حقیر سی پونجی لے کر حاضر ہو گئے ہیں[۱۱۲]، سو (عنایت فرمائیے اور) ہمیں پورا غلہ دیجیے اور ہم پر خیرات بھی کیجیے، اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ خیرات کرنے والوں کو اچھا بدلہ دیتا ہے[۱۱۳]۔ (اُن کی یہ التجا سن کر یوسف سے رہا نہ گیا)، اُس نے کہا: تمھیں کچھ پتا ہے کہ جب تم جہالت میں مبتلا تھے تو یوسف اور اُس کے بھائی کے ساتھ تم کیا کر گزرے؟ وہ (چونک کر) بولے: کیا واقع میں تمھی یوسف ہو؟ اُس نے کہا: ہاں، میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر عنایت فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو خدا سے ڈرتے اور ثابت قدم رہتے ہیں، اُن کا اجر اُنھیں لازماً ملتا ہے، اِس لیے کہ اللہ اُن لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں[۱۱۴]۔ اُنھوں نے کہا: بخدا، کچھ شک نہیں کہ اللہ نے تم کو ہمارے اوپر برتری عطا فرمائی ہے اور کچھ

۱۱۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'بِضَاعَةٍ مُّزْجٰةٍ'۔ یعنی ایسی حقیر پونجی جس کو کوئی قبول نہ کرے۔ اِس سے خیال ہوتا ہے کہ نقد کے بجاے وہ کوئی ایسی جنس لے کر گئے تھے جس کی وہاں کوئی خاص مانگ نہیں تھی۔

۱۱۳؎ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ضرورت کس شان اور طنطنے کے لوگوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

يَغۡفِرُ اللّٰهُ لَكُمۡ ۡ وَهُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ ﴿۹۲﴾ اِذۡهَبُوۡا بِقَمِيۡصِيۡ هٰذَا فَاَلۡقُوۡهُ عَلٰى وَجۡهِ اَبِيۡ يَاۡتِ بَصِيۡرًا ۚ وَاۡتُوۡنِيۡ بِاَهۡلِكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا فَصَلَتِ الۡعِيۡرُ قَالَ اَبُوۡهُمۡ اِنِّيۡ لَاَجِدُ رِيۡحَ يُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوۡا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيۡ ضَلٰلِكَ الۡقَدِيۡمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّاۤ اَنۡ

شک نہیں کہ ہم ہی قصور وار تھے۔ یوسف نے کہا: اب تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تمھیں معاف کرے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔ (جاؤ)، میرا یہ کرتا لے جاؤ اور اِس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، اُس کی بینائی لوٹ آئے گی[۱۱۵] اور اپنے سب اہل وعیال کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ ۸۸-۹۳

جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو اُن کے باپ نے (کنعان میں اپنے گھر کے لوگوں سے) کہا: اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں تو میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں[۱۱۶]۔ لوگوں نے کہا: خدا کی قسم، آپ ابھی تک اپنے اُسی

۱۱۴؎ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت کے لیے یہ تمام سرگذشت قریش مکہ کو سنائی گئی ہے۔

۱۱۵؎ یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے جس کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''حضرت یوسف نے اپنے جسم سے لمس کیا ہوا کرتا ہی اپنی نشانی کے طور پر کیوں بھیجا؟ اور کرتے میں یہ اثر کہاں سے آیا کہ اِس سے بصارت عود کر آئے؟ یہ سوالات نہ ہر شخص کے حل کرنے کے ہیں اور نہ اِس کا حل ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اِن چیزوں کا تعلق جذبات سے ہے اور جذبات بھی ایسے عالی مقام لوگوں کے کہ ایک طرف حضرت یعقوب ہیں، دوسری طرف حضرت یوسف۔ ہم عامی اِس طرح کے معاملات میں اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ سچے جذبات کی تاثیر و تاثر کے کرشمے ایسی حیرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں کہ عقل اُن کی توجیہ سے بالکل قاصر رہ جاتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/۲۵۱)

جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚۙ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿٩٧﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٩٨﴾

پرانے خبط میں مبتلا ہیں۔ پھر جب یہ ہوا کہ خوش خبری دینے والا پہنچ گیا[117]، اُس نے کرتا یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا تو یکا یک اُس کی بینائی لوٹ آئی۔ تب اُس نے کہا: میں نے تمھیں بتایا نہ تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ یوسف کے بھائی بول اٹھے: ابا جان، آپ ہمارے گناہوں کی معافی کے لیے دعا کریں، واقعی ہم خطا کار تھے۔ اُس نے کہا: میں اپنے رب سے جلد[118] تمھارے لیے مغفرت کی دعا کروں گا، بے شک وہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔۹۴-۹۸

۱۱۶ یعقوب علیہ السلام خدا کے پیغمبر تھے۔ اللہ تعالیٰ جن ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے، اُن کے قویٰ اور حواس کو اپنے قویٰ اور حواس پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ اُنھیں اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں اور جس طریقے سے چاہتے ہیں، کسی معاملے سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی دیکھ لیجیے، یوسف علیہ السلام ۲۰ سال سے زیادہ مدت تک مصر میں رہے اور حضرت یعقوب کو کبھی اُن کی خوشبو نہ آئی، مگر اِس وقت اُن کی قوت ادراک یکا یک ایسی تیز ہو گئی کہ یوسف کا پیرہن مصر سے چلا اور وہ اُس کی خوشبو محسوس کرنے لگے۔

۱۱۷ اصل الفاظ ہیں: 'فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ'۔ اِن میں 'اَنْ' سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰۤی اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾ وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا

پھر جب یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے، اُس نے اپنے والدین[119] کو خاص اپنے پاس جگہ دی اور کہا: مصر میں، اللہ چاہے تو امن چین سے رہیے۔[120] (اپنے گھر پہنچ کر) اُس نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا[121] اور سب بے اختیار اُس کے لیے سجدے میں جھک گئے۔[122] یوسف نے کہا: ابا جان، یہ میرے اُس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔

یوسف
۱۲

۱۱۸۔ اصل میں لفظ 'سَوْفَ' آیا ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ حضرت یعقوب نے اُن سے خاص اہتمام کے ساتھ اور خاص وقت میں دعا کا وعدہ فرمایا، یہ کہہ کر ٹال نہیں دیا کہ جاؤ، اللہ تمھیں معاف فرمائے۔

۱۱۹۔ یعنی اپنے والد اور اپنی سوتیلی والدہ کو جو اُن کی حقیقی خالہ بھی تھیں۔ بائیبل میں صراحت ہے کہ اُن کی والدہ وفات پا چکی تھیں۔

۱۲۰۔ یہ خیر مقدم کا جملہ ہے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ یہ لوگ پہنچے تو حضرت یوسف نے شہر سے باہر نکل کر اِن کا خیر مقدم کیا اور اِنھیں اِس شان سے شہر میں لائے کہ ایک جشن کی صورت پیدا ہو گئی۔

۱۲۱۔ اِس سے مراد یہاں تختِ شاہی نہیں، بلکہ وہ تخت ہے جس پر حضرت یوسف اپنے منصب کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے بیٹھتے تھے۔

۱۲۲۔ سجدے سے مراد یہاں وہ سجدہ نہیں ہے جو ہم خدا کے آگے کرتے ہیں، بلکہ رکوع کے طریقے پر جھکنا ہے۔ بڑوں کی تعظیم کے لیے اِس انداز میں جھکنا قدیم زمانے کا معروف طریقہ تھا۔ عربی زبان میں لفظ 'سجد' اِس معنی کے لیے بھی عام استعمال کیا جاتا ہے۔ بائیبل اور تلمود، دونوں میں تصریح ہے کہ جس چیز کو اصطلاحی سجدہ کہا جاتا ہے، وہ بنی اسرائیل کی شریعت میں بھی

رَبِّیْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾

یوسف ۱۲

میرے پروردگار نے اُس کو حقیقت بنا دیا۔ اُس نے مجھ پر بڑا اکرم فرمایا، جب مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ سب لوگوں کو دیہات سے یہاں لے آیا، اِس کے باوجود کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے، اُس کے لیے نہایت مخفی راہیں نکال لینے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی علیم و حکیم ہے۔ پروردگار، تو نے مجھے اقتدار میں حصہ عطا فرمایا اور باتوں کی تعبیر کر لینے کے علم میں سے بھی سکھا دیا۔ زمین اور آسمانوں کے بنانے والے، دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا کارساز ہے۔ مجھے اسلام پر موت دے اور اپنے نیک بندوں کے زمرے میں شامل فرما[۱۲۳]۔ ۹۹-۱۰۱

غیر اللہ کے لیے اُسی طرح ممنوع تھا، جس طرح ہماری شریعت میں ممنوع ہے۔ یہاں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ کس طرح پیش آیا؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''حضرت یوسف نے اپنے والدین کو تعظیماً تخت پر جگہ دی۔ بقیہ لوگ حسب دستور عام لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھے ہوں گے۔ اِس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف نمودار ہوئے اور قاعدے کے مطابق اُن کے خدم و حشم اُن کی تعظیم کے لیے جھکے تو ماحول سے متاثر

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ یَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾
وَ مَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَ مَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَ كَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ

یہ سرگذشت غیب کی خبروں میں سے ہے، اِسے ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں، (اے پیغمبر)۔ تم اُس وقت اُن کے پاس موجود نہ تھے، جب یوسف کے بھائیوں نے اپنا ارادہ پختہ کر لیا تھا اور وہ (اُس کے خلاف) سازش کر رہے تھے۔ ۱۰۲

اِس کے باوجود اِن لوگوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ تم، خواہ کتنا ہی چاہو، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں[۱۲۴]۔ تم اِس خدمت پر اُن سے کوئی اجر نہیں مانگ رہے ہو

ہو کر یہ لوگ بھی بے اختیارانہ اُن کی تعظیم کے لیے جھک پڑے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۲۵۴)

۱۲۳؎ سبحان اللہ، کیا حسن سیرت ہے! نہ گلہ نہ شکوہ، نہ طعن و تشنیع اور ملامت، نہ فخر جتانے اور بڑائی ظاہر کرنے کی کوشش، بلکہ اپنے پروردگار کی شکر گزاری اور اُس کے احسانات کا اعتراف اور بھائیوں کی تسلی کے لیے اپنی طرف سے یہ صفائی کہ درحقیقت یہ شیطان تھا جس نے میرے اور اُن کے درمیان برائی ڈال دی تھی۔ پھر خدا سے اُس کی بندگی پر استقامت اور صالحین کے زمرے میں شامل کیے جانے کی دعا جس پر بات ختم ہوئی ہے۔ قرآن اپنے ماننے والوں میں جو سیرت و کردار پیدا کرنا چاہتا ہے، یوسف علیہ السلام کی یہ گفتگو اُس کا بہترین نمونہ ہے۔

۱۲۴؎ یعنی اِس کے باوجود ایمان لانے والے نہیں کہ اِس وقت تم ایک ایسی سرگذشت اُنھیں سنا رہے ہو جو بجاے خود اِس بات کا ثبوت ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو، اِس لیے کہ تمھارے لیے یہ غیب کی ایک خبر ہے۔ تم اُس وقت موجود نہیں تھے، جب یہ واقعہ پیش آیا، لیکن تم نے اِس صحت کے ساتھ اِسے سنایا ہے کہ لوگوں میں انصاف ہو تو اِس سے وہ بائیبل کے بیانات کی تصحیح کر سکتے ہیں

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿١٠٥﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿١٠٦﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٠٧﴾

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٨﴾

یوسف ۱۲

(کہ وہ گریز و فرار کی راہیں تلاش کریں)۔ یہ تو صرف ایک یاددہانی ہے دنیا والوں کے لیے۔ (وہ تم سے نشانی مانگتے ہیں، دراں حالیکہ) زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے وہ گزرتے ہیں اور اُن کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ اُن میں سے اکثر خدا کو اِسی طرح مانتے ہیں کہ ساتھ ہی اُس کے شریک ٹھیرائے ہوئے ہیں۔ پھر کیا وہ (اپنے اِن شریکوں پر بھروسا کرکے) مطمئن ہو گئے ہیں کہ اُن پر خدا کے عذاب کی کوئی آفت آ پڑے یا اُن پر اچانک قیامت آ جائے اور وہ اُس سے بالکل بے خبر ہوں؟ ۱۰۳-۱۰۷

اِن سے صاف صاف کہہ دو، یہ میری راہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں،

جن میں تاریخی غلطیاں بھی ہیں اور قصے کے بعض قیمتی اجزا حذف بھی کر دیے گئے ہیں جنھیں بجا طور پر اِس قصے کی جان کہا جا سکتا ہے۔ تمھاری زبان پر جو کچھ جاری ہوا ہے، اُس کا ایک ایک لفظ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف جیسے جلیل القدر پیغمبروں کی سیرت کے شایانِ شان اور عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ تمھارے مخاطبین اگر بائیبل اور تالمود کے متقابل رکھ کر اِسے دیکھیں تو خود پکار اُٹھیں گے کہ یقیناً یہ تمھاری طرف وحی کیا گیا ہے، یہ بائیبل یا تالمود کا چربہ نہیں ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ

پوری بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ بھی جو میری پیروی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اور (سن لو کہ) اللہ (شرک کی تمام آلایشوں سے) پاک ہے[۱۲۵] اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ ۱۰۸

(انھیں تعجب ہے کہ ایک آدمی رسول بن کر آ گیا ہے)۔ تم سے پہلے بھی، (اے پیغمبر)، ہم نے جتنے رسول بھیجے، سب اِنھی بستیوں کے رہنے والے آدمی ہی تھے، ہم اُن کی طرف وحی کرتے تھے۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتے کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو اِن سے پہلے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کر لیا ہے۔ پھر کیا سمجھتے نہیں ہو؟ (یہ عذاب کے لیے جس طرح جلدی مچا رہے ہیں، اِن کے اگلے بھی اِسی طرح مچاتے رہے)، یہاں تک کہ جب اُن کے رسول اُن سے مایوس ہو گئے اور وہ لوگ بھی خیال کرنے لگے کہ اُن سے جھوٹ

---

۱۲۵ اِس سے وہ آلایشیں مراد ہیں جو مشرکانہ عقیدے کا لازمی تقاضا اور شرک کا منطقی نتیجہ ہیں۔

الْمُجْرِمِیْنَ ﴿١١٠﴾ لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَلٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿١١١﴾

سورة الرعد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓمّٓرٰ ۚ قف تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ

کہا گیا تھا (کہ اُن پر کوئی عذاب آنے والا ہے) تو ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ پھر اُن کو بچا لیا گیا جنھیں ہم چاہتے تھے (کہ بچا لیں) اور مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب ٹالا نہیں جا سکتا۔ اُن کی سرگذشتوں میں عقل والوں کے لیے، بلاشبہ بہت کچھ سامان عبرت ہے۔ یہ قرآن کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں ہے، بلکہ جو اِس سے پہلے موجود ہے، اُس کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل (جو ہدایت کے لیے ضروری ہے) اور اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت جو ماننے والے ہیں[126]۔ ۱۰۹-۱۱۱

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورہ 'الٓمّٓرٰ' ہے[127]۔ یہ کتاب الٰہی کی آیتیں ہیں[128] اور تمھارے پروردگار کی طرف سے

---

[126] یعنی آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے رحمت۔

[127] اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق ہم اپنا نقطۂ نظر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ

جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ (سراسر) حق ہے[129]، مگر (تمھاری قوم کے) اکثر لوگ مان نہیں رہے ہیں۔ ا

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر اونچا بنا کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں[130]، پھر وہ اپنے تخت سلطنت پر متمکن ہوا[131] اور اُس نے سورج اور چاند کو

الرعد ۱۳

۱۲۸؎ اصل الفاظ ہیں: 'تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ'۔ اِن میں 'تِلْكَ' کا اشارہ 'الٓمّٓرٰ' کی طرف ہے اور 'الْكِتٰب' کے معنی کتاب الٰہی کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ اِس معنی کے لیے استعمال ہوا ہے اور اُسی طریقے پر استعمال ہوا ہے، جس پر کوئی لفظ اپنے مختلف مفاہیم میں سے کسی اعلیٰ اور برتر مفہوم کے لیے خاص ہو جایا کرتا ہے۔ یہ فقرہ کس لیے ارشاد ہوا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس فقرے میں بہ یک وقت اظہار احسان بھی ہے اور دھمکی بھی۔ احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ عظیم نعمت، جس کا اُس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے وعدہ فرمایا تھا، اتار دی ہے۔ اب یہ لوگوں کا فرض ہے کہ اِس کی صدق دل سے قدر کریں اور اِس کی برکتوں سے متمتع ہوں۔ دھمکی کا پہلو یہ ہے کہ یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں تو جو لوگ اِن کی قدر کرنے کے بجاے اِن کا مذاق اڑائیں گے اور اِن کی مخالفت میں اپنا زور صرف کریں گے، وہ خود سوچ لیں کہ وہ اپنے لیے کس شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۲۷۰)

۱۲۹؎ یعنی قطعی حقیقت ہے، اُس میں کسی ریب و گمان کی گنجایش نہیں ہے۔ چنانچہ ہر چیز جس طرح بیان ہوئی ہے، اُسی طرح واقع ہو کر رہے گی۔

۱۳۰؎ یعنی محسوس اور مرئی ہوں۔ دور حاضر کے انسانی علم نے اِسی چیز کو کشش ثقل کا نام دیا ہے۔ یہاں اِس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی طرف توجہ دلانا ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ﴿٢﴾ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ

ایک قانون کا پابند بنایا۔ اِن میں سے ہر ایک ایک مقرر وقت کے لیے گردش کر رہا ہے۔[۱۳۲] وہی نظمِ عالم کی تدبیر فرماتا ہے۔ وہ اپنی اِن نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے، اِس لیے کہ تم اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین کرو۔[۱۳۳] ۲

اور وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اُس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑے اور ندیاں بہا دیں اور اُس میں ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے۔[۱۳۴] وہ رات کو (چادر

۱۳۱؎ مطلب یہ ہے کہ اِن بے کراں آسمانوں کو پیدا کر کے وہ کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے، جیسا کہ مشرکین گمان کرتے ہیں، بلکہ اپنے تختِ سلطنت پر متمکن ہے اور زمین و آسمان کی تدبیرِ امور فرما رہا ہے۔ آگے 'یُدَبِّرُ الْاَمْرَ' کے الفاظ میں اِس کو کھول دیا ہے۔

۱۳۲؎ یہ دو بڑی نشانیوں کی مثال سے اِس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ہر چیز ہر وقت خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اُس وقت تک کے لیے گردش کر رہی ہے جو اُس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اِس عالم میں کوئی چیز بھی ابدی و سرمدی نہیں ہے، بلکہ کشاں کشاں ایک معین اجل کی طرف بڑھ رہی ہے۔

۱۳۳؎ یعنی اپنی کتاب میں اِن کی تفصیل کرتا ہے تاکہ جن حقائق پر یہ دلالت کر رہی ہیں، تم اُن کو سمجھو اور اِس کے نتیجے میں کائنات کی اِس عظیم حقیقت کا یقین حاصل کر لو کہ جس نے اپنی بے پایاں قدرت اور کمال حکمت کے ساتھ یہ دنیا بنائی ہے، وہ اِسے اتمام و تکمیل تک پہنچائے بغیر یوں ہی ختم نہیں ہونے دے گا، بلکہ لازماً اُس منزل تک لے جائے گا جو اِس کے لیے مقرر ہے۔

۱۳۴؎ یعنی جس طرح حیوانات کے جوڑے ہیں، اُسی طرح درختوں کے بھی نر و مادہ ہیں جن

فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴿۳﴾
وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ قف وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾

کی طرح) دن پر اُڑھا دیتا ہے۔ یقیناً اِن سب چیزوں میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور کریں۔[۱۳۵] ۳

اور زمین میں پاس پاس کے قطعے ہیں، انگوروں کے باغ ہیں، کھیتی ہے، کھجور کے درخت ہیں، جن میں جڑواں بھی ہیں اور اکہرے بھی۔[۱۳۶] سب ایک ہی پانی سے سیراب کیے جاتے ہیں، لیکن اُن کے پھلوں میں ہم ایک کو دوسرے پر برتری دے دیتے

سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔

۱۳۵؎ اوپر آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی تھی، اُس کے بعد اب یہ زمین کی نشانیوں کی طرف متوجہ کیا ہے کہ اِنھیں بھی دیکھو۔ دریا، پہاڑ، زمین سے پیدا ہونے والے قسم قسم کے پھل اور لیل و نہار کی گردش، یہ سب کس قدر مختلف چیزیں ہیں، مگر کس بے پایاں حکمت، بے مثال نظم و ترتیب اور کتنی اتھاہ معنویت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ متعلق ہیں۔ یہ اِس بات کا صریح ثبوت ہے کہ نہ یہ زمین و آسمان آپ سے آپ وجود میں آئے ہیں اور نہ اِن پر الگ الگ دیوتاؤں کی حکمرانی ہے، بلکہ ایک ہی قادر و حکیم ہے جس نے اِن کی ہر چیز میں یہ حیرت انگیز توافق، ہم آہنگی اور سازگاری پیدا کر دی ہے۔ اِس کو دیکھنے اور اِس پر غور کرنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے اور ایک دن یہ سب خاک میں گم ہو جائے گا تو یہ عقل و دانش کی نہیں، بلکہ حماقت و بلادت کی دلیل ہے۔

۱۳۶؎ درختوں کی نشو و نما میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے، یہ اُس کا ذکر ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں

وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۵﴾

ہیں۔ یقیناً اِن سب چیزوں میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں[۱۳۷] جو عقل سے کام لیں۔۴

اب اگر تعجب کرو تو تعجب کے قابل تو اِن کی یہ بات ہے کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟[۱۳۸] یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کا انکار کر دیا ہے[۱۳۹]۔ یہی ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں[۱۴۰]۔ یہی دوزخ کے لوگ ہیں، یہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔۵

کہ کہیں ایک ہی جڑ سے کئی کئی تنے پھوٹ نکلتے ہیں اور کہیں ایک ہی تنا نکلتا ہے۔

۱۳۷؎ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ کائنات کا خالق زمین کی پیداوار میں کس قدر تنوع، رنگارنگی، جدت اور بوقلمونی کے ساتھ اپنی ہمہ گیر قدرت اور اپنے بے خطا علم و حکمت کو نمایاں کرتا ہے۔

۱۳۸؎ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی بات پر تعجب کرنا ہے تو زمین و آسمان کی اُن نشانیوں کو دیکھ کر، جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، اُن لوگوں کی بات پر تعجب کرنا چاہیے جو مرنے کے بعد جی اٹھنے پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ نشانیاں تو پکار پکار کر شہادت دے رہی ہیں کہ جس خدا نے اپنی مخلوقات میں کمال حکمت کے یہ نمونے دکھائے ہیں، اُس کا کوئی کام بھی عبث نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ممکن نہیں ہے کہ وہ انسان جیسی مخلوق کو پیدا کر کے اُسے یوں ہی خاک میں گم کر دے گا اور اُس کے لیے کوئی ایسی دنیا نہیں بنائے گا، جہاں اُس کا باطن ہر لحاظ سے اُس کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔

۱۳۹؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ آخرت کا انکار درحقیقت خدا کا انکار ہے، کیونکہ آخرت کے انکار کے بعد خدا کے اقرار کے بھی کوئی معنی نہیں ہیں۔ یہ، اگر غور کیجیے تو خدا کی تمام اعلیٰ صفات ——

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى

الرعد ۱۳

یہ بھلائی سے پہلے تم سے برائی کے لیے جلدی مچا رہے ہیں[۱۴۱]، دراں حالیکہ (اِس رویے پر) عبرت ناک عذاب کی مثالیں اِن سے پہلے گزر چکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا پروردگار لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود اُن سے درگذر فرمانے والا ہے۔ اور اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ تیرا پروردگار سخت سزا دینے والا ہے۔ ۶

یہ منکرین کہتے ہیں کہ اِس شخص پر اِس کے پروردگار کی طرف سے (عذاب کی) کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ (انھیں بتاؤ کہ یہ تمھارا کام نہیں ہے، اِس لیے کہ) تم تو صرف خبردار کرنے والے ہو اور ہر قوم کے لیے اِسی طرح ایک راہ بتانے والا آتا رہا ہے۔ (اِن پر عذاب کے لیے کوئی نشانی کب ظاہر ہوگی؟ اِسے اللہ جانتا ہے، جس

قدرت، ربوبیت، علم اور حکمت ـــــ کا انکار ہے۔ جو شخص اِن صفات کے بغیر خدا کو مانتا ہے، اُس کا ماننا اور نہ ماننا، دونوں برابر ہیں۔

۱۴۰؎ یعنی جہالت، ہٹ دھرمی، انانیت، تعصب اور اندھی تقلید کے طوق جو استاذ امام کے الفاظ میں اِن کی گردنیں نہ اوپر اٹھنے دیتے ہیں کہ آسمان کی نشانیوں پر غور کریں اور نہ زمین کی طرف جھکنے دیتے ہیں کہ اُس کی نشانیوں پر تدبر کی نگاہ ڈالیں۔ چنانچہ جو زاویۂ نظر اپنے لیے مقرر کیے ہوئے ہیں، اُسی پر جم کر رہ گئے ہیں۔ اُس سے ہٹ کر کسی اور طرف نظر دوڑانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

وَمَا تَغِيضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ⑧ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ⑨ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ⑩ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ

طرح) ہر مادہ کے حمل کو اللہ جانتا ہے اور جو کچھ رحموں میں گھٹتا اور بڑھتا ہے، اُس کو بھی جانتا ہے۔ ہر چیز اُس کے ہاں ایک اندازے کے مطابق ہے[۱۴۲]۔ وہ غائب و حاضر کا جاننے والا ہے، سب سے بڑا ہے، سب سے برتر ہے۔ اُس کے علم میں یکساں ہیں جو تم میں سے چپکے سے بات کریں اور جو پکار کر کریں اور جو رات (کی تاریکی) میں چھپے ہوئے ہوں اور جو دن میں چل رہے ہوں۔ اُن کے آگے اور پیچھے سے اُن پر امر الٰہی کے موکل لگے رہتے ہیں جو اُن کی نگرانی کرتے ہیں۔ (یہ جلدی نہ مچائیں)، اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک

۱۴۱؎ مطلب یہ ہے کہ انھیں تو تم سے خدا کی رحمت و عنایت اور اپنے لیے خیر و صلاح کی طلب کرنی چاہیے تھی، مگر یہ اُس سے پہلے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔

۱۴۲؎ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر حاملہ کے وضع حمل کا ٹھیک ٹھیک وقت صرف اللہ کے علم میں ہوتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ اُس میں در پردہ کیا کمی بیشی ہو رہی ہے، اُسی طرح عذاب کا وقت بھی اُسی کے علم میں ہے اور وہی جانتا ہے کہ تمھارے حالات کے لحاظ سے اُس میں کیا کمی بیشی کرنی ہے۔ میں تو جو کچھ بتا سکتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنے عقیدہ و عمل کے فساد کا حمل تم لوگ بھی قبول کر چکے ہو اور اپنی مدت کو پہنچ کر وہ بھی لازماً ظہور میں آ جائے گا۔ میں اُسی سے تمھیں خبردار کر رہا ہوں،

سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

هُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنۡشِیُٔ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿ۚ۱۲﴾ وَ یُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِهٖ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ مِنۡ خِیۡفَتِهٖ ۚ وَ یُرۡسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیۡبُ بِهَا مَنۡ یَّشَآءُ وَ هُمۡ یُجَادِلُوۡنَ

وہ خود اپنے رویے میں تبدیلی نہ کر لے اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی اور نہ اللہ کے مقابل میں اُن کا کوئی مددگار ہو سکتا ہے۔[۱۴۳] ۷-۱۱

وہی ہے جو تمھیں بجلی دکھاتا ہے جس سے خوف بھی پیدا ہوتا ہے اور امید بھی اور وہی (پانی سے) لدی ہوئی بدلیاں اٹھاتا ہے۔ اُن کی گرج اُس کی پاکی بیان کرتی ہے، اُس کی حمد کے ساتھ، اُس کے ڈر سے اور فرشتے بھی اِسی طرح اُس کے ڈر سے اُس کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے ہیں۔[۱۴۴] وہ کڑکتی ہوئی بجلیاں بھیجتا ہے، پھر جس پر چاہتا

جس طرح پہلی قوموں کے رسول کرتے رہے ہیں۔

۱۴۳؎ یہ اُس سنت الٰہی کا حوالہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ جس طرح افراد کو صبر یا شکر کے امتحان کے لیے منتخب کرتا ہے، اُسی طرح قوموں کو بھی منتخب کرتا ہے۔ اِس انتخاب کے نتیجے میں جب کوئی قوم ایک مرتبہ سرفرازی حاصل کر لیتی ہے تو اللہ اُس کے ساتھ اپنا معاملہ اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ علم و اخلاق کے لحاظ سے اپنے آپ کو پستی میں نہیں گرا دیتی۔ یہ خدا کی غیر متبدل سنت ہے اور اپنی اِس سنت کے مطابق جب کسی قوم کے لیے بار بار کی تنبیہات کے بعد وہ ذلت و نکبت کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کا یہ فیصلہ کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا اور دنیا کی کوئی قوت بھی خدا کے مقابلے میں اُس قوم کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ انسان کی پوری تاریخ قوموں کے عزل و نصب

فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ؁۱۳

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ؁۱۴

ہے، اُنھیں (بسا اوقات عین اُس حالت میں) گرا دیتا ہے، جب کہ وہ خدا کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی زبردست قوت والا ہے۔[۱۴۵] ۱۲-۱۳

اُسی کو پکارنا برحق ہے۔ اُس کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں، وہ اِس سے زیادہ اِن کی دادرسی نہیں کر سکتے کہ کوئی اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف بڑھائے کہ وہ اُس کے منہ تک پہنچ جائے، دراں حالیکہ وہ کسی طرح اُس کے منہ تک پہنچنے والا نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن منکروں کی فریاد محض صدا بہ صحرا ہے۔ ۱۴

میں اِس سنت کے ظہور کی گواہی دیتی ہے۔

۱۴۴؎ آیت میں ایک دوسرے کے مقابل الفاظ وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف کر دیے گئے ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔

۱۴۵؎ جو لوگ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے، یہ اُنھیں آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ امید و بیم کا پیغام لے کر بجلیاں تو ہر روز تمھارے سروں پر چمکتی ہیں۔ اِن کے بعد اب کس نشانی کے منتظر ہو؟ تم عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو اور اُدھر جو چیزیں عذاب بن کر نازل ہو سکتی ہیں اور جو عذاب کا فیصلہ لے کر آتے ہیں، سب خدا کے خوف سے لرزتے اور ہر وقت اُس کی حمد اور تسبیح میں مصروف رہتے ہیں کہ معلوم نہیں، کس وقت کیا حکم صادر ہو جائے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ

زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، سب طوعاً و کرہاً خدا ہی کو سجدہ کر رہے ہیں اور صبح و شام اُن کے سایے بھی۔[146] اِن سے پوچھو، زمین اور آسمانوں کا مالک کون ہے؟ کہہ دو، اللہ۔ اِن سے پوچھو، کیا پھر بھی تم نے اُس کے سوا ایسے کارساز بنا رکھے ہیں جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ اِن سے پوچھو، کیا اندھے اور آنکھوں والے، دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ یا اندھیرے اور روشنی، دونوں برابر ہوں گے؟[147] یا پھر اُنھوں نے خدا کے ایسے شریک ٹھیرائے ہیں جنھوں نے اُسی طرح

۱۴۶؎ یہ استدلال کی ایک خاص قسم ہے جسے اشارات سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اِس میں ذہن کو علامت سے حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی مخاطب کو ہر چیز کے مطیع و منقاد اور قانون سے مسخر ہونے کی طرف متوجہ کرنے کے لیے یہ تعبیر اختیار فرمائی ہے کہ دیکھ لو، چیزوں کے سایے بھی رات بھر سجدے میں پڑے رہتے ہیں، صبح کو آہستہ آہستہ سر اٹھاتے اور زوال آفتاب کے بعد ایک مرتبہ پھر اُسی پروردگار کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

۱۴۷؎ یعنی خدا کی نگاہ میں برابر ہوں گے اور تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کی بات مان کر وہ عقلی اور اخلاقی لحاظ سے اندھوں اور بیناؤں کو ایک ہی انجام سے دوچار کر دے گا؟ آیت میں یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ اندھیرے کے لیے 'ظُلُمٰت' کا لفظ جمع لائے ہیں، جب کہ اُس کے مقابل لفظ

الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۭ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاۗءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ڛ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاۗءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿١٧﴾ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا

پیدا کیا ہے، جس طرح خدا نے پیدا کیا ہے، سو اُن پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا ہے[۱۴۸]؟ اِنھیں بتا دو کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے اور وہ یکتا ہے، سب پر غالب ہے۔ ۱۵-۱۶

اُس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیاں اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہ نکلیں اور سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اُٹھا لیا، اور اِسی طرح کا جھاگ اُن چیزوں کے اندر سے بھی ابھرتا ہے جنھیں زیور یا (اِسی قسم کا) دوسرا ساز و سامان بنانے کے لیے آگ میں پگھلاتے ہیں۔ اللہ اِسی طرح حق اور باطل کو ٹکراتا ہے۔ سو جھاگ تو رائگاں جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے، وہ زمین میں ٹھیر جاتی ہے[۱۴۹]۔ اللہ اِسی طرح

'نُوْر' واحد استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ لطیف اشارہ مقصود ہے کہ تاریکیاں ہزار راستوں سے ظہور میں آتی ہیں، مگر روشنی اور اجالے کا منبع ایک ہی ہے اور وہ اِس کائنات کا پروردگار ہے۔

۱۴۸؎ چنانچہ مجبور ہیں کہ کسی نہ کسی درجے میں دوسروں کو بھی خالق مان کر خدائی میں شریک ٹھیرائیں۔

۱۴۹؎ مطلب یہ ہے کہ وحی الٰہی کی صورت میں جو بارش اِس وقت ہو رہی ہے، اُس نے بھی منکرین کے ہنگامہ و شورش کی صورت میں کچھ جھاگ اٹھا دیا ہے جو اِس طرح چرخ کھا رہا

لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٨﴾

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ

مثالیں بیان کرتا ہے، (جن سے تم اِس حقیقت کو بھی سمجھ سکتے ہو کہ) جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت کو لبیک کہا، اُن کے لیے اچھا انجام ہے اور جنھوں نے اُس کی دعوت قبول نہیں کی، (اُن کا حال یہ ہوگا کہ) اُنھیں اگر وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اُسی کے برابر اور بھی تو سب اپنی رہائی کے لیے دے ڈالیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا حساب برا[۱۵۰] اور جن کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! ۱۷-۱۸

سو کیا جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھاری طرف

ہے کہ شاید کچھ دیر تک سطح پر وہی نظر آئے گا، لیکن تم دیکھو گے کہ بہت جلد یہ سارا جھاگ فنا ہو جائے گا اور جو کچھ باقی رہے گا، وہ قرآن اور اُس کے حاملین ہوں گے۔ خدا کی سنت یہی ہے جس کا ظہور اِس کائنات میں ہر جگہ ہوتا ہے، جس طرح کہ مثال سے واضح ہے اور رسولوں کی بعثت کے بعد جب حق و باطل میں کشمکش برپا ہوتی ہے تو انسانوں کے لیے بھی لازماً ہو جاتا ہے۔

۱۵۰؎ یعنی ایسا سخت ہوگا کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بری طرح گرفت میں آئے گی، کسی لغزش سے چشم پوشی نہیں ہوگی اور اُن کے اعمال نامے میں رائی کے برابر برائی بھی اُن کے لیے پہاڑ بن کر سامنے آجائے گی۔

اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى

اتارا گیا ہے، وہ حق ہے، اُس شخص کے مانند ہو جائے گا جو اندھا ہے[۱۵۱]؟ (یہ ایک یاد دہانی ہے اور) یاد دہانی تو وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں ـــــ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اِس پیمان کو توڑتے نہیں[۱۵۲] اور جو اُس چیز کو جوڑتے ہیں جسے اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے[۱۵۳] اور اپنے رب سے ڈرتے اور برے حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کی رضا طلبی میں ثابت قدم رہے اور نماز کا اہتمام کیا اور جو کچھ ہم نے اُنھیں عطا فرمایا، اُس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کیا اور جو برائی کو

۱۵۱؎ یعنی عقل کا اندھا ہے اور حقیقت کو سامنے پا کر بھی دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔

۱۵۲؎ اِس سے مراد وہ ازلی عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابتداے آفرینش میں تمام انسانوں سے لیا تھا۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۷۲ میں اِس کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔

۱۵۳؎ یہ رشتۂ رحم کی تعبیر ہے۔ قرآن نے یہ اسلوب جہاں بھی اختیار کیا ہے، موقع کلام کی دلالت سے واضح ہے کہ رشتۂ رحم و قرابت کے لیے اختیار کیا ہے۔ اِس میں جو ابہام ہے، اُس سے رشتۂ رحم کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ گویا یہ ایسی معروف اور بدیہی حقیقت ہے کہ اِس کا نام لیے بغیر ہی ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے خدا نے کاٹنے کا نہیں، بلکہ جوڑنے کا

الدَّارِ ﴿٢٢﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿٢٣﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٤﴾

بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔[154] اگلے گھر کا انجام اُنھی کے لیے ہے، ابد کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بھی جو اُن کے آبا و اجداد اور اُن کی بیویوں اور اُن کی اولاد میں سے اِس کے اہل بنیں گے۔[155] فرشتے ہر دروازے سے اُن کے پاس آئیں گے اور کہیں گے: تم لوگوں پر سلامتی ہو، اِس لیے کہ تم ثابت قدم رہے۔ سو کیا ہی خوب ہے یہ اگلے گھر کا اچھا انجام![156] ۱۹-۲۴

الرعد ۱۳

حکم دیا ہے۔

۱۵۴ یعنی بدی کے مقابلے میں بدی نہیں، بلکہ نیکی کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن پر بھی خرچ کیے جاتے ہیں جن کا سلوک اُن کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا۔ وہ اِس بات کو سمجھتے ہیں کہ اُن کا پروردگار اِسی رویے کو پسند کرتا ہے کہ شر کا مقابلہ شر سے نہیں، بلکہ خیر سے کیا جائے اور ظلم کے جواب میں ظلم نہیں، بلکہ انصاف کا علم اٹھائے رکھا جائے، خواہ اِس کے لیے کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔

یہ تمام تفصیل اِس لیے کی گئی ہے کہ منکرین کو متنبہ کر دیا جائے کہ تم جس اندھے پن کا مظاہرہ کر رہے ہو، اُس کے ساتھ تم اُن لوگوں کے مانند نہیں ہو سکتے جنھیں اللہ تعالیٰ نے دل و دماغ کی روشنی عطا فرمائی ہے۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے کہ آپ پریشان نہ ہوں، آپ جو چیز پیش کر رہے ہیں، اُس کے بارے میں ہر شخص کا رویہ یکساں نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مطمئن رہیے، اُس سے وہی لوگ یاددہانی حاصل کریں گے جو ہوش گوش رکھتے اور عقل سے کام لیتے ہیں اور جن کی سیرت و کردار کا رنگ وہ ہے جو بیان کیا جا رہا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ

الرعد ۱۳

اِس کے برخلاف جو اللہ کے عہد کو اُس کے باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُسے کاٹتے ہیں اور اِس طرح زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، وہی ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور جن کے لیے اُس کا گھر نہایت بُرا انجام بھی ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے، رزق کی فراخی عطا فرماتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے[۱۵۷]، اُسے تنگ کر دیتا ہے۔ یہ (اِس حقیقت کو نہیں سمجھے اور) اِسی دنیا کی زندگی پر ریجھے ہوئے ہیں، دراں حالیکہ دنیا کی یہ زندگی آخرت میں محض ایک متاعِ حقیر[۱۵۸] ہی نکلے گی۔ ۲۵-۲۶

یہ منکرین کہتے ہیں کہ اِس کے پروردگار کی طرف سے اِس شخص پر کوئی نشانی

۱۵۵؎ یہ اچھے انجام کی مزید تفصیل ہے کہ اُن کے اعزہ واقربا بھی اہل ہوئے تو جنت میں اُن کے ساتھ ہوں گے تاکہ اُن کی مسرت میں کوئی کمی نہ رہے۔

۱۵۶؎ یہ فقرہ فرشتوں کے قولِ تہنیت کا جز نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس مرتبۂ بلند کی تحسین ہے جو انجام کار اُنھیں حاصل ہو جائے گا۔

۱۵۷؎ یہ الفاظ وضاحتِ قرینہ کی بنا پر اصل میں محذوف ہیں۔

۱۵۸؎ اصل میں لفظ 'مَتَاع' آیا ہے۔ یہ نکرہ ہے۔ اِسی تنکیر کو ہم نے متاعِ حقیر کے الفاظ میں

اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿٢٧﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ؕ﴿٢٨﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ ﴿٢٩﴾ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاْ

کیوں نہیں اتاری گئی؟ اِن سے کہہ دو، اللہ جس کو چاہتا ہے (اپنے قانون کے مطابق[159] اِسی طرح) گم راہ کر دیتا ہے اور اپنا راستہ اُنھی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف متوجہ ہوں[160]، جو ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کی اِس یاددہانی سے مطمئن ہوتے ہیں۔ سنو، اللہ کی اِس یاددہانی ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے[161]۔ جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے، اُن کے لیے خوش خبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔ ۲۷-۲۹

ہم نے اِسی طرح، (اے پیغمبر، ایسی کسی نشانی کے بغیر ہی) تم کو ایک ایسی قوم میں

ادا کیا ہے، اِس لیے کہ آیت میں یہ تقلیل کے مفہوم میں ہے۔

۱۵۹؎ یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق کہ جو لوگ انفس و آفاق کی نشانیوں سے آنکھیں بند کر کے قبولِ حق کے لیے معجزوں اور کرشموں کا مطالبہ کریں، وہ اِسی کے مستحق ہیں کہ گم راہ کر دیے جائیں۔

۱۶۰؎ ہدایت پانے کے لیے یہ لازمی شرط ہے۔ آدمی اگر ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر خدا کی طرف متوجہ ہو جائے تو اِس نعمت سے لازماً بہرہ یاب ہو جاتا ہے۔

۱۶۱؎ یعنی معجزوں اور کرشموں سے نہیں، بلکہ قرآن سے جب وہ اللہ تعالیٰ کی صفات، اُس کے سنن اور اُس کی معرفت کے دلائل و حجج سے حق کو پوری طرح مبرہن کر دیتا ہے۔ تاہم اِس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی حق کو مجرد حق کی حیثیت سے پہچاننے کے لیے تیار ہو جائے۔

عَلَیۡہِمُ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ ہُمۡ یَکۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ ؕ قُلۡ ہُوَ رَبِّیۡ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَ اِلَیۡہِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾ وَ لَوۡ اَنَّ قُرۡاٰنًا سُیِّرَتۡ بِہِ الۡجِبَالُ اَوۡ قُطِّعَتۡ بِہِ الۡاَرۡضُ اَوۡ کُلِّمَ بِہِ الۡمَوۡتٰی ؕ بَلۡ لِّلّٰہِ الۡاَمۡرُ جَمِیۡعًا ؕ اَفَلَمۡ یَایۡـَٔسِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰہُ لَہَدَی النَّاسَ جَمِیۡعًا ؕ وَ لَا یَزَالُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا تُصِیۡبُہُمۡ بِمَا صَنَعُوۡا قَارِعَۃٌ

رسول بنا کر بھیجا ہے، جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں، اِس لیے کہ تم اُنھیں وہ پیغام سنا دو جو ہم نے تم پر وحی کیا ہے، ہر چند وہ خداے رحمٰن کا انکار کر رہے ہیں۔[۱۶۲] اِن سے کہو کہ وہی میرا پروردگار ہے، اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، میں نے اُسی پر بھروسا کیا ہے اور (جانتا ہوں کہ ایک دن) اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا قرآن بھی ہوتا جس سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین ٹکڑے ہو جاتی یا اُس سے مردے بولنے لگتے تو کیا یہ ایمان لے آتے؟[۱۶۳] نہیں، یہ تمھارا کام نہیں ہے (کہ اِنھیں نشانیاں دکھاؤ)، بلکہ تمام اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پھر کیا ایمان والے (یہ جان کر بھی اِن سے) مایوس نہیں ہوئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟[۱۶۴] (تم دیکھتے رہو)، اِن منکروں پر برابر کوئی نہ کوئی آفت اِن کے اعمال کی پاداش

۱۶۲؎ یعنی اُس کی بندگی سے گریزاں ہیں اور اُس کے صفات و حقوق میں دوسروں کو اُس کا شریک بنا رہے ہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ اِس رویے کو خدا کے انکار سے تعبیر کیا ہے۔

۱۶۳؎ یہ جواب شرط ہے جو اصل میں محذوف ہے۔ اِسی طرح 'بَلْ' سے پہلے بھی نفی کا جملہ اِسی طریقے پر حذف کر دیا گیا ہے۔ ہم نے دونوں کو کھول دیا ہے۔

۱۶۴؎ یعنی اِن لوگوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوئے، بلکہ ابھی تک امید لگائے بیٹھے ہیں کہ

اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ

میں آتی رہے گی یا اِن کی بستی کے قریب کہیں نازل ہوتی رہے گی، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو۔[165] یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔ تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے انکار کرنے والوں کو ڈھیل دی، پھر میں نے اُن کو پکڑا تو (دیکھو کہ) کیسی تھی میری سزا! ۳۰-۳۲

پھر کیا وہ جو ایک ایک شخص کے عمل کی خبر رکھنے والا ہے اور جو کسی بات پر قدرت نہیں رکھتے، یکساں ہیں[166] اور اِنھوں نے (اِسی بنا پر) اللہ کے شریک بنا لیے ہیں؟ اِن

اِن کے مطالبات پورے کر دیے جائیں تو یہ ایمان لے آئیں گے، جب کہ اُن پر واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر اِس طرح کا ایمان مطلوب ہوتا تو اِس کے لیے معجزے اور کرشمے دکھانے کے تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام تو اِس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ اللہ آن کی آن میں سب کو اپنی قدرت سے مومن بنا دیتا۔ مگر اُس نے ایسا نہیں کیا، اِس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل و بصیرت سے کام لیں اور اپنے اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ پورے شعور سے ایمان لائیں۔ یہی امتحان ہے جس میں انسانوں کو مبتلا کیا گیا ہے۔

۱۶۵؎ مطلب یہ ہے کہ اِن کی طلب کے مطابق معجزے اور کرشمے تو نہیں، مگر تنبیہات نازل ہوتی رہتی ہیں اور اِن کے کرتوتوں کی پاداش میں خود اِن پر یا اِن کے قرب و جوار کے لوگوں پر اِسی طرح نازل ہوتی رہیں گی تاکہ یہ بیدار ہوں اور پیغمبر کی دعوت پر غور کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

سے کہو، اُن کے نام تو بتاؤ، کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دے رہے ہو جس سے وہ خود اپنی زمین میں بے خبر ہے یا پھر اوپری باتیں کر رہے ہو؟[167] نہیں، بلکہ اِن منکروں کے لیے اِن کا فریب[168] خوش نما بنا دیا گیا ہے اور یہ راہ حق سے روک دیے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جنھیں اللہ (اپنے قانون کے مطابق) گم راہی میں ڈال دے، اُنھیں کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے۔ اُن کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو اِس سے کہیں سخت ہے اور اُنھیں کوئی اللہ سے بچانے والا نہ ہوگا۔ ۳۳-۳۴

اِس کے برخلاف اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے،

اب یہ اِن پر ہے کہ اِنھی تنبیہات سے متنبہ ہو جائیں یا انتظار کرتے رہیں، یہاں تک کہ وہ آخری عذاب آجائے جس کی وعید اِنھیں سنائی جا رہی ہے۔

۱۶۶؎ جملے کا یہ حصہ اصل میں محذوف ہے۔ اِس سے متکلم کی نفرت و کراہت کا اظہار ہو رہا ہے۔ گویا اِس طرح کی بات کا ذکر بھی اُسے گوارا نہیں ہے۔

۱۶۷؎ یعنی بغیر سوچے سمجھے جو منہ میں آئے، کہہ رہے ہو۔ اِس جملے میں جو غصہ اور تحقیر چھپی ہوئی ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

۱۶۸؎ شرک کے لیے یہ لفظ اِس لیے استعمال کیا ہے کہ اِس سے مذہبی پیشوا اپنے آپ کو بھی

الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ

اُس کی تصویر یہ ہے کہ اُس کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، اُس کے پھل دائمی اور اُس کا سایہ لازوال ہوگا[۱۶۹]۔ یہ اُن لوگوں کا انجام ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں اور منکروں کا انجام یہ ہے کہ اُن کے لیے دوزخ کی آگ ہے۔ ۳۵

ہم نے جن کو کتاب عطا فرمائی ہے[۱۷۰]، وہ اُس چیز سے خوش ہیں جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور تمھارے منکرین کے گروہوں میں ایسے بھی ہیں جو اُس کی بعض چیزوں کو نہیں مانتے[۱۷۱]۔ تم اُن کو صاف کہہ دو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ خدا ہی کی بندگی کروں اور کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھیراؤں۔ میں اُسی کی طرف بلاتا ہوں اور اُسی کی

دھوکا دیتے ہیں اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے لوگوں کو بھی دھوکے میں مبتلا کیے رکھتے ہیں۔

۱۶۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا'۔ اِن میں 'ظِلُّهَا' کی خبر وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف کر دی گئی ہے۔

۱۷۰؎ یہ صالحین اہل کتاب کا ذکر ہے، اِس لیے 'اُوْتُوا الْكِتٰبَ' کے بجائے 'اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ' کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ قرآن کا خیر مقدم کیا۔

۱۷۱؎ آگے کے مضمون سے واضح ہے کہ اِن بعض چیزوں میں سب سے نمایاں قرآن کی

حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿٣٧﴾
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ

طرف میرا لوٹنا ہے۔ ہم نے یہ کتاب اِسی لیے[172] ایک فرمان کی حیثیت سے[173] عربی میں اتاری ہے۔ اب اگر تم اُس علم کے بعد[174] جو تمھارے پاس آ چکا ہے، اُن کی خواہشوں[175] کی پیروی کرو گے تو اللہ کے مقابل میں نہ تمھارا کوئی مددگار ہو گا نہ بچانے والا۔[176] ۳۶-۳۷

(اِنھیں اعتراض ہے کہ تم کوئی نشانی کیوں نہیں دکھاتے اور دنیوی علائق کیوں رکھتے ہو)؟ ہم نے، (اے پیغمبر)، تم سے پہلے بھی رسول بھیجے تھے اور (چونکہ انسان

دعوت توحید تھی جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین میں سے بعض گروہ کسی حال میں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

۱۷۲؎ اصل میں لفظ 'کَذٰلِكَ' ہے۔ یہ عربی زبان میں اُس معنی کے لیے بھی آتا ہے جسے ہم 'چنانچہ' یا 'اِسی لیے' جیسے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔

۱۷۳؎ یعنی ایک فرمان واجب الاذعان کی حیثیت سے جسے جھٹلایا گیا تو خدا کی عدالت اِسی زمین پر اپنا فیصلہ سنا دے گی۔

۱۷۴؎ یعنی وہ علم قطعی جس میں کسی ریب و گمان کی گنجایش نہیں ہے۔

۱۷۵؎ اصل میں لفظ 'اَهْوَآء' آیا ہے۔ اِس سے یہاں اِن گروہوں کی بدعتیں مراد ہیں، اِس لیے کہ اِن کی بنیاد علم پر نہیں، بلکہ خواہشوں ہی پر ہوتی ہے۔

۱۷۶؎ یہاں بھی خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر روے سخن منکرین ہی کی طرف ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اِس میں یہ بلاغت ہے کہ سننے والے اچھی طرح متنبہ ہو جائیں کہ اِس حکم کی خلاف ورزی کر کے جب پیغمبر بھی خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے تو تابہ

الرعد ۱۳

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِیَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيْعُ

ہی تھے، اِس لیے) اُن کو بیویاں بھی دی تھیں اور اولاد بھی۔ اور کسی رسول کے اختیار میں نہیں تھا کہ وہ اذن الٰہی کے بغیر کوئی نشانی لا دکھائے۔ (ہر چیز کے لیے ایک وقت ہے اور) ہر وقت کے لیے ایک نوشتہ ہے۔ اللہ جو کچھ چاہتا ہے، اُس میں سے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے، باقی رکھتا ہے اور اِس نوشتے کی اصل اُسی کے پاس ہے[۱۷۷]۔ ۳۸-۳۹

ہم جو وعید اِنھیں سنا رہے ہیں، اُس کا کچھ حصہ ہم تمھیں دکھائیں یا تم کو وفات دیں اور اِس کے بعد اِن سے نمٹیں، بہرکیف تمھاری ذمہ داری صرف پہنچانا ہے اور اِن کا حساب لینا ہمارا کام ہے۔ کیا یہ نہیں دیکھ رہے کہ اِس سرزمین کو ہم اِس کے کناروں سے کم کرتے ہوئے اِس کی طرف بڑھ رہے ہیں[۱۷۸]۔ اللہ فیصلہ کرتا ہے، کوئی اُس کے

دیگراں چہ رسد!

[۱۷۷] مطلب یہ ہے کہ خدا کے فیصلے مبرم بھی ہوتے ہیں اور معلق بھی۔ پھر جو معلق ہیں، اُن میں وہ اپنی حکمت و مشیت کے تحت تبدیلی بھی کرتا ہے۔ لیکن جو کچھ کرتا ہے، وہی کرتا ہے، اِس لیے کہ اصل نوشتہ اُسی کے پاس ہے اور کسی دوسرے کے لیے اُس تک رسائی کا کوئی موقع نہیں ہے کہ وہاں جائے اور کسی نشانی کے ظہور کا وقت اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر لے۔

الۡحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدۡ مَكَرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلِلّٰهِ الۡمَكۡرُ جَمِيۡعًا ؕ يَعۡلَمُ مَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ ؕ وَسَيَعۡلَمُ الۡكُفّٰرُ لِمَنۡ عُقۡبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَسۡتَ مُرۡسَلًا ؕ قُلۡ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًاۢ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكُمۡ ۙ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

فیصلے کو ہٹانے والا نہیں ہے اور وہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے[۱۷۹]۔ جو اِن سے پہلے گزرے ہیں، اُنھوں نے بھی چالیں چلی تھیں، مگر چالیں سب اللہ کے اختیار میں ہیں۔ ہر ایک جو کچھ کر رہا ہے، وہ اُس کو جانتا ہے۔ اور یہ منکرین بھی عنقریب جان لیں گے کہ اگلے گھر کا اچھا انجام کس کے لیے ہے۔ ۴۰-۴۲

(یہ سب سننے کے بعد بھی تمھارے) منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہہ دو، میرے اور تمھارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور اُن لوگوں کی گواہی جن کے پاس کتاب کا علم ہے[۱۸۰]۔ ۴۳

۱۷۸؎ یہ اُن فتوحات کی طرف اشارہ ہے جو اسلام کی دعوت کو مکہ کے اطراف میں حاصل ہو رہی تھیں۔ خدا نے اِسے اپنے اقدام سے تعبیر فرمایا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اگر کوئی نشانی ہی دیکھنا چاہتے ہیں تو اِس نشانی کو کیوں نہیں دیکھتے کہ ہماری دعوت کے اثرات گردوپیش کے قبائل میں پھیلتے جا رہے ہیں، اِن کا دائرہ تنگ ہو رہا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ اِن کا یہ شہر بھی ایک دن اِس دعوت کی یلغار سے مفتوح ہو جائے گا؟

۱۷۹؎ رسولوں کی بعثت کے بعد اُن کے مخاطبین کے ساتھ کب کیا ہوگا؟ اِس کا فیصلہ اللہ کرتا ہے۔ یہ اُسی فیصلے کا حوالہ ہے۔ اِس کی حیثیت ایک قضاے مبرم کی ہوتی ہے، اِسے کوئی ٹال نہیں سکتا اور جس طرح کہ اوپر فرمایا ہے، رسول کی زندگی میں یا اُس کی وفات کے بعد یہ فیصلہ پورے

انصاف کے ساتھ سنا دیا جاتا ہے۔

۱۸۰؎ یعنی صالحین اہل کتاب جن کا ذکر اوپر آیت ۳۶ میں ہو چکا ہے۔

کوالالمپور

۱۶؍مئی ۲۰۱۲ء

ابراهيم - الحجر

۱۴ــــ ۱۵

ابراھیم - الحجر

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں جس چیز کے لیے قریش کو تنبیہ و تہدید ہے، دوسری میں اُسی کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ مطمئن رہو، یہ قرآن بجائے خود ایک واضح حجت ہے، یہ نہیں مانتے تو اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑو، وہ وقت اب جلد آنے والا ہے، جب یہ آرزوئیں کریں گے کہ اے کاش، ہم نے یہ رویہ اختیار نہ کیا ہوتا۔

دونوں کا موضوع وہی انذار و بشارت ہے جو پچھلی سورتوں سے چلا آرہا ہے۔ اتنا فرق، البتہ ہوا ہے کہ نتائج کا بیان زیادہ صریح ہو گیا ہے اور فہمایش تنبیہ، ملامت اور زجر و توبیخ میں تبدیل ہو گئی ہے۔

دونوں سورتوں میں خطاب اصلاً قریش ہی سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

سورة ابرٰهیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ قف کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ اِلَیۡکَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۬ۙ بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ وَیۡلٌ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ

ابرٰھیم ۱۴

—— ۱ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'الٓرٰ' ہے[۱]۔ یہ کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، اِس لیے کہ تم لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آؤ[۲]، اُن کے پروردگار کے اذن سے[۳]، اُس خدا کے راستے کی طرف جو زبردست ہے، اپنی ذات میں آپ محمود ہے[۴]۔ وہی اللہ کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اُسی کا ہے۔ (تم اِس کا انکار کرو گے؟) یاد

۱ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق ہم نے اپنا نقطۂ نظر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۲ اصل میں 'ظُلُمٰت' اور 'نُوۡر' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'نُوۡر' واحد اور 'ظُلُمٰت' جمع ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ گم راہی ہزار راستوں سے آتی ہے، مگر ہدایت کا راستہ ایک ہی ہے جسے قرآن صراط مستقیم سے تعبیر کرتا ہے۔

۳ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ ہدایت کی توفیق خدا کے اذن سے ملتی ہے اور یہ اذن اُنھی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اپنے آپ کو اِس کا اہل ثابت کر دیتے ہیں۔

۴ چنانچہ وہی سزاوار ہے کہ اُس سے ڈرا جائے اور وہی حق دار ہے کہ اُس کی حمد کی جائے اور

شَدِيْدِ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

رکھو)، اُن کے لیے جو اِس کتاب کے منکر ہیں، ایک شدید عذاب کی تباہی ہے۔ اُن کے لیے جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور خدا کے راستے سے روکتے ہیں اور اُس میں ٹیڑھ پیدا کرنا چاہتے ہیں[۵]۔ یہ لوگ بہت دور کی گم راہی میں ہیں۔ (اِن کے لیے یہ کتاب اِن کی زبان میں اتاری گئی ہے) اور (ہمارا طریقہ یہی ہے کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اُس کی قوم کی زبان میں بھیجا ہے، اِس لیے کہ وہ اُنھیں اچھی طرح کھول کر سمجھا دے۔ پھر اللہ جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق[۶]) گم راہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔ وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ ۱-۴

ہم نے اِسی طرح موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاؤ اور اُنھیں خدا کے دنوں کی یاد دلاؤ، (جن میں اُس کی دینونت

اُس سے امیدیں باندھی جائیں۔

۵۔ یعنی اُس کو خدا کے بجائے اپنے ٹھیرائے ہوئے معبودوں کی طرف موڑ دینا چاہتے ہیں۔

۶۔ یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق کہ جو ہدایت کے مستحق ہیں، اُنھیں ہدایت دی جائے اور جو گم راہی چاہتے ہیں، اُنھیں اُسی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۵﴾
وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۶﴾ وَاِذْ

کا ظہور ہوا ہے[8])۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِن میں ہر اُس شخص کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو (خدا کی آزمایشوں میں) صبر اور (اُس کے افضال و عنایات پر) شکر کرنے والا ہو[9]۔ ۵

یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے اوپر اللہ کی اُس نعمت کو یاد رکھو، جب اُس نے تمھیں فرعون کے لوگوں سے چھڑایا جو تمھیں نہایت برے عذاب دیتے تھے، وہ تمھارے بیٹوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ذبح کر دیتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔ تمھارے پروردگار کی طرف سے اِس میں[10] (تمھارے لیے) بڑی عنایت تھی۔

---

۷ یہ اُن نشانیوں کا ذکر ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو فرعون پر اتمام حجت کے لیے دی گئی تھیں، جیسے عصا اور ید بیضا وغیرہ۔

۸ یعنی جزا و سزا کے فیصلے ہوئے ہیں اور خدا نے رسولوں کے منکرین پر اِسی دنیا میں اپنا عذاب نازل کر دیا ہے، جیسے قوم نوح، قوم لوط اور قوم شعیب وغیرہ۔ قرآن میں یہ تعبیر اِنھی ایام کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

۹ یہی دو صفات ہیں جو آدمی کے اندر موجود ہوں تو وہ آیات الٰہی کی طرف متوجہ ہوتا اور اُن سے عبرت حاصل کرتا ہے۔

۱۰ یعنی اِس مصیبت سے چھڑانے میں۔

تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝٧ وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝٨

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛؕ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فِيْۤ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ

اور یاد کرو، جب تمھارے پروردگار نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر تم شکر کرو گے تو ضرور میں تم کو اور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میری سزا بھی بڑی سخت ہے[۱۱]۔ اور موسیٰ نے (اِس کے ساتھ) تنبیہ بھی کر دی کہ اگر تم ناشکری کرو اور زمین کے سارے لوگ بھی اِسی طرح ناشکرے ہو جائیں تو خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے، اِس لیے کہ اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے[۱۲]۔ ۶-۸

تمھیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں؟ قوم نوح، عاد و ثمود اور جو اُن کے بعد ہوئے ہیں، جنھیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اُن کے رسول اُن کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو اُنھوں نے اپنے ہاتھ اُن کے منہ میں دے

۱۱؎ اِس وقت چونکہ یہود بھی در پردہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے سرگرم ہو چکے تھے، اِس لیے یہ بات اللہ تعالیٰ نے اُنھیں براہ راست خطاب کر کے کہہ دی ہے۔

۱۲؎ یہ غالباً اُسی تقریر کا خلاصہ ہے جو بائیبل کی کتاب استثنا میں بڑے شرح و بسط کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ تقریر اپنی وفات سے کچھ پہلے صحراے سینا میں بنی اسرائیل کے سامنے فرمائی تھی۔ اِسے کتاب استثنا کے ابواب ۴، ۶، ۸، ۱۰، ۱۱ اور ۲۸ تا ۳۰ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿٩﴾ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ

دیے[۱۳] (کہ خاموش ہو جاؤ) اور کہہ دیا کہ جو تمھیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اُس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی طرف تم ہم کو بلا رہے ہو، اُس کے بارے میں ہم ایسے شک میں پڑ گئے ہیں جو سخت الجھن میں ڈال دینے والا ہے۔ اُن کے رسولوں نے کہا: کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا وجود میں لانے والا ہے[۱۴]؟ وہ تمھیں بلا رہا ہے کہ تمھارے گناہوں میں سے معاف فرمائے (جو اِس سے پہلے تم سے ہوئے ہیں) اور تم کو ایک مقرر مدت تک مہلت دے۔ اُنھوں نے جواب دیا: تم ہماری طرح کے ایک آدمی ہی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہمیں اُن چیزوں کی بندگی سے روک دو جنھیں

۱۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ'۔ جب کوئی شخص غصے اور نفرت سے کسی کو بات کرنے سے روکنا چاہتا ہے تو اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے کہ زبان بند کرو، اِس کے بعد ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالو۔ یہ اِسی صورت حال کی تعبیر ہے۔ لفظ 'رَدُّوْا' یہاں 'جعلوا' کے معنی میں ہے اور یہ لفظ اِس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۴؎ یہ سوال استعجاب کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کو تو تم مانتے ہو۔ ہم جس چیز کی طرف تمھیں بلا رہے ہیں، وہ اِس کے سوا کیا ہے کہ بندگی کا مستحق بھی صرف وہی ہے۔ یہ تو خدا کو ماننے کا لازمی نتیجہ ہے۔ تم اِسے نہیں مان رہے تو پھر کیا خدا کے بارے میں کسی شک میں پڑ گئے ہو؟

مُّبِيۡنٍ ﴿۱۰﴾ قَالَتۡ لَهُمۡ رُسُلُهُمۡ اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَاۤ اَنۡ نَّاۡتِيَكُمۡ بِسُلۡطٰنٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدۡ هَدٰٮنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصۡبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَيۡتُمُوۡنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُتَوَكِّلُوۡنَ ﴿۱۲﴾ وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِرُسُلِهِمۡ لَنُخۡرِجَنَّكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِىۡ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوۡحٰۤى اِلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ لَنُهۡلِكَنَّ

ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں۔ (یہی بات ہے) تو ہمارے سامنے کوئی صریح سند لاؤ۔[۱۵] اُن کے رسولوں نے اُن سے کہا: بے شک، ہم تمھاری ہی طرح کے آدمی ہیں، مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، فضل فرماتا ہے۔ یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ اذن الٰہی کے بغیر ہم تمھیں کوئی سند لا دکھائیں۔ (سو تمھارا یہ مطالبہ اللہ کے حوالے ہے) اور ایمان والوں کو چاہیے کہ (اِس طرح کے معاملات میں) اللہ ہی پر بھروسا رکھیں۔ اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسا رکھیں، جب کہ ہمارے اِن راستوں کی ہدایت اُسی نے ہمیں بخشی ہے؟ تم جو اذیت بھی ہمیں دے رہے ہو، ہم اُس پر ہر حال میں صبر کریں گے اور (اللہ پر بھروسا کریں گے، اِس لیے کہ) بھروسا کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ اِس پر منکروں نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ہم تم کو اپنی اِس سرزمین سے لازماً نکال دیں گے یا تمھیں بالآخر ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔[۱۶] تب اُن کے

۱۵؎ مطلب یہ ہے کہ اپنے معبودوں کے بارے میں ایسی سنگین بات ہم اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی کس طرح مان سکتے ہیں؟ ہمیں کوئی معجزہ دکھاؤ جس کو دیکھ کر یقین آ جائے کہ تم فی الواقع خدا کے بھیجے ہوئے ہو۔

الظّٰلِمِينَ ﴿١٣﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿١٤﴾

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿١٥﴾ مِّنْ وَّرَاۗىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّاۗءٍ صَدِيْدٍ ﴿١٦﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿١٧﴾

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ

پروردگار نے اُن کی طرف وحی بھیجی کہ ہم اِن ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور اِن کے بعد تمھیں اِس ملک میں آباد کریں گے۔[۱۷] یہ بشارت ہے اُن کے لیے جو میرے حضور (جواب دہی کے لیے) کھڑے ہونے سے ڈرے اور جو میری وعید سے ڈرے۔ ۹-۱۴

اُنھوں نے فیصلہ چاہا تھا، سو فیصلہ ہو گیا اور ہر سرکش ضدی نامراد ہوا۔ اب اُس کے آگے دوزخ ہے۔ وہاں اُس کو پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ وہ اُس کو گھونٹ گھونٹ پیے گا اور گلے سے اتار نہ سکے گا۔ موت ہر طرف سے اُس پر پلی پڑ رہی ہو گی، لیکن مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک اور سخت عذاب اُس کا منتظر ہو گا۔ ۱۵-۱۷

جن لوگوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا ہے،[۱۸] اُن کے اعمال[۱۹] کی مثال اُس راکھ کی

۱۶؎ یہ اُنھوں نے اپنے گمان کے مطابق کہا ہے، اِس لیے کہ دعوت سے پہلے وہ یہی سمجھتے تھے کہ رسول بھی اُسی مذہب پر ہیں جو اُنھوں نے اپنے لیے اختیار کر رکھا ہے۔

۱۷؎ رسولوں کے باب میں یہی خدا کی سنت ہے۔ ہم اِس کتاب میں جگہ جگہ اِس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾
وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا

سی ہے جس پر آندھی کے دن تند و تیز ہوا چل جائے۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا ہوگا، اُس میں سے کچھ بھی نہ پاسکیں گے۔ یہی دور کی گم راہی ہے[20]۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے؟ (یہ اُس کی دی ہوئی مہلت ہے کہ وہ تمھارے اِس کفر و شرک کو گوارا کر رہا ہے)۔ وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور ایک نئی مخلوق (تمھاری جگہ) لے آئے۔ یہ اللہ پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔ ۱۸-۲۰

(یہ مہلت بہت جلد ختم ہو جائے گی) اور سب خدا کے روبرو نکل کھڑے ہوں

۱۸؎ یعنی جانتے بوجھتے اُس کے شریک ٹھیرائے ہیں۔ شرک اپنی حقیقت کے لحاظ سے کفر ہی ہے، اِس لیے کہ دین میں خدا کا صرف وہی ماننا تسلیم کیا جاتا ہے جو توحید پر پورے ایمان کے ساتھ ہو۔ چنانچہ آیت میں 'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا' سے مراد مشرکین قریش ہی ہیں جو سورہ کے مخاطب ہیں۔

۱۹؎ اِس سے، ظاہر ہے کہ اُن کے وہ اعمال مراد ہیں جو اُنھوں نے اپنی طرف سے نیکی کے اعمال سمجھ کر کیے ہوں گے۔ قرآن نے یہ بات جگہ جگہ واضح کر دی ہے کہ شرک کے ساتھ کوئی عمل بھی خدا کے ہاں مقبول نہیں ہے۔

۲۰؎ یعنی ایسی گم راہی ہے جس سے لوٹ کر آنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا۔

لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰكُمْؕ سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ ﴿۲۱﴾

وَقَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْؕ وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّؕ اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ

ابرٰھیم ۱۴

گے۔[۲۱] پھر جو کمزور تھے وہ اُن سے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کہیں گے: ہم تمھارے پیچھے چلنے والے تھے تو کیا اللہ کے عذاب سے ہمیں کچھ بچا لو گے؟ وہ جواب دیں گے کہ اگر اللہ نے ہمیں راہ دکھائی ہوتی[۲۲] تو ہم بھی تمھیں راہ دکھاتے۔ اب ہمارے تمھارے لیے یکساں ہے کہ چیخیں چلائیں یا صبر کریں، ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ۲۱

اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا، (سو اُس نے وہ پورا کر دیا) اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا، مگر میں نے تمھارے ساتھ وعدہ خلافی کی اور میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اِس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ تمھیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اِس لیے مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ اب نہ میں تمھاری فریاد کو پہنچ سکتا

۲۱؎ مطلب یہ ہے کہ کسی کے لیے کوئی پردہ یا اوٹ باقی نہیں رہے گی، تمام سہارے ختم ہو جائیں گے اور لوگ تنہا اور بے یار و مددگار خدا کے حضور پیش ہو جائیں گے۔

۲۲؎ یعنی اِس بات کی توفیق دی ہوتی کہ عقل سے کام لیتے اور دنیا ہی میں صحیح راستہ دیکھ لیتے۔

مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۲﴾
وَ اُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾
اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کَلِمَةً طَیِّبَةً کَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِیْۤ اُکُلَهَا کُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾

ہوں، نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکتے ہو۔ تم نے جو مجھے شریک ٹھیرایا تھا، میں نے اُس کا پہلے ہی انکار کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِسی طرح کے ظالم ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔۲۲

اِس کے برخلاف جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، وہ ایسے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کا تحیہ اُن باغوں میں ایک دوسرے کے لیے سلام ہوگا۔۲۳

(یہ اِس لیے کہ اُن کے علم و عمل کی بنیاد ایک کلمۂ طیبہ[۲۳] ہے)۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کلمۂ طیبہ کی مثال کس طرح بیان فرمائی ہے؟ وہ ایک شجرۂ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑیں زمین میں اتری ہوئی اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں[۲۴]۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے اپنا پھل ہر فصل میں دیتا رہتا ہے[۲۵]۔ (یہ کلمۂ طیبہ

۲۳۔ یعنی کلمۂ توحید اور اُس پر مبنی عقائد و نظریات۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيۡثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيۡثَةِ ۨاجۡتُثَّتۡ مِنۡ فَوۡقِ الۡاَرۡضِ مَا لَهَا مِنۡ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

کی مثال ہے) اور اللہ لوگوں کے لیے تمثیلیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں[26]۔ ۲۴-۲۵

اور اِس کے مقابل میں کلمۂ خبیثہ[27] کی مثال ایک شجرۂ خبیثہ کی[28] ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے، اُس کو کوئی ثبات نہ ہو[29]۔ ۲۶

۲۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُهَا فِي السَّمَآءِ'۔ اِس میں مقابل کے الفاظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گئے ہیں۔ اِنھیں کھول دیجیے تو گویا پورا جملہ یہ ہے: 'اَصۡلُهَا ثَابِتٌ فِي الۡاَرۡضِ وَفَرۡعُهَا عَالٍ فِي السَّمَآءِ'۔

۲۵؎ یعنی سدابہار ہے، اُس پر کبھی خزاں نہیں آتی۔

۲۶؎ یہ قریش کو متنبہ فرمایا ہے کہ وہ چیتیں اور سوچیں کہ اللہ تعالیٰ اِس تمثیل کے ذریعے سے اُنھیں جن حقائق کی یاددہانی کرا رہا ہے، وہ کیا ہیں؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کلمۂ توحید کی تمثیل ایک ایسے درخت سے دے کر قرآن نے ایک حقیقت تو یہ واضح فرمائی کہ اِس کی جڑیں انسانی فطرت کے اندر بھی گہری اتری ہوئی ہیں اور عنداللہ بھی یہ سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والی حقیقت ہے۔ گویا زمین و آسمان، میں جو مقام اِس کو حاصل ہے، وہ کسی اور چیز کو حاصل نہیں۔

دوسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اِس کو انسانی فطرت کے اندر سے بھی برابر غذا اور قوت حاصل ہوتی رہتی ہے اور اوپر سے بھی برابر ترشحات اِس پر نازل ہوتے رہتے ہیں جو اِس کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھتے ہیں۔

تیسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اِس کی برکات ابدی اور دائمی ہیں۔ اِس کا فیض ہمیشہ جاری

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَفِى الۡاٰخِرَةِ‌ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيۡنَ‌ ۙ وَيَفۡعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

ایمان والوں کو اللہ اِسی محکم بات سے[۳۰] دنیا اور آخرت، (دونوں) کی زندگی میں ثبات عطا فرمائے گا[۳۱] اور جو (اپنی جان پر) ظلم کرنے والے ہیں، اُن کو اللہ (منزل سے) بھٹکا دے گا[۳۲]۔ اللہ (اپنے علم و حکمت کے مطابق) جو چاہے، کر گزرتا ہے۔ ۲۷

رہتا ہے۔ جس کے سینے میں یہ نور موجود ہے، وہ ہمیشہ آسودہ اور شادکام رہتا ہے۔"

(تدبر قرآن ۳۲۵/۴)

۲۷؎ یعنی کلمۂ شرک اور اُس پر مبنی عقائد و نظریات۔

۲۸؎ یعنی ایسے درخت کی جو جھاڑ جھنکاڑ کی قسم کا ہے۔ اُس میں نہ پھل آتا ہے نہ پھول نکلتے ہیں۔ نہ اُس کے سایے میں بیٹھ سکتے ہیں نہ اپنے لیے کوئی غذا حاصل کر سکتے ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں گویا ایک خودرو، خاردار، بدبودار، بے فیض و بے ثمر جھاڑی ہے جس کو ہاتھ لگایئے تو اُس کے کانٹے ہاتھوں کو زخمی کریں، چکھیے تو اُس کی تلخی سے زبان اینٹھ جائے، پاس بیٹھیے تو اُس کی بو سے قوت شامہ ماؤف ہو کے رہ جائے۔

۲۹؎ مطلب یہ ہے کہ کلمۂ شرک کی کوئی بنیاد نہ عقل و فطرت کے اندر ہے نہ انبیا علیہم السلام کی تعلیمات میں۔ یہ گویا ایک خودرو جھاڑی ہے جو زمین کے اوپر ہی اوپر ہے، نہ اِس کی کوئی گہری جڑ ہے، نہ فضا کی بلندی نے اِس کو قبول کیا ہے۔ اِسے کوئی اکھاڑنا چاہے تو اوپر ہی سے اکھاڑ کر پھینک سکتا ہے۔

۳۰؎ یعنی کلمۂ توحید سے۔

۳۱؎ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہ فکر و عمل کی ہر پریشانی اور سرگردانی سے محفوظ رہیں گے اور آخرت میں بغیر کسی حیرانی اور سراسیمگی کے ٹھیک اُس منزل پر پہنچ جائیں گے جس کے لیے سرگرم سفر

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ كُفۡرًا وَّاَحَلُّوۡا قَوۡمَهُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصۡلَوۡنَهَا ؕ وَبِئۡسَ الۡقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَجَعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا لِّيُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعُوۡا فَاِنَّ مَصِيۡرَكُمۡ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

تم نے دیکھا نہیں[۳۳] اُن لوگوں کو جنھوں نے اللہ کی نعمت[۳۴] کے بدلے میں ناشکری کی اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر ـــــ جہنم ـــــ میں لا اتارا ہے؟ وہ اُس میں داخل ہوں گے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! اُنھوں نے اللہ کے شریک ٹھیرائے تاکہ (لوگوں کو) اُس کے راستے سے بھٹکا دیں۔ اُن سے کہو، مزے کرلو، تمھارا ٹھکانا بالآخر دوزخ ہی کی طرف ہے۔ ۲۸-۳۰

رہے۔ اُن کے پاے استقلال میں یہاں اور وہاں کوئی لغزش نہیں آئے گی۔

۳۲ے یعنی اُن کے کسی عمل کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دے گا۔ اُن کی ہر سعی رائگاں جائے گی اور وہ بالکل نامراد ہو کر رہ جائیں گے۔ آیت میں لفظ 'ظَالِم' 'ظالم لنفسه' کے معنی میں ہے۔ قرآن میں شرک کو اِسی بنا پر 'ظُلْمٌ عَظِيْمٌ' کہا گیا ہے۔ یہاں بھی 'ظٰلِمِيْن' سے مراد وہی مشرکین قریش ہیں جو سورہ کے مخاطب ہیں۔

۳۳ے یہ اسلوب خطاب یہاں اظہار تعجب اور ملامت کے لیے ہے اور مخاطبین قریش اور اُن کے لیڈر ہیں جو اپنی قوم کو دھکیل کر کفر و شرک کے گڑھے تک لے آئے تھے، جیسا کہ آگے بیان ہوا ہے۔

۳۴ے اشارہ ہے اُس نعمت عظمیٰ کی طرف جو قریش کو اللہ کی عنایت اور ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی برکت سے حاصل ہوئی اور وہ پورے عالم کے لیے توحید کے مرکز اور خدا کے حرم کی پاسبانی کے لیے چن لیے گئے۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿٣١﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿٣٢﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿٣٣﴾ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ

ابراھیم
۱۴

(اے پیغمبر)، میرے جو بندے ایمان لے آئے ہیں، اُن سے کہہ دو کہ نماز کا اہتمام رکھیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو عطا فرمایا ہے، اُس میں سے کھلے اور چھپے (اللہ کی راہ میں) خرچ کریں[۳۵]، اِس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی کام آئے گی۔ ۳۱

(یہ مشرکین دیکھتے نہیں کہ) اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی اتارا، پھر اُس سے تمھاری روزی کے لیے طرح طرح کے پھل نکالے اور کشتی کو تمھارے کام میں لگا دیا کہ اُس کے حکم سے سمندر میں چلے اور اُس نے دریاؤں کو تمھارے کام میں لگایا اور سورج اور چاند کو تمھارے کام میں لگایا، دونوں برابر چلے جا رہے ہیں۔ اِسی طرح دن اور رات کو بھی اُس نے تمھارے کام میں لگایا اور تمھیں ہر چیز میں سے، جو تم نے مانگی، عطا فرمایا[۳۶]۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو نہیں

---

۳۵ مطلب یہ ہے کہ اپنی قوم کے لوگوں کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے وہ نماز اور انفاق کا اہتمام کریں تاکہ وہی امانت اب اُن کے سپرد کر دی جائے جس میں اُن کے یہ بھائی خیانت کر

لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿٣٤﴾
وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿٣٥﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ

گن سکتے۔ (اِس پر بھی خدا کے شریک ٹھیراتے ہو)؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے۔ ۳۲-۳۴

(یہ ابراہیم کی اولاد ہیں)۔ اِنھیں وہ واقعہ سناؤ، جب ابراہیم نے دعا کی تھی[۳۷] کہ میرے پروردگار، اِس شہر کو امن کا شہر[۳۸] بنا اور مجھے اور میری اولاد[۳۹] کو اِس سے دور رکھ کہ ہم

چکے ہیں۔

۳۶؎ یعنی ہر وہ چیز عطا فرمائی جس کا تقاضا تمھاری خلقت نے کیا اور جس چیز کی احتیاج تمھارے اندر رکھی، اُس کا جواب پوری مطابقت کے ساتھ فراہم کر دیا۔ اِس سے یہ حقیقت بالکل مبرہن ہو گئی کہ جس نے بنایا ہے، وہی پروردگار بھی ہے اور تمھاری سب ضرورتوں کا اہتمام بھی اُسی نے فرمایا ہے۔ اِس میں کوئی دوسرا کسی بھی درجے میں اُس کا شریک نہیں ہے۔

۳۷؎ آگے کی آیتوں سے واضح ہے کہ یہ دعا اُس وقت کی گئی، جب حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ کو سرزمین مکہ میں لا کر بسایا ہے۔

۳۸؎ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی ذریت کو مکہ میں آباد کیا تو اُس وقت یہ شہر نہ صرف یہ کہ تہذیب و تمدن اور آبادی و زرخیزی سے بالکل محروم تھا، بلکہ وحشی اور خانہ بدوش قبیلوں کی لوٹ مار سے بھی محفوظ نہ تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اِسی بنا پر یہ دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اُسے اِس طرح قبول فرمایا کہ اولاً، اِس سرزمین میں لڑنا بھڑنا اور جنگ و جدال یک قلم ممنوع قرار دیا۔ ثانیاً، اِس کی طرف سفر کے لیے چار مہینے حرام قرار دیے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اِس کے گردوپیش میں خطرناک سے خطرناک علاقے بھی اِن مہینوں میں بالکل پرامن ہو گئے۔ ثالثاً، اِس میں اپنے گھر کو ایسی

النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ

ابرٰھیم ۱۴

بتوں کو پوجنے لگیں۔ پروردگار، اِن بتوں نے بہت لوگوں کو گم راہی میں ڈال دیا ہے[۴۰]۔ (یہ میری اولاد کو بھی گم راہ کر سکتے ہیں)، اِس لیے جو (اُن میں سے) میری پیروی کرے، وہ تو میرا ہے اور جس نے میری بات نہیں مانی، اُس کا معاملہ تیرے حوالے ہے، پھر تو بخشنے والا ہے، تیری شفقت ابدی ہے۔ اے ہمارے پروردگار، میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے حرمت والے گھر کے پاس ایک بن کھیتی کی وادی میں لا بسایا ہے۔ پروردگار، اِس لیے کہ وہ اِس گھر میں نماز کا اہتمام کریں[۴۱]۔ سو تو لوگوں کے دل اُن کی طرف مائل کر دے اور اُنھیں پھلوں کی روزی عطا فرما، اِس لیے کہ وہ (تیرا) شکر ادا کریں[۴۲]۔

ہیبت عطا فرمائی کہ اِس پر باہر سے اول تو کسی نے حملہ آور ہونے کی جرأت ہی نہیں کی، لیکن اگر کبھی ایسا ہوا تو اِس کے باشندوں کی اِس طرح مدد کی کہ اُن کی معمولی مزاحمت پر آسمان سے اُن کے لیے اپنے جنود قاہرہ بھیج کر اُس کے دشمنوں کو بالکل پامال کر دیا۔

۳۹؎ اصل میں لفظ 'بَنِیَّ' آیا ہے جس کے معنی بیٹوں کے ہیں، لیکن یہ علیٰ سبیل التغلیب یہاں اولاد کے معنی میں آ گیا ہے۔

۴۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ'۔ اِس میں چونکہ بتوں کی شدت تاثیر و تسخیر کا اظہار مقصود ہے، اِس لیے ضمیریں اور افعال وہ آ گئے ہیں جو ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

مَا نُخۡفِیۡ وَمَا نُعۡلِنُ ؕ وَمَا یَخۡفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ

پروردگار، تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔[۴۳] حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے، نہ زمین میں، نہ آسمان میں۔ خدا کا شکر ہے

۴۱؎ نماز خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کا اولین ظہور ہے، باقی تمام چیزیں اِسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اِسی کا ذکر کیا ہے۔ وہ اِس حقیقت کو خوب جانتے تھے کہ اگر نماز اپنی صحیح روح کے ساتھ قائم رہے گی تو دین کی کوئی چیز بھی ضائع نہیں ہوگی، بلکہ یہی نماز ہر چیز کو قائم رکھنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

۴۲؎ یہ دعا بھی اِس طرح پوری ہوئی کہ حج و عمرہ کی وجہ سے لوگوں کا رجوع اِس سرزمین کی طرف بہت بڑھ گیا۔ اِس سے تجارت اور کاروبار کو فروغ ہوا۔ باہر سے ہر قسم کی چیزیں اِس شہر کے بازاروں میں پہنچنے لگیں۔ پھر حرم کی تولیت کے باعث قریش کو ایسی عزت حاصل ہوئی کہ اُن کے قافلے بغیر کسی تعرض کے دوسرے ملکوں کو جانے لگے۔ اِس سے گلہ بانی اور شکار ہی پر گزر بسر کرنے والوں کی معیشت میں غیر معمولی تبدیلی آئی۔ چنانچہ ہر طرح کی اجناس اور پھل وغیرہ اِس شہر میں فراوانی کے ساتھ میسر ہو گئے۔

۴۳؎ یہ فقرہ نہایت بلیغ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس فقرے کی بلاغت احاطۂ بیان میں نہیں آسکتی۔ بندہ جب اپنے رب سے کسی اہم معاملے میں دعا کرتا ہے تو اُس کو ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ بعض باتیں وہ کہنا تو چاہتا ہے، لیکن وہ بیان میں نہیں آتیں، اِسی طرح بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو دل میں تو ہوتی ہیں، لیکن وہ اُن کے کہنے میں کسی مبہم سبب سے کچھ حجاب سا محسوس کرتا ہے۔ اِس فقرے نے اِس طرح کی ساری باتوں کو سمیٹ لیا، اِس لیے کہ خدا کا علم ظاہر و مخفی، سب کو محیط ہے۔“

(تدبر قرآن ۴/ ۳۴۴)

وَاِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَسَمِیۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ٭ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلۡ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾

جس نے مجھے اِس بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق عطا فرمائے ہیں[۴۴]۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ میرا پروردگار دعا کا سننے والا ہے۔ پروردگار، مجھے نماز کا اہتمام کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی، (جنھیں میں یہاں بسا رہا ہوں)۔ پروردگار، اور میری یہ دعا قبول فرما۔ پروردگار، تو مجھ کو بخش دے اور میرے والدین[۴۵] کو اور سب ایمان والوں کو بخش دے، اُس دن جب کہ حساب قائم ہوگا[۴۶]۔ ۳۵-۴۱

۴۴؎ یہ دعا کے حق میں اُن احسانات کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اِس سے پہلے اُن پر کیے تھے۔ اِس سے ضمناً یہ بات بھی پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے اسمٰعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ کو اُن کی پیدایش کے بعد نہیں، بلکہ اُس وقت مکہ کی وادی غیر ذی زرع میں لا کر بسایا، جب اسمٰعیل علیہ السلام کے واقعۂ قربانی کے بعد اسحٰق علیہ السلام بھی پیدا ہو چکے تھے اور اسمٰعیل اِس قابل تھے کہ بیت اللہ کے خادم اور متولی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکیں۔

۴۵؎ لفظ 'وَالِدَیْنِ' بتا رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اِس دعا میں اپنے والد ـــــ آزر ـــــ کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ اُس وعدے کی بنا پر ہے جو اُنھوں نے ہجرت کے وقت باپ سے کیا تھا کہ 'سَاَسۡتَغۡفِرُ لَکَ رَبِّیۡ'*۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اِس سے روک دیا۔ یہ دعا، ظاہر ہے کہ اِس ممانعت سے پہلے کی ہے۔

* مریم ۱۹: ۴۷۔ ''میں آپ کے لیے اب اپنے پروردگار سے بخشش کی دعا کروں گا۔''

وَلَا تَحۡسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعۡمَلُ الظّٰلِمُوۡنَ ۬ؕ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمۡ لِیَوۡمٍ تَشۡخَصُ فِیۡهِ الۡاَبۡصَارُ ﴿۴۲﴾ مُهۡطِعِیۡنَ مُقۡنِعِیۡ رُءُوۡسِهِمۡ لَا یَرۡتَدُّ اِلَیۡهِمۡ طَرۡفُهُمۡ ۚ وَ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ هَوَآءٌ ﴿ؕ۴۳﴾

وَ اَنۡذِرِ النَّاسَ یَوۡمَ یَاۡتِیۡهِمُ الۡعَذَابُ فَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا رَبَّنَاۤ اَخِّرۡنَاۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ نُّجِبۡ دَعۡوَتَکَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَ لَمۡ تَکُوۡنُوۡۤا

یہ ظالم جو کچھ کر رہے ہیں، تم خدا کو اُس سے ہرگز غافل نہ سمجھو، (اے پیغمبر)۔ وہ اِنھیں صرف اُس دن کے لیے ٹال رہا ہے جس میں نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ یہ سر اٹھائے ہوئے بھاگ رہے ہوں گے، اِن کی نظر (اُٹھے گی تو) اِن کی طرف پلٹ کر نہ آئے گی اور اِن کے دل اڑے ہوئے ہوں گے۔۴۲-۴۳

تم اِن لوگوں کو اُس دن سے خبردار کر دو، جس دن اِنھیں عذاب آلے گا۔ اُس وقت یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہمیں تھوڑی سی

۴۶؎ اِس دعا میں لفظ 'رَبّ' یا 'رَبَّنَا' بار بار دہرایا گیا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یوں بظاہر تو یہ ایک تکرار سی محسوس ہوتی ہے، لیکن درحقیقت یہ چیز دعا کی خصوصیات، بلکہ اُس کے لوازم میں سے ہے۔ دعا کا اصل مزاج تضرع، استمالت، استغاثہ اور التجا و فریاد ہے۔ یہ چیز مقتضی ہوتی ہے کہ جس سے دعا کی جا رہی ہے، اُس کو بار بار متوجہ کیا جائے۔ جب بندہ خدا کو 'رَبِّیْ' سے خطاب کرتا ہے تو وہ گویا اُس لطف خاص کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا ہے جس کا تجربہ اُسے خود ہے اور جب اُس کو 'رَبَّنَا' سے خطاب کرتا ہے تو وہ اُس کے اُس کرم عام کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا ہے جس کا مشاہدہ تمام خلق میں ہو رہا ہے۔"

(تدبر قرآن ۴/ ۳۳۴)

أَقْسَمْتُم مِّن قَبْلُ مَا لَكُم مِّن زَوَالٍ ﴿٤٤﴾ وَسَكَنتُمْ فِي مَسَٰكِنِ
الَّذِينَ ظَلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ
الْأَمْثَالَ ﴿٤٥﴾ وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِندَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِن
كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿٤٦﴾

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ
ذُو انتِقَامٍ ﴿٤٧﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَٰوَٰتُ وَبَرَزُوا
لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿٤٨﴾ وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي

مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت قبول کرلیں گے اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں گے ـــــ کیا تم اِس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے رہے تھے کہ تم (اپنی جگہ سے) ہٹنے والے نہیں ہو؟ تم اُنھی لوگوں کی بستیوں میں آباد تھے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے تھے اور تم پر کھل چکا تھا کہ ہم نے اُن کے ساتھ کیا معاملہ کیا اور ہم نے تمھارے لیے اُن کی مثالیں بیان کر دی تھیں۔ اُنھوں نے اپنی سب چالیں چل دیکھیں۔ اُن کی یہ چالیں اب اللہ کے پاس دھری ہیں، اگرچہ اُن کی چالیں ایسی تھیں کہ اُن سے پہاڑ بھی ٹل جائیں۔ ۴۴-۴۶

سو ہرگز خیال نہ کرو کہ اللہ اپنے رسولوں سے کیے ہوئے وعدوں کے خلاف کرے گا۔ یقیناً اللہ زبردست ہے، وہ انتقام لینے والا ہے۔ اُس دن کو یاد رکھو، جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی اور سب (تنہا، بے یارومددگار) اللہ واحد وقہار کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔ اُس دن تم مجرموں کو دیکھو گے کہ

الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾
لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾
هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ
وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

سورة الحجر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۣ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱﴾ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ

زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، اُن کے لباس تارکول کے ہیں اور اُن کے چہروں پر آگ چھائی ہوئی ہے۔ یہ اِس لیے کہ اللہ ہر شخص کو اُس کی کمائی کا بدلہ دے۔ بے شک، اللہ جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ یہ لوگوں کے لیے ایک اعلان ہے، اِس لیے کہ اُن پر حجت پوری ہو جائے اور اِس لیے کہ وہ اِس کے ذریعے سے خبردار کر دیے جائیں اور اِس لیے کہ وہ جان لیں کہ وہی ایک معبود ہے اور اِس لیے کہ دانش مند (اِس سے) یاددہانی حاصل کر لیں۔ ۴۷-۵۲

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'الٓرٰ'[۴۷] ہے۔ یہ کتاب الٰہی اور قرآن مبین[۴۸] کی آیتیں ہیں۔ وہ دن بھی آئیں

[۴۷] اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق ہم اپنا نقطۂ نظر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝٢ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝٣ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝٤ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝٥ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝٦ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٧ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝٨ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ

گے، جب یہ منکرین تمنا کریں گے کہ کاش، ہم مسلمان ہوتے۔ اِنھیں چھوڑو، یہ کھائیں پییں، مزے کریں اور اِن کی آرزوئیں اِنھیں بھلاوے میں ڈالے رکھیں۔ پھر یہ عنقریب جان لیں گے۔ (اِس وقت ہم اِن کو اِس لیے نہیں پکڑ رہے کہ) ہم نے جس بستی کے لوگوں کو بھی ہلاک کیا ہے، اُس کے لیے ایک مقرر نوشتہ رہا ہے۔ کوئی قوم نہ اپنے مقرر وقت سے آگے بڑھتی ہے نہ پیچھے ہٹتی ہے۔ (اِنھیں بھی یہ مہلت اِسی بنا پر دی گئی تو) اب یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس (کا خیال ہے کہ اُس) پر یہ ذکر اتارا گیا ہے، تم یقیناً دیوانے ہو[۴۹]۔ اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتے؟ ہم

۴۸ اصل الفاظ ہیں: 'تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ'۔ اِن میں 'و' تفسیر کی ہے اور قرآن کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ لفظ 'مُبِيْن' استدلال کے محل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کلام جو اِن کو سنایا جا رہا ہے، یہ حقائق کو اِس طرح مبرہن کر دینے والا ہے کہ اِس کے بعد مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ اِس کا بیان ہی اِس کی صداقت کی دلیل بن جاتا ہے۔

۴۹ یہ بات وہ طنزیہ انداز میں اور اِس معنی میں کہتے تھے کہ تم ہمیں عذاب کی وعیدیں سناتے اور اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے فوز و فلاح کے دعوے کرتے ہو، یہ سب تمھارا خبط ہے اور اِسی

لَحٰفِظُوْنَ ⑨ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ⑩ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑪ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ

فرشتوں کو صرف فیصلے کے ساتھ اتارتے ہیں[۵۰] اور (جب وہ اتارے جائیں گے تو) اُس وقت اِنھیں مہلت نہیں دی جائے گی۔ (یہ قرآن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ تم مطمئن رہو، اے پیغمبر)، اِس میں شبہ نہیں کہ یہ ذکر خود ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اِس کے نگہبان ہیں[۵۱]۔ ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے گزرے ہوئے گروہوں میں اپنے رسول بھیجے تھے۔ اُن

خبط میں تم اِس طرح کی باتیں بھی کرنے لگے ہو کہ تم پر وحی آتی ہے اور فرشتے اترتے ہیں۔

۵۰؎ یعنی اُس وقت اتارتے ہیں، جب کسی قوم کا فیصلہ چکا دینے کا ارادہ کرلیا جاتا ہے۔ اُس وقت صرف فیصلہ چکایا جاتا ہے، یہ مہلت نہیں دی جاتی کہ فرشتوں کو دیکھ رہے ہو تو اب ایمان لے آؤ۔

۵۱؎ مطلب یہ ہے کہ اِن کی یاددہانی کے لیے یہ قرآن تم اپنی طرف سے تصنیف کرکے نہیں لائے ہو۔ یہ ہم نے اتارا ہے اور تمھاری طرف سے بغیر کسی تمنا اور طلب کے اتارا ہے، اِس لیے اِس کی حفاظت بھی ہم ہی کریں گے۔ یہ اِس کو یا اِس کی دعوت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ قرآن کے بارے میں یہ اُسی طرح کا وعدہ ہے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے کہ 'وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ'*۔ یہ وعدہ حرف بہ حرف پورا ہوا اور قرآن کے خلاف اُس کے دشمنوں کی تمام تدبیریں ناکام ہوگئیں۔ وہ نہ کسی کے مٹائے مٹ سکا، نہ دبائے دب سکا، نہ اُس کی قدر و منزلت میں کوئی کمی آئی، نہ اُس کی دعوت میں کوئی رکاوٹ ڈالی جا سکی اور نہ اُس میں تحریف اور رد و بدل کرنے کی کوئی کوشش کبھی کامیاب ہوسکی۔ وہ جس طرح دیا گیا، ٹھیک اُسی طرح دنیا کو منتقل ہوگیا۔ یہاں تک کہ اب اُس کے خلاف کچھ کرنا کسی کے لیے ممکن ہی نہیں رہا۔

* المائدہ ۵: ۶۷۔ ''اللہ اِن لوگوں سے تمھاری حفاظت کرے گا۔''

فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٢﴾ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ﴿١٤﴾ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ ﴿١٥﴾

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ﴿١٧﴾ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُبِينٌ ﴿١٨﴾

کے پاس بھی جو رسول آیا، وہ اُس کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔ ہم اپنی اِس یاددہانی کو اِس طرح کے مجرموں کے دل میں اِسی طرح (تیرو نشتر بنا کر) اتارتے ہیں۔ یہ اِس پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اِن کے اگلوں سے یہی طریقہ چلا آ رہا ہے۔ ہم اِن پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے جس میں یہ چڑھنے لگتے، تب بھی یہی کہتے کہ یہ تو ہماری آنکھیں خیرہ کر دی گئی ہیں، بلکہ ہم سب لوگوں پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ۱-۱۵

(یہ دیکھیں تو سہی)، ہم نے آسمان میں مضبوط قلعے بنائے ہیں[۵۲] اور اُس کو دیکھنے والوں کے لیے رونق دی ہے اور ہر شیطان مردود[۵۳] (کی دراندازی) سے اُس کو محفوظ کر دیا ہے، الّا یہ کہ کوئی چوری چھپے کان لگا کر سننے کی کوشش کرے۔ سو اِس پر ایک روشن

۵۲؎ اِس سے مراد وہ آسمانی قلعے ہیں جن میں خدا کے ملائکہ اور کروبیوں کی فوجیں اُن سرحدوں کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت مامور رہتی ہیں جن سے آگے کسی جن یا انسان کو بڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

۵۳؎ اصل میں لفظ 'رَجِیْم' آیا ہے۔ شیطان کے لیے یہ صفت اُس سنگ باری کا ہدف بن جانے کی رعایت سے آئی ہے جس کا ذکر آگے ہوا ہے۔

وَالۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰهَا وَاَلۡقَيۡنَا فِيۡهَا رَوَاسِىَ وَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ مَّوۡزُوۡنٍ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلۡنَا لَـكُمۡ فِيۡهَا مَعَايِشَ وَمَنۡ لَّسۡتُمۡ لَهٗ بِرٰزِقِيۡنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ

شعلہ اُس کا تعاقب کرتا ہے۔[۵۴] ۱۶-۱۸

ہم نے زمین کو پھیلایا، (اُس کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے) اُس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے، ہر قسم کی چیزیں ایک تناسب کے ساتھ اُس میں اگا دیں اور اُس میں تمھاری معیشت کے اسباب بھی فراہم کر دیے اور اُن کی معیشت کے بھی جنھیں تم روزی دینے والے نہیں ہو۔[۵۵] حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے

الحجر ۱۵

۵۴؎ اِس سے غالباً وہی شعلے مراد ہیں جنھیں ہم اپنی اصطلاح میں شہاب ثاقب کہتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تم پیغمبر سے معجزے مانگتے ہو۔ رات کو کبھی کھلے میدان میں کھڑے ہو کر آسمان پر نظر ڈالو، اُس کی وسعتوں میں چمکتے ہوئے تارے اور اُن سے ٹوٹتے ہوئے شہاب تمھارے سامنے خدا کی عظمت اور اُس کے جلال و جمال کا ایسا منظر پیش کریں گے کہ حیران و ششدر ہو کر رہ جاؤ گے اور بے اختیار پکار اٹھو گے کہ 'رَبَّنَا، مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً'*۔ اِس سے ضمناً یہ بات بھی واضح ہوئی کہ خدا کی بات صرف اُس کے ملائکہ لا سکتے ہیں، اُسے کوئی جن یا انسان زمین سے صعود کر کے اور ملاء اعلیٰ کے حدود میں داخل ہو کر اپنے طور پر حاصل نہیں کر سکتا۔ جو کاہن، جوگی، عامل اور صوفی اِس کے دعوے کرتے ہیں، وہ سب فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ اُن کے علوم اور ذرائع، سب زمینی ہیں اور اُن کی مدد سے وہ اتنا ہی جان سکتے ہیں، جتنا زمین کے حدود میں پہنچا دیا گیا ہے۔

۵۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ'۔ اِن میں حرف جر کو عربیت کے قاعدے سے ایک جگہ حذف کر دیا ہے۔ چنانچہ 'مَنْ لَّسْتُمْ' درحقیقت 'و لمن لستم' ہے۔ ہم نے ترجمہ

* آل عمران ۳: ۱۹۱۔ ''پروردگار، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا ہے۔''

اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۲۱﴾
وَاَرۡسَلۡنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسۡقَیۡنٰکُمُوۡہُ ۚ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ لَہٗ بِخٰزِنِیۡنَ ﴿۲۲﴾
وَاِنَّا لَنَحۡنُ نُحۡیٖ وَنُمِیۡتُ وَنَحۡنُ الۡوٰرِثُوۡنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَقۡدِمِیۡنَ مِنۡکُمۡ وَلَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَاۡخِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ

پاس نہ ہوں، لیکن اُس کو ہم ایک معین اندازے ہی سے اتارتے ہیں[۵۶]۔ ۱۹-۲۱

ہم ہی ہواؤں کو بار آور بنا کر چلاتے ہیں۔ پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں اور تمھیں اُس سے سیراب کر دیتے ہیں۔ تم اُس کے یہ ذخیرے جمع کر کے نہیں رکھ سکتے تھے۔ ۲۲

(چنانچہ) کچھ شک نہیں کہ ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور سب کے وارث بھی ہم ہی ہیں[۵۷]۔ ہم اُن کو بھی جانتے ہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اُن کو

اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۵۶؎ یہاں اور اِس سے پہلے اندازے اور تناسب کے ذکر سے جس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ خدا کے خزانوں میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، لیکن وہ اُن میں سے اتنا ہی اتارتا ہے، جتنا زمین پر انسان کے قیام و بقا اور آرام و راحت کے لیے ضروری ہے۔ وہ علیم و حکیم ہے اور خوب جانتا ہے کہ اگر کوئی ایک چیز بھی حد مطلوب سے تجاوز کر جائے تو پورا نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔

۵۷؎ یعنی ہم ہی باقی رہ جائیں گے اور سب کو آنا بھی ہمارے پاس ہی ہے۔ اگر کسی نے کسی اور سے کوئی امید باندھ رکھی تو اِس وہم سے نکل آئے، اِس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ وَالْجَاۗنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

بھی جانتے ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں۔ یقیناً تمھارا پروردگار ہی ہے جو (ایک دن) اِن سب کو اکٹھا کر لے گا۔ اِس لیے کہ وہ حکیم و علیم ہے۔[58] ۲۳-۲۵

(یہ ابلیس کے فریب میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ اِنھیں یاد دلاؤ)، ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے بنایا تھا اور اِس سے پہلے جنوں کو لو کی لپٹ سے پیدا کیا تھا۔[59] اور یاد دلاؤ، جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں

۵۸؎ مطلب یہ ہے کہ حکیم ہے، اِس لیے لازماً ایک روز جزا لائے گا اور علیم بھی ہے، اِس لیے نہ اُس سے کوئی چھپ سکتا ہے اور نہ وہ کسی کے عمل سے بے خبر ہے۔

۵۹؎ یہ آگے کی بات کے لیے تمہید ہے اور ابلیس و آدم کی بنائے مخاصمت کو واضح کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے۔ اِس سے اِن مخلوقات کے عناصر خلقت کا سراغ دینا مقصود نہیں ہے۔ تاہم اتنی بات اِس سے یقیناً واضح ہو جاتی ہے کہ انسانوں سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جنوں کو لو کی لپٹ سے پیدا کیا۔ پھر انسان کو مٹی سے بنانے کا فیصلہ کیا تو اُس کا حیوانی وجود بالکل اُسی طرح زمین کے پیٹ میں تخلیق فرمایا، جس طرح وہ اب ماں کے پیٹ میں تخلیق کیا جاتا ہے۔ قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی صورت غالباً یہ ہوئی کہ دریاؤں اور سمندروں کے کنارے کی کیچڑ میں کسی جگہ نطفہ کے قسم کی کوئی چیز پیدا ہوئی جس کے اوپر کی کیچڑ خشک ہو کر بیضے کی شکل اختیار کر گئی۔ قرآن نے اِسی کو کھنکھناتی مٹی سے تعبیر کیا ہے۔ تخلیق کے مختلف مراحل سے گزر کر انسان اُس بیضے سے اُسی طرح نمودار ہو گیا، جس طرح انڈوں سے بچے نکلتے ہیں۔ تمام جان دار پہلے

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ

سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ سو جب میں اُس کو ہر لحاظ سے درست کر لوں اور اُس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں[۶۰] تو تم سب اُس کے آگے سجدہ ریز ہو جانا[۶۱]۔ پھر (ہوا یہ کہ) تمام فرشتے سجدے میں گر پڑے (اور

مرحلے میں غالباً اِسی طریقے سے پیدا کیے گئے۔ پھر اُن کا تسویہ ہوا اور اُن میں اپنی نسل آپ پیدا کر لینے کی صلاحیت ودیعت کر دی گئی۔ قرآن مجید میں 'اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ'* اور 'اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا'** کی تعبیرات اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

۶۰؎ یہ امور متشابہات میں سے ہے جن کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تاہم اتنی بات واضح ہے کہ یہی وہ لطیف پھونک ہے جس سے انسان کے حیوانی وجود میں وہ چیز داخل ہوئی جسے انسان کہا جاتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں بھی یہ اِسی مرحلے میں پھونکی جاتی ہے۔ اِس سے پہلے انسان، انسان نہیں ہوتا، صرف ایک حیوان ہوتا ہے جو تخلیق کے مختلف مراحل سے گزر کر انسانی شخصیت کے لیے ایک ایسا قالب بن جاتا ہے کہ اب اُس میں یہ روح پھونک دی جائے۔

۶۱؎ یہ حکم امتحان کے لیے دیا گیا۔ اِس سے مقصود یہ تھا کہ آدم پر واضح ہو جائے کہ اصلی سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہے۔

۶۲؎ آگے 'اِلَّآ اِبْلِيْسَ' کے الفاظ ہیں۔ قرآن میں صراحت ہے کہ ابلیس جنات میں سے تھا۔ اِس سے آپ سے آپ واضح ہوا کہ جنات چونکہ اپنی خلقت کے لحاظ سے فرشتوں سے زیادہ دور نہیں ہیں، اِس لیے اُنھیں جب سجدے کا حکم دیا گیا تو علیٰ سبیل التغلیب جنات بھی اِس حکم میں

* ہود ۱۱: ۶۱۔ النجم ۵۳: ۳۲۔ ''اُس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا۔''

** نوح ۷۱: ۱۷۔ ''اللہ ہی نے تمھیں خاص اہتمام کے ساتھ زمین سے اگایا۔''

مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٣١﴾ قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٣٢﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٣٣﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿٣٤﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٣٥﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿٣٦﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿٣٧﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿٣٨﴾ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ

جنات بھی[62])، ابلیس کے سوا۔ اُس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ خدا نے پوچھا: اے ابلیس، تیرا کیا معاملہ ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا؟ اُس نے جواب دیا: میں وہ نہیں ہوں کہ ایک ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا ہے[63]۔ فرمایا: (یہ بات ہے) تو یہاں سے[64] نکل جا، اِس لیے کہ تو راندۂ درگاہ ہے اور تجھ پر روز جزا تک لعنت ہے۔ اُس نے عرض کیا: پروردگار، پھر مجھے اُس دن تک کے لیے مہلت دے دے، جب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا: اچھا، تو بھی اُنھی میں سے ہے جنھیں اُس مقرر وقت کے دن تک کے

شامل تھے۔ یہ بات چونکہ 'اِلَّآ اِبْلِيْسَ' کے استثنا سے واضح ہو جاتی ہے، اِس لیے قرآن نے اِسے الفاظ میں بیان نہیں کیا۔

۶۳؎ انسان جب علم، دولت، حسن یا اقتدار میں اپنے آپ کو دوسروں سے برتر دیکھتا ہے تو ابلیس کا یہی استدلال ہے جو اُسے حق کے مقابل میں اکڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اپنی خلقت کے لحاظ سے فرشتے جنات سے بھی برتر تھے، مگر اُنھوں نے یہ احمقانہ استدلال نہیں کیا، بلکہ سجدے کے حکم کو خدا کا امتحان سمجھا اور بغیر کسی تردد کے امتثال امر کے لیے تیار ہو گئے۔

۶۴؎ یعنی آسمان سے، جہاں ابلیس بھی فرشتوں کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ عربی

اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٣٩﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٤٠﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿٤١﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿٤٢﴾

لیے مہلت دی گئی ہے۔ اُس نے کہا: پروردگار، جیسا تو نے مجھے گم راہ کیا ہے،[۶۵] اُسی طرح اب میں بھی اِن کے لیے زمین میں دل فریبیاں پیدا کروں گا اور اِن میں سے تیرے منتخب بندوں کے سوا سب کو گم راہ کر کے چھوڑوں گا۔ فرمایا: یہ (بندگی کا راستہ) ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والا ہے۔[۶۶] میرے بندوں پر تیرا ہرگز کوئی زور نہیں

الحجر ۱۵

زبان میں آسمان کے لیے 'السَّمَآء' کا لفظ ہے۔ آیت میں 'ھَا' کی ضمیر اسی کے لیے آئی ہے۔

۶۵؎ آیت میں اِس کے لیے 'بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ ابلیس نے یہ بات کیوں کہی؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِغْوَا' کے معنی گم راہ کرنے کے ہیں۔ چونکہ ابلیس آدم کو سجدہ نہ کرنے کے معاملے میں اپنے آپ کو بجانب حق خیال کرتا تھا، اِس وجہ سے اُس نے نہایت گستاخانہ انداز میں فعل 'اِغْوَا' کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کیا۔ مطلب یہ کہ اگر میں اِس حکم کی عدم تعمیل کے باعث سے گم راہ ٹھیرا تو اِس میں میرا قصور نہیں ہے، بلکہ یہ حکم ہی ایسا تھا کہ میں اِس کی تعمیل نہیں کر سکتا تھا۔ اِس وجہ سے اگر میں اِس کے سبب سے گم راہ ہوا تو اِس پر تو نے ہی مجھے مجبور کیا۔''

(تدبر قرآن ۳۵۹/۴)

۶۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ'۔ اِن میں 'صِرَاطٌ' کے بعد 'عَلٰى' عربیت کے خاص اسلوب کے مطابق آیا ہے۔ قرآن اور کلام عرب، دونوں کے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب کسی راستے کے بارے میں یہ بتانا مقصود ہو کہ وہ ایسا سیدھا ہے کہ اپنے رہرووں کو خود منزل پر لا ڈالتا ہے۔

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوۡعِدُهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبۡعَةُ اَبۡوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنۡهُمۡ جُزۡءٌ مَّقۡسُوۡمٌ ﴿۴۴﴾ اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ؕ ﴿۴۵﴾ اُدۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيۡنَ ﴿۴۶﴾ وَنَزَعۡنَا مَا فِىۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ

چلے گا۔ تیرا زور صرف اُنھی پر چلے گا جو بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے تیری پیروی کریں گے[67] اور اِن سب کے لیے جہنم کا وعدہ ہے[68]۔ اُس کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے کے لیے اُن میں سے ایک حصہ خاص کر دیا گیا ہے[69]۔ اِس کے برخلاف جو خدا سے ڈرنے والے ہیں، وہ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ اُن سے کہا جائے گا: اِن میں سلامتی کے ساتھ بے خوف ہو کر رہو۔ اُن کے سینوں کی کدورتیں جو کچھ رہی ہوں

۶۷۔ اِس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ شیطان اُنھی کو گم راہ کر سکتا ہے جو خود گم راہ ہونا چاہتے ہوں۔ اللہ کے جو بندے گم راہی سے بچنے کا ارادہ کر لیں اور سیدھی راہ کے سچے طالب بن کر زندگی بسر کریں، اُن پر اُس کی ترغیبات کبھی اِس درجے میں اثر انداز نہیں ہوتیں کہ وہ کسی ایسی گم راہی میں پڑ جائیں جو باعث ہلاکت ہو۔

۶۸۔ اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوۡعِدُهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ'۔ اِن میں زور لفظ 'اَجۡمَعِيۡنَ' پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ ابلیس کے قول 'لَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ' کے جواب میں استعمال فرمایا ہے۔ اُس نے بڑے طنطنے کے ساتھ دعویٰ کیا کہ میں سب کو گم راہ کر کے چھوڑوں گا۔ اُس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اُسی زور کے ساتھ فرمایا کہ پھر میں بھی اُن سب کو جہنم رسید کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔

۶۹۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ایسی جہنم کہاں سے مہیا ہو گی جو اتنے سب لوگوں کو اپنے اندر سمیٹ لے؟ اِس طرح کے مجرموں کے لیے جو جہنم تیار کی گئی ہے، وہ ایسی وسیع ہے کہ اُس کے سات دروازے ہوں گے جن سے جہنمیوں کے گروہ اُن کے جرائم کے لحاظ سے الگ

اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿٤٧﴾ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ﴿٤٨﴾

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿٤٩﴾ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ﴿٥٠﴾ وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ ﴿٥١﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿٥٢﴾ قَالُوْا

گی، ہم نکال دیں گے۔ وہ آمنے سامنے تختوں پر بھائی بھائی کی طرح بیٹھے ہوں گے۔ اُنھیں وہاں نہ کوئی تکان لاحق ہوگی[٧] اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔ ۴۶-۴۸

(اے پیغمبر)، میرے بندوں کو بتاؤ کہ یہ میں ہوں کہ بڑا ہی بخشنے والا ہوں، میری شفقت ابدی ہے۔ اور یہ بھی کہ میرا عذاب ہی بڑا دردناک عذاب ہے۔ (یہ فرشتوں کو دکھانے کا مطالبہ کرتے ہیں)، اِنھیں (یہ حقیقت سمجھانے کے لیے)[٧١] ابراہیم کے مہمانوں کا قصہ سناؤ۔ جب وہ اُس کے پاس آئے تو اُنھوں نے کہا: تم پر سلام ہو۔ ابراہیم نے (اُن کے رویے میں کچھ اجنبیت دیکھی تو) کہا: ہمیں تم لوگوں سے اندیشہ

الگ داخل کیے جائیں گے۔ قرآن نے جن چیزوں کو اصلی مہلکات قرار دیا ہے، وہ اگر شمار کی جائیں تو سات عنوانات کے تحت آجاتی ہیں*۔ شیطان اُنھی میں سے کسی ایک یا سب میں مبتلا کر کے لوگوں کو جہنم کے راستے پر ڈالتا ہے۔ یہ درجہ بندی غالباً اِنھی مہلکات کے لحاظ سے ہوگی۔

٧٠۔ یہ کس درجے کی نعمت ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...بہتر سے بہتر عیش و آرام کی زندگی بھی کسی کو حاصل ہو، لیکن اُس میں تجدد و تنوع نہ ہو تو آدمی بجھ کے رہ جاتا ہے۔ جنت میں اہل جنت کو اِس صورت حال سے سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ اُس میں ابدی عیش و آرام کی زندگی بھی ہوگی اور ہر لمحہ خدا کی نعمتوں میں ایسی گونا گونی و بوقلمونی

* بنی اسرائیل ١٧: ٢٢-٣٩۔

لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى

محسوس ہو رہا ہے[2]۔ وہ بولے: اندیشہ نہ کرو، ہم تمھیں ایک ذی علم[3] لڑکے کی بشارت دے رہے ہیں۔ ابراہیم نے کہا: کیا تم مجھے بشارت دے رہے ہو، جب کہ مجھ پر بڑھاپا آ چکا ہے؟ سو اب کس چیز کی بشارت دیتے ہو[4]؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہم نے تمھیں برحق بشارت دی ہے، اِس لیے مایوس نہ ہو۔ ابراہیم نے کہا: اپنے پروردگار کی رحمت سے گم راہوں کے سوا کون مایوس ہو سکتا ہے! ۴۹-۵۶

ابراہیم نے پوچھا: اے فرستادو، پھر اب تمھاری مہم کیا ہے[5]؟ اُنھوں نے جواب

بھی ہو گی کہ اہل جنت کی طبیعت کبھی اُس سے اچاٹ نہیں ہو گی۔'' (تدبر قرآن ۴/۳۶۲)

۱؎ یعنی یہ حقیقت کہ میں بڑا مہربان ہوں، لیکن اُس کے ساتھ بڑا ہی منتقم اور قہار بھی ہوں۔ اِس لیے یہ مطالبہ کر رہے ہو تو اِس بات پر بھی غور کر لو کہ اگر فرشتے آئے تو وہ تمھارے لیے کوئی بشارت لے کر آئیں گے یا صاعقۂ عذاب بن کر تمھاری بستیوں پر ٹوٹ پڑیں گے؟

۲؎ ابراہیم علیہ السلام کے اِس ارشاد سے واضح ہے کہ وہ یہ بات سمجھ گئے تھے کہ فرشتوں کا اِس طرح علانیہ آنا خطرے سے خالی نہیں ہے، یہ لازماً کسی مہم کے لیے آئے ہیں۔ سورۂ ہود میں اِس واقعے کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے فرشتہ ہونے کا گمان اُنھیں اُس وقت ہوا، جب اُنھوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

۳؎ یہ اِس بات کی طرف لطیف اشارہ تھا کہ وہ لڑکا علم نبوت سے بھی سرفراز ہو گا۔

۴؎ ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہایت خوب صورت پیرائے میں اِس بات کی تصدیق چاہی

قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

دیا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ صرف لوط کے لوگ مستثنیٰ ہیں۔ اُن سب کو ہم لازماً بچالیں گے،[۶] اُس کی بیوی کے سوا۔ ہم نے ٹھیرالیا ہے کہ وہ اُنھی میں ہو گی جو پیچھے رہ جائیں گے۔[۷] ۵۷-۶۰

ہے کہ تم جو بشارت مجھے دے رہے ہو، کیا یہ فی الواقع اُسی پروردگار کی طرف سے ہے جو بڑھاپے میں بھی اولاد دے سکتا ہے؟

۵؎ یہ سوال بتا رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دل کی کھٹک دور نہیں ہوئی اور اپنے لیے بشارت کے باوجود اُنھیں اندیشہ رہا کہ فرشتوں کی یہ پوری جماعت ضرور کسی دوسرے مقصد سے آئی ہے۔ وہ قوم لوط کے حالات سے واقف تھے، اِس لیے ممکن ہے کہ اُنھی کے بارے میں خیال کر رہے ہوں کہ یہ بجلی کہیں اِسی خرمن فساد پر تو گرنے والی نہیں ہے۔

۶؎ یہ صراحت اِس لیے ضروری تھی کہ حضرت ابراہیم کم سے کم لوط اور اُن کے پیرووں کے بارے میں مطمئن ہو جائیں کہ وہ اِس عذاب کی زد میں نہیں آئیں گے۔ لوط علیہ السلام کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ اُن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔ بائیبل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔ لوط علیہ السلام کا تعلق اُس قوم کے ساتھ وہی تھا جو حضرت موسیٰ کا قوم فرعون کے ساتھ تھا۔ اُن کی بیوی کا ذکر یہاں اور بعض دوسرے مقامات پر جس اسلوب میں ہوا ہے، اُس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اُن کی شادی اُسی قوم کے اندر ہوئی تھی اور اِس لحاظ سے وہ اُنھی کے ایک فرد بن چکے تھے۔

۷؎ یعنی اگرچہ پیغمبر کی بیوی ہے، لیکن خدا کا قانون بے لاگ ہے، وہ اُسے بھی نہیں

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ۨالْمُرْسَلُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٦٢﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٦٤﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَقَضَيْنَآ

پھر جب یہ فرستادے لوط کے لوگوں کے پاس پہنچے تو اُس نے کہا: تم کچھ اجنبی سے لوگ معلوم ہوتے ہو؟ اُنھوں نے جواب دیا: نہیں، بلکہ ہم تمھارے پاس وہی چیز لے کر آ گئے ہیں جس میں یہ شک کر رہے تھے۔ ہم تمھارے پاس ایک قطعی حکم لے کر آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں[78]۔ لہٰذا اب تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ اور تم اُن کے پیچھے پیچھے چلنا[79] اور تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ

چھوڑے گا۔ آیت میں اِس کے لیے لفظ 'قَدَّرْنَا' آیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...لفظ 'قَدَّرْنَا' کے صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھیے تو اِس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ پیغمبروں اور نیکوں سے قرابت رکھنے کے باوجود اگر کوئی شخص، خواہ مرد ہو یا عورت، بدی کی راہ اختیار کرے تو وہ خدا کے غضب کا دوسروں کے مقابل میں زیادہ سزاوار ٹھیرتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/۳۶۸)

۷۸؎ یہ تنبیہ اور توثیق کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں لڑکوں کی صورت میں دیکھ کر کسی غلط فہمی میں نہ پڑنا۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ شدنی ہے، اِس لیے اب بغیر کسی تردد کے اور بلا تاخیر ہماری ہدایات پر عمل کرو۔

۷۹؎ یہ اِس لیے فرمایا کہ اُن کے گھر والوں میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، جس طرح راعی اپنے گلے کے پیچھے چلتا ہے کہ کوئی بھیڑ ریوڑ سے الگ رہ کر بھیڑیے کا شکار نہ ہو جائے۔

اِلَيۡهِ ذٰلِكَ الۡاَمۡرَ اَنَّ دَابِرَ هٰۤؤُلَاۤءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِيۡنَ ﴿۶۶﴾ وَجَآءَ اَهۡلُ الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ هٰۤؤُلَاۤءِ

دیکھے[80] اور وہاں چلے جاؤ، جہاں تم کو جانے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔ اور ہم نے اُس کو اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا[81] کہ صبح ہوتے ہی اِن لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔ ۶۱-۶۶

(اِس سے پہلے یہ ہوا[82] کہ لڑکوں کو لوط کے گھر آتے دیکھ کر) شہر کے لوگ خوشیاں

الحجر ۱۵

۸۰۔ یہ ہدایت کیوں ہوئی؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...کسی جگہ سے نکلتے ہوئے اُس کی طرف مڑ مڑ کے دیکھنا اِس بات کی علامت ہے کہ اُس کے ساتھ انس اور لگاؤ ہے۔ یہ انس اور لگاؤ عام حالات میں تو ایک فطری چیز ہے اور ایک فطری تقاضے کو روکا یا دبایا نہیں جا سکتا، لیکن جس بستی کے لیے اتمام حجت کے بعد عذاب الٰہی کا فیصلہ ہو چکا ہو، اُس سے نکلتے وقت اہل ایمان کو اِس طرح دامن جھاڑ کے اٹھنا چاہیے کہ اُس کے ساتھ دل کے لگاؤ کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہ جائے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۳۶۸)

۸۱۔ اصل میں لفظ 'قَضَيۡنَا' آیا ہے اور اُس کے ساتھ 'اِلٰی' کا صلہ ہے۔ یہ اِس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں 'أبلغنا' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ کا مفہوم مقدر ہے۔

۸۲۔ سورۂ ہود میں یہ واقعہ جس ترتیب سے سنایا گیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ بدمعاشوں کے حملے سے پہلے حضرت لوط اِس بات سے واقف نہ تھے کہ اُن کے مہمان درحقیقت فرشتے ہیں۔ یہی ترتیب واقعات کی فطری ترتیب ہے، اِس لیے کہ لوط علیہ السلام اگر اُن کی حقیقت سے واقف ہو چکے ہوتے تو اُس فریاد و فغاں کی ضرورت نہیں تھی جس کا ذکر آگے ہوا ہے۔ لیکن قرآن نے یہاں حملے کی روداد کو موخر کر دیا ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جس پہلو کو نمایاں کرنا مقصود ہے، وہ فرشتوں کا آنا ہے تاکہ مخاطبین یہ جان لیں کہ اُن کے مطالبے پر فرشتے آ گئے تو اُن کے لیے کیا

ضَيْفِي فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿٦٨﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿٦٩﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٧١﴾ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٢﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ

مناتے ہوئے آ پہنچے۔[83] لوط نے کہا: یہ میرے مہمان ہیں، اِس لیے میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔[84] وہ بولے: کیا ہم نے تمھیں باہر کے سب لوگوں سے روک نہیں دیا تھا (کہ اُن کے اور ہمارے درمیان رکاوٹ نہ بنا کرو)؟[85] لوط نے (عاجز ہو کر) کہا: اگر تمھیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں۔[86] تیری جان کی قسم،

الحجر
۱۵

لے کر آئیں گے۔ اِس طرح کی تقدیم و تاخیر کی مثالیں قرآن کے بعض دوسرے مقامات میں بھی ہیں۔

۸۳؎ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ بد اخلاقی کی کس انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ لوط علیہ السلام جیسا مقدس انسان اور معلم اخلاق ہے جس کے گھر پر یہ اِس لیے خوشیاں مناتے ہوئے پہنچ گئے ہیں کہ اِنھیں کچھ خوب رو لڑکے اُن کے گھر جاتے ہوئے نظر آ گئے ہیں جن سے یہ اپنی ہوس کی پیاس بجھا سکتے ہیں۔

۸۴؎ حضرت لوط نے یہ اِن لوگوں کو نہایت موثر انداز میں اپنی عزت و آبرو کا واسطہ اور خوف خدا کا حوالہ دے کر بد معاشی سے روکنے کی کوشش کی ہے۔

۸۵؎ یعنی باہر سے آنے والوں کو ہم ماریں، لوٹیں یا اُن کی آبرو ریزی کریں، تم اِس میں رکاوٹ نہ بنا کرو۔ لوط علیہ السلام، ظاہر ہے کہ اِس سے پہلے بھی اُنھیں اِن سب باتوں سے روکتے رہے ہوں گے اور اُنھوں نے آپ کو اور آپ کے پیرووں کو دھمکیاں دی ہوں گی کہ ہماری بد معاشیوں میں اِس طرح کی رکاوٹیں پیدا کر کے تم ہماری بستی میں نہیں رہ سکو گے۔ یہ اُن لوگوں نے اِسی کا حوالہ دیا ہے۔

مُشْرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٧٤﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿٧٥﴾ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿٧٦﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾

(اے لوط، اِس وقت) یہ اپنی سرمستی میں اندھے ہو رہے ہیں۔ (ہم نے لوط کو تسلی دی)، پھر دن نکلتے ہی اُن کو ہماری ڈانٹ[۸۷] نے آپکڑا اور ہم نے وہ بستی اوپر تلے کر ڈالی اور اُن پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی[۸۸]۔ بے شک، اِس سرگذشت میں اُن لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو بصیرت حاصل کرنے والے ہوں۔ یہ بستی ایک عام گزرگاہ پر واقع ہے[۸۹]۔ بے شک، اِس میں ایمان والوں کے لیے بھی بڑی نشانی ہے[۹۰]۔ ۶۷-۷۷

۸۶ حضرت لوط کی طرف سے یہ اُن اوباشوں کے لیے کیا کوئی پیش کش تھی؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ حضرت لوط کی طرف سے کوئی پیش کش نہیں تھی، بلکہ یہ اپنی قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے اُن کی آخری تدبیر تھی۔ اگر اُن لوگوں کے اندر اخلاقی حس کی کوئی رمق بھی ہوتی تو وہ سوچ سکتے تھے کہ ایک یہ شخص ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے اپنی عزت تک خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہے اور ایک ہم ہیں کہ اُس کی اور اُس کے مہمانوں کی عزت کے درپے ہیں۔ یہ بالکل اُسی طرح کی بات ہے، جس طرح ایک اعلیٰ کردار کا آدمی دوسرے کی جان یا آبرو بچانے کے لیے اپنی جان اور اپنے وقار کو خطرے میں ڈال دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۳۷۰)

۸۷ یہ اُس عذاب کی تعبیر ہے جو قوم لوط پر بھیجا گیا۔ بادتند کے ساتھ اُس میں رعد و برق کی کڑک اور چمک بھی تھی، اِس وجہ سے یہ لفظ اُس کے لیے نہایت موزوں استعمال ہوا ہے۔

۸۸ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قوم میں بالعموم پتھر برسانے والی آندھی

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿٧٨﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٩﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٨٠﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٨١﴾

اِسی طرح بن والے[91] بھی یقیناً ظالم تھے[92]۔ سو ہم نے اُن سے بھی انتقام لیا۔ یہ دونوں بستیاں[93] کھلی شاہ راہ پر واقع ہیں۔ اور حِجر والے بھی رسولوں کو جھٹلا چکے ہیں[94]۔ ہم

سے تباہ کی گئی ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ اِسے 'حَاصِب' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اُسی کا بیان ہے۔

۸۹ سدوم اور عمورہ کی بستیاں حجاز اور شام کے تجارتی راستے پر واقع تھیں۔ دونوں ملکوں کے تجارتی قافلوں کے لیے یہ راستہ عام گزر گاہ تھا۔ اِس سے قافلے گزرتے تو لوگ تباہی کے اُن آثار کو دیکھتے تھے جو اِس علاقے میں آج بھی نمایاں ہیں۔

۹۰ قریش مکہ کے بعد اب یہ اہل ایمان کو بھی متوجہ کیا ہے کہ وہ بھی اگر چاہیں تو اِن آثار میں اپنے دشمنوں کا مستقبل دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا مطمئن رہیں، بالآخر وہی کامیاب ہوں گے اور اُن کے دشمن اِسی طرح پامال ہو جائیں گے۔

۹۱ اِس سے قوم شعیب مراد ہے۔ پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکا ہے کہ شعیب علیہ السلام مدین والوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ اِس بستی کے قریب ایک بہت بڑا بن تھا۔ عربی زبان میں جھاڑی اور بن کے لیے 'اَیْکَة' کا لفظ آتا ہے۔ یہاں چونکہ مخاطبین کو عذاب الٰہی کے اُن زمینی نشانات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جنھیں وہ اپنے تجارتی سفروں میں دیکھتے تھے، اِس لیے قوم شعیب کا ذکر 'اَصْحٰبُ الْاَیْکَةِ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ آگے قوم ثمود کو 'اَصْحٰبُ الْحِجْرِ' کہا گیا ہے۔ اُس کی وجہ بھی یہی ہے۔

۹۲ یعنی 'ظالمین أنفسهم' (اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے)۔ یہ کفر و شرک اور صراط مستقیم سے انحراف کے لیے قرآن کی خاص تعبیر ہے۔

وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ

نے اُن کو اپنی نشانیاں دیں، مگر وہ اُن سے روگردانی ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے کہ اُن میں چین سے رہیں۔[۹۵] پھر اُن کو صبح ہوتے ہماری ڈانٹ[۹۶] نے آپکڑا تو اُن کے کچھ کام نہ آیا جو کچھ وہ کماتے رہے تھے۔ ۸۷-۸۴

ہم[۹۷] نے، (اے پیغمبر)، زمین اور آسمانوں کو اور اُن کے درمیان سب چیزوں کو

۹۳ یعنی قوم لوط اور قوم شعیب کی بستیاں۔

۹۴ 'حجر' شمالی عرب اور شام کے درمیانی علاقے کو کہتے ہیں۔ یہ قوم ثمود کا مسکن تھا۔ صالح علیہ السلام کی بعثت اِسی علاقے کے اندر ہوئی۔ اُس وقت جو شہر یہاں آباد تھا، اُس کے کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العلاء سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اِس قوم کی طرف ایک ہی رسول کی بعثت ہوئی تھی، مگر کوئی رسول بھی یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کرتا، اُس کے ساتھ اُن کا معاملہ وہی ہوتا جو صالح علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔ قرآن نے اِسی بنا پر لفظ 'مُرْسَلِيْن' جمع استعمال کیا ہے۔ اِس سے جرم کی سنگینی اور شدت ظاہر ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُنھوں نے جب ایک رسول کو جھٹلایا تو گویا سب کو جھٹلا دیا۔

۹۵ مطلب یہ ہے کہ کمال فن سے بنائے ہوئے نہایت شان دار اور مستحکم مکانات میں اپنی جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن بیٹھے تھے اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اُن کے یہی مستحکم اور شان دار مکانات کسی وقت اُن کی قبروں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

۹۶ یہ لفظ کیوں استعمال ہوا ہے؟ اِس کی وجہ پیچھے قوم لوط کے ذکر میں بیان ہو چکی ہے۔

۹۷ یہاں سے آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین و تسلی کے لیے خطاب التفات ہے۔ یہ

السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ

مقصد کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے[۹۸] اور اِس میں کچھ شک نہیں کہ قیامت آنے والی ہے، اِس لیے اِن کے ساتھ خوبی سے درگذر کرو۔[۹۹] یقیناً تمھارا پروردگار ہی بڑا خلاق اور بڑے علم والا ہے۔[۱۰۰] ہم نے تم کو سات مثانی، یعنی قرآن عظیم عطا کر دیا ہے۔[۱۰۱] تم اُن چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے اِن کے مختلف گروہوں کو دے رکھی

خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ انذار عام اور اتمام حجت کی سورتوں کا خاتمہ بالعموم اِسی مضمون پر ہوتا ہے۔

۹۸۔ یہ آگے کی بات کے لیے تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ دنیا غایت وحکمت کے ساتھ پیدا کی ہے۔ اِس کا لازمی تقاضا ہے کہ یہ اپنے انجام کو پہنچے اور اِس میں جو کچھ ہوا ہے، خدا کی عدالت انصاف کے ساتھ اُس کا فیصلہ سنا دے۔ یہ کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے کہ لوگ اِس میں جو چاہے، کرتے پھریں اور اُن سے کوئی باز پرس نہ ہو۔

۹۹۔ اِس سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...خوبصورتی کے ساتھ درگذر کا مطلب یہ ہے کہ نہ اِن کی شرارتوں سے بددل اور مایوس ہو، نہ اِن کی بے ہودہ باتوں کا جواب دو اور نہ اپنے فرض دعوت وتبلیغ سے دست کش ہو، بلکہ اپنے کام میں لگے رہو اور اِن کے معاملے کو اللہ پر چھوڑو۔" (تدبر قرآن ۴/۳۷۶)

۱۰۰۔ اوپر فرمایا ہے کہ قیامت آنے والی ہے۔ یہ اُس کی دلیل ہے کہ خدا خالق ہے تو پھر کیا مشکل ہے، وہ جب چاہے، اِسی طرح دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ یہ دوسری پیدایش اگر احتساب کے لیے ہے تو اِس میں بھی کچھ مشکل نہیں، اِس لیے کہ وہ علیم بھی ہے۔ زمین وآسمان کی کوئی چیز اُس

عَلَيۡهِمۡ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلۡ اِنِّيۡۤ اَنَا النَّذِيۡرُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۸۹﴾ كَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَى الۡمُقۡتَسِمِيۡنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيۡنَ جَعَلُوا الۡقُرۡاٰنَ عِضِيۡنَ ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسۡـَٔلَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا

ہیں اور نہ اِن کی حالت پر غم کرو۔ اپنے شفقت کے بازو، البتہ اہل ایمان پر جھکائے رکھو اور (نہ ماننے والوں سے) کہہ دو کہ میں تو ایک کھلا ہوا خبردار کرنے والا ہوں۔ ہم نے اِسی طرح اُن بانٹ دینے والوں پر بھی اتارا تھا جنھوں نے اپنے قرآن کو بانٹ کر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے[۱۰۲]۔ اِس لیے تیرے پروردگار کی قسم، ہم اُن

سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ وہ جب فیصلہ کرلے گا کہ تمھیں جواب دہی کے لیے بلانا ہے تو تمھارا سب کچا چٹھا نکال کر تمھارے سامنے رکھ دے گا۔

۱۰۱۔ یعنی قرآن جیسی دولت گراں مایہ اور نعمت عظمیٰ عطا کر دی ہے جو سات مثانی کا مجموعہ ہے۔ لفظ 'مَثَانِی' 'مثنیٰ' کی جمع ہے اور اِس کے معنی ہیں: وہ چیز جو دو دو کر کے ہو۔ آیت میں حرف 'مِنْ' اضافت کو ظاہر کر رہا ہے اور حرف 'وْ' تفسیر کے لیے ہے۔ چنانچہ سات مثانی سے ہمارے نزدیک قرآن میں سورتوں کے وہ مجموعے مراد ہیں جن کی ہر سورہ مضمون کے لحاظ سے اپنا ایک جوڑا اور مثنیٰ رکھتی ہے اور دونوں میں اُسی طرح کی مناسبت ہے، جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ اِس سے مستثنیٰ چند سورتیں ہیں جن میں سے فاتحہ پورے قرآن کے لیے بمنزلۂ دیباچہ اور باقی تتمہ و تکملہ یا خاتمۂ باب کے طور پر آئی ہیں۔ یہ مجموعے تعداد میں سات ہیں۔ اِنھیں ہم قرآن کے ابواب بھی کہہ سکتے ہیں۔ قرآن کی تمام سورتیں آپس میں توام بنا کر اور اِنھی ابواب کی صورت میں مرتب کی گئی ہیں*۔

*اِس کی تفصیل کے لیے دیکھیے، اِسی کتاب کا "مقدمہ"۔

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾
اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿٩٥﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا
اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ
بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٩٨﴾
وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿٩٩﴾

الحجر ۱۵

سب سے ضرور پوچھیں گے جو وہ کرتے رہے ہیں۔ سو، (اے پیغمبر)، تمھیں جو حکم ملا ہے، اُس کو کھول کر سنا دو اور اِن مشرکوں سے اعراض کرو۔ تمھاری طرف سے ہم اِن مذاق اڑانے والوں (سے نمٹنے) کے لیے کافی ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو بھی شریک قرار دیتے ہیں، پھر وہ عنقریب جان لیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں، اُس سے تمھارا دل تنگ ہوتا ہے۔ سو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو اور سجدہ کرنے والوں میں سے بنو اور اپنے پروردگار کی بندگی میں لگے رہو، یہاں تک کہ تمھارے پاس یقین کی گھڑی آ پہنچے۔[۱۰۳] ۸۵-۹۹

قرآن کے بارے میں یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس ارشاد سے بھی واضح ہوتی ہے جس میں آپ نے سورۂ فاتحہ کو سبع مثانی اور قرآن عظیم قرار دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...سورۂ فاتحہ کی حیثیت پورے قرآن کے دیباچہ کی ہے اور اِس میں وہ تمام مطالب بالاجمال سمٹ آئے ہیں جو پورے قرآن میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ گویا اِس نگینے کے اندر قرآن عظیم کا پورا شہرستان معانی بند ہے۔ اِس پہلو سے یہ سبع مثانی بھی ہے اور قرآن عظیم بھی۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۳۷۸)

۱۰۲۔ یہ اشارہ یہود کی طرف ہے جنھوں نے اپنے قرآن، یعنی تورات کو حصوں میں بانٹ دیا،

پھر بعض کو چھپایا اور بعض کو ظاہر کیا۔ یہ وہی فعل ہے جسے سورۂ انعام (۶) کی آیت ۹۱ میں 'تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ ' (جس کو ورق ورق کر کے اُنھیں دکھاتے ہو) سے تعبیر فرمایا ہے۔

۱۰۳؎ یعنی خدا کا فیصلہ صادر ہو جائے اور ہر وہ بات واقعہ بن جائے جس کی تم لوگوں کو خبر دے رہے ہو۔

کوالالمپور

۲۲ راگست ۲۰۱۲ء